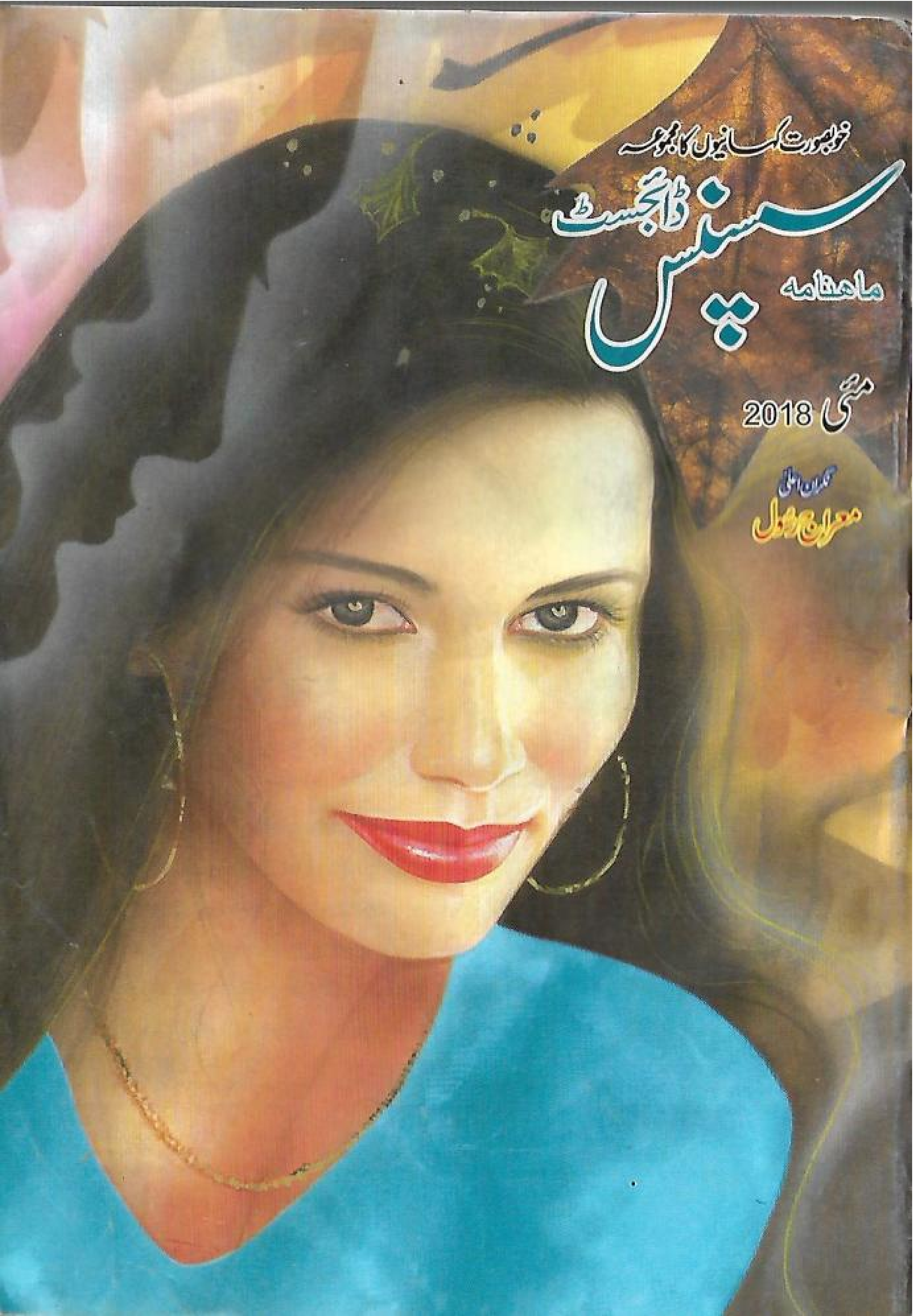

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
مئی 2018
مدیر اعلیٰ
معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ

CPNE — MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ — یمنیٰ احمد
نائب مدیر — اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 47 • شمارہ 05 مئی 2018 • زرِسالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پرنٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

نظر آنا

جون ایلیا

اس دور کا سب سے نمایاں رجحان یہ ہے کہ جو تم ہو وہ نظر نہ آؤ۔ یہ معاشرے کا دباؤ ہے جو ہمیں اس بے معنی اداکاری پر مجبور کرتا ہے۔ ہم باہر سے بہت ثابت وسالم اور ہشاش بشاش نظر آتے ہیں لیکن اندر سے ریزہ ریزہ اور اذیت زدہ ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہم نے معاشرے کے اس ظالمانہ دباؤ کو کیوں قبول کر رکھا ہے۔

آپ ہرگز خوش حال نہیں ہیں مگر آپ کی یہ مجال نہیں کہ خوش حال نظر نہ آئیں۔ تین مہینے سے آپ نے گھر کا کرایہ ادا نہیں کیا، قرض پر آپ کا مدار ہے لیکن آپ کے خیالات اور نظریات اور ایک خوش حال آدمی کے خیالات اور نظریات میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کا سیاسی نقطۂ نظر بالکل وہی ہے جو دولت مند لوگوں کا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ آپ اتنے محروم آدمی ہیں کہ احساسِ محرومی سے بھی محروم ہیں۔ حقیقتِ حال سے اس درجہ انکار! ذات اور ذہن پر معاشرے کا اتنا دباؤ۔

آپ اور آپ کی بیوی، جنہیں آپ خود اپنی زبان سے بیگم کہتے ہیں جبکہ آپ کا اپنی بیوی کو بیگم کہنا آدابِ گفتگو کے قطعاً خلاف ہے اور ایک غیر مہذبانہ حرکت ہے۔ یہ دوسروں کا فرض ہے کہ وہ آپ کی بیوی کو بیگم کہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد خوش نظر آ رہے ہیں جبکہ دونوں ایک دوسرے سے بری طرح تپے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں کا بس نہیں چل رہا کہ ایک دوسرے کا منہ نوچ لیں مگر نہ جانے آپ کو دوسروں کا اتنا خیال کیوں ہے کہ مثالی شوہر اور بیوی نظر آنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہر حال میں مثالی شوہر اور مثالی بیوی نظر آنا آخر کس نظام اخلاق اور کس نظام تہذیب کی رو سے لازمی اور ضروری ہے۔ جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر آپ بالکل بجا طور پر اپنی بیگم کی چوٹی کھینچ لیں اور وہ آپ کا گریبان، تو کیا قیامت آجائے گی۔

''مگر لوگ کیا کہیں گے!''

لوگ کیا کہیں گے؟ کچھ بھی کہیں، انہیں کہنے دیجیے۔ حد سے حد یہی تو کہیں گے کہ دونوں نے شادی کی تھی جو ناکام ہوگئی۔ چلیے قصہ پاک ہوا مگر آپ ہیں کہ معاشرے سے بے تکان جھوٹ بولے چلے جا رہے ہیں۔

جناب آپ کل سے جس بددلی اور بیزاری میں مبتلا ہیں، کیا اس کے ہوتے ہوئے آج آپ کو ڈاڑھی بنانا زیب دیتا تھا اور آپ نے ڈاڑھی ہی نہیں بنائی، بال بھی سنوارے ہیں اور خوشبو بھی لگائی ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ یہ سب کچھ آپ نے اپنی خاطر اور اپنی بددلی اور بیزاری کو دور کرنے کے لیے کیا ہو مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ آپ نے یہ سب کچھ لوگوں کے لحاظ میں کیا ہے تاکہ وہ آپ کو ایک شائستہ اور نستعلیق آدمی سمجھیں۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر آپ بددل اور بیزار ہیں اور بددل اور بیزار نظر بھی آ رہے ہیں تو اس میں عیب کی کیا بات ہے؟ شاید آپ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرہ آپ کا بددل اور بیزار نظر آنا پسند نہیں کرے گا۔ یقیناً ایسا ہی ہے اور جب ایسا ہی ہے تو اس بے حس اور ناہنجار معاشرے پر لعنت کیوں نہیں بھیجتے جس نے آپ کو ایک اداکار بنا کر رکھ دیا ہے۔ آپ مجھ پر شبہ نہ کریں۔ میں آپ کو بہکانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ میں خود پیچ و تاب میں مبتلا ہوں۔ خود میں بھی اسی صورتِ حال سے دوچار ہوں جس سے آپ دوچار ہیں۔ ہو سکتا ہے میری کیفیت آپ سے زیادہ اذیت ناک ہو اور مجھ میں آپ سے زیادہ دوغلا پن پایا جاتا ہو۔ یہ دوغلا پن ہی تو ہے کہ ہماری کیفیت ہو کچھ اور ہم ظاہر کچھ اور کریں۔ یہ ساری حرکتیں محض اس لیے کی جاتی ہیں کہ آدمی شائستہ اور بردبار نظر آئے۔ گویا شائستگی اور بردباری کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر لمحہ اپنے آپ سے جھوٹ بولے اور ایسا نظر آئے جیسا ہو نہیں۔ اگر شائستگی یہی ہے تو کیا اس کے ایک انتہائی بیہودہ شے ہونے میں کوئی شبہ کیا جا سکتا ہے؟

میں شاید یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اصل اور بے ساختہ آدمی کی اس معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں۔ وہ اپنی اصل حالتوں اور کیفیتوں کے اظہار کے ساتھ اس معاشرے میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں پہلے صورتِ حال اتنی شدید نہیں تھی۔ مگر اب شائستگی کے فروغ کے ساتھ ساتھ بے ساختگی کے ساتھ زندگی گزارنے کا امکان کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ معاشرے کی خاطر ہم ویسے نظر آئیں جیسے ہوں نہیں۔ وہی نظر آنا، نظر آنا، نظر آنا۔ لعنت ہے اس نظر آنے پر۔

☆☆☆

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

مئی 2018ء کا شمارہ گرمی کی سوغات لیے حاضر ہے۔ قہر برساتا سورج پاکستانی عوام کو اپنی بے بسی و بے کسی کا احساس دلا رہا ہے جو موسم بے موسم سختیوں کو برداشت کرنے کے پہلے سے عادی ہیں۔ لگتا ہے ہر سال کی طرح اس بار بھی ہیٹ اسٹروک کی لہر آئے گی اور بے شمار انسانوں کو اپنی زد میں لے لے گی (اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے) ہر ملک میں آفاقی حالات کے لیے پہلے سے احتیاطی تدابیر، بچاؤ کے رستے اور طبی سہولیات کے انتظام کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ ہمارے یہاں شاید پہلے سے بھی زیادہ پریشانیوں میں اضافے کے اسباب پیدا کرنے کی تدابیر پر غور کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ جون کے بجٹ کو دھماکا خیز بنانے کے لیے ابھی سے خورد و نوش کی اشیاء اور دودھ جیسی مائع چیز کی قیمتوں اور بسوں کے کرایوں میں من مانا اضافہ...... دیکھیے تو ذرا ہم پہلے سے کیسی کیسی تدابیر پر غور کرتے ہیں کہ اب کیسے عوام پر مہنگائی کا بم گرایا جائے اور تو اور...... اب رمضان المبارک کی آمد پر ہر طرح سے کیس یہ تھائی فطرت با اختیار طبقہ کیسے کیسے ہنر آزمائے گا عوام کی کھال اتارنے کے لیے۔ معصوم بچوں کے لیے دودھ کی کوالٹی دیکھیے اور غریب والدین کے لیے قیمتوں میں اضافہ دیکھیے پھر نعرہ ہے کہ نئی نسل ہمارا آنے والا مستقبل ہے۔ کسی چیز پر کوئی کنٹرول نظر نہیں آتا۔ اب کسی بھی طبقے میں مہنگائی کے لیے نہ کوئی ریلی نہ کوئی دھرنا اور نہ کوئی ورنہ...... بس اللہ توکلی حساب کتاب چل رہا ہے۔ جبکہ یکم مئی کا دن ہر سال ہمیں معاشرے کے سب سے کمزور طبقے یعنی مزدوروں کے استحصال کی نشاندہی کرتے ہوئے اس طبقے کے مسائل کو سمجھنے کی طرف راغب کرتا ہے لیکن افسوس یہاں ان معاملات سے کسی کو رغبت ہی نہیں ہے۔ بہر حال مئی کے پرچے کی تیاری ماہِ شعبان یعنی اپریل میں ہی کی جا رہی ہے جس میں شب برأت کی مقدس رات اس کائنات کی ہر مخلوق کے لیے حساب کتاب کی رات ہوتی ہے، جس میں زندگی موت، روزی رزق کے بارے میں فیصلے ہوتے ہیں اور جو عبادتوں کی رات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اس رات کی بابرکت ساعتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق دے اور اپنے اپنے نامۂ اعمال میں اچھے اور نیک اعمال میں اضافے کے مواقع دے (الٰہی آمین)۔ ابھی سے موسم گرما اپنے جوبن پر آ گیا ہے اور ساتھ ہی بجلی کا محکمہ اپنی بے رحمانہ کارروائیوں کے لیے فعال ہو گیا ہے۔ جھوٹا دلاسا آخر کب تک کہ جلد ہی بجلی کا بحران ختم ہو جائے گا اور اسی آس میں جانے کتنے انسان ختم ہو چکے...... بھلا وہ بحران...... کیسے ختم ہو سکتا ہے جسے ختم کرنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ ٹھنڈے کمروں میں رہنے اور اے سی کاروں میں گھومنے والے بھلا ان کا کیا احساس کر سکتے ہیں جو تپتی دوپہروں اور حبس زدہ راتوں میں بلبلاتے بچے بوڑھے بجلی کے محکمے کی انتظامیہ کو دہائیاں دے رہے ہوتے ہیں۔ آخر میں ایک سوال کیا کوئی ایسا ہے جو ان مظلوم عوام کو کم از کم رمضان المبارک کے لیے مہنگائی کی ظالم لہروں اور بجلی کے بحران سے بچا سکے؟؟؟؟ سوالیہ نشان کو چھوڑتے ہوئے ہم تو چلے اب اپنی محفل کی جانب۔

⊕ **چلبلی ہیر کا خط جھنگ صدر سے** ”اپریل کا شمارہ پڑھا دل بہت خوش ہوا کہ میرا تبصرہ صدارت کی طرف رواں دواں ہے۔ کسی ماہ ہیر صاحبہ بھی محفل صدر ہوں گی۔ (جی ضرور ضرور) کیونکہ میرا یقین ہے اچھا سوچو تو اچھا ہی ہوتا ہے۔ کراچی کے ادریس احمد خان صاحب صدارت پر تھے۔ مبارک باد۔ زرین خان پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں، بہترین مثال دی مدیرہ جی نے۔ کڑاہی میں شاید حلوا ہوتا ہے جو اتنے میٹھے تبصرے کرتی ہیں۔ منشی محمد عزیز مئے ہماری محفل میں بھی منشی گیری کرتے ہیں کہ سب کے خطوط کا حساب کتاب لکھتے ہیں۔ اشفاق شاہین صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ دوست محمد صاحب نے بھی چلبلی کو یاد رکھا۔ محمد رفاقت صاحب تھینک یو۔ ریاض بٹ انکل جی دعاؤں کے لیے نوازش۔ قدرت اللہ نیازی انکل میں 100 فیصد اصلی ہیر ہوں آپ کا پتا نہیں مسئلہ کیا ہے۔ کدی ہنس وی لیا کرو انکل جی۔ ناہید یوسف اور شاہانہ سلطانہ دونوں اچھے تبصرے دیتی ہیں۔ کہانیوں کی ابتدا اے آر راجپوت کی طویل داستان رنگِ آسماں سے کی کہ مہاراجا چندر گپتا نے وہ زہر کھا لیا اور انتقال کر گیا۔ داستان کا پھیلاؤ کافی دلچسپی لیے ہوئے ہے۔ حسام بٹ صاحب کی وقت واقعی بہترین وقت دے رہی ہے۔ (دے رہی ہے یا لے رہی ہے) امریکا میں شروع ہونے والی داستان اب کراچی میں الجھی ہوئی ہے۔ اسد علی تو اپنی شادو کو بھی بھول ہی گیا۔ امیدِ صبح اور ناہید سلطانہ اختر ویلڈن، بہت ہی بہترین اور بامقصد کہانی آخری صفحات کی زینت۔ گورے یا باہر سے آنے والے تو ہوتے ہی پھوٹ ڈالنے کے لیے ہیں۔ بے پناہ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے سکندرِ اعظم کی زندگی اور فتوحات کے بہترین پہلو پر روشنی ڈالی۔ بہت ہی زبردست اور شاندار رہی یہ داستان بھی۔ اجنبی محسن میں ملک صفدر حیات بہت باریک بینی سے مجرموں کا پتا لگانے میں کامیاب

ہوئے۔ شاید زاہد کو معاف بھی کر دیا کہ اس نے برائی کا خاتمہ کیا تھا۔ منظر امام صاحب کی رقیب بہت اچھی رہی۔ منظر امام صاحب ہمارا موڈ خوشگوار کرنے میں کامیاب رہے۔ محفل شعر و سخن میں اپنا شعر اول پوزیشن پر دیکھ کر از حد خوشی ہوئی اور اپنی فرینڈز کو بھی دیکھا، بہت شکریہ۔ باقی تمام احباب کے اشعار بھی دلفریب تھے۔ مراسلے سدا کی طرح معیاری تھے۔“ (بہت شکریہ جناب)

⊕ **منشی محمد عزیز مئے، لڈن ضلع وہاڑی سے تشریف لائے ہیں** ”اس بار سرورق ذرا منفرد سا لگا۔ ویلڈن ذاکر صاحب۔ اپنا خط شائع ہونے کی ”خوش خبری“ دو دن پہلے ہی مل چکی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے اسی پر نظر ڈالی۔ جی بجا ارشاد، مگر آپ خود ہی سوچیے۔ اگر آپ کی سال بھر کی محنت رائگاں چلی جائے تو کیا افسوس نہیں ہوگا؟ خیر جو بیت گیا، سو بیت گیا۔ جون ایلیا پاکستانی عوام کی حالتِ زار کی قوتِ برداشت کا ”اندازہ“ لگا رہے تھے، سچ تو یہ ہے کہ اس معاملے میں پاکستانی عوام کافی ”ڈھیٹ“ ثابت ہوئی ہے وگرنہ جس طرح سے سیاستدان، عوام کو نوچ کھسوٹ رہے ہیں، اگر کوئی ”عام“ قوم ہوتی تو کب کی ہار مان چکی ہوتی۔ ”آپ کے خط“ کی صدارت اس مرتبہ ادریس احمد خان کے نام تھی، مبارکباد۔ جھنگ کی چلبلی ہیر اس محفل میں اچھا اضافہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ویسے سر جی! اس رانجھا کو نہیں لائی ہیں، لگتا ہے موصوف کو بانسری بجانے سے فرصت نہیں مل رہی ہوگی۔ قدرت اللہ نیازی صاحب نے بھی اپنے درشن کروا ہی ڈالے، شکریہ۔ دیگر دوستوں میں دوست محمد، ریاض بٹ، ایمانے زارا شاہ اور ناہید یوسف کے خطوط پسند آئے۔ محفل شعر و سخن میں انعام یافتگان کے علاوہ رمضان پاشا، ملائکہ حریم، انجم کمال، نوروز خان اور ناصر حسین کا انتخاب پسند آیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد بے پناہ کے عنوان سے سکندرِ اعظم کی فتوحات کے ساتھ حاضر تھے۔ ویسے سکندر کی اعلیٰ ظرفی قابلِ تعریف ہے جب اس نے صحرا میں اس وقت پانی پینے سے انکار کر دیا جب پانی صرف اسی کے لیے تھا اور پوری فوج پیاسی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی شہنشاہ پورس سے اس کا سلوک بھی کمال کا تھا۔ شرط پڑھ کر عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ اک غریب لڑکے کی داستان۔ جنہوں نے اپنی بہن کو ڈیوی کے چنگل سے آزاد کروانے کے لیے کتنے جتن کیے اور پھر بالآخر اس نے ڈیوی کو اس کے انجام بد سے دوچار کرنے کا طریقہ تلاش کر لیا۔ منظر امام کی اتنی طویل تحریر پہلی بار پڑھی۔ ان کی ایک خوبی ہے کہ وہ بظاہر عام سی اور سادہ سی بات کو بھی اپنے اندازِ بیان سے خوب [illegible] آخر میں مشتاق نے خوب گیم کھیلتے ہوئے پرویز اور شیخو سے ان کی محبوبائیں ہتھیا لیں۔ اجنبی محسن کے اختتام پر میں تو ذہن بھی [illegible] کہ ملک صاحب نے زاہد کو کیا سزا دی ہوگی۔ شاید کئی قارئین سمجھ جائیں اپنی سمجھ سے تو بالاتر ہے کیونکہ ملک صاحب رشوت خور پولیس آفیسر تو نہیں ہیں جو رشوت لے کر زاہد کو آزاد کر دیں۔ راز کی ابتدا میں لکھا ہے کہ نعیم اپنی بیوی کو وہ رجسٹر پڑھنے نہیں دیتا جس پر اپنی یادداشتیں لکھتا ہے مگر آخر میں جب اس کی بیوی اسے قاتل گردانتی ہے اور اس کے ثبوت مانگنے پر وہ رجسٹر اٹھا لاتی ہے، تب کیا وہ تالا توڑ کر لاتی ہے؟ صداقت حسین ساجد نے مختصر سی تحریر میں بہت بڑا سبق دیا ہے۔ انجم فاروق ساحلی دیوانگی کے عنوان سے ماہر فلکیات کی کتھا لیے حاضر تھے۔ فلپ نے اپنی تسکین پوری نہ ہونے پر تین لڑکیوں کو قتل کر ڈالا اور پھر خودکشی کر لی۔ اسٹیو کی قسمت اچھی تھی جو نارما بچ گئی، وگرنہ وہ بھی قتل کا مجرم ٹھہرتا۔ اصل کھلاڑی ایک نادان لڑکی کی داستان جو راہزن کو ہی راہبر سمجھ بیٹھی اور پھر...... کہیں کی بھی نہ رہی۔ نبیل کی محبت حیرت انگیز تھی جو سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی ماہم کے راستے سے ہٹ گیا۔ ناہید سلطانہ اختر منجھی ہوئی لکھاری ہیں۔ ان کی تحریر امیدِ صبح نے تا دیر اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیا اور تڑپا کے رکھ دیا۔“ (ان کے قلم کی یہی خاصیت ہے کہ قارئین کچھ دیر سوچ میں ڈوب جاتے ہیں)

⊕ **محمد جاوید خان، تحصیل علی پور سے تبصرہ کر رہے ہیں** ”اسلام آباد کی ناہید یوسف اپنے میاؤں جی کے پنجوں کی پکڑ میں آئی ہوئی تھیں۔ منشی محمد عزیز مئے میں نے آپ کا طویل تر داستان دیوتا پر خلاصہ پڑھا ہے بہت پُراثر اور محنت طلب کام تھا۔ صداقت حسین ساجد کا موضوع عبرت ریڈیو پر کم و بیش 30 یا 35 برس قبل من و عن ایسا ہی ڈراما سامعین کے گوش گزار کیا جا چکا ہے غالباً وہی خیال لکھاری کے دماغ میں ڈیرے ڈالے بیٹھا تھا جسے کاوش نگار نے سینۂ سسپنس پر منتقل کیا۔ بہر حال وقت کی سوکھی ریگ ہتھیلیوں کی چھلنی سے مکمل سرکنے سے پہلے ہی وقاص کی عقل سلیم لوٹ آئی عبرت اچھی سبق آموز کوشش و کاوش رہی۔ حسام بٹ کی وقت میں وقت بے وقت کبھی کبھی جملے کی کلی اپنے سرخ پردوں کو کھول کر مسکراہٹوں کی خوشبو ہونٹوں پر بکھیر دیتی ہے۔ وقت کا پھنکارتا سرکتا ہوا سانپ اپنے پیچھے حادثوں کی زہریلی لکیر چھوڑتا جا رہا ہے۔ منظر امام بہت پرانے قلمی کھلاڑی ہیں۔ اپنے بار بدن کے حساب سے دھان پان سی کہانیاں رقم کرتے ہیں۔ رنگِ آسماں کے دامن نے ہر رنگ کے رنگ محبت، نفرت، پراسراریت، شماتت قلبی شقاوت جانے نہ جانے اور کتنے منفی و مثبت جذبوں کے ترش و شیریں رنگ سمیٹ رکھے ہیں۔ رنگِ آسماں بہت اچھا و راز سلسلہ ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا بہ زبان قلم بیان کردہ تاریخی قصہ بے پناہ آنکھوں سے سنا۔ الیگزینڈر دی گریٹ بیک وقت دو سوچوں کا اسیر رہا۔ کشور کشائی اور زمین کی آخری حد اور پوشیدہ بھید اور اسرار کی کھوج آخری خواب تعبیر کی منزل کو نہ چوم سکا بالآخر صغیر سنی میں لقمۂ تراب بنا۔ اس کی پہلی بیوی اس کے حسد گزیدہ سوتیلے بھائی کی جنسی ہوس کا نشانہ بنی تھی مگر الیگزینڈر دی گریٹ نے اپنے بھائی کو معاف کر دیا تھا۔ مرد بہت کم کسی سے محبت کرتا ہے، جب کرتا ہے تو ٹوٹ کر کرتا ہے۔ بہت خوش نصیب ہوتی ہے وہ عورت جسے مرد کی محبت نصیب ہو اور بہت بدنصیب ہوتی ہے وہ عورت جسے مرد کی محبت حاصل اور نصیب ہو اور وہ ادھر ادھر نہ جانے کدھر کدھر منہ مارتی پھرے۔ اصلی کھلاڑی کی ماہم جیسی عورت درِ محبت پا کر بھی صدفِ دل میں محفوظ نہ رکھ سکی۔ ماہم جیسی خواتین کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے جو گھر کی تو ہوتی ہی نہیں،



گھاٹ کی بھی نہیں رہتیں۔ اعتزاز سلیم وصلی کے راز کے پردے کو بے پردہ کیا تو محبوب ہی محبوبہ کا قاتل نکلا۔ پردیسی کہانی شرط میں ایک فکرمند بھائی کو خودسر بہن کی بے راہ روی کی وجہ سے قتل جیسے بدفعل کی بے داغ منصوبہ بندی کرنی پڑی۔ مغرب میں فحاشی دعریانی عروج پر ہے۔ مشرق بھی کچھ زیادہ پیچھے نہیں رہا۔ جرم وفا میں اسراف پسند بے وفا بیوی کی وجہ سے شوہر کو قرض کے ساتھ ساتھ دو دو جگہ ملازمت کرنی پڑی۔ باوجود اتنی مشقت اور قربانی کے بھی موہن کی بیوی غیر اخلاقی فعل میں مبتلا تھی۔ پہلے تین اشعار کے بعد بابر عباس، انعم علی، محمد طلحہ، دانش عمیر، میمونہ عزیز، جبران احمد ملک کے اظہار کے لفظوں کے سہرے دیگر اشعار کی نسبت زیادہ پسند آئے۔ اجنبی محسن میں پتھر دل ماں کی ستائی ہوئی بے گناہ اور مظلوم ماہ جبیں کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے مجبوری کے تحت انتہائی اقدام اٹھانے پڑے۔ قانونی پوزیشن دونوں کی مستحکم، طریقہ کار جو بھی ہو دونوں کو بالآخر ازدواجی ملن کی خوب صورت اسیری نصیب ہوئی ہوگی۔ ناہید سلطانہ اختر کی رقم کردہ امید صبح ماہ مارچ کے شمارے کی زینت رہی۔ اگر امید صبح کے کرداروں کے متعلق یوں سوچا جائے کہ باباجی قائداعظم، جھنڈا ہمارا قومی پرچم، جھنڈے والا گھر ہمارا دیس پاکستان، چاروں بیٹے صوبہ بلوچستان، صوبہ پنجاب، صوبہ سندھ، صوبہ خیبر پختون خوا چاروں بیٹوں کی اولاد چاروں صوبوں میں بسنے والے مستقبل کے بھیانک انجام سے غافل عوام، ڈمور ڈمور کی تکرار کرنے والا گورے میاں چالاک بیرونی گورا بھیڑیا جو مطلب نکل جانے کے بعد بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ جاتا ہے اور امید باباجی اور مستقیم کی طرح پرفکر عوام کا بیش قیمت سرمایہ تو ایسی سوچ غالباً سوچی جاسکتی ہے۔ سپنس کلاسک سسپنس کے پہلے شمارے کی مختصر اور طویل دو حصوں کی کہانیوں سے ترتیب وار شروع کیا جائے۔“

☒ جنید بن اقبال، لیہ سے حاضر ہیں ”سسپنس ڈائجسٹ سے تعلق بڑے بھائی کی وجہ سے بنا جن کو کم وبیش 25 سال سے سسپنس نے اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ ایک بار میں نے یونہی وقت گزاری کے لیے سسپنس ڈائجسٹ اٹھا کر پڑھنا شروع کردیا۔ بس پھر کیا تھا، اپنے گردوپیش کا بھی کچھ ہوش نہ رہا یہاں تک کہ پورا ڈائجسٹ ہی پڑھ ڈالا۔ بڑے بھائی تو تھے ہی، میں بھی سسپنس ڈائجسٹ کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ بھائی تو اب تک خط لکھنے کی جرأت نہ کرپائے مگر میں نے کرڈالی۔ بھئی ظاہری بات ہے اگر میں جرأت نہ کرتا تو آپ سب کو پتا کیسے چلتا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ خیر، اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا یہ ”محبت نامہ“ محفل کی زینت بنایا جاتا ہے یا پھر ردی سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ (ماشاء اللہ زعم تو دیکھو...... آپ کی محبتوں کو ہم کیسے نظرانداز کرسکتے ہیں) دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کسی کی حوصلہ شکنی بھی نہیں کرتے۔ بہار کیا آئی رت ہی بدل گئی۔ ہر طرف ہریالی اور قدرت کے حسین مناظر دیدہ زیب ہیں۔ اس ماہ کا شمارہ ہاتھ آتے ہی یوں لگا جیسے بنجر زمین میں زرخیزی آگئی ہو اور کسی راہ چلتے تھکے ہارے اور پیاسے مسافر کو پانی مل گیا ہو۔ ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا۔ ٹائٹل گرل ہمیں متاثر کرنے کے لیے مختلف پوز بنارہی تھی اور وہ بھی بہت ڈراؤنے قسم کے۔ ذاکر انکل پلیز کوئی ایسی حسن کی دیوی بنائیں جسے دیکھ کر پلکیں جھپکانا ہی بھول جائیں۔ محفل میں سب دوستوں کے نہایت عمدہ تبصرے پڑھنے کو ملے۔ بھئی یہی محفل تو سسپنس کی شان بڑھاتی ہے۔ کہانیاں ایک دو ہی پڑھ پایا ہوں اس لیے تبصرے کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ پڑھائی کی مصروفیات کے باعث بڑی مشکل سے ہی سسپنس کے لیے ٹائم نکال پاتا ہوں اور یہی میری سسپنس ڈائجسٹ سے محبت کا ثبوت ہے۔“ (بالکل درست کہا آپ نے...... پہلے تعلیم پر توجہ پھر سسپنس کا نمبر ہے)

☒ ساگر تلوکر چشمہ بیراج سے چلے آرہے ہیں ”سسپنس جلدی مل گیا۔ سرورق خوب صورت اور پیارا لگا۔ جون ایلیا سے حکمت کے موتیوں کی مالالی۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح عمدہ تھا۔ محفل میں کرسی صدارت پر ادریس خان تھے۔ بہت بہت مبارک ہو۔ چلبلی ہیر، منشی عزیز اور ناہید یوسف کے تبصرے دل کو بھائے۔ تاریخی کہانی بے پناہ بہت اچھی لگی۔ شرط نے خاص مزہ نہیں دیا۔ رنگ آسماں بھی خاص متاثر نہیں کررہی۔ رقیب منظر امام ہمیشہ عمدہ لکھتے ہیں۔ بہت چٹپٹی لگی۔ بہت ہنسی آئی۔ ایسی کہانیاں ہر ماہ شامل کیا کریں۔ اجنبی محسن صفدر نے زاہد کے لیے کونسی سزا کا انتخاب کیا۔ بہت سوچا مگر نا کام رہے۔ راز بہت بڑھیا کہانی تھی۔ اعتزاز سلیم نئے لکھاری ہیں مگر بہت سوہنا لکھتے ہیں۔ وقاص کو ویلے پہ عقل آگئی ورنہ اس نے رل جانا تھا۔ والدین کی خدمت ہمارا فرض ہے۔ فرض سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ محفل شعروسخن میں اپنا شعر تلاش کیا مگر نہیں ملا۔ ہائے رے ہمارا ڈاک کا نظام، اللہ ان کو ہدایت اور تیز رفتاری دے۔ انجم فاروق دیوانگی لے کر آئے اور دیوانہ بنا گئے۔ وقت پر تجسس ہے۔ علی کے لیے نئی پریشانی آنے والی ہے۔ ہمسفر میں مارلن کو سوزی ملی تو جولین کی جدائی کا غم بھول گیا۔ وقت بڑے بڑے گھاؤ بھر دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے واقعات بہت شوق اور عقیدت سے پڑھتا ہوں۔ پڑھ کر دل کو بہت سکون ملتا ہے۔ اصلی کھلاڑی ماہم جیسی لڑکیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ ان کے انجام پہ رونا آتا ہے۔ ریحان جیسے لوگ ہوس کے پجاری ہوتے ہیں۔ جرم وفا گزارے لائق تھی۔ امید صبح بہت چٹپٹی لگی۔ باباجی کے گھر اجڑنے کا بہت دکھ ہوا۔ گورے میاں پر بہت غصہ آیا۔ مستقیم اور امید کا کردار بہت پسند آیا۔ شکر ہے کہانی کا اینڈ ہیپی ہوا۔ ورنہ اکثر ناہید سلطانہ رلادیتی ہیں۔ سسپنس کلاسک کب شروع ہوگا؟ انتظار کی کوئی حد ہوتی ہے۔ (انشاء اللہ عید سے شروع ہوسکتا ہے) اب ہم پہ رحم کرئیں۔ کاشف زبیر اور نواب صاحب کی کہانیاں بھی شامل کریں۔“ (یہ تو آپ نے بالکل درست کہا۔ ان خوب صورت مصنفین کی کمی ہمیں بھی بہت محسوس ہوتی ہے اور انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ہی سسپنس کلاسک کے سلسلے کا آغاز کیا جارہا ہے)



☒ طلعت مسعود، دبئی سے محفل کی رونق بنے ہیں ”اپریل کے سسپنس پر بات کرنے سے پہلے میں آپ کی توجہ ایک معاملے کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ موت کے سوداگر ناول سسپنس اور جے ڈی پی گروپ کے مشہور اور مقبول ترین ناولز میں سے ایک ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے وقت میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے بلکہ آج بھی اتنا ہی مقبول و معروف ہے۔ اس ناول کی آخری قسط جون 2006ء کے سسپنس میں آئی تھی جبکہ کتابی شکل میں اس کے اٹھارہ حصے پبلش ہوچکے ہیں۔ آج تقریباً دس سال ہونے کو آئے، اس کے اٹھارہ پارٹ سے آگے پبلش نہ ہوسکے۔ ابھی ہم پہلے اٹھارہ حصوں کے بعد اگر کہیں سے پرانا سسپنس مل جائے تو اس میں سے اکادکا قسط پڑھتے ہیں جس سے تشنگی مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس بہترین ناول کے بقیہ حصے ابھی تک کیوں نہیں آرہے جبکہ ہمیں ڈر ہے کہ اتنی دیر نہ ہوجائے کہ وقت کی گرد میں ایک شاہکار ناول کھوجائے اور ہم اور آنے والے قارئین اس شاہکار ناول سے محروم رہ جائیں۔ (اس سلسلے کے پبلشر نے اسے ادھورا چھوڑا ہوا ہے جس میں ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ یا مصنف کا کوئی دخل نہیں ہے) اس مہینے کے سسپنس کی بات کریں تو اس دفعہ بھی معمول کے مطابق سسپنس کا آغاز وقت سے کیا جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اب حسام بٹ صاحب سے گزارش ہے کہ کہانی کا ٹیمپو تھوڑا تیز کریں۔ لگتا تو ہے کہ ڈیلفینا اب علی کے قریب پہنچ چکی ہے اور کچھ نئے ہنگامے علی کے منتظر ہیں اور انہی ہنگاموں کے ہم بھی منتظر ہیں۔ رنگ آسماں تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شوکی اور رینا کا کبھی خوشی کبھی غم والا حساب لگ رہا ہے۔ آخری صفحات پر سینئر رائٹر ناہید سلطانہ اختر صاحبہ امید صبح دکھارہی تھیں۔ دلچسپ اور ہلکے پھلکے انداز میں بہت عمدہ پیغام دیا۔ خاص کر ڈمور کے مطالبے نے بہت مزہ دیا۔ اس کہانی میں ہم ایک فیملی سے لے کر اپنے عالمی حالات تک دیکھ سکتے ہیں کیونکہ ہمارا بھی ”گورا صاحب“ ہر وقت ڈمور کی رٹ ہی لگائے رکھتا ہے۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں بھی گورا صاحب کی طرف دیکھنا چھوڑ کر جھنڈے والے گھر کو مضبوط بھی بنانا ہے اور اس کی حفاظت بھی کرنی ہے۔ بہت خوب صورت کہانی رہی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایمان افروز واقعات کو رضوانہ ساجد بہت خوب صورت انداز میں بیان کررہی ہیں۔ ملک صاحب اس بار اجنبی محسن کے ساتھ آئے تھے اور ہمیشہ کی طرح بہت عمدگی سے کیس کو حل بھی کردیا لیکن آخر میں ذہین قارئین کے لیے سوال چھوڑ کر الجھن میں ڈال دیا۔ چنانچہ ذہانت کا ثبوت دینے کے لیے ہم نے اس کا یہ حل نکالا کہ ملک صاحب نے زاہد کو شادی کی صورت والی عمر قید پر ہی بخش دیا۔ اب پتا نہیں یہ سزا سخت ہوگی یا دوسری جو نہ ہوئی۔ یہ تو کوئی تجربے کار ہی بتا سکتا ہے ہم تو صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔ ویسے ملک صاحب کی کہانی پڑھ کر یہ سوچ ہر بار آتی ہے کہ ایسے پولیس والے اب کیوں نہیں ملتے اور آپ سے یہ بھی گزارش ہے کہ ملک صاحب کے ڈی ایس پی کے زمانے کے واقعات بھی اگر پیش کریں تو کیسا رہے گا؟ (بہت اچھا اور دلچسپ رہے گا...... اچھا آئیڈیا ہے آپ کا...... شکریہ)

☒ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے بھرپور تبصرے کے ساتھ ”اپریل کا شمارہ چند دن تاخیر سے ملا۔ بہت بے چینی رہی۔ شمارہ ملتے ہی سرورق پر نظر گئی۔ خاتون کی آنکھیں اور گوندھی ہوئی چوٹی بہت خوب لگی۔ انشائیہ ”اندازہ“ پڑھ کر دل گرفتگی کی وہ حالت ہوئی کہ الفاظ نہیں۔ سچ واقعی بڑا کڑوا ہوتا ہے۔ جو حالات اس وقت ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، ان سے ہر بچہ واقف ہے۔ مارکیٹ جاکر خریداری کے بعد مہنگائی دیکھ کر جو حالت ہوئی ہے گم سم کردیتی ہے۔ جو انتہائی ضروری اشیا ہیں ان پر زیادہ مہنگائی ہے۔ سب کچھ تو باہر سے آرہا ہے۔ ڈالر 115 روپے، پیٹرول پر دنیا میں دام کم ہو رہے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کو عیاشی کے لیے رقم درکار ہے۔ جو پیٹرول، گیس، چاول، تیل گھی جائے کی قیمتوں کو بڑھا کر پوری کررہے ہیں۔ آئی ایم ایف سے جتنا قرضہ لے رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی شرائط بھی مان رہے ہیں۔ اگر امراء اور حکمران اپنے باہر کے اثاثوں کا ٹیکس بھی پاکستان لے آئیں تو قرض نہ لینا پڑے مگر حلف اٹھانے والو کبھی خدا سے ڈرو، کہیں تمہاری وجہ سے غریب اور مظلوم عوام اور ملک، خدا کے قہر میں نہ مبتلا ہوجائے۔ قصوروار تو قوم ہی ہے۔ اب کوئی لیڈر پاک صاف نہیں۔ ذہنی گراوٹ اور حالات نے ہم سے خودداری اور سمجھ بوجھ چھین لی ہے۔ یہ قوت برداشت کا معاملہ نہیں رہا۔ ہم ذہنی مفلوج ہوچکے ہیں۔ عزیز اور پیارے دوستوں کی محفل بڑی پرمغز ہے۔ ادریس احمد خان میر کارواں ہیں مبارک ہو۔ میں ان تمام دوستوں کا شکرگزار ہوں جنہوں نے میرے تبصرے کو پسند کیا اور مجھے یاد رکھا۔ بے پناہ، تاریخی یادداشت میں سکندر اعظم کو پڑھا۔ نظریہ یہ تھا کہ سکندر اعظم دنیا کو فتح کرگیا لیکن اب تفصیل سے پتا چلا کہ اس کو کتنی مشکلات، صدموں سے گزرنا پڑا۔ وہ 32 سال میں ہی دنیا چھوڑ گیا۔ بہت معلوماتی سلسلہ تھا۔ رنگ آسماں، چھٹا حصہ بھی بڑا پرجوش رہا۔ دو کہانیوں کو بڑی خوبی سے ساتھ ساتھ لے کر چلنا مصنف کا کمال اور زور قلم ہے۔ انگریزوں کا تعصب اور چال بازی اور محلاتی سازشیں۔ ہندو دھرم کے پجاریوں کی بدمعاشیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ اجنبی محسن، ملک صاحب کا ایک عمدہ کارنامہ۔ ان کہانیوں میں منظرکشی بہت لاجواب ہے۔ کہانی کے حسن کو دوبالا کردیتی ہے۔ موسموں کا ذکر، کھیتوں اور ندیوں، دریاؤں کی منظرکشی آفرین ہے۔ راز، ایک عمدہ کہانی، لوگ کس کس طرح سے دوسروں کا دکھ دور کرتے ہیں ایک انوکھا انداز۔ عبرت، ایسے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہمارے بزرگ اپنی اولاد کو اپنے خون سے پرورش کرتے ہیں۔ اولاد تو شاید خیال کرے لیکن باہر سے آنے والی بیگمات ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں۔ وہ احسان فراموش ہوجاتے ہیں لیکن ایک معصوم فرشتے نے ضمیر کو جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ وقت، بڑا لاجواب سلسلہ جو بہت سنسنی خیزی



سے آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن قسط نمبر 13 میں حسن و عشق کی زیادتی نے کہیں کہیں بوریت پیدا کر دی۔ شاید میں اس میں تحمل کا زیادہ طلب گار ہوں۔ یہ حسن و عشق کا تڑکا بے مزہ کر رہا ہے۔ یہ کہانی کا حسن تو ہے لیکن زیادتی بہرحال محسوس ہوئی۔ حضرت موسیٰ، بے پناہ معلوماتی سلسلہ، ایسی چیزیں اور واقعات پڑھنے کو ملے جس سے پہلے ہم اتنا واقف نہیں۔ طالب علموں کے لیے اور کم علم لوگوں کے لیے یہ نادر روزگار ہے۔ جرم وفا، ایک دلچسپ اور معاشرے کے نفسیاتی جذباتی جذبوں کی داستان جو ہمارے معاشرے کے دیے جانے والے زخموں کا نتیجہ ہی ہے۔ ہم سفر، کسی کی جدوجہد زندگی اور محبت کی چاہت کی داستان جو ہر انسان کے دل میں رہتی ہے۔ اب اس میں کتنی مشکلات آتی ہیں۔ کسی کو خواہش کے مطابق سب کچھ آسانی سے مل جاتا ہے اور کسی کو بہت تکلیفوں کے بعد۔ ایک اچھی تحریر۔ کترنیں، لطائف، سنہری باتیں رسالے کے حسن میں بہت اضافہ کرتی ہیں۔ اس دفعہ بھی بعض باتیں نوٹ کر لینے کے قابل۔ اشعار کی محفل کی اپنی ایک شان۔“ (اتنی گہری نظر سے سسپنس کے مطالعے کا بے حد شکریہ)

☒ زرین خان آفریدی، حیدرآباد سے کیا کیا فرما رہی ہیں ”ماہ اپریل کا سسپنس اپنی خوبصورتی کے ساتھ 17 مارچ کو مل گیا۔ سرورق پر مہوش حیات کی ہم شکل لیڈی براجمان تھی۔ انشائیہ میں جون ایلیا جی نے پاکستان کے موجودہ حالات اور ہم عوام کے قوتِ برداشت کا صحیح اندازہ لگایا ہے، ہمیں اپنے پیارے ملک سے محبت و عقیدت ہے جس کی وجہ سے یہ سب برداشت کیے جا رہے ہیں۔ اداریہ میں بھی لوگوں کے غلط طرزِ عمل اور طرزِ زندگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اپنی پُر رونق محفل میں انٹری کی تو جناب ادریس احمد خان کرسیِ صدارت پر، ہم وزارت پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ مبارک باد ادریس احمد صاحب۔ تیسرے نمبر پر ہیر صاحبہ تھیں، اچھا لکھتی ہیں۔ پشاور کے دوست محمد صاحب آپ کا شکریہ، تبصرہ اور شعر پسند کرنے کا۔ منشی محمد عزیز صاحب کو سسپنس کافی مہنگا پڑتا ہے لیکن شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ (یہ ان کی محبت کا ثبوت ہے) ریاض بٹ صاحب کا دعاؤں بھرا تبصرہ اچھا لگا۔ ایمانے زارا نے اس بار جلدی جلدی تبصرہ لکھا اور ختم کیا۔ محمد قدرت اللہ صاحب کبھی تو پوزیٹو تبصرہ کر دیا کریں۔ بے پناہ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے اس بار دنیا کے عظیم فاتح سکندرِ اعظم کی فتوحات نئے رخ سے پیش کیں۔ دل خوش ہو گیا کیونکہ سکندرِ اعظم میری فیورٹ شخصیات میں شامل ہے۔ بہت انجوائے کیا۔ ویلڈن صاحبِ قلم۔ امید صبح ناہید سلطانہ اختر صاحبہ بہترین اسٹوری پیش کرنے پر مبارک باد کی مستحق ہیں۔ اتفاق و بھائی چارہ میں ہی خوشی اور بقا ہے پاکستان ہمارا آشیانہ ہے اور چاروں صوبوں کے لوگوں کو پیار اور امن سے رہنا چاہیے۔ کسی باہر والے گورے کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے۔ ملک صاحب کی ڈائری سے اجنبی محسن میں ماسی نوری نے تھانے دار صاحب کو صحیح رخ پر متوجہ کیا۔ زاہد اور ماہ جبیں سامنے آئے۔ ملک صاحب نے چیلنج کیا ہم قارئین کو۔ مجھے تو لگتا ہے ملک صاحب نے زاہد کو معاف کر دیا کہ اس نے ایک معصوم لڑکی کی عزت بچائی اور اس کے ساتھ عزت کا رشتہ قائم کیا۔ راز اعتزاز سلیم وصلی کی پراسرار کہانی تھی۔ سلمیٰ کا مرنا بنتا تھا۔ عبرت، صداقت حسین ساجد واقعی مکافاتِ عمل کے زندان سے خوفزدہ لوگوں کو شرمندہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ وقاص اور نورین کے لیے آئینہ تھا۔ رقیب منظر امام اپنے منفرد انداز میں تشریف لائے۔ مشتاق، پرویز شینو اور کمال زبردست کردار رہے، ساتھ فرزانہ اور کہکشاں نے بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ ویلڈن صاحب۔ رنگِ آسماں، اے آر راجپوت صاحب کی بہت ہی اوسم جا رہی ہے۔ مہاراجا چندر گپتا کا انتقال داستان میں نیا موڑ شروع، مہارانی مجو بائی کا پلان ایک بار پھر چوپٹ ہو گیا، وقت کتنی جلدی گزر گیا پتا ہی نہیں چلا۔ (یہی وقت کی چالاکی ہے۔ دبے قدموں گزر بھی جاتا ہے) حسام بٹ صاحب کے وقت کی تیرھویں قسط پڑھی۔ ایک سال اور ایک ماہ ہو گیا۔ اسد علی کراچی کی بھول بھلیوں میں گھرا ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ کا چوتھا حصہ پڑھا، بہترین رہا۔ رضوانہ ساجد صاحبہ جزاکم اللہ کثیرا۔ عمیر علی کی اصل کھلاڑی اور جرم وفا ثمر عباس کی بیسٹ اینڈ بیسٹ رہیں۔ مراسلے بھی اے ون رہے۔ محفل شعر و سخن بھی اپنے جوبن پر تھی۔ اعزازی اشعار واقعی زبردست تھے۔“ (محبت بھرے انداز کا بے حد شکریہ۔ ایک بات کا خیال رکھیں، اشعار کے لیے ہمیشہ الگ صفحہ استعمال کریں۔ خطوط والے صفحات پر نہ لکھیں)

☒ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے چلے آ رہے ہیں ”سسپنس ڈائجسٹ اس مرتبہ تھوڑا تاخیر سے موصول ہوا مگر ہم نے دیر آید درست آید کے مصداق ہاتھوں ہاتھ لیا کہ انتظار جو بے چینی سے رہتا ہے۔ سرورق حسبِ حال تھا جو سراہے جانے کے لائق ہوتا ہے۔ انشائیہ سے بھی مستفید ہوئے اور دل سے تائید کرتے ہیں۔ اندر اداریے کے بعد ناموں کی محفل میں پہنچے تو اپنے نام پر نظر پڑی، بہت شکریہ۔ دیگر دوستوں کی حاضری بھی بھرپور ہے۔ سب سے پہلے تاریخ کے جھروکوں سے آگہی حاصل کی اور ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی کہانی بے پناہ پڑھی۔ سکندرِ اعظم کے واقعات و حالات سے آگاہی حاصل ہوئی۔ اللہ ڈاکٹر ساجد امجد کو ہمت اور زندگی دے۔ وہ اسی طرح تاریخ کے تاریک گوشوں سے متعارف کراتے رہیں (آمین) شرط میں ایک بھائی نے بے غیرت بننا گوارا نہ کیا اور بہن کی عزت کے لٹیرے کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں بہت خوبی سے چل رہی ہے۔ قارئین کی توجہ سمیٹ رہی ہے۔ منظر امام صاحب کی رقیب بہت دلچسپ اور موثر رہی۔ راز بھی اچھے انداز میں لکھی گئی۔ عبرت بھی سبق آموز تھی۔ محفل شعر و سخن بھی منتخب اشعار کے حوالے سے بہت کامیاب رہی۔ انجم فاروق ساحلی صاحب کی دیوانگی بھی اچھی لگی۔ وقت نے بھی اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ ہمسفر بھی بہتر کہانی تھی۔ دلوں کو جلا بخشنے والی حضرت



موسیٰ کی کہانی بھی ابھی جاری ہے۔ اصل کھلاڑی اور جرمِ وفا بھی اچھی لگیں۔ آخری صفحات کی ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کی امید صبح بہترین کہانی تھی ان کی ہر کہانی آئینہ دکھاتی محسوس ہوتی ہے، سماج کے بے حس رویوں پر، بہت خوب۔ کترنوں نے بھی محظوظ کیا۔“ (بہت خوب تبصرہ کیا)

☒ ریاض بٹ، حسن ابدال سے تبصرے کے ساتھ حاضرِ محفل ہیں ”ماہ اپریل 2018ء کا شمارہ اس وقت ہاتھوں میں ہے۔ سرورق کی حسینہ 420، دو بالوں کی چوٹیاں بنا کر اترا رہی ہے اور بھلا کیوں نہ اترائے۔ ہر دلعزیز اور ایک وسیع و عریض (عریض دیارِ غیر کی طرف اشارہ ہے) سرکولیشن رکھنے والے رسالے کے سرورق پر جو براجمان ہے۔ اپنے پیاری محفل میں پہنچے تو محترم مدیرہ صاحبہ بھی یہی بات کہہ رہی ہیں۔ آگے انہوں نے چھوٹے اور منچلے بچوں کو موٹر سائیکل اور کار دینے کے متعلق لکھا ہے۔ واقعی یہ ظلم ہے اس سے والدین کے دکھوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہرحال اس بار کرسیِ صدارت پر ادریس احمد خان براجمان ہیں۔ آپ کا تبصرہ مختصر ہونے کے باوجود جاندار ہے۔ کم از کم ڈھنگ کے لفظوں کا استعمال تو ہے۔ دلی مبارکباد قبول کریں۔ زرین خان آفریدی میں آپ کی بات سے متفق ہوں۔ اچھا تبصرہ ہے۔ اس بار پھر چلبلی ہیر اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ شاملِ محفل ہیں۔ ویل ڈن۔ دوست محمد صاحب آپ کا تبصرہ مدلل اور سیر حاصل ہے۔ منشی محمد عزیز میرے آپ کی رپورٹ برائے سال 2017ء قابلِ قدر ہے۔ ویل کم...... اپنا احتجاج ختم کر کے بھرپور طریقے سے اپنے پیارے رسالے میں شرکت کریں۔ ویسے یہ روٹھنا اور مان جانا بھی زندگی کا حسن ہے۔ انجم فاروق ساحلی اچھی کہانی کو سراہنا تو بنتا ہے نا۔ باقی لوگوں کے تبصرے بھی خوب ہیں۔ خاص کر اشفاق شاہین، ایمانے زارا شاہ، بابر عباس، فضل عباس کے تبصرے محفل کی جان ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب ہر قسم کی کہانیاں لکھنے میں طاق ہیں۔ اس بار وہ ہمیں تاریخ کے اوراق سے آشنا کر رہے ہیں۔ ان کی تحریر کردہ کہانی بے پناہ تعریف کے قابل ہے۔ علاقے فتح کرنے کے لیے بہت کشت و خون ہوا تھا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ اس کے بعد دل لگا کے ملک صفدر حیات کی کہانی اجنبی محسن پڑھی۔ سسپنس سے بھرپور تحریر ثابت ہوئی۔ اس کہانی کو میں نے ایک ہی نشست میں ختم کیا۔ آخر میں ملک صاحب نے جو ذو معنی بات کی، اس سے لگتا تو یہی ہے کہ انہوں نے زاہد کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ ویسے کہانی پڑھ کر یہ بات تو پایۂ ثبوت تک پہنچ ہی گئی تھی کہ اس نے ایک مظلوم لڑکی جو کہ اپنے ماں باپ کے ظلم و ستم اور بے پروائی سے عاجز آ کر گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئی تھی، کی عزت بچانے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا...... تنویر ریاض کی شرط میں ایک بھائی کی بے بسی کی تصویر کھینچی گئی لیکن آخر اس نے بازی جیت لی۔ تدبیر سے...... اور تکبر اور گھمنڈ کو شکست ہوئی۔ رنگِ آسماں بھی اب کافی رنگ بدل رہا ہے۔ اے آر راجپوت صاحب اس قسط میں کافی محنت کرتے نظر آئے۔ اب دیکھنا ہے کہ اگلے ماہ کیا ہوتا ہے؟ منظر امام کی تحریر کردہ کہانی رقیب بہت عمدگی سے لکھی کہانی ہے۔ ہلکے پھلکے بلکہ ذرا طنزیہ انداز کی کہانی پسند آئی۔ انجام غیر متوقع ہے لیکن دل کو بھا گیا۔ راز اعتزاز سلیم وصلی کی کہانی ذرا ہلکی تھی۔ انجم فاروق ساحلی اس بار دیوانگی لے کر آئے۔ اس کہانی میں معلومات کے ذریعے کرداروں کی نفسیات بیان کی گئی ہے۔ فطرت سے منہ موڑنا ممکن نہیں اور جو یہ کرتا ہے، اسے ایسے ہی انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انجم صاحب کہانی میں سسپنس برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ اصل کھلاڑی، جرمِ وفا بھی اچھی کہانیاں ہیں۔ آپ کے انتخاب کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ محفل شعر و سخن اور کترنیں بھی پرچے کے ماتھے کا جھومر ہیں۔“ (آپ کا تبصرہ بے حد شاندار اور جاندار رہا)

☒ محمد رفاقت واہ کینٹ سے تشریف لائے ہیں ”اپریل کا شمارہ ہاتھوں میں آ گیا ہے یہ مجھے 20 تاریخ کو ملا اور 21 کو جوابی خط ارسال کر رہا ہوں۔ کیا کروں جلد سے جلد جواب دینے کو دل کرتا ہے اور ڈر بھی رہتا ہے کہ کہیں خط شائع ہونے سے رہ نہ جائے۔ (آپ کا ڈر واقعی قابلِ فکر ہے) میرے خط کو جن لوگوں نے پسند کیا میں سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایمانے زارا شاہ صاحبہ اور محترم بھائی بابر عباس صاحب آپ نے بھی مبارک باد دیں ہم تو آپ کو اپنے دل میں بٹھا کے رکھتے ہیں۔ محترمہ ناہید یوسف صاحبہ آپ کا بھی شکریہ۔ وقت تو اپنے پیارے رسالے کے لیے نکالنا ہی پڑتا ہے۔ تو جناب سب کے تبصرے اچھے تھے اور خوب تھے۔ جس سے ایک بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ قارئین اپنے رسالے کو گہری نظر سے پڑھتے ہیں۔ جناب پہلی ہی کہانی ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تھی جس نے بہت متاثر کیا اور سکندرِ اعظم صاحب کے بارے میں معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ بے پناہ، واقعی اچھی کہانی تھی۔ تنویر ریاض کی شرط، منظر امام کی رقیب، ملک صفدر حیات صاحب کی اجنبی محسن، اعتزاز سلیم وصلی صاحب کی راز، جناب صداقت حسین ساجد صاحب کی عبرت، دیوانگی انجم فاروق ساحلی صاحب کی، شاہ زین رضوان کی ہم سفر عمیر علی صاحب کی اصل کھلاڑی، ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کی امید صبح بہت خوب صورت کہانیاں تھیں۔ سلسلے وار کہانیوں میں رنگِ آسماں، حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بہت اچھے سلسلے ہیں۔ محفل شعر و سخن میں چلبلی ہیر، جھنگ صدر سے پہلے نمبر پر آیا شعر بہت پسند آیا مبارک ہو۔ باقی سب لوگوں نے بھی اچھے اور معیاری شعر لکھے ہیں۔ محترم منشی محمد عزیز صاحب نے 2017ء کا جو خط ارسال کیا ہے بہت خوب، جناب، مبارک ہو آپ کا یہ انداز دل میں اتر گیا ہے۔“

☒ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے حاضر ہیں ”اپریل 2018ء کا سسپنس کا گیٹ اپ بہت عمدہ تھا۔ سرورق دیدہ زیب تھا۔



فہرست کی تزئین کاری بھی بھلی لگی۔ انشائیہ ہمیشہ کی طرح کھوپڑی میں زلزلہ پیدا کرنے والا تھا، کم ازکم میری کھوپڑی میں۔ (اللہ رحم کرے آپ کی حالت پر) خطوط کی محفل میں اول آنے والے ادریس احمد خان صاحب کو مبارکباد۔ موصوف کا تبصرہ کچھ تشنہ تشنہ سا لگا۔ دیگر تبصرہ نگاروں میں منشی محمد عزیز، ریاض بٹ، بابر عباس، ایمانے زارا شاہ کے تبصرے اچھے لگے۔ بے پناہ بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ سکندر اعظم اینڈ کمپنی فتوحات کرتے کرتے ہمارے وطن عزیز پاکستان کے شہر جہلم میں آکر بیمار ہوا اور یہیں فوت ہوا اور یہیں دفن ہوا۔ لیکن زیر نظر کہانی میں مذکور ہے کہ سکندر یونان میں اپنے محل میں فوت ہوا۔ اب سچ کیا ہے خدا جانے۔ شرط گزارے لائق تھی۔ رقیب منظر صاحب نے اس بار بہت ہنسایا۔ اس کہانی کے بے تکے واقعات کے پس منظر میں جو تحقیقی باتیں چھپی ہوئی ہیں وہ سمجھ میں آجائیں تو منظر صاحب کو داد دوں گا۔ رنگ آسماں میں مختلف واقعات آپس میں گڈمڈ ہوتے جارہے ہیں، جس سے ہمارے لطف میں دراڑیں پڑنے لگی ہیں۔ مصنف سے گزارش ہے کہ سیدھے سبھاؤ کہانی کو آگے بڑھائیں۔ اجنبی محسن ملک صفدر حیات کے کیا ہی کہنے، تھانے دار ہو تو ایسا...... ملک صاحب کی بھاگ دوڑ اور کوششیں رنگ لائیں۔ راز پسند نہیں آئی۔ عبرت واقعی عبرت آموز کہانی تھی۔ دیوانگی پسندیدگی کی صف میں اول نمبر پر ہے۔ حسام بٹ کے وقت پر تبصرہ کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ ہم سفر اچھی نہیں لگی۔ اصل کھلاڑی ماں باپ کی اجازت کے بغیر آشنا کے ساتھ گھر سے فرار ہونے والی لڑکیوں کے لیے ایک بھرپور سبق ہے یہ کہانی۔ بھارتی کہانی جرم وفا اچھی اور متاثر کن تھی۔ امید صبح یا ایسی کہانی جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اشعار کی محفل میں ماہا ایمان، مرزا طاہر الدین بیگ، وسیم چودھری، اشفاق شاہین، ریاض بٹ، محمد کمال انور کے اشعار قابل داد تھے۔ خطوط کی محفل میں میرا ذکر خیر کیا۔ ان سب دوستوں کا شکریہ، خصوصاً منشی عزیز کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے خطوط کی گنتی کی اور دوسرے نمبر پر بٹھایا۔''

✠ بابر عباس، فضل عباس، کھاریاں سے سیر حاصل تبصرہ کررہے ہیں۔ ''سرجی سسپنس کا نیا شمارہ سترہ مارچ کو لاہور سے لیا۔ سرورق پر دو چوٹیاں کیے خوف صورت حسینہ کو دیکھ کر یوں لگا اسے کہیں دیکھا ہے۔ جون ایلیا صاحب مرحوم کو ان کے انداز پر سلام کرتا ہوا آپ کی جلی کٹی باتوں کو کڑوے گھونٹ کی طرح پیتا ہوا محفل میں اپنا خط تلاش کرنے لگا۔ ارے یہ کیا؟ آپ نے میرے خط کو ایک نمبر ترقی دیتے ہوئے تیرھویں نمبر سے بارھویں نمبر پر کردیا تھا یعنی 13ویں گریڈ سے 12ویں گریڈ میں۔ اس بار کرسی صدارت پر آپ نے اپنے ہی شہر کراچی سے ادریس احمد خان کو موقع دیا۔ اسے کہتے ہیں موقع شناس، کیا خوب موقع دیا ہے۔ زرین خان آفریدی صاحب ہم بھی کھڑے ہیں راہوں میں، کچھ نظر کرم ہم پہ بھی ہوجائے۔ میں بھی محفل کا سینئر ساتھی ہوں۔ دوست محمد صاحب جناب خط پسند کرنے کا شکریہ، فضل عباس میرے بچے کا نام ہے۔ محمد رفاقت صاحب مکھن کم لگائیں مکھن سے بندہ پھسل بھی جاتا ہے۔ یہ نہ ہو میں پھسل کر واہ کینٹ پہنچ جاؤں۔ منشی محمد عزیز صاحب، انشاء اللہ ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ آپ اپنے سالانہ تبصرے میں مجھ ناچیز کا ذکر خیر بھی ضرور کریں گے۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب، خوش آمدید ویلکم ٹو بیک جی آیاں نوں۔ حسب دستور کہانیوں میں کہانی کا آغاز اے آر راجپوت کی رنگ آسماں سے کیا۔ ونڈر فل رب کائنات آپ کے ذہن کو مزید زرخیز کرے۔ رنگ آسماں کو آپ بہت اچھے انداز میں آگے لے کر جارہے ہیں، بس ذرا مریضوں پر بھی توجہ دیں۔ منظر امام صاحب اپنے انداز کے ایک منفرد رائٹر ہیں۔ جب بھی کچھ لے کر آتے ہیں زبردست لے کر آتے ہیں۔ اس بار منظر امام صاحب بڑے عرصے بعد ذرا طویل کہانی رقیب لے کر آئے اور آتے ہی چھا گئے۔ بادشاہو کمال کردتہ جے! طنز و مزاح سے بھرپور ہلکی پھلکی تحریر نے اتنا ہی مزہ دیا جو کسی بھی حکیم کی پھکی دیتی ہے۔ وقت کے بارے میں سرجی یہی کہوں گا بور کرنے لگی ہے۔ ملک صفدر حیات اس بار اجنبی محسن لے کر آئے۔ زبان تو ملک صاحب کی تھی مگر ہاتھ حسام بٹ صاحب کے تھے اور حسب معمول ملک صاحب نے مجرم کو پکڑ ہی لیا بعد میں بے شک چھوڑ دیا ہو۔ اعتزاز سلیم وصلی صاحب کی راز کا اینڈ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس بار وصلی صاحب کی کہانی پسند نہیں آئی۔ ہاں البتہ صداقت حسین ساجد کی مختصری کہانی عبرت نے کچھ متاثر کیا۔ والدین کی عزت کروگے تو سب کچھ پالوگے۔ عمیر علی کی اصل کھلاڑی اپنے تھیم اور پلاٹ کے حساب سے بہترین کہانی کہی جاسکتی ہے۔ ثمر عباس صاحب اس بار ایک ہندی کہانی جرم وفا لے کر آئے۔ بس ایویں سی کہانی تھی۔ رضوانہ ساجد کی اللہ تعالیٰ کے پیارے نبی کی زندگی کا احاطہ کرتی ہوئی ایک خوب صورت اور ایمان افروز تحریر حضرت موسیٰؑ ایک زبردست تحریر۔ ویل ڈن رضوانہ ساجد صاحبہ۔ آپ کی کاوش واقعی لائق تحسین ہے۔ تاریخی صفحات ایک ماہ ساجد امجد صاحب اور ایک ماہ علی اختر صاحب کے پاس یہ دونوں اپنے علاوہ کسی اور کو موقع ہی نہیں دیتے۔ (مثلاً کسے نہیں دیتے) ساجد امجد صاحب سکندر اعظم کو بے پناہ کی شکل میں لے کر آئے اور ہمیں سکندر اعظم کے حالات زندگی سے روشناس کروایا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی ایک بہترین پیشکش تھی۔ اس بار حقیقی معنوں میں سسپنس نے اپنی روایات کو نبھاتے ہوئے ایک معیاری اور خوب صورت کہانی پڑھنے کے لیے دی۔ ناہید سلطانہ اختر آپی نے اپنے ذہن کو الفاظ کی قلابازیاں کھلاتے ہوئے ایک خوب صورت تحریر امید صبح کی شکل دی۔ سرجی یقین کریں، ناہید سلطانہ آپی کی امید صبح نے سسپنس کے آخری صفحات کی حرمت کو برقرار رکھا ہے اس کو کہتے ہیں اتفاق میں برکت۔ سلطانہ آپی اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ تنویر ریاض صاحب کی شرط نے مجھے بھی شرط لگانے پر مجبور کردیا مگر افسوس میں ہار گیا جیسے ڈیوی کولن ہار گیا تھا۔ شاہ زین رضوان کی ہم سفر بھی سوسو تھی۔''



✠ ایمانے زارا شاہ، اسلام آباد سے فرما رہی ہیں ''اپریل کا شمارہ ہاتھ آتے ہی سرورق کی دولٹ نما بالوں والی خاتون سے نظریں چار کرتے کرتے اداریے کی سمت چل پڑے...... آپ نے بجا فرمایا ہے ہم نے اپنی ذمے داریوں کو بھی حکومت پر ڈال رکھا ہے...... حقوق و فرائض کے دو طرفہ چکر کو صرف حقوق کے کھاتے میں ڈال کر ہم معاشرے میں کیا تبدیلی لاسکتے ہیں......! اکثر مجھے اداریہ پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے پاکستان میں بس ناامیدی رہ گئی ہے، پلیز تھوڑا سا ہلکا پھلکا لکھا کریں...... (جو اچھا ہے وہ تو اچھا ہی ہے نا...... مگر جو اچھا نہیں، وہ زیادہ تکلیف دہ ہے اسی لیے اس پر توجہ کی ضرورت ہے) خطوط کی محفل میں ادریس احمد خان کو ٹاپ کرنے پر مبارک باد...... زرین آپ شکر کریں دونوں تبصرے کم از کم منزل مقصود تک بخیر و عافیت پہنچ تو گئے۔ ایک ہم ہیں ہماری تو ای میل بھی کسی برمودا ٹرائی اینگل میں جا گرتی ہے...... جلبلی ہیر کا تبصرہ خوشی و شوخی کے امتزاج سے بھرپور لگا۔ منشی صاحب آپ کے حساب و کتاب میں ہمارا نام کہاں گیا؟ سسپنس کے نام کچھ پیار بھرے سندیسے تو ہم بھی بھیج چکے...... باقی سب کے تبصرے بھی اچھے ہی تھے اور بابر عباس صاحب آپ کے تبصرے پڑھ کر خیال آتا ہے آپ کو 2000 وولٹ کے ایسے دو چار جھٹکے لگتے رہنے چاہئیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے وقت کی طرف نگاہیں دوڑائیں۔ علی اور ڈیلفینا کی آنکھ مچولی سے امید بر آئی۔ اب کہانی سبک خرامی چھوڑ کر تیز رفتاری پکڑے گی اور جس ایکشن کا ہم مہینوں سے انتظار کررہے ہیں وہ اب دور نہیں...... جمشید نے کچھ الفاظ کی تکرار اتنی شدومد سے کی جس سے مزہ کرکرا ہوگیا جیسے بریانی کھاتے ہوئے لونگ آجائے...... باقی دیکھتے ہیں تیل اور تیل کی دھار کس رخ پر بہنے لگی ہے۔ رنگ آسماں میں بالکل ناقابل یقین موڑ آگیا ہے۔ ویسے اس قسط میں کہانی تیزی سے رنگ بدلتی پائی گئی خاص کر نواب صاحب تک پہنچنے والی گوگو باتیں مزید کسی پراسراریت کی طرف اشارہ کررہی ہیں یعنی اب کہانی کافی حد تک کھل چکی ہے۔ زبردست...... دیکھتے ہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ منظر امام کی رقیب نے طبیعت فریش کردی اور کیا مزیدار اینڈ کیا۔ آخر میں بے ساختہ قہقہے لگانے کا دل کررہا تھا۔ ویلڈن۔ اعتزاز وصلی کہانی تو اچھی رہی لیکن طلاق کے بعد اسی انسان سے ملنا جو سب کے سامنے بے عزت کرچکا ہو چہ معنی دارد...... پھر عادل نے یہی کرنا تھا تو بیوی بنا کر بھی بعد میں طلاق دے سکتا تھا۔ وہ جن بھوت والا ڈراما رچا کر پہلے اس سے ملتی رہی پھر ایک دم دوسرے انسان سے محبت کرکے اسے قاتل بنوا دیا۔ عمیر علی کی سسپنس میں انٹری دیکھی۔ روایتی موضوع پر روایتی کہانی۔ خیر اچھی کوشش رہی آپ کی۔ انجم فاروق ساحلی کی دیوانگی پسند آئی۔ فلپ کے قتل کے بعد اسٹیو پر پورا شک ہوچکا تھا لیکن کڑیاں ملانا مائیک کا کام تھا اس لیے اس کا کام ہم نے اس پر چھوڑ دیا۔ خلوص و اپنایت کے رشتوں میں بندھی تحریر صبح امید جنہیں زنجیر سمجھ کر اونچی اڑان بھرنے والوں کے لیے بہترین سبق تھا۔ عموماً ناہید سلطانہ کی کہانیاں بہت تلخ حقائق پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس یہ لائٹ انداز میں پیش کی گئی اسی لیے دل کو چھو گئی۔'' (اتنے خوب صورت الفاظ میں اظہار خیال کا شکریہ)

✠ محمد ہمایوں تنولی، مانسہرہ سے محفل کی زینت بن رہے ہیں ''پورے 9 سال کے بعد محفل میں شرکت کررہا ہوں۔ امید ہے کہ کوئی مائنڈ نہیں کرے گا۔ (مائنڈ...... یہ کس چڑیا کا نام ہے...... البتہ افسوس ضرور ہے کہ اتنے عرصے بعد......؟) کیونکہ مابدولت اتنے عرصے بعد محفل کو چار چاند لگانے آئے ہیں۔ سب سے پہلے تو سرورق والی بی بی کی بات کررہے ہیں۔ محترمہ نے دو گُت کی ہوئی ہیں اور پیچھے کتاب رکھ کے نہ جانے کس کا انتظار کررہی ہے۔ اس بار 25 مارچ کو بھی بھیر کنڈ بابو بک اسٹال سے سسپنس مل گیا۔ نہ جانے اس بار جلدی کیسے آگیا کہ انتظار بھی نہ کرنا پڑا۔ سرورق کی حسینہ سے ملاقات کے بعد آگے بڑھے تو کیئر کریم والی لڑکی نے کہا کہ کہانیوں کی فہرست میں جھانکنے سے پہلے بلیچ کریم لگا کے جاؤ تو یہ سب اچھے لگیں گی۔ تو جناب میں نے اس ..... کے بعد صوفی سے پانی مانگ کر پیا۔ جون ایلیا کا انشائیہ مل گیا کہ مجھے پڑھے بغیر آگے نہ جانا چنانچہ انشائیہ پڑھ کر پاؤ بھر خون جلانے کے بعد محفل میں حاضر ہو کر آپ کے خط کے اوپر سے جمپ مار کر بے پناہ زور لگا کر اس شرط پر رقیب روسیاہ کے رنگ آسماں پر اجنبی محسن کے ساتھ راز کی باتیں کیں۔ ملک صفدر اور مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ صاحب کا شکریہ کہ ان کی بدولت ہم ہر ماہ اپنے پسندیدہ رسالے میں شکار کی کہانیاں پڑھ کر عبرت حاصل کرتے ہیں۔ آخر میں عرض کروں گا۔ محفل شعر و سخن میں 1،2،3 شعر پر انعام دیا کریں تاکہ ہم مزید دل لگا کر شعر بھیجیں۔ خدا تمام لکھنے اور پڑھنے والوں کو صحت و تندرستی دے۔ آمین۔'' (بہتر ہے جناب...... آپ کی رائے نوٹ کرلی گئی ہے)

☆...... ادارے سے طویل وابستگی رکھنے والے مصور، ذاکر حسین عرصۂ دراز سے علیل ہیں اور پیشہ ورانہ کام کرنے سے قاصر ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ ان کی صحت یابی کے لیے دعا فرمائیں۔

☆...... سسپنس میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ شائع ہو رہا ہے۔ مارچ کے سسپنس میں جو حصہ لگا اس کے لیے ہمیں کچھ قارئین کے فون موصول ہوئے۔ جس میں سوال کیا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں حضرت مریم کا ذکر کیوں تو جناب حضرت مریم بنت عمران آپ کی بہن کا نام ہے، لہٰذا نام کی مماثلت سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوا جائے۔ شکریہ!

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے

ریحانہ عطاءاللہ، ملتان۔ حمیرا اقبال، کوٹری۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ مہتاب احمد، حیدرآباد۔ صبا سحر، کراچی۔ رانا محمد ارشد، فیصل آباد۔ ناصر محمود، پھالیہ۔ طاہر مجاہد، میانوال رانجھا۔ میاں ارشاد احمد، قادرآباد۔

رامنی

علی اختر

وقت جتنی شدت سے اپنا انتظار کرواتا ہے اتنی ہی تیزی سے گزر بھی جاتا ہے لیکن اس کے نشانات رہ جاتے ہیں جسے ماضی کا نام دے کر ہم اپنی یادوں میں محفوظ کرلیتے ہیں مگر کبھی کبھی فرصت کے لمحات میں ان یادوں کے اوراق الٹنے کا دل چاہتا ہے۔ زیرِ نظر تحریر بھی ایک ایسے ہی دور کی یاد دلاتی ہے جو اپنے وقت میں بہت دلچسپ واقعات کو رقم کرتا ہوا مکمل ہوا اور آنے والی نسلوں کے لیے سوچ کے کئی در وا کرتے ہوئے کتابوں میں منتقل ہوگیا۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب کی زندگی سے متعلق بہت کچھ جان کر بھی بہت کچھ پوشیدہ رہا جیسے کہ یہ واقعات اس عہد کا ایک اور ہی رخ دکھا رہے ہیں۔ رامنی ایک ایسا کردار جو اپنی اوقات بھول کر شہزادے کے عشق میں گرفتار ہوئی اور بالآخر اپنے انجام کو پہنچی۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



دونوں ہی عمر کے اس حصے میں تھیں، جہاں زندگی کے خوش رنگ کچے پکے خواب خواہشوں کے ہنڈولے میں جھولے لینے لگتے ہیں اور آنکھیں کسی ان دیکھے شہزادے کو سوتے جاگتے اپنی طرف آتے اور اس کے انتظار کی سرشاری میں رہنے لگتی ہیں۔ دونوں ہم عمر تھیں اس لیے دونوں کی سوچیں بھی ایک سی تھیں۔ وہ جب اکٹھی ہوتیں، خوب ''ہلا گلا'' مچاتی تھیں۔ ان میں سے ایک آسام کے راجا سرگادیو جے دھواج سنگھا کی اکلوتی بیٹی رامنی گبھارو تھی۔ جسے تاریخ نگاروں نے اپنے ترجموں میں کئی مختلف ناموں سے پکارا ہے۔ کامنی، رامنی گبھارو، نانگ گبھارو اور بینا گبھارو۔ یہ اوہم راجا کی شہزادی تھی جبکہ دوسری پتام کے راجا کی بیٹی اور رامنی کی ہم عمر تھی۔ وہ راجا جے دھواج سنگھا کی بھانجی بھی لگتی تھی۔ پتام کا حکمران رامنی کے ننھیال سے تھا اس لیے ان کی آپس میں رشتے داری تھی۔ رامنی کی والدہ کا

تعلق بھی شاہی خاندان سے تھا۔ دونوں شہزادیاں ایک خاندان اور برسر اقتدار راجاؤں کی بیٹیاں تھیں۔ اس لیے دونوں کے ملنے جلنے پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی۔ وہ آزادانہ طور پر ایک دوسرے کے محلوں میں بلا روک ٹوک آتی جاتی تھیں۔ رامنی کی والدہ پاکھوری ان دونوں کو اکٹھا دیکھ کر بے حد خوش ہوتی تھی۔ ان دنوں میں آسام بھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ان ریاستوں کے راجا بھی الگ الگ تھے۔ آسام دو حصوں مشرقی اور مغربی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ مغربی آسام میں رنگ پور، میمن سنگھ، سلہٹ، جینتا پور، کچھار، منی پور کے علاقے شامل تھے۔ آسام کی ریاست دوسری نزدیکی ریاستوں سے زیادہ طاقتور تھی۔ اس کا رہن سہن اور ترقی دوسری ریاستوں سے زیادہ ہونے کے سبب دوسرے بڑے علاقوں اور خاص طور پر دہلی کے حکمرانوں کی نظریں بھی اس پر لگی ہوئی تھیں۔

اس روز پتام کے راجا کی بیٹی مہمان بن کر ان کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ دونوں سہیلیاں آپس میں خوش گپیاں لگا رہی تھیں۔ پاکھوری بھی ان کے نزدیک بیٹھی ان کو میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر اچانک وہ اٹھ کر اپنے مخصوص کمرے میں چلی گئی، تب رامنی نے اپنی سہیلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سکھی رات میرے ساتھ عجب ماجرا ہوا۔"

"کیا ہوا......؟" اس کی سہیلی نے پوچھا۔

"رات میں بڑے مزے سے سو رہی تھی کہ اچانک پتا نہیں کیا ہوا۔ میری آنکھیں ہڑبڑا کر کھلیں، تو میرا جسم ایک انجانے خوف کی وجہ سے پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ میرے پورے بدن پر خوف طاری تھا۔ میں اٹھ کر محل کے باہر کھلنے والی کھڑکی کو کھول کر کھڑی ہو گئی۔ ہلکی ہلکی اور مدھر کر دینے والی پون ماحول میں خوشبوئیں بکھیر رہی تھی۔ جب ذرا میرا ڈر کم ہوا تو میں نے آسمان کی طرف دیکھا، اس وقت آسمان تاروں سے پورا بھرا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا کسی نے مٹھی بھر بھر کر ستاروں کو آسمان کی طرف اچھال دیا ہو۔ ننھے منے اور بڑے ستارے اپنی مقدور بھر روشنیاں پھیلا رہے تھے کہ اچانک مجھے لگا، جیسے آسمان کے ایک بڑے اور روشن ستارے کا اچانک سے دروازہ کھل گیا ہو۔"

"پھر......؟" اب اس کی سہیلی بھی مارے حیرت کے ہمہ تن گوش ہو چکی تھی۔

"پھر اس دروازے سے ایک انتہائی خوب صورت سنہرا رتھ نکلا جس کے آگے بڑے تنومند اور خوب صورت جسم والے سفید گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ وہ بڑے ہی زور آور اور اتھرے دکھائی دے رہے تھے۔ اتنی دیر میں ایک تیز سانٹے کی آواز گونجی اور گھوڑے سرپٹ دوڑتے ہوئے میری طرف آنے لگے۔ اس وقت میں اور بھی ڈر گئی تھی۔ میں چیخنا چاہتی تھی مگر آواز میرے حلق ہی میں کہیں دفن ہو چکی تھی۔ گھوڑے اپنے سنہری رتھ کو لے کر میرے اور نزدیک آتے رہے۔ پھر وہ محل کی راہداری کی چھوٹی دیوار پر آ کر رک گئے۔ دیوار کے بالکل اوپر متوازی ہو کر رتھ کھڑا ہو گیا تھا۔ یوں جیسے اسے گرنے کا ذرا بھی خوف نہ ہو۔

"رتھ کے رکتے ہی اس پر سوار ایک نہایت حسین و جمیل شہزادہ چھلانگ لگا کر نیچے اترا۔ میں نے تو مارے دہشت کے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس نے اترتے ہی اپنے ہاتھوں سے میرے ہاتھوں کو پکڑ کر میری آنکھوں سے ہٹایا...... سکھی کیا بتاؤں...... وہ اتنا خوب صورت تھا کہ میں اپنی آنکھیں جھپکنا تک بھول گئی تھی۔"

"تمہارا وہم ہوگا......" اس نے لقمہ دیا۔

"ارے نہیں میری دوست...... یہ میرا وہم ہرگز نہ تھا۔ میں نے اپنے گال پر چٹکی لی تو میرا احساس یقین میں بدل گیا۔ پتا ہے وہ شہزادہ کون تھا؟"

"مجھے کیا پتا سپنا تمہارا ہے...... میں کونسا تمہارے ساتھ تھی۔" رامنی کی سہیلی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں...... یہ بھی درست ہے...... اس شہزادے کی شکل ہو بہو کرشن مہاراج سے ملتی جلتی تھی۔ بالکل اسی طرح حسین اور خوب صورت تھا......" اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی کرشن کی مورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"یہ سب تمہاری والدہ اور ماسی پاکھوری کی ہر وقت دی جانے والی دینی تعلیم ہے جو تمہارے دماغ میں بیٹھ گئی ہے اور یوں مجسم خیال بن کر تمہارے سامنے آئی ہے...... اور کچھ نہیں......" اس کی سہیلی نے وضاحت کی۔

"یہ سپنا تھا یا حقیقت لیکن یقین کرو، میں اس کی سرشاری میں ابھی تک ڈوبی ہوئی ہوں......" رامنی نے آنکھیں بند کر کے مزے سے کہا۔

"کہتی ہوں ماسی سے کہ اب وہ تمہارا کوئی بندوبست کرنے کا سوچیں۔ یہ واہموں اور خیالوں میں آتے شہزادے کہیں ویسے ہی نہ تمہیں لے اڑیں......" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں...... نہیں بڑی بی...... میں اتنی بھی نادان نہیں

ہوں کہ ان واہموں کو اپنے سر پر سوار کر کے بھٹک جاؤں۔ ہاں اگر تمہاری خواہش ہے، تو میں تمہاری والدہ سے سفارش کروا دیتی ہوں کہ تمہارے کہیں لگن کی فکر کریں......" اتنا کہہ کر رامنی زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دی اور ایک ہلکی سی چپت اس کے گال پر لگا دی۔ ابھی ان کی ہنسی رکنے بھی نہ پائی تھی کہ رامنی کی والدہ اور آسام کی ملکہ پاکھوری پھر ان کے درمیان آ بیٹھی۔

"کس بات پر اتنی ہنسی آ رہی ہے؟" اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"بس یونہی ماسی...... ہم ایک سپنے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ہنس رہے تھے۔"

"کیا سپنا تھا...... میں بھی تو سنوں؟" پاکھوری نے ان دونوں کو میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی اس لاڈلی بیٹا گبھارو جسے آسامی لوگ رامنی کے نام سے جانتے ہیں، نے رات ایک عجیب و غریب سپنا دیکھا جس کی تفصیل یہ مجھے بتا رہی تھی۔ واہ کیا اوٹ پٹانگ خواب تھا...... رات اس نے جاگتی آنکھوں سے کرشن مہاراج کو دیکھا۔ بھلا آپ بتائیں...... کیا ایسا ممکن ہے......؟"

"میری بیٹی ہر سمے دینی تعلیمات کے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ پھر میں بھی تو اسے ہمیشہ ہی ایسی دینی باتیں سناتی اور بتاتی رہتی ہوں جن کی وجہ سے اس کا دماغ اچھائیوں اور دینی تعلیم سے بھرا رہتا ہے...... ہوسکتا ہے یہ سپنا اسی کی ایک وجہ ہو......" پاکھوری نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں انہیں بتایا۔ "یہ دیوی اور دیوتاؤں سے اس کی محبت ہے۔"

"بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر میں کسی اور تشویش میں مبتلا ہو گئی ہوں۔" اس کی سہیلی نے رامنی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

رامنی نے نظروں ہی نظروں میں اپنی سہیلی کو روکنے کی التجا کی...... مگر وہ کہاں رکنے والی تھی۔ "ماسی! اس سے پہلے کہ یہ دیوتا اسے اڑا لے جائیں اس کا کسی اچھے سے لڑکے کے ساتھ سمبندھ جوڑ دیں۔ مجھے لڑکی ہاتھ سے نکلتی دکھائی دے رہی ہے۔"

"چل ہٹ شیطان......" رامنی نے ایک دھول اس کے سر پر ماری تو پاکھوری کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

"اوہ لڑکیو...... نہ سوچا کرو ایسی فضول باتیں......" ہنستے ہوئے پاکھوری نے کہا اور پھر وہ تینوں خاموش ہو گئیں۔

کرپشن

اسکول میں ایڈمیشن کے لیے ہیڈ ماسٹر نے فوٹو گرافر کو بلایا اور 10 روپے فی طالب علم پر بات پکی ہوگی۔

ہیڈ ماسٹر نے ٹیچر سے کہا۔ "30 روپے ہر بچے سے جمع کرو۔"

ٹیچر نے کلاس میں اعلان کیا۔ "صبح ہر بچہ فوٹو کے لیے 50 روپے لے کر آئے۔"

ایک بچے نے گھر جا کر ماں سے کہا۔ "اسکول والوں نے فوٹو کے لیے 100 روپے مانگے ہیں۔"

شام کو ماں نے بچے کے باپ کو بتایا۔ "اسکول والوں نے منے سے 200 روپے فوٹو کے لیے مانگے ہیں، اب بتائیں ملک سے کرپشن کیسے ختم ہوگی؟"

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

☆☆☆

تائی آہوم خاندان نے جب آسام پر اپنی حکمرانی قائم کی، اس وقت آسام ایک انتہائی پس ماندہ ریاست تھی۔ عوام کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور تھے جبکہ حکمرانوں کو لامحدود اختیارات حاصل تھے۔ آسام کے اردگرد کی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کے آپس میں جھگڑے رہتے تھے اور وہ ایک دوسرے کی ریاست ہڑپ کرنے کے چکر میں کئی بار آپس میں جھڑپیں کر چکے تھے۔ نظام حکومت ڈانواں ڈول ہونے پر ہتھیار بند جاگیردار من مانیوں پر اتر آئے تھے۔ وہ جب چاہتے زور زبردستی دیہی آبادیوں سے لگان لینے نکل آتے۔ وہ اس قدر طاقتور ہو چکے تھے کہ بے دھڑک حکومت کے سامنے بھی کھڑے ہو جاتے۔ چھوٹے بڑے جتھوں کی شکل میں حکومت کی راہ میں بھی روڑے اٹکانے لگے تھے۔ حکومت کی گرفت دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے میں ذات پات کا عفریت بھی منہ کھولے انہیں ہڑپ کرنے کی کوشش میں تھا۔ جنوبی ہند میں شمالی ہند کی نسبت چھوت چھات کا نظریہ زیادہ شدید تھا۔ 1615ء میں آہوم خاندان اور مغل بادشاہوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مغل شہنشاہوں کی نظریں آسام پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی سلطنت کو مزید وسعت دینے اور ان ریاستوں پر اپنی دھاک بٹھانے کی کوششوں میں ان پر چڑھائی کرتے تو آہوم کی ساری ریاستوں کے حکمران ایک دوسرے کی مدد کو آ جاتے اور اس طرح کئی بار مغلوں کو ان کے ساتھ جھڑپوں میں

ہزیمت بھی اٹھانا پڑی اور کئی بار وہ جیت بھی گئے لیکن جلد ہی انہیں واپس لوٹنا پڑا۔ بالآخر مغلوں نے کچھ اور بہار کے حکمران کے ساتھ معاہدہ کرلیا۔ اب آسام کے حکمرانوں کو دو اطراف سے دشمنی کا خطرہ تھا۔ اگر شمال مشرق کی طرف سے انہیں مغلوں کے حملے کا خطرہ تھا تو مغرب کی طرف سے کچھ اور بہار کی ریاست کے حکمران اس کے دشمن تھے۔ اب ان کو مغلوں کی حمایت بھی حاصل ہو چکی تھی۔ ان دونوں سے نمٹنے کے لیے آہوم کے راجا سکھا امپا نے ایک چال چلی۔ اس نے مشرقی حصے کا حکمران بننے والے رگھودیو سے لکھمن نرائن کی بیٹی کی شادی کرادی اور اس طرح کچھ اور حاجو کی ریاستوں کو اپنی ریاست کوئیلا پارا کا حصہ بنالیا اور ایک بار پھر اس معاہدے کی تجدید کرلی گئی کہ جب بھی بیرونی حملہ آور آسام اور اردگرد کی ریاستوں کو ہڑپ کرنے کی نیت سے آئیں گے تو وہ ایک دوسرے کی پہلے کی طرح حمایت میں کھڑے ہوں گے۔ اس کے اس حربے نے آسام کو ایک بار پھر دوسری ریاستوں کے مقابلے میں مزید طاقتور بنادیا۔

مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں آہوم اور مغلوں کے درمیان ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ دس سال کی پرانی دشمنی نے دونوں طاقتوں کو تھکا کر رکھ دیا تھا مگر یہ صلح بھی عارضی ثابت ہوئی اور بہت جلد دوبارہ جھڑپوں کا آغاز ہوگیا۔ 1638ء میں آہوم سادھورا کا قلعہ کھونے کے ساتھ ساتھ کام روپ میں بھی شکست کھا چکے تھے۔ اب یہ سوچنا بھی فضول تھا کہ آہوم اور مغلوں کے درمیان امن کا کیا گیا معاہدہ بڑے تسلی بخش طریقے سے چل رہا ہے اور دونوں اطراف سے اس کی پابندی کی جارہی ہے۔ جب آہوم راجا کو اس بات کی خبر ہوئی کہ شاہ جہاں بیمار ہے اور بسترِ مرگ پر پڑا ہے تو آسام اور کام روپ میں پھر بغاوت ہوگئی۔ آسام بہار کے راجاؤں نے تاوان دینے سے انکار کردیا۔ آہوم کے راجا جے دھواج سنگھا کی سرکردگی میں ان کی مشترکہ فوجوں نے مغلوں کی چوکیوں کو روند ڈالا۔ آسام اور بنگال کی سرحد تک ان کی فوجوں کو دھکیل دیا۔ اس وقت تک شاہ جہاں وفات پاچکا تھا اور شہزادگان میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ دارا، شجاع، اورنگ زیب اور مراد تخت کے لیے آپس میں برسرپیکار ہونے لگے تھے۔ ہر کسی کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی راج دھانی اس کے قبضے میں آئے۔ اس دوران تائی آہوم کے راجاؤں کو اپنے معاملات درست کرنے کے لیے بہت وقت مل گیا۔ جے دھواج سنگھا نے گواہٹی، کاجلی، ساموگڑھ اور کھڑگاؤں پر اپنی گرفت زیادہ مضبوط کرلی۔ جے دھواج سنگھا بے حد ہوشیار اور چالاک شخص تھا جو اپنے مفاد کے لیے ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوجاتا تھا جس میں اس کی ذات اور حکومت کی بہتری نظر آتی تھی۔

مغلیہ شہزادگان میں حکومتی معاملات طے پاگئے۔ شاہ جہاں کے دوسرے بیٹے اورنگ زیب نے اپنے بھائی بھتیجوں کو مغلوب اور مقتول کرنے میں تین سال ضائع کیے۔ جب تک یہ نہ ہوا، اسے خود اپنی زندگی کا بھی خطرہ رہا۔ باپ کے بیمار ہونے پر دارا نے دارالسلطنت سے صوبہ جات کی طرف جانے والی سڑکوں کو بند کردیا اور بھائیوں کے وکیلوں کو نظربند کردیا۔ اس پر شہزادوں نے یہ سمجھا کہ شاہ جہاں کا انتقال ہوچکا ہے اور دارا شکوہ اس خبر کو چھپا کر مرکزِ حکومت پر اپنی طاقت مستحکم کررہا ہے۔ سب سے پہلے مراد بخش نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اس کے بعد یہی حرکت شجاع نے کی۔ آخرکار اورنگ زیب اور مراد میں معاہدہ ہوگیا کہ دارا شکوہ کو بادشاہ نہ بننے دیا جائے۔ ساموگڑھ کے مقام پر جو آگرہ سے مشرق کی طرف دس میل کے فاصلے پر ہے، دارا اور اورنگ زیب کی فوجوں میں فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ جس میں دارا شکوہ کو شکست ہوئی اور وہ دہلی کی طرف بھاگا۔ اورنگ زیب اس کے پیچھے بھاگا۔ دارا شکوہ فوراً لاہور پہنچا اور 15 جولائی 1658ء کو شہر پر قابض ہوگیا۔ پنجاب کے صوبے دار عزت خاں نے اس کا مکمل ساتھ دیا۔ اورنگ زیب کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ لاہور کی طرف بڑھا۔ وہ لوگ جو دارا شکوہ کی حمایت میں اس کا ساتھ دے رہے تھے، ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد وہ دارا کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب کے ساتھ مل گئے۔ بعدازاں دارا شکوہ گرفتار ہوا اور اسے مذہبی عدالت سے فیصلہ لے کر سزائے موت دے دی گئی۔ بالآخر اورنگ زیب کامیاب ہوا اور سلطنت دہلی کا فرماں روا مقرر ہوگیا۔ اس زمانے میں آسام کے راجا نے بھی اپنی سلطنت پر گرفت مضبوط کرلی تھی اور اپنے اردگرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مغلوب کرکے اپنی راج دھانی میں شامل کرلیا تھا۔

☆☆☆

جے دھواج سنگھا کو جب اطمینان ہوگیا کہ اب اس کی سلطنت کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں اور مغل شہنشاہ تخت و تاج کی جنگ میں پھنسے ہوئے ہیں، ان کا دھیان بٹا ہوا ہے اور خاندانی دشمنی کی آگ کا الاؤ بڑی تیزی سے دہک رہا ہے تو اس نے بھی پر پرزے نکالنا شروع کردیے۔ اب اس

کا زیادہ تر وقت لہو و لعب میں گزرنے لگا تھا۔ اس نے اپنی رعایا کی طرف توجہ دینے کے بجائے عیش پرستی کو اپنا شعار بنالیا۔ آسام کی سرزمین اور رعایا اب جے دھواج سنگھا کی عدم توجہ کا شکار ہوکر رہ گئی تھی۔ اوپر سے وہ قدرتی آفات کا بھی نشانہ بنی ہوئی تھی۔ آسام کی سرزمین اونچی نیچی پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ برسات کے دن آتے ہی بھرپور بارشوں میں جب اس کی سرزمین کیچڑ کے مارے لیس دار ہوجاتی تو دریاؤں میں سیلاب آنے کی وجہ سے راستے مسدود ہوکر رہ جاتے۔ لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف تو ہوتی ہی تھی، باہر سے آنے والے تجارتی قافلے بھی رک جاتے۔ ایسے میں حکمران طبقے اونچے مقام گواہٹی اور کھڑگاؤں کی طرف چلے جاتے۔ آسام کے راجا جے دھواج سنگھا کی آسام پر گرفت کیا مضبوط ہوئی، اس کی حرکات میں بھی تبدیلی آنے لگی تھی۔ اس نے اپنے لیے محل تعمیر کروانے شروع کردیے۔ اس نے کھڑگاؤں میں محل بنوایا۔ اب وہ برسات کا پورا مہینا کھڑگاؤں کے اس محل میں چلا جاتا اور وہاں شراب کے ساتھ دوسری عیاشیوں میں مصروف ہوجاتا۔ ریاست کی خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ دادِ عیش دیتا پھر اس نے اپنے آپ کو جے دھواج سنگھا کے بجائے کام روپ کہلوانا شروع کردیا۔

کیونکہ کام روپ کا علاقہ آسام سے قدرے خوب صورت تھا اور یہاں کی لڑکیاں بھی آسام کی سانولی لڑکیوں کے مقابلے میں نقش و نگار میں زیادہ نازک اندام اور حسین تھیں۔ اس کے لیے یہ کام آسام کے بگڑے ہوئے جاگیردار انجام دیتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے گرد چاپلوسی کرنے والوں کا ایک ہجوم رہنے لگا تھا جو اس کے لیے عیاشی کا ہر سامان مہیا کرتا تھا اور اس کے بدلے میں اپنا اپنا فائدہ اٹھاتا تھا۔ کام روپ جب آسام سے کھڑگاؤں آتا، بدقماشوں کا یہ ٹولا اس کے گرد جمع ہوجاتا۔ اسے طرح طرح کے کاموں پر اکساتا۔ ان کے اکسانے پر وہ اردگرد کی ریاستوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے وقتاً فوقتاً ان سے چھیڑ چھاڑ سے بھی گریز نہ کرتا تھا جس کی وجہ سے یہ ریاستیں اس سے خوفزدہ رہنے لگی تھیں۔ اندر ہی اندر وہ جے دھواج سنگھا سے نفرت بھی کرنے لگے تھے۔ جب آہوم خاندان کے ایک امیر سیسن گپھا پرتاب سنگھا کی شادی دوسری ریاست کے راجا پرکشٹ کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تو خاندان میں پھوٹ پڑگئی اور وہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہونے لگے۔ خاندان کے بڑے نارنرائن نے اپنے بھانجے کی خواہش پر ریاست کو شمال مشرقی اور مغربی حصوں میں بانٹ دیا۔ جس کا رگھودیو کو بے حد رنج ہوا اور اس نے دہلی میں بیٹھے مغلوں کو ایک بار پھر آسام پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا۔

جے دھواج سنگھا اس وقت گواہٹی میں دادِ عیش دے رہا تھا۔ جب اسے اس بات کا علم ہوا تو اس نے ایک بار پھر اپنی حمایتی ریاستوں کو اکٹھا کرکے مغلوں کے خلاف ممکنہ اقدام اٹھانے کے لیے کہا۔ اس نے فوراً مغلوں کو بھجوایا جانے والا تاوان بند کردیا اور اس کی دیکھا دیکھی دوسری چھوٹی ریاستوں نے بھی یہی اقدام اٹھایا۔ اس وقت تک اورنگ زیب دلی کی راجدھانی پر اپنے قدم جما چکا تھا اور اپنی سلطنت کو طول دینے کے لیے ادھر ادھر اپنی سپاہ بھیجنے کے قابل ہوچکا تھا۔ اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی اور کئی ریاستوں کو جنگ کے ذریعے دلی کی سلطنت میں شامل کرلیا۔

☆☆☆

اورنگ زیب اپنے پیش روؤں سے یکسر مختلف بادشاہ ثابت ہوا۔ اس نے اپنی تاج پوشی کے پورے دس سال بعد ہر طرف سے مطمئن ہوکر سب سے پہلے یہ کام کیا کہ دلی کی راجدھانی میں پہلے سے ملازم ہندو اور عیسائی جو حکومتی عہدوں پر تعینات تھے انہیں معزول کردیا اور ان کی جگہ مسلمانوں کو مقرر کردیا۔ اس کے اس اقدام کی وجہ سے وہ راجپوت جو شہنشاہ اکبر پر جان دیتے تھے اور انہوں نے اس کی سلطنت کو زبردست بنادیا تھا، اب یہی راجپوت اورنگ زیب کے مخالف ہوگئے اور اس سے نفرت کرنے لگے۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی جاگیریں بھی چھین لیں جس کی وجہ سے وہ بھاگ کر دلی سے دوسرے ملکوں میں جانے لگے۔

اورنگ زیب پرہیزگار بادشاہ تھا۔ اس نے پہلے مغل شہنشاہوں کی طرح شراب اور عیاشی پر اپنی توجہ مرکوز نہ کی۔ اسے نہ تو شراب کا چسکا تھا اور نہ ہی عیاشی کی لت تھی۔ وہ اپنے ذاتی مصارف پر بھی بے جا روپیہ ضائع نہ کرتا تھا بلکہ اپنے ہاتھ سے کلاہ اور ٹوپیاں بنا کر اپنی روزی کماتا تھا۔ نہایت سادہ لباس پہنتا تھا۔ جب تخت پر بیٹھتا تھا، تب بھی اسی سادگی کے ساتھ کہ اس کے اٹھنے بیٹھنے سے غرور اور تمکنت کا اظہار نہ ہوپائے۔ اسے ناچ اور گانے بجانے سے انتہائی نفرت تھی۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے محلات سے ان طوائفوں اور گویوں کو نکال دیا جو اس کے باپ کے زمانے میں حکومت میں باقاعدہ ملازم تھے اور اونچے اونچے مشاہرے لیتے تھے۔ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ

جب اس نے یہ اقدام اٹھایا تو ان لوگوں نے چند روز بعد ہی ایک جنازہ بنایا اور روتے پیٹتے اسے محلات کے جھروکوں کے نیچے سے لے کر نکلے۔ اورنگ زیب نے انہیں دیکھا اور پوچھا کہ یہ کس کی میت ہے جس کے ورثاء اس قدر رو پیٹ رہے ہیں تو اسے بتایا گیا کہ یہ علم موسیقی کی میت ہے اور یہ لوگ اسے قبرستان میں دفنانے کے لیے لے جا رہے ہیں۔

اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''برائے خدا اسے ایسا نیچے گاڑنا کہ دوبارہ قبر سے نکل نہ آئے......'' اس طرح کے دیگر واقعات خفی خاں کی تصنیف سے ملتے ہیں۔

اورنگ زیب دین کے معاملے میں بڑا سخت رویہ رکھتا تھا۔ وہ رعب سے کام لیتا تھا اور سلطنت کے کاروبار میں محبت کو پاس نہ پھٹکنے دیتا تھا مگر اس کا کیا علاج...... کہ خود اس کا بیٹا...... اسی محبت کا گھائل ہوا...... اور باوجود اس قدر پابندیوں کے اسے نبھانے میں بھی کامیاب ہوا۔ اس کا اپنے بیٹوں پر بہت رعب تھا۔ یہاں تک کہ انہیں ہمیشہ اپنے والد سے جان کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ ان میں سے ایک بیٹے کا تو یہ حال تھا کہ جب بھی اسے والد کا خط آتا تو وہ اسے دیکھتے ہی پیلا پڑ جاتا تھا۔ اورنگ زیب حکم عدولی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اگر کوئی اس کے حکم سے منہ پھیرتا تو وہ اسے ہرگز معاف نہ کرتا۔ اس کی سپاہ کے جنگی افسر اور ملکی کارندے اس کے نام سے تھراتے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ اکبر کی طرح ہمتِ مردانہ رکھتا تھا اور سپہ سالار ایسا تھا کہ کیسی ہی خطرناک مہم ہو اس پر جانے سے نہ ڈرتا اور نہ جھجکتا تھا۔ وہ جس بات کا ارادہ کر لیتا، جب تک اسے پورا نہ کر لیتا، تب تک چین سے نہ بیٹھتا تھا۔

1658ء میں جب شاہ جہاں بیمار پڑا تو اس وقت اس کی عمر ستّر سال تھی۔ اسے تیس سال حکومت کرتے ہوئے ہو گئے تھے۔ لوگوں نے سمجھا کہ بس اب یہ مر جائے گا۔ اس کے چاروں بیٹوں نے بادشاہت کے لیے لڑنا شروع کر دیا مگر اورنگ زیب سب پر غالب آیا اور بادشاہ بن گیا۔ اس نے دارا کو اور مراد کو قتل کرا دیا۔ باپ جو بیماری سے بچ گیا تھا اسے نظر بند کر دیا، جہاں وہ سات برس تک رہا اور مر کر ہی نظر بندی سے اس کی جان چھوٹی۔ اگر مغلیہ خاندان کے شہنشاہوں پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات بڑی واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ بابر نے اپنے بیٹے کے لیے جان دے دی۔ ہمایوں نے بار بار اپنے بھائیوں کی جان بخشی کی جو اس کی جان کے دشمن تھے۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب نے اپنے اپنے باپ سے بغاوت کی اور بھائیوں کو قتل کرایا۔ اگر اس کو اس کی ذاتی حیثیت میں دیکھا جائے تو وہ انتہائی رحم دل، دین سے محبت کرنے والا بادشاہ نظر آتا ہے۔ وہ کارِ حکومت چلانے کے لیے رعب سے کام لیتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پشیمان بھی ہوتا تھا کہ اس نے کیوں اپنے باپ بھائیوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا اور اپنی ہندو رعایا کو اپنا دشمن بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ نوے برس کی عمر میں وہ اپنے ایک بیٹے کو لکھتا ہے کہ......

''میں اپنی سلطنت کی ذمے داریاں پوری طرح ادا نہیں کر سکا۔ اب میں مرنے والا ہوں اور اپنے گناہوں کا ثمر اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔ کون جانے عقبیٰ میں خدا مجھے کیا عذاب دے......''

اس سے اس کی نرم دلی کا پتا چلتا ہے اور یقین ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ نہ صرف اس کی وقتی ضرورت تھی بلکہ سلطنت کے حصول کے لیے اس کی اہمیت بھی تھی۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ دکن کو فتح کرنے کا خبط اس کو عمر بھر رہا۔ کتنی ہی جنگوں کے بعد اس نے گولکنڈہ اور بیجاپور کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا تھا اور آسام اور بہار تک اپنی سلطنت کو طول دے لیا تھا۔

☆☆☆

یہ 1662ء کا ذکر ہے جب میر جملہ دوم اپنی فوجوں کے ساتھ آسام کے راجے سرگا دیو جے دھواج سنگھا اور بہار کے باج گزار بھیم نرائن کو کچلتا ہوا مغربی آسام کے راجا کام روپ کا پیچھا کرتا ہوا کھڑگاؤں تک پہنچ گیا۔ کھڑگاؤں مغربی آسام کا ایک الگ علاقہ تھا جس کا صدر مقام گواہٹی تھا۔ کھڑگاؤں کا علاقہ آسام کے دوسرے علاقوں سے قدرتی طور پر زیادہ محفوظ تھا کہ اس علاقے میں آسام کے دوسرے علاقوں کی نسبت بارشیں بھی کم ہوتی تھیں اور یہاں بارشوں اور سیلابوں سے پیدا ہونے والا کیچڑ اور دلدل بھی کم ہوتی تھی۔ اگرچہ یہاں بھی پہاڑی سلسلے قائم تھے جس کی وجہ سے یہ زیادہ محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مغربی آسام کا راجا کام روپ آسام کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت اسے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ وہ کھڑگاؤں کے قلعے میں رہ کر عیاشیوں میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا زیادہ تر نشانہ گردونواح کی وہ خوب صورت اور جوان لڑکیاں ہوتی تھیں جنہیں اس کے خاص بندے زبردستی اٹھا کر لے آتے تھے اور راجا کے حضور پیش کر کے یا تو اپنے ذاتی کام نکلوا لیتے یا پھر انعام و اکرام کے حق دار ٹھہرتے تھے۔ اگر کبھی باہر سے کوئی لڑکی نہ ملتی تو وہ اپنے ہی علاقے کی غریب، بے بس

اور اقلیتی قوم کی لڑکیوں کو اٹھوا لیتا...... ایسے لوگوں میں وہاں کے مسلمان بھی شامل ہوتے تھے، جن کی لڑکیاں راجا کی ہوس کا نشانہ بنتی تھیں...... خود اس کے آہوم خاندان کی لڑکیاں بھی اس کی ہوس سے بچی ہوئی نہ تھیں۔ کمزور اور پست قوم سے تعلق رکھنے والے لوگ اس کی ان حرکتوں سے بے حد نالاں تھے۔ جستہ جستہ اس کی ان حرکات کی شکایات دلی میں موجود حکمرانوں کو بھی ہوتی رہتی تھی اور انہوں نے وقتاً فوقتاً ان کی حکومت اور خاص طور پر آسام کے تخت پر بیٹھے آہوم حکمرانوں پر حملے بھی کیے۔ یہ سلسلہ 1615ء سے شروع ہوا تھا جب مغل شہنشاہ جہانگیر نے پہلی بار حاجو، کاجلی، برنا گڑھ پر حملہ کیا اور مغل سپاہ نے آہوم سلطنت کی ان چوکیوں کو تباہ کرتے ہوئے ان کو روند ڈالا پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی آہوم جیت جاتے اور کبھی مغل بادشاہ کام روپ اور اس کے گردونواح کی ریاستوں پر قابض ہو جاتے اور دوسرے ہی لمحے آہوم راجے ان چوکیوں کو مغلوں سے چھڑا لے جاتے۔ کام روپ کا یہ علاقہ دریائے مناس اور بارندی کے درمیان کا علاقہ ہے، جس کی وجہ سے اس پر راج کرنے والے حکمران اپنے آپ کو کام روپ کہلوانے لگے تھے۔ اس وقت ہندوستان پر اورنگ زیب کی حکمرانی تھی، جس کے پاس مغربی آسام کے حکمران جے دھواج سنگھا کی شکایات پہنچیں تو اس نے اسے سبق سکھانے کا بیڑا اٹھایا۔ ان دنوں آسام کے راجا اور بہار کے باج گزار نے مغلوں کے درمیان سلطنت کے معمول کی جنگ چھڑی ہوئی دیکھ کر لگان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اس مہم پر میر جملہ دوم کی سرکردگی میں سپاہ بھیجی۔ میر جملہ دوم اپنی فوجوں کے ساتھ مغربی آسام کے راجا جے دھواج سنگھا کام روپ اور بہار کے باج گزار بھیم نرائن کو کچلتا ہوا مغربی آسام سے گزر کر کھڑگاؤں تک پہنچ گیا۔ جب کھڑگاؤں میں موجود کام روپ کو خبر ہوئی تو وہ اپنی فوج لے کر میر جملہ سے ٹکرا گیا۔ میر جملہ نے اپنی روایتی جنگی حکمتِ عملی کے ساتھ انہیں شکست سے دوچار کیا۔ جب کام روپ کو اپنی شکست کے آثار نظر آئے تو وہ اپنی حمایتی ریاستوں کی طرف لپکا تاکہ ان کی مدد سے میر جملہ کو ہزیمت سے دوچار کرے لیکن کام روپ کو کہیں سے یہ اطلاع ملی کہ کھڑگاؤں کے گردونواح میں موجود نفری میر جملہ کے ساتھ ملنے کے لیے پر تول رہی ہے۔ چنانچہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ وہاں پہنچا اور ان کے عملے کو برطرف کرنے کے احکامات جاری کرتا ہوا خود بھاگ کر کام روپ کے پہاڑی علاقے میں جا چھپا۔

میر جملہ نے بھی کھڑگاؤں میں قیام کر لیا اور ان پہاڑوں کا محاصرہ کر لیا۔ کتنے دنوں تک میر جملہ کا محاصرہ قائم رہا۔ اس دوران میر جملہ نے ان راستوں پر جن کے ذریعے کام روپ اور اس کی سپاہ کو راشن جاتا تھا، ان پر قبضہ کر کے اپنے سپاہی وہاں بٹھا دیے۔ کام روپ نے جب دیکھا کہ رسد و رسائل کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں تو اس نے صلح کے لیے اپنے ایک سپاہی کے ہاتھ میر جملہ کو درخواست بھیجی۔

میر جملہ نے صلح کے لیے اپنی طرف سے جواب میں شرائط لکھ بھیجیں۔

''اگر راجا کام روپ اس سے پہلی جھڑپ میں گواہٹی سے لوٹا ہوا سامان شاہی فوج کو واپس کر دے اور اس کے علاوہ بطور تاوان اپنی بیٹی کا نکاح بھی دے۔ اس کے علاوہ اسے یہ شرط بھی ماننا ہوگی کہ وہ ہر سال تین لاکھ روپے کے ساتھ 90 بہترین ہاتھی بطور تاوان مغل سلطنت تک پہنچانے کا وعدہ کرے تو اس کے ساتھ صلح ہو سکتی ہے۔ ورنہ شاہی افواج سارے علاقے کو نیست و نابود کر دیں گی۔''

جب بڑی بحث و مباحثے کے بعد کام روپ نے ان شرائط کو مان لیا تو میر جملہ دوم نے میر مرتضیٰ کو توپ خانے کا انچارج اور راجا امر سنگھ ہاڑا کو کھڑگاؤں کی عملداری سونپی اور خود آگے بڑھ گیا۔ ابھی وہ متھرا پور کے نزدیک ہی پہنچا تھا جب کچھ دنوں کے بعد برسات نے اپنا زور دکھانا شروع کر دیا۔ اوپر سے دریائے مناس اور بارندی میں بھی شدید بارشوں کی وجہ سے سیلاب آ گیا۔ بارشوں کے ساتھ سیلاب نے شاہی فوج کے تمام راستے بند کر دیے۔ مغل افواج کی اس بے بسی کو دیکھتے ہوئے راجا دھواج سنگھا کام روپ کی فوجوں نے پہاڑوں سے نکل نکل کر دوبارہ شاہی افواج پر حملے کرنے شروع کر دیے۔

ماہ شوال کی ابتدا ہی میں کام روپ کی افواج نے کئی علاقوں کو شاہی فوج سے چھڑوا لیا۔ یہاں تک کہ ترسیل رسد کے راستے پر بھی قبضہ کر لیا۔ میر جملہ بڑی بہادری اور استقامت کے ساتھ ان مشکلات کا سامنا کرتا رہا۔ اس کی فوج کے چند سپاہیوں نے اسے مشورہ بھی دیا کہ ان حالات میں ان کے لیے لڑنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے واپس چلا جائے مگر میر جملہ آسام کو چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ پھر چھ ماہ بعد ربیع الاول میں میر جملہ نے دوبارہ سے کامیابیاں حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اس کی فوجوں نے ایک بار پھر حملہ کرتے ہوئے ترسیل رسد کے راستے دوبارہ واگزار کروا لیے۔ شاہی فوج تک سامانِ رسد دوبارہ پہنچنے لگا تو ان

کے حوصلے دوبارہ سے سنبھل گئے اور ان کی ہمتوں میں پھر سے ایک نئی روح پھونکی گئی۔ انہوں نے دوبارہ سے حملے شروع کیے۔ ادھر برسات کے دن بھی ختم ہو چکے تھے۔ ان کے پے در پے حملوں نے آسامی فوج کے قدم دوبارہ سے اکھاڑ دیے اور وہ دوبارہ بھاگ کر پہاڑی پناہ گاہوں کو چلے گئے۔ راجا کام روپ جس کی سربراہی میں آسامی فوج لڑ رہی تھی، وہ بھی سولہ کوڑی سے ہوتا ہوا نام روپ کی پہاڑی میں جا چھپا...... اس کشمکش میں وقت گزرتا رہا۔ کام روپ کو جب بھی موقع ملتا وہ شاہی فوج کی استقامت میں رخنہ ڈالتا رہا۔ وہ پہاڑی پناہ گاہوں سے نکلتا، اس کی فوج کے بکھرے سپاہی شاہی فوج پر حملہ کرتے مگر ان کی جوابی کارروائی سے خوفزدہ ہو کر دوبارہ اپنی پناہ گاہوں میں جا چھپتے...... کتنے دنوں تک یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔ اب ربیع الثانی کا چاند اپنے پورے جوبن کو پہنچ چکا تھا لیکن میر جملہ پوری طرح سے آسامی فوج کو زیر نہ کر سکا تھا پھر بھی اس نے اپنے حوصلوں کو پست نہ ہونے دیا۔ ربیع الثانی کی چودہ تاریخ کو میر جملہ ایک بار پھر کھڑ گاؤں سے راجا کام روپ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ جب کام روپ کو اس کی اطلاع ملی کہ میر جملہ ایک بار پھر بھرپور قوت سے اس پر حملہ آور ہونے والا ہے تو وہ پھر بھاگ اٹھا۔ میر جملہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور علاقے فتح کرتا ہوا دریائے مناس کے دوسرے کنارے تک جا پہنچا تو ربیع الثانی کی اٹھارہ تاریخ ہو چکی تھی۔ آسامی فوج یہاں بھی شاہی فوج کا مقابلہ نہ کر سکی اور اپنی چوکیاں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ خراب موسم اور مسلسل فوج کشی سے میر جملہ بیمار ہو گیا اور دریا کے دوسرے کنارے پر بیماری کی حالت میں پڑا رہا مگر اب آسام کی فوجوں پر اس کی اتنی دھاک بیٹھ چکی تھی کہ کسی آسامی فوجی کو شاہی فوج کا سامنا کرنے کی جرأت نہ رہی تھی۔ ویسے بھی آسام کے لوگ بار بار کی شاہی فوج کشی اور پے در پے بارشوں کے ساتھ ساتھ موسمی حالات سے تنگ آ چکے تھے اور انہوں نے بالآخر میر جملہ کی حکمرانی کو تسلیم کر لیا تھا۔

راجا کام روپ کا ایک اہم ساتھی ''بدلی بھوکن'' بھی اسے چھوڑ کر میر جملہ کے ساتھ آملا تھا۔ جس کو دیکھتے ہوئے راجا کام روپ کے بہت سے فوجی بھی کام روپ سے بغاوت کر کے میر جملہ کی فوج میں شامل ہو گئے۔ میر جملہ ابھی تک بیمار تھا مگر اس کے حوصلے بلند تھے، اس لیے اس نے ایک بار پھر آگے بڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ راجا کام روپ اس دوران بار بار شاہی فوج کے ساتھ صلح کی درخواستیں بھجوا رہا تھا۔ آخر اس نے دلیر خاں کے ذریعے ایک بار پھر صلح کا پیغام بھیجا۔ میر جملہ کو اس مہم پر نکلے سترہ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس دوران کبھی جھڑپیں لگاتار ہونے لگتیں اور کبھی ان میں وقفہ آ جاتا۔ اب نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ راجا کام روپ شاہی فوج کے ڈر سے ادھر ادھر چھپتا پھر رہا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ شاہی فوج کے ہتھے نہ چڑھ جائے کیونکہ اس کے پکڑے جانے کا مطلب موت تھا۔ اب میر جملہ کی افواج باغیوں اور دشمنوں کا قلع قمع کرتی جا رہی تھیں۔ تبھی وہ بار بار صلح کے لیے پیغام بھجوا رہا تھا مگر میر جملہ اپنی شرائط پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی شرائط سے سر مو ہٹنے کو تیار نہیں۔ راجا کام روپ بھاگتا ہوا پتام کے علاقے میں جا پہنچا۔ یہاں سے ایک درّہ نام روپ کی پہاڑیوں تک چلا جاتا تھا۔ اس ریاست پر کام روپ کے رشتے دار کا قبضہ تھا۔ وہ یہاں کا راجا تھا جس کی بیٹی اور راجا کام روپ کی بیٹی رامنی آپس میں بہترین سہیلیاں بھی تھیں۔ یہاں پہنچ کر اس نے ایک بار پھر میر جملہ کے پاس صلح کا پیغام بھجوایا۔ اس کام کے لیے اس نے بہت سے لوگوں کو اپنا وکیل بنا کر میر جملہ کے پاس بھیجا۔ میر جملہ نے بھی اپنے ساتھیوں کو اپنی شرائط پر راجا کام روپ سے صلح کی بات چیت کرنے کے لیے بھیجا۔ جب دونوں کام روپ اور میر جملہ کے وکیل آمنے سامنے ہوئے تو کام روپ کے وکیلوں میں سے ایک بولا۔

''ہم مغربی آسام کے راجا کام روپ کی طرف سے عزت مآب میر جملہ دوم کے پاس صلح و آشتی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ کیا عزت والا میر جملہ ہمیں عزت بخشیں گے۔''

اس کے جواب میں میر جملہ کا ایک ساتھی آگے بڑھا اور جواباً کہنے لگا۔ ''جیسا کہ پہلے بھی کام روپ کے علم میں ہے ہم نے اس کے صلح کے لیے بڑھائے ہوئے ہاتھ کو پہلے بھی عزت بخشی تھی مگر حالات کے بدلتے ہی راجا اپنے وعدے سے مکر گیا اور پینترے بدل بدل کر ہم پر حملے کرتا رہا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں یہ بات تھی کہ وہ اس طرح شاہی فوج کو تھکا دے گا اور اسے ہزیمت سے دوچار کر دے گا مگر وہ یہ جنگ نہ جیت سکا اور نہ ہی وہ شاہی فوج کے حوصلوں کو پست کر سکا۔ اب جبکہ اسے اپنی شکست کا یقین ہو چکا ہے تو وہ دوبارہ صلح کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ ہم اس پر کس طرح یقین کر لیں کہ وہ اپنی بات میں مخلص ہے۔ ہمارا اعتماد اس سے اٹھ چکا ہے۔ اب ہماری اس کے ساتھ کھلی جنگ ہے۔''

اس پر راجا کام روپ کا وکیل دوبارہ بولا۔ ''اب اس

بات کی ضمانت ہم دیتے ہیں جو آپ کے سامنے چل کر آئے ہیں۔''

میر جملہ کے ساتھی نے جواباً کہا۔ ''ٹھیک ہے...... ہمیں تمہارے راجا کی کسی بات کا یقین تو نہیں رہا لیکن آپ کی ضمانت پر ہم اس کے ساتھ ایک بار پھر صلح کرنے کو تیار ہیں مگر ہماری شرائط وہی ہوں گی جو ہم پہلے بتا چکے ہیں۔''

''کیا آپ تکلیف کرتے ہوئے ہمیں اپنی شرائط کے مندرجات دوبارہ بتانا پسند کریں گے تاکہ راجا کے گوش گزار کر کے اس سے جواب لے سکیں۔'' ان میں سے وہی دوبارہ بولا۔

''ہماری شاہی افواج کے سپہ سالار میر جملہ کی طرف سے جو شرائط ہیں۔ ان کی تفصیل یوں ہے......

''پہلی شرط کے مطابق راجا آسام اپنی ایک شہزادی یا دو شہزادیاں ضمانت کے طور پر ان کے حوالے کرے گا۔ اس شرط میں پتام کے راجا کی شمولیت بھی ضروری ہے جو کہ اس جنگ میں ہر طرح سے آپ کے راجا کا حمایتی رہا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ راجا آسام تیس ہزار تولے سونا، ایک لاکھ بیس ہزار تولے چاندی، بیس ہاتھی اقساط کی صورت میں شہنشاہ معظم اورنگ زیب کے لیے اور پندرہ ہاتھی میر جملہ دوم سپہ سالار شاہی فوج کی خدمت میں فی الفور پیش کرے گا۔ ساتھ ہی پانچ ہاتھی دلیر خاں کو جس کے توسط سے یہ صلح طے پا رہی ہے، دینے کا پابند ہوگا۔''

''یہ بہت بڑا انیائے ہے...... راجا کا اتنا پاپ نہیں ہے جس کی سزا اتنی بڑی دی جا رہی ہے۔'' راجا کام روپ کا ایک دوسرا وکیل آگے بڑھ کر بولا۔

''تو پھر اسے میر جملہ دوم سپہ سالار اعظم شاہی فوج کی طرف سے کھلی جنگ کا پیغام پہنچا دیں۔'' میر جملہ کے ساتھی نے حتمی فیصلہ سنایا۔

''لیکن...... ہمیں کچھ موقع تو دیں۔ ہم آپ کی شرائط راجا کام روپ اور پتام کے راجا تک پہنچا دیں۔''

''اس کی کیا ضمانت ہے کہ راجا کام روپ اسے تاخیری حربے کے طور پر استعمال نہیں کرے گا اور اس وقفے سے پہلے کی طرح فائدہ نہیں اٹھائے گا......'' میر جملہ کے وکیل نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اس کی ضمانت ہم لوگ آپ کے پاس موجود ہیں۔ ہم میں سے صرف ایک یا دو آدمی راجا کے پاس آپ کی شرائط لے کر جائیں گے اور اس کا جواب ایک دو روز میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔'' کام روپ کا وکیل بولا۔

''ٹھیک ہے۔ ہمیں راجا کام روپ پر اعتبار نہیں مگر آپ کی باتوں اور ضمانت کو اعتبار دیتے ہیں۔ ہم آپ کے جواب کا انتظار کر لیتے ہیں۔''

اس صلح کو طے کرتے ہوئے کئی بار اونچ نیچ بھی ہوئی۔ تلخ جملوں اور جھگڑے تک بات بھی پہنچی۔ بالآخر یہی طے ہوا کہ تمام شرائط راجا کام روپ اور اس کے حواریوں کے سامنے رکھی جائیں، کیونکہ وہی اس کا بہتر جواب دے سکتے ہیں۔ ابھی دونوں اطراف کے وکیل مقام صلح پر ہی بیٹھے تھے۔ جب کام روپ کی طرف بھیجے گئے پیغام رساں واپس آ گئے اور انہوں نے آتے ہی اعلان کیا کہ...... ''آسام کے راجا کام روپ اور راجا پتام نے شاہی افواج کے سپہ سالار کی طرف سے عائد تمام شرائط تسلیم کر لی ہیں اور وکیلوں کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ ان شرائط کو باقاعدہ ایک معاہدے کی شکل میں تحریر کریں جس پر شاہی فوج کے سپہ سالار بذات خود دستخط کریں۔ ہماری طرف سے راجا کام روپ اور اس کے حلیف راجا پتام پہلے ہی دستخط کر چکے ہیں۔''

جمادی الآخر کی پانچ تاریخ کو یہ معاہدہ طے پا گیا جس پر میر جملہ نے اپنے دستخط کر دیے۔ تب راجا کام روپ کے وکیلوں نے ہی خیر سگالی کے طور پر دستخط کر دیے اور راجا کام روپ کی اکلوتی بیٹی رامنی اور اس کی بھانجی جو کہ پتام کے راجا کی بیٹی تھی دونوں راجکماریوں اور زرِ ضمانت کے طور پر پہلی قسط سونا چاندی کی شکل میں ادا کر دی گئی۔ علاوہ ازیں کام روپ کے چار سرداروں کے لڑکے بھی میر جملہ کے وکیلوں کے حوالے کر دیے گئے۔

معاہدہ طے پانے کے بعد میر جملہ دوم دس جمادی الآخر کی اگلی فتوحات کے لیے کوہستان کے علاقے نام روپ سے ہوتا ہوا بنگال کی طرف بڑھ گیا۔ میر جملہ کی بیماری کسی طرح اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اس بیماری کے دوران مزید فتوحات حاصل کر کے ہندوستان کی وسیع سلطنت میں شامل کر کے بادشاہ کے حضور مزید نیک نامی اور عزت حاصل کر لے۔ جمادی الآخر کے مہینے کے ایک بدھ کا دن تھا، جب میر جملہ اپنی افواج کے ساتھ خضر پور سے دو کوس آگے پہنچا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔

اگلے سال شوال کی پہلی تاریخ تھی جب شہنشاہ ہند نے آسام کی فتح کے سلسلے میں ایک بہت بڑے جشن کا اعلان کیا۔ آسام کی دشوار ترین مہم کا سہرا بلاشبہ میر جملہ کی

ذہانت، ہمت اور صلاحیت کے سربند ھتا تھا مگر وہ تو اس جشن کو دیکھے بنا ہی راہی عدم ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس کامیاب وکامران مہم کا انعام واکرام میر جملہ دوم کے بیٹے کو دیا گیا۔

☆☆☆

آسام کے راجا جے دھواج سنگھا کام روپ کی اکلوتی بیٹی رامنی گبھارو اور پتام کے راجا کی راجکماری دربار شاہی میں پہنچ چکی تھیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے انہیں زنان خانے میں بھجوادیا تھا اور ساتھ ہی یہ فرمان بھی جاری کردیا تھا کہ دونوں شہزادیوں کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ رکھا جائے اور ان کے آرام وآسائش میں کسی قسم کی کوتاہی نہ برتی جائے۔ دونوں شہزادیوں کو محل میں الگ الگ کمروں میں ٹھہرادیا گیا تھا۔ تب شہنشاہ دیگر امورِ سلطنت میں مصروف ہوگیا۔ شہزادیاں گو اپنی اپنی ریاستوں کے راجاؤں کی بیٹیاں تھیں مگر وہ شہنشاہِ ہند کے محل میں آکر حیران وپریشان ہوکر رہ گئی تھیں۔ محلوں کی شان وشوکت اور چکاچوند دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ محل سرا میں کنیزوں اور باندیوں کی فوج دندناتی پھرتی تھی۔ وہ جس ماحول سے آئی تھیں، وہاں آزادی تو تھی مگر اتنی شان وشوکت نہ تھی۔ کچھ عرصے تک وہ دونوں پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو بھی نہ کرتی تھیں۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں صبح سے لے کر شام تک پڑی رہتیں اور مایوسی کی حالت میں درودیوار کے ساتھ باتیں کرتی رہتیں۔ انہیں سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے اور انہیں کیوں، کس جرم میں اپنوں سے جدا کردیا گیا ہے۔ وہ یہاں زنان خانوں میں رہنے والیوں کی شان وشوکت اور رعب ودبدبے سے اس قدر مرعوب تھیں کہ وہ کسی سے بات کرنے سے بھی ڈرتی تھیں۔ نیا ماحول اپنانے میں انہیں کافی دن لگے۔ پتام کے راجا کی بیٹی بڑی حد تک خوش مزاج اور منہ پھٹ قسم کی تھی۔ جبکہ کام روپ کی شہزادی اسی قدر سنجیدہ اور خاموش رہنے والی تھی۔ محل کے خواجہ سراؤں اور کنیزوں سے بھی اس نے کھلنے کی کوشش نہ کی تھی۔ شاید وہ ابھی تک خود کو اس ماحول سے ہم آہنگ نہ کر پارہی تھی یا پھر اس کی زبان جاننے اور سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ پھر جس ماحول اور جن لوگوں میں اس نے اپنی عمر کا ایک حصہ گزارا تھا اب وہ یکسر اجنبی ماحول اور مختلف لوگوں میں آپہنچی تھی۔ اس لیے وہ یا تو اپنا زیادہ وقت جاپ اور تپسیا میں گزارتی یا پھر چپ چاپ پڑی رہتی۔ اس روز بھی وہ حسب عادت بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں پڑی تھی، جب پتام کی شہزادی اس کے پاس آئی اور آتے ہی اس نے باتوں کی پھلجڑیاں چھوڑنا شروع کردیں۔

''اے رامنی...... اے رامنی گبھارو......''

وہ خاموشی کے ساتھ ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہی۔

''اوہ رامنی...... کام روپ راجا کی بیٹی میں تم سے مخاطب ہوں۔'' وہ پھر چہکی۔

''کیا بات ہے سکھی......'' رامنی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''یہ چپ کا روزہ کب تک رکھے رہوگی...... ہم راجاؤں کی بیٹیاں ہوکے بھی بے جان مہروں کی طرح ہیں۔ ہمارے معاشرے کے مرد جب چاہیں اپنی چال چلتے ہوئے ہمیں ادھر سے ادھر کرنے پر قادر ہیں۔ اب دیکھو...... ہمارے راجا والدین نے ہمیں ہماری مرضی پوچھے بغیر ہمیں بادشاہ کے پاس بھیج دیا جیسے ہم بے جان کٹھ پتلیاں ہوں...... سمجھ تو مجھے بھی نہیں آتی کہ ہمیں یہاں بھیج کر اور ان سجے سجائے محل کے کمروں میں کس جرم کی سزا دی گئی ہے اور کون جانے ہماری یہ سزا کتنی دیر کے لیے ہے۔''

''مجھے بھی اسی بات کی تشویش ہے۔'' رامنی نے آہستگی سے اس کی باتوں پر صاد کیا۔

''تم نے دیکھا اور محسوس کیا کہ ہمارے رہن سہن اور ہمارے بولنے چالنے میں اس ماحول کے مقابلے میں کتنا فرق ہے۔'' وہ بولی۔

''سچ پوچھو...... تو مجھے بھی جب سے میں یہاں آئی ہوں، ایک گھٹن سی محسوس ہورہی ہے۔'' رامنی نے دل کی بات کھولی۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے...... یہاں اس محل سرائے میں عورتیں جو یقیناً یہاں کی باندیاں اور کنیزیں ہوں گی کیسے منہ سر لپیٹے ادھر سے ادھر پھرتی ہیں۔ ان کی نظروں میں ہمارے لیے بے شمار سوالات چھپے ہوتے ہیں۔ کس قدر پردہ ہوتا ہے یہاں...... اف توبہ...... کچھ تو بڑی بڑی ڈولیوں میں بیٹھ کر جاتی ہیں جنہیں کہار اٹھائے ہوتے ہیں۔'' وہ حیرانی سے بتارہی تھی۔

''ہمارے ہاں کتنی آزادی ہے۔ نہ پہننے میں پابندی اور نہ پھرنے، چلنے پر قدغن...... وہاں صبح ہوتے ہی موسیقی کے جھرنے بہنے لگتے تھے جن کی لے پر خوامخواہ ناچنے اور تھرکنے کو جی کرتا ہے اور یہاں پردے کی اس قدر پابندی، دن میں چار پانچ مرتبہ مولوی کے پکارنے کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔ یہاں کے لوگوں سے استفسار کرنے

پر معلوم ہوا کہ یہ اذان کی آواز ہوتی ہے۔"

"مجال ہے اس کے علاوہ کبھی کسی مرد کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی ہو......" رامنی نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو حیرانی ہوتی ہے، مرد تو کجا، یہاں تو خواجہ سرا بھی محل میں آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ شاید ان پر بھی پابندی ہو۔ صرف کنیزیں ہی کدکڑے مارتی پھرتی ہیں۔" پتام کی شہزادی بولی۔

"یہاں کا تو ہر کام انوکھا ہے، خواجہ سرا کنیزوں سے کبھی کبھار چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں تو ان کے ملے جلے قہقہوں سے زندگی کے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ شہنشاہ حضور آتے ہیں یا کبھی کبھار شہزادے آتے ہیں تو در و دیوار عجیب وغریب آوازوں سے گونج اٹھتے ہیں۔" رامنی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"جان کی امان پاؤں تو میں کچھ عرض کروں......" پتامی شہزادی نے کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی نقل اتارتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"کہو باندی کیا بات ہے......" رامنی نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ویسے شہزادی عالیہ آپ کے خواب سچ ثابت ہونے لگے ہیں۔" پتام کی شہزادی بولی۔

"کیا مطلب...... میں سمجھی نہیں؟" رامنی نے حیرانی سے پوچھا۔

"شاید شہزادی صاحبہ کو اب وہ سپنا یاد بھی نہ رہا ہو۔ وہی سنہری رتھ والا سپنا جو محل کی چھوٹی دیوار پر آرکا تھا۔" پتام کی شہزادی نے یاد دلایا۔

"ہاں یاد آیا...... وہ میں بھلا کیسے بھول سکتی ہوں۔ مجھے تو اس شہزادے کے نین نقش بھی نہیں بھولے۔ وہ یقیناً کرشن مہاراج ہی تھے۔" رامنی بولی۔

"وہی...... دیکھ لو...... تمہارا وہ سپنا کیسے پورا ہوا۔ سنہری رتھ والے محل میں تو تم آ پہنچی ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ شہزادہ تمہیں کب ملتا ہے۔" پتام کی شہزادی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب اگر وہ آیا تو سکھی میں اسے تمہارا کمرا دکھا دوں گی۔" رامنی نے کھل کر قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہ بابا...... اپنے شہزادے کو اپنے ہی نینوں میں چھپا رکھنا۔ میری طرف بھیجنے کی جرأت نہ کرنا۔ میں ایسے ہی بھلی۔" اس نے آگے سے کہا۔ پتامی شہزادی نے ہنستے ہوئے رامنی کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی تو رامنی نے اس کے بال پکڑ کر اپنی گود میں گرا لیا۔ اس پر دونوں ہنسنے لگیں۔

"سچ پوچھو سکھی...... آج ایک مدت کے بعد میں کھل کر ہنسی ہوں۔ مجھے تو یہ سب بھول ہی گیا تھا۔ اور یہاں تو بات کرنے کو بھی میری زبان ترسنے لگی تھی پتا نہیں کونسی زبان یہاں بولی جاتی ہے۔ خاک سمجھ نہیں آتی۔" رامنی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"خود اپنا بھی یہی حال ہے۔" پتام کی شہزادی نے جواب دیا۔

"کچھ دن پہلے ایک کنیز آئی تھی... جو اپنا نام گل بانو بتاتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خاص میرے لیے ہے۔ تم بتاؤ...... تمہارے لیے بھی شہنشاہ عالم پناہ نے کوئی کنیز بھیجی کہ نہیں......" رامنی نے پتام کی شہزادی سے پوچھا۔

"ہاں بھیجی تو ہے...... مگر میں اسے زیادہ منہ نہیں لگاتی۔ آخر میں بھی تو شہزادی ہوں۔ کونسا ایرا غیرا ہوں......" وہ ہنس دی۔

"یہ بات تو ہے۔ میں نے اپنی ذاتی کنیز سے یہاں بولی جانے والی زبان کے کچھ حروف سیکھ لیے ہیں۔ اب میں اس کی بات سمجھ جاتی ہوں۔ ابھی کل ہی وہ بتا رہی تھی کہ عالم پناہ نے ہمیں فارسی زبان سکھانے کے لیے ایک معلم کا انتظام کردیا ہے۔" رامنی نے بتایا۔

"چلو...... یہ بھی اچھا ہوا...... ہمیں آسانی ہوجائے گی......" پتامی شہزادی نے جواب دیا اور کہنے لگی۔

"ایک اور بات دیکھی تم نے۔ عالم پناہ اول تو محل میں آتے نہیں۔ جب آتے ہیں تو شہزادے ان کے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر یوں چلتے ہیں کہ کہیں ان کا قدم الگ سے پڑ گیا تو کوئی بلا انہیں اچک لے جائے گی اور پھر ان کے آنے سے پہلے باقاعدہ اعلان کیا جاتا ہے۔ نقارہ بجایا جاتا ہے۔ عجیب رواج ہے...... اگر کبھی بدقسمتی سے شہزادگان میں سے ایک آدھ شہزادہ بھولے سے ادھر نکل آئے تو ان کنیزوں اور باندیوں کی عید ہوجاتی ہے۔ ایک اُدھم مچ جاتا ہے۔ وہ دوڑ کر اس کی خدمت میں حاضر ہوجاتی ہیں اور اس کے ہر کام کو جی جان سے کرکے اس کے دل میں اپنا مقام بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔" رامنی نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات ختم کی۔

"اپنے اپنے ملک اور اپنے اپنے رواجوں کی بات ہے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔" یہ کہہ کر پتامی شہزادی رامنی کے کمرے سے نکل آئی۔

رامنی ابھی تک محل سرا میں رہنے والی رانیوں اور شہزادیوں سے پوری طرح واقف نہ ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام رانیاں اور شہزادیاں کبھی ایک جگہ اکٹھی ہی نہ ہوئی تھیں۔ ہاں البتہ کبھی کبھار کسی مخصوص دن یا تہوار پر وہ ایک جگہ جمع ہوتیں مگر اجنبیت کی دیواریں گرنے سے پہلے ہی وہ محفل ختم ہوجاتی۔ بہت سے دلوں کی خواہشیں اور حسرتیں یونہی تشنہ کام رہ جاتیں۔ شہزادگان جب اکیلے محل سرا میں آتے تو محل سرا میں موجود نوکرانیاں، شہزادیاں اور ان لڑکیوں کو جنہیں ضمانت کے طور پر یا مالِ غنیمت سمجھ کر محل سرا میں رکھا ہوتا، شہنشاہ یا شہزادگان کی خصوصی توجہ کے لیے ان کے سامنے سے گزارا جاتا۔ ایسے میں نوکرانیاں اور باندیاں ان کے گرد جمع ہوجاتیں۔ کچھ جو پہلے سے شہزادگان میں سے کسی شہزادے کو جانتی ہوتیں، وہ ان سے تیکھی باتیں کرتیں، باقی بڑی میٹھی اور پیار بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہتیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے شہزادگان میں سے شہزادہ سلطان محمد اور شہزادہ معظم دونوں شادی شدہ تھے۔ پھر بھی باندیاں اور کنواریاں ان کے گرد زیادہ رہتی تھیں۔ شہزادے بھی ان کی باتوں میں بے حد دلچسپی لیتے تھے اور اگر کوئی ان کی پسندیدہ کنیز حاضر نہ ہوتی تو اس کے بارے میں پوچھ بھی لیتے تھے۔ محل سرا کی عورتوں میں شہنشاہ اورنگ زیب کی بڑی بہن روشن رائے سب سے اہم اور معتبر شخصیت تھیں۔ وہ بہت رعب داب والی عورت تھیں اور رامنی کو بتایا گیا تھا کہ شہنشاہ بھی ان کی ناراضگی سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے تھے اور ان کے حضور آکر ان کی ہر بات پر سر جھکاتے تھے۔ اس لیے ان کی اجازت کے بغیر محل سرا میں کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔

فارسی زبان سے آشنائی نے رامنی کے لیے محل سرا میں بڑی آسانیاں پیدا کردی تھیں۔ اب وہ ان کنیزوں اور باندیوں کے ساتھ گھل مل جاتی جو محل سرا میں موجود ہوتیں۔ کبھی شہزادوں کے آنے سے ہلا گلا ہونے لگتا تو وہ بھی اٹھ کر دروازے کی جھریوں سے یہ ہنگامہ دیکھنے کو آجاتی یا پھر شہزادے کے جانے کے بعد کسی نہ کسی نوکرانی سے اس بارے میں پوچھ لیتی تھی کیونکہ اس وقت کنیزیں اور باندیاں ان کی باتیں خوب مزے لے لے کر ایک دوسرے کو بتاتی اور ہنستی تھیں۔ دروازے کی اوٹ سے وہ ان کی باتوں کو بھی سنتی تھی۔ اب رامنی کو بھی اندر ہی اندر ایسی باتوں میں دلچسپی ہونے لگی تھی اور وہ ایسے لمحوں کی منتظر رہنے لگی تھی جب کوئی نہ کوئی شہزادہ محل میں آتا اور جب تک وہ محل سرا کا چکر لگا کر واپس نہ چلا جاتا وہ دروازے سے لگی رہتی تھی۔

☆☆☆

گل بانو رامنی کی کنیز خاص تھی۔ جو خاصی تیز طرار، چالاک اور ہوشیار لڑکی تھی۔ محل سرا میں رہنے والی دوسری کنیزوں سے زیادہ شوخ طبیعت رکھتی تھی اور چٹون میں بھی باتیں کرنے کی عادی تھی۔ اس کے نقوش ایرانی اور ہندوستانی تہذیب کی مکمل عکاسی کرتے تھے۔ پہلے پہل وہ رامنی سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ مگر جب سے رامنی نے فارسی زبان پر عبور حاصل کرلیا تھا وہ بھی رامنی کے نزدیک ہوچکی تھی اور اب رامنی کے ساتھ گپ شپ بھی کرلیتی تھی۔ شہزادگان جب محل سرا میں آتے تو یہ ان کے آگے پیچھے پھرنے اور بات سے بات نکالنے میں سب سے آگے ہوتی تھی۔

اس روز رامنی کی طبیعت صبح سے ہی کچھ اداس تھی۔ پتام کی شہزادی اپنی مصروفیات کی وجہ سے اب اس کے پاس بھی نہ آتی تھی۔ وہ سوچوں میں ڈوبی بیٹھی تھی، جب گل بانو اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور آتے ہی بولی۔

"کیا بات ہے شہزادی صاحبہ...... نصیبِ دشمناں طبیعت تو ٹھیک ہے......!"

"بس یونہی گل بانو...... صبح سے نڈھال ہو رہی ہوں۔ تم بتاؤ کیسی ہو؟ کیا اب شہزادوں کا محل میں آنا منع کردیا گیا ہے جو کچھ دنوں سے نہ تو کوئی ادھر آیا ہے اور نہ ہی کوئی ہلا گلا ہو رہا ہے۔"

"سنا ہے، شہنشاہ عالم پناہ نے انہیں کسی نہ کسی مہم کو سر کرنے کے لیے بھیجا ہوا ہے۔" گل بانو نے جواب دیا۔

"تبھی...... محل میں خاموشیوں نے پہرے جما رکھے ہیں۔" رامنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شہزادی عالیہ! اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک بات پوچھوں۔ بڑے دنوں سے بلکہ اس وقت سے میرے من میں یہ بات گھر کیے ہوئے ہے۔"

"کہو...... کیا بات ہے......؟" رامنی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کی ریاست میں بھی عورتوں پر اسی طرح پابندی ہے۔ میرا مطلب ہے وہاں بھی پردے کی اتنی ہی سختی ہے جتنی ہمارے محل میں اور یہاں کے لوگوں میں ہے؟" گل بانو نے پوچھا۔

"نہیں گل بانو...... ہمارے ہاں پردے کی اتنی سختی نہیں ہے۔ ممکن ہے وہاں ایسی باتوں کا رواج ہی نہ ہو......" رامنی نے دلیل دی۔ "ہاں البتہ دور دیہاتوں میں کہیں کہیں

پردہ کیا تو جاتا ہے لیکن اس قدر سختی اور پابندی کے ساتھ نہیں...... وہاں رواجاً پردہ کیا جاتا ہے مذہباً نہیں۔" رامنی نے جواب دیا۔

"میں نے پتا نہیں کہاں سے سنا ہے کہ جہاں سے یہ دو شہزادیاں آئی ہیں، وہاں کے لوگ آدمیوں کا گوشت کھاتے ہیں اور..... جادو اور شیطانی علوم میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ یہ بدمعاش اور غیر مہذب لوگ ہیں ان کی رسومات، عادات اور رہن سہن بھی بالکل الگ سے ہیں۔" گل بانو نے یہ بات کہہ کر رامنی کی آنکھوں میں جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ وہ رامنی کے چہرے پر اپنے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے لگی تھی۔

"ارے نہیں گل بانو...... یہ تم سے کس نے کہا ہے۔ تم مجھے دیکھ نہیں رہی ہو۔ کیا تمہیں یہ لگتا ہے کہ ہم انسانی گوشت کھاتے ہوں گے۔ رہی بات غیر مہذب ہونے کی، جس جگہ غریبی ہوگی اور جس ملک کے راجے اور سرمایہ دار لوٹ کھسوٹ میں مصروف رہتے ہوں اور عوام کی طرف توجہ دینے کے بجائے اپنی عیاشیوں کو مقدم جانتے ہوں، وہاں تہذیب کیا ہوگی۔ ہمارے ہاں تو جادو ٹونے کا بھی اس قدر استعمال نہیں ہوتا جس قدر اس کی شہرت کی گئی ہے۔" رامنی نے وضاحت سے اسے سمجھایا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ آپ پہلے پہل جب اس محل میں آئی تھیں تو پتا ہے ہم کنیزوں اور باندیوں میں یہی باتیں آپ سے متعلق مشہور ہو گئی تھیں۔ اسی وجہ سے یہاں رہنے والیاں آپ سے کھنچی کھنچی رہتی تھیں۔ شاید آپ کو اس کا علم نہ ہو۔ ان کے درمیان آپ سے متعلق کیا کیا باتیں ہوتی تھیں۔ بعض تو یہاں تک کہتی تھیں کہ اس آسام کی شہزادی کے قریب مت جانا۔ وہ جادو کے ذریعے شکل بدل دے گی اور بعض صرف اس خوف سے آپ کے قریب آنے سے کتراتی تھیں کہ آپ اپنے شیطانی علوم کی وجہ سے ان کو بیمار کر دیں گی یا مار ڈالیں گی اور سچ پوچھیے...... جب عالم پناہ نے مجھے آپ کی کنیزِ خاص مقرر کیا تو میں خود اس بات سے ڈرتی تھی۔"

"پھر......" رامنی نے گویا اس کو مزید کہنے کا راستہ دیا۔

"پھر کیا...... میں نے اپنے اس خوف کا ذکر بڑی بیگم صاحبہ سے بھی کیا تو انہوں نے میرے اس شک کو یقین میں بدل ڈالا اور فرمانے لگیں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ بنگال اور آسام کے جادوگر تو پورے ہندوستان میں مشہور ہیں لیکن شہزادی صاحبہ! میں نے آپ میں تو ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔" گل بانو نے آہستہ آہستہ ساری بات بتا ڈالی۔

"ارے نہیں گل بانو! یہ سب جھوٹی باتیں ہیں، جو ہمارے علاقے سے متعلق پھیلائی گئی ہیں۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو...... تم بتاؤ کہ بڑی بیگم روشن رائے کیسی طبیعت کی مالک ہیں؟" رامنی نے پوچھا۔

"شہزادی صاحبہ! کچھ نہ پوچھیے۔ وہ اس قدر مہربان اور سخی ہیں کہ ہر کنیز اور ہر باندی کے علاوہ محل سرائے کے باہر ڈیوٹیاں دینے والے خواجہ سرا بھی ان کے ہاں ہر وقت حاضری کے متمنی رہتے ہیں۔ وہ عالم پناہ کی بڑی بہن ہیں اور عالم پناہ بھی ان سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ جب بھی ان کے حضور کوئی ادنیٰ ملازم جاتا ہے تو وہ انعام و اکرام کے بغیر واپس نہیں آتا۔ عالم پناہ کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ جب بھی محل سرا میں آتے ہیں تو گھنٹوں بڑی بیگم صاحبہ کے حضور حاضری دیتے ہیں اور تو اور وہ شہزادگان اور شہزادیوں سے بھی بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ وہاں بھی کبھار آپ کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ جب آپ پہلی بار اس محل سرا میں آئی تھیں تو ایک روز انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"گل بانو...... سنا ہے ہمارے محل سرا میں دو شہزادیاں آسام سے بطور ضمانت آئی ہیں، کیسی ہیں......؟"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "بڑی بیگم صاحبہ...... ایک دم سانولی، پکے رنگ کی ہیں۔ ہمارے محل میں ایسے نین نقش اور کالے رنگ کی کوئی بہو بیٹی نہیں۔ یہ پتا نہیں کہاں سے اٹھ کر محل سرا میں آ گئی ہیں۔ میں نے چونکہ پہلی بار آپ کو دیکھا تھا، اس لیے پہلی نظر میں جو دیکھا بیان کر دیا۔ تو وہ کمال مہربانی سے بولیں۔

"گل بانو...... کسی کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔ وہ بھی اللہ کی پیدا کردہ مخلوق ہیں۔"

"ان کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرافت انسانی کے ان میں بے شمار جوہر ہیں۔" رامنی نے جواب میں کہا۔

"اور تم شہزادہ اعظم کے بارے میں کچھ بتاؤ......"

رامنی نے جب شہزادے کا نام لیا تو گل بانو نے عجیب نظروں سے رامنی کی طرف دیکھا۔ گویا وہ پوچھ رہی ہو...... تو شہزادی صاحبہ تم بھی......

رامنی گل بانو کی دزدیدہ نظروں کا مفہوم اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

شہزادہ اعظم جب بھی محل سرا میں آتا تو بڑی تیزی سے راہداری عبور کر جاتا۔ بے شک کنیزیں اور باندیاں اس کا رستہ روکنے کی کوششیں بھی کرتیں لیکن وہ ان رکاوٹوں

کو نظر انداز کرتا ہوا پریشانی سے عبور کرتا ہوا سیدھا اپنی والدہ دل رس بانو کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ ادھر سے فارغ ہو کر بڑی بیگم روشن رائے کے پاس سلام کرنے پہنچ جاتا۔ پھر اگر وقت ملتا تو جھروکے میں جا کر بیٹھ جاتا۔

کنیزوں اور باندیوں کی شہزادہ اعظم سے چھیڑ چھاڑ اور کھٹی میٹھی باتیں جو وہ کرتی تھیں، رامنی دروازے میں کھڑی ہو کر سنتی رہتی اور بقیہ رہی سہی باتیں گل بانو مزے لے کر اس کے گوش گزار کر جاتی۔ اب تو کئی دنوں سے رامنی کے من میں بھی عجیب و غریب خواہشوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا بھی جی چاہنے لگا تھا کہ وہ بھی شہزادہ اعظم سے خود ایسی باتیں کرے کیونکہ ایک تو شہزادے کی باتیں اس قدر دلچسپ ہوتی تھیں، اوپر سے گل بانو کا اندازِ بیاں رامنی کے دل میں اور شوق جگا جاتا تھا۔ اب تو اگر گل بانو نہ بھی ایسی باتیں بتاتی تو خود رامنی کرید کرید کر ان باتوں کا سیاق و سباق پوچھنے لگتی۔ لگتا تھا کہ شہزادہ اعظم اس کی سوچوں پر سوار ہو چکا تھا۔

جوانی کے اپنے ہی انداز اور اپنی ہی خواہشیں ہوتی ہیں۔ رامنی کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ محل سرا میں اس سے زیادہ خوب صورت اور حسین شہزادیاں اور کنیزیں موجود ہیں مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اس کے من میں شہزادہ اعظم کے لیے ایک خوب صورت اور پوتر جگہ بنتی جا رہی تھی۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ اب وہ اپنے کمرے میں تنہا ہوتی تو خیالوں ہی خیالوں میں شہزادہ اعظم سے باتیں کرنے لگی تھی۔

اس روز بھی وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھی، اسے لگنے لگا تھا کہ جیسے سنہری رتھ پر اس روز کے سپنے میں آنے والا خوب صورت شہزادہ کرشن مہاراج نہیں بلکہ شہزادہ اعظم تھا۔ جس نے رتھ سے اترتے ہی اسے اپنی مضبوط بانہوں میں لے لیا تھا۔ وہ جلد ہی اپنی ان سوچوں کو جھٹک دیتی...... شاید اس وہم کے ساتھ کہ کہاں کرشن مہاراج اور کہاں شہزادہ اعظم...... اس کے خیالات میں کس قدر ناپاکی در آئی ہے مگر وہ ان پاگل سوچوں کو کہاں تک روک سکتی تھی۔ گل بانو جب بھی اس کے پاس آتی تو وہ اس کے سلونے اور ملیح چہرے پر کچھ ڈھونڈتی نظروں سے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی۔ تب رامنی کو بڑی الجھن سی ہونے لگتی اور وہ مارے شرمندگی کے اپنی نظریں چرا جاتی۔ اب تو گل بانو کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ رامنی گھما پھرا کر شہزادہ اعظم سے متعلق باتیں کیوں پوچھتی رہتی ہے۔ کہیں وہ من ہی من میں شہزادے کو پسند تو نہیں کرنے لگی۔

دن ڈھل کر ہفتوں اور مہینوں میں بدلنے لگے تھے۔ راجکماری رامنی کی چاہت دھیرے دھیرے گل بانو پر بھی کھلنے لگی تھی۔ آخر ایک روز گل بانو نے ہمت کر کے رامنی سے پوچھ ہی لیا۔

"راجکماری صاحبہ! بڑے دنوں سے ایک بات پوچھنا چاہ رہی ہوں مگر ہمت نہیں پڑتی۔ اتنی پیاری اور اس قدر کامنی صورت راجکماری کہیں ناراض ہی نہ ہو جائیں۔" گل بانو نے کہا۔

"جاؤ ہم نے تمہیں جان کی امان دی......" رامنی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پوچھو بے دھڑک ہو کر...... ہم تم سے غصے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

گل بانو نے محلاتی زبان کی نقل اتارنے پر رامنی کا منہ چومتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔

"میں کتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں، راجکماری کے من میں شہزادہ اعظم کے لیے کوئی چور نقب لگا رہا ہے۔"

رامنی، گل بانو کی اس جرأت پر خود بھی ہنس دی اور آہستگی سے بولی۔

"ہاں گل بانو...... تمہاری باتیں سن سن کر نہ جانے میرے من میں بھی خواہش سی ابھرتی ہے کہ میں بھی شہزادہ اعظم سے تمہاری طرح چھیڑ چھاڑ اور باتیں کروں...... مگر خوف آڑے آ رہا ہے۔"

"اوہو...... اتنی سی بات پر ڈرنا کس بات کا...... میں تو یہاں رہنے والیوں کے دلوں میں چھپے ہوئے کئی ایسے چور لمحوں سے واقف ہوں۔ آپ کیوں گھبراتی ہیں۔ آپ کے من میں کوئی بھی ایسی بات ہو تو اپنی اس باندی سے کہیے...... کسی کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑے گی۔ ایسی باتوں کی بڑی کچی پکی قبریں اس من میں بنی ہوئی ہیں۔ دفن ہیں کئی راز...... آپ کہیں تو سہی۔ آپ کے من میں کوئی کہنے کی بات ہو تو بتائیں، میں آپ کا پیغام بحفاظت شہزادہ اعظم کو پہنچا دوں گی۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔ میں کتنے دنوں سے یہ بات جانتی تھی مگر آپ سے اس سلسلے میں بات ہی نہیں ہو پائی تھی۔"

رامنی اس کی بات سن کر خاموش ہو رہی۔ تب تھوڑی دیر بعد گل بانو دوبارہ گویا ہوئی۔ "اچھا میں یوں کرتی ہوں۔ جب شہزادہ اعظم محل سرا میں پدھاریں (آئیں) گے تو آپ کی ملاقات کرا دوں گی۔ یہ ٹھیک رہے گا...... پھر خود ہی اپنے من کا بوجھ اتار لینا......" گل بانو نے تجویز دی۔

''ہوں......'' رامنی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن ان دنوں میں شہزادہ اعظم محل سرا میں آیا ہی نہیں۔ رامنی نے اپنے من ہی من میں اس ملاقات کے بارے بہت کچھ سوچ رکھا تھا مگر ہر دن کے انتظار کے بعد وہ ساری سوچیں مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاتیں۔ اس دوران البتہ شہنشاہ کئی بار محل میں آئے۔ انہوں نے محل سرا میں مقیم شہزادیوں اور نوکرانیوں کو انعام و اکرام سے بھی نوازا تھا۔ شہنشاہ معظم کی طرف سے ابھی تک جنگ سے لائی گئی یا ضمانتاً پہنچائی گئی شہزادیوں اور لڑکیوں کو نہ تو زبردستی مذہب تبدیل کرنے کا کہا گیا اور نہ ہی یہ پوچھا گیا کہ محل میں آنے کے بعد انہیں کسی قسم کی تکلیف کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا۔ حیرانی رامنی کو یہ بھی تھی کہ مسلمان شہنشاہ کے دربار اور محل میں رہتے ہوئے اسے اپنے مذہب کی عبادت سے بھی کسی نے نہ روکا تھا۔ وہ صبح و شام اتنی ہی آزادی کے ساتھ اپنے مذہب کی پراتھنا (عبادت) کرتی جیسے وہ آزاد رہ کر کیا کرتی تھی۔ شہنشاہ کے اس اخلاق اور رواداری نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر اسلام کی اور سچائیاں بھی کھلتی گئیں۔ اس کے دل میں اب مسلمانوں کے لیے عزت و احترام بڑھتا چلا گیا۔ جیسے جیسے مذہب سے متعلق اس کے نظریات میں تبدیلی آتی جا رہی تھی، اسی طرح اس کے دل میں یہاں مقیم مسلمان شہزادیوں اور رانیوں کا احترام بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

''کس قدر خوش قسمت ہیں ایسے شہنشاہوں کے زیر سایہ رہنے والی عورتیں......'' کبھی کبھی وہ سوچتی...... ''اور ایک ہمارا دیس تھا۔ جہاں عورتوں کی کوئی عزت و توقیر ہی نہیں۔ مردوں کی خواہشوں پر قربان ہونے والی عورتیں، جنہیں برہنہ دیکھ کر راجاؤں کے من کو نہ جانے کونسا سکون ملتا ہے۔'' اب تو رامنی کی حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ جب بھی وہ پراتھنا کے لیے کرشن مہاراج کی مورتی کے سامنے بیٹھتی تو دھیرے دھیرے کرشن مہاراج کی مورتی کے نقش مٹنے لگتے اور اس کی جگہ شہزادہ اعظم کے نین نقش ابھر آتے...... پھر آج کل اس کی عبادت کے جنتر وں منتروں سے بھی اس کی...... روح...کو شانتی نہ مل پاتی تھی۔ جب وہ اپنی اس حالت کے ہاتھوں بے حد مجبور ہوگئی تو ایک روز تنگ آ کر اس نے گل بانو سے پوچھ ہی لیا۔

''گل بانو...... یہ تمہارا شہزادہ کب محل سرا میں آتا ہے......؟''

''مجھے کیا علم راجکماری...... شہزادے کا اپنا من ہے، جب چاہتا ہے وہ بڑی بیگم صاحبہ کو سلام کرنے آ جاتے ہیں...... لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' گل بانو نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

''بس...... یونہی...... یاد کرو تم نے ایک بات کہی تھی۔ اب اگر وہ محل میں آئے تو مجھے ضرور خبر کرنا......'' راجکماری رامنی کے دل کی بات بالآخر اس کے ہونٹوں تک آ ہی گئی۔

''جی بہتر......'' گل بانو یہ کہہ کر جانے لگی تو راجکماری فوراً اس کے رستے میں آ گئی۔ گل بانو وہیں ٹھٹک کر رہ گئی۔

''گل بانو...... ایک بات اور بتاؤ...... تمہارے اس شہزادے کی ابھی تک شادی کیوں نہیں ہوئی؟'' رامنی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہ میں کیا جانوں...... شاید ابھی تک انہوں نے شادی کے بارے میں سوچا ہی نہ ہو۔ پھر ہمارے مذہب میں شادی ماں باپ کی مرضی سے ہوتی ہے۔ شہزادے کا بیاہ کرنا بڑی سرکاروں کا کام ہے۔ ویسے بھی ابھی شہزادہ جنگوں اور لڑائیوں سے فارغ نہیں ہوا تو وہ شادی کے بارے میں کیا سوچے گا۔'' گل بانو نے بتایا۔

''وہ ہر وقت جنگوں میں کیوں مصروف رہتا ہے؟'' راجکماری نے اگلا سوال کیا پھر خود ہی اس بے معنی سوال پر شرمندہ سی ہوگئی۔ لیکن گل بانو نے یہ سن لیا تھا اس لیے وہ بولی۔

''حکومتیں ایسے ہی تو سنبھالی نہیں جاتیں۔ اس کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اس کا ادراک تو آپ کو بھی ہے۔ پھر شہزادہ اعظم اتنا بہادر اور نڈر ہے کہ بادشاہ سلامت اس کے علاوہ کسی پر اعتماد بھی تو نہیں کرتے۔ وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور شہزادہ اعظم کو بھی جنگوں کے اتھرے دریا میں کود کر زیادہ مزہ آتا ہے۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''تمہارا رب انہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔'' رامنی نے دل سے دعا دی اور گل بانو باہر نکل گئی تو دیر تک سوچتی رہی کہ اس کے من میں ایسے الفاظ کس لیے اترے ہیں۔ وہ کس لیے شہزادے کے لیے منتظر رہتی ہے اور ہر آہٹ پر...... باندیوں کے ہر وقت اعلان پر اس کے دل کی دھڑکنیں کیوں تیز ہو جاتی ہیں۔ کیا اسی کو پریم کہتے ہیں۔ کیا محبت اسی کا نام ہے۔ جو اس کے احساس میں ایک عجیب قسم کی بے چینی پیدا کرتی جا رہی ہے۔ جیسے جیسے اس کا یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا، شہزادہ اعظم کی محل سرا میں آمد اتنی ہی

کم ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

رجب کا مہینا چڑھے آج ساتواں روز تھا اور 1666ء کا سال تھا جب شہزادہ اعظم دکن کی مہم سے فارغ ہو کے واپس پلٹا تھا تو شہنشاہ کو اپنی کامیابیوں کی داستان سنانے کے بعد ملکہ عالیہ دل رس بانو کو سلام کرنے محل سرائے میں آیا۔ رامنی اپنے کمرے میں بیٹھی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی جب اس کی کنیز خاص گل بانو بھاگی بھاگی اس کے پاس آئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ آتے ہی وہ تیزی سے بولی۔

''راجکماری صاحبہ...... شہزادی صاحبہ...... صاحب علم شہزادہ محمد اعظم اپنی مہم سے سرخرو ہو کر محل میں تشریف لائے ہیں۔'' یہ سن کر رامنی جلدی سے اپنے کمرے سے نکل کر اس کے ہمراہ راہداری میں آ گئی۔ شہزادہ اعظم اپنی والدہ سے مل کر بڑی بیگم صاحبہ کے پاس جا رہا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھی۔ آج اس نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنے دل کی بات ہر حال میں شہزادے کے گوش گزار ضرور کر کے رہے گی۔ گل بانو اس سے تیزی کے ساتھ آگے نکل گئی اور شہزادہ اعظم کے پاس اس سے پہلے پہنچ گئی تھی لیکن شہزادہ اپنی ہی دھن میں آگے نکل گیا۔ راجکماری رامنی کو اس نے آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے شہزادے کے اس رویے سے بڑی سبکی محسوس ہوئی مگر وہ اپنے دروازے سے لگی کھڑی رہی۔

شہزادہ اعظم بڑی بیگم صاحبہ سے مل کر کچھ ہی دیر میں واپس جانے لگا تو گل بانو نے جرأت کر کے راجکماری رامنی کا سلام اسے پہنچا دیا۔ گل بانو شہزادے کے قریب کھڑی تھی اور شہزادہ بھی کچھ دیر کو رک گیا تھا۔

''اگر جان کی امان پاؤں تو ایک چھوٹی سی بات اس کنیز نے عرض کرنی تھی۔ گو مجھ میں اتنی ہمت تو نہیں مگر پیغام دینے والے کا پیغام نہ دینا بھی خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔'' گل بانو نے اٹک اٹک کر مدعا بیان کیا۔

''کہو گل بانو...... کیا کہنا چاہتی ہو......''

''سرکار! بڑے دنوں سے وہ آسام کی راجکماری آپ کو سلام پیش کرنا چاہ رہی تھی۔''

''یہ کون ذات ہیں اور کیا ان سے ہماری پہلے بھی آشنائی ہوئی ہے؟'' شہزادہ اعظم نے پوچھا۔

''یہ...... رامنی ہیں...... راجا آسام کام روپ کی سپتری ہیں......'' گل بانو کو حوصلہ ملا تو اس نے شہزادہ اعظم کو سب بتا دیا، ~~سننے~~ تحمل کے بعد شہزادے نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... ان کا سلام قبول کیا جاتا ہے۔ ہمارا سلام بھی ان تک پہنچا دینا۔'' رامنی ابھی تک اپنے کمرے کے دروازے سے لگی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کونسا لمحہ تھا جب شہزادہ اعظم واپس جاتے ہوئے اس کے قریب سے گزرا۔ اس کے من میں آئی کہ موقع اچھا ہے مگر اس کی نظریں گل بانو پر تھیں، جو دور کھڑی اشارے سے کہہ رہی تھی کہ بڑھ کر خود اپنے دل کی بات شہزادے کو کہہ ڈالے۔ معاً شہزادے کی نظریں بھی گل بانو پر پڑیں۔ اس نے گل بانو کو اشارے کرتے دیکھ لیا تھا۔ رامنی کو موقع ملا تو وہ شہزادے کی راہ میں آ گئی۔ شہزادہ اس سے کنی کترا کر نکل جانا چاہتا تھا مگر جب رامنی اس کے رستے میں آ گئی تو وہ بھی ٹھٹک کر رک گیا۔ تب اس نے دھیرے سے کہا۔

''صاحب علم کی خدمت میں یہ باندی سلام عرض کرتی ہے۔''

پہاڑی جھرنوں جیسی مترنم آواز سن کر شہزادہ اعظم نے اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا جس کے لہجے میں تاملی اور فارسی زبان کی آمیزش نمایاں تھی۔

''وعلیکم السلام......'' شہزادے نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے سلام کا جواب دیا۔

''مجھے رامنی کہتے ہیں...... رامنی گبھارو...... میں ہی آسام کے راجا کام روپ کی اکلوتی بیٹی ہوں......''

ابھی وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ شہزادے نے بڑی سادگی سے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''اس محل میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے...... آرام تو ہے نا......؟''

''جی...... جی...... بھگوان کی کرپا سے سب ٹھیک ہے۔ ہمارے تو دھن بھاگ ہیں جس نے ہمیں آپ ایسے لوگوں کی چھایا میں رکھا ہوا ہے۔'' رامنی نے لڑکھڑاتے لفظوں میں اپنا فقرہ مکمل کیا۔

''ٹھیک ہے...... ابھی ہمیں جلدی ہے......''

گویا یہ اس بات کا عندیہ تھا کہ اس کا رستہ اب چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ رامنی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے راستے سے ہٹ گئی۔ شہزادے کے جاتے ہی رامنی افسردگی سے اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ شہزادے سے نہ مل پانے پر ایک حسرت تھی۔ بے لگام خواہش تھی جو اس کی سوچوں کے آگے بند باندھے کھڑی تھی اور اس کے پیچھے ہزاروں باتوں

کی لہریں تھیں جو اس بند سے ٹکرا کر باہر نکلنے کو بے تاب تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ ان بکھری باتوں کو ایک ترتیب دینے کی کوشش کی کہ وہ شہزادے سے ملتے ہی پہلے یہ بات کہے گی پھر یہ پوچھے اور یہ بتائے گی مگر یہاں تو اس کی ہر ترتیب اور ہر سلیقہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اور چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ پائی تھی، ہر سوچ تشنہ رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے اپنے عشق کی توہین دیکھی تو اسے بڑا افسوس ہوا۔ اس کی سب سوچیں...... خواہشوں کے قید خانے میں ہی پڑی رہ گئی تھیں۔ شہزادے کے حسن نے اسے مبہوت ہی اتنا کر ڈالا تھا کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی اور شہزادہ اسے حیرت میں ڈوبا چھوڑ کر چلا گیا۔

لمحوں کے پنچھی پھر اڑانیں بھرتے رہے اور اس کے اردگرد اڑتے رہے پھر ایک روز راہداری سے گزرتے ہوئے ایک خواجہ سرا نے کسی کنیز کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسے بتایا کہ شہنشاہ عالم پناہ نے شہزادے کو اکبرآباد بھیج دیا ہے۔ کیونکہ وہاں ان کے دادا حضور کی طبیعت بڑی ناساز ہے۔ وہ عادتاً دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی جب اس نے یہ بات سنی۔ یہی بات جب محل سرا میں پھیلی تو محل سرا میں رہنے والی شہزادیوں، رانیوں کے ساتھ ساتھ ہر باندی، کنیز اور خواجہ سرا کے لبوں پر شہزادہ والاشان کے دادا... حضور کی صحت یابی کے لیے مانگی جانے والی دعائیں جاگ اٹھی تھیں مگر اللہ کے کاموں میں کسے دخل ہے۔

رجب کے مہینے کی 26 تاریخ تھی جب شہزادے کے دادا کا انتقال ہوگیا۔ محل سرا کی فضائیں درد اور سوگ میں ڈوب گئیں۔ شہنشاہ عالم پناہ خود رانیوں اور شہزادیوں کے ساتھ اکبرآباد روانہ ہوگئے۔ محل سرا میں موجود ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ماتم اور افسوس کا اظہار ایک دوسرے سے کیا جارہا تھا اور بین کے ساتھ گھٹی گھٹی رونے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ رامنی کے لیے یہ بات بڑی عجیب تھی۔ آسام میں رواج تھا کہ مرنے والے کے قریبی عزیز خاص طور پر اس کی بیویوں اور اس کی پسندیدہ کنیزیں ایک ساتھ کمرے میں بند کردی جاتیں۔ یا انہیں ستی کی آگ میں جلادیا جاتا تھا مگر یہاں مرنے والے کے عزیز واقارب موت کی خبر سن کر رونے پیٹنے لگے تھے۔ وہ بین کرتے یا پھر روپیٹ کر چند دنوں کے بعد خاموش ہوگئے۔ رامنی کو بھی افسوس تو ہورہا تھا کہ وہ اس کے پریم اور اس کے محبوب کے دادا حضور اور اس محل سرا کے مالک، پورے ہندوستان کی راجدھانی کے شہنشاہ کے باپ تھے۔ یہی سوچ اس کی آنکھوں میں پانی بن کر بہنے لگی تھی۔

1666ء میں شہنشاہ اورنگ زیب اکبرآباد سے واپس آگئے۔ ان کے ساتھ ہی تمام سوگواران بھی پلٹ آئے۔ شوال کی پہلی تاریخ کو شہنشاہ دوبارہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے تو انہوں نے بے کس، غرباء اور حق داران میں خیرات کی شکل میں دھن دولت کے دروازے کھول دیے۔ شہزادہ اعظم بھی واپس آگیا تھا۔ اب ان کا زیادہ وقت بڑی بیگم صاحبہ کے حضور میں گزرتا تھا۔ ایسے میں آتے جاتے رامنی اور شہزادے کا آمنا سامنا بھی ہوجاتا تھا اور کبھی کبھار بات چیت بھی ہوجاتی مگر یہ بات چیت چند جملوں پر ہی مشتمل ہوتی تھی۔ گو اب بات شناخت سے آگے بڑھ چکی تھی۔ رامنی کو بھی اب حوصلہ ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ بھی کبھار کوئی طنزیہ بات، کوئی اڑتا ہوا جملہ کہہ کر اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بھی کرنے لگی تھی مگر وہ کبھی تہذیب سے نہیں گری تھی۔ شہزادہ اعظم بھی اب اس کی باتوں سے لطف لینے لگا تھا اور وہ بھی بڑا انیکھا سا جواب دے کر آگے نکل جاتا۔ رامنی خوش تھی کہ اب شہزدے پر اس کے دل کا حال کھل چکا ہے۔ اب تو گل بانو بھی ان دونوں کے درمیان ایک مضبوط پل کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ وہ رازداری اور پیغام رسانی کے فرائض بڑے احسن طریقے سے انجام دینے لگی تھی۔ رامنی اور شہزادے کو اب کوئی بات بھی کہنا ہوتی تو وہ دونوں گل بانو کا ذریعہ استعمال کرنے لگے تھے اور گل بانو فوراً ایک دوسرے کے پیغام پہنچانے لگی تھی۔ رامنی کو اب پورا یقین ہو چلا تھا کہ محبت کا دیا...... جو پہلے اس کے من میں ٹمٹمایا تھا، اب وہ شہزادے کے دل میں بھی جوت جگانے لگا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شہنشاہ اورنگ زیب کی نظریں مہمات سے ہٹی ہوئی تھیں۔ فراغت ہونے کے سبب شہزادوں اور شہزادیوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا ہوا تھا۔ ملازم پیشہ لوگوں کے لیے تو ایسے مواقع عید اور شبراتوں سے کم نہیں ہوا کرتے۔ ایسے موقعوں پر کنیزوں اور باندیوں کے بھی چھپے ہوئے خواب اور دبی ہوئی خواہشیں جاگ جاتیں۔ وہ باتوں اور گھاتوں کی خوب دھنی تو ہوتی ہیں پھر وہ پیغام رسانی کا کام انعام واکرام کے لالچ میں سرانجام دے کر خوب مزے لوٹتیں۔ خوب صورت فقروں اور محبتوں چاہتوں کے پیچ لڑانے میں دونوں اطراف کی مدد کرتیں۔ شہزادہ اعظم کے گرد کنواریوں کا ہجوم زیادہ رہتا تھا۔ وہ خود تو غیر شادی شدہ تھا ہی...... اوپر سے خوب صورت سوچوں کا

مالک بھی تھا۔ شہزادہ جب بھی راہداری سے گزرتا رامنی پہلے سے اس کی منتظر ہوتی۔ وہ چند لمحے اس کے پاس رکتا۔ خوب صورت باتوں سے اس کے دل کو لبھاتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ شہزادے کے ساتھ محو گفتگو ہوتی تو کوئی خواجہ سرا...... یا کوئی کنیز ان کے قریب سے بڑی گہری نظروں سے انہیں دیکھتی اور طنزیہ مسکراہٹ اچھالتی ہوئی گزر جاتی مگر اب رامنی کے لیے ایسی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پہلے پہل اسے ایسی باتوں سے خوف محسوس ہوتا تھا مگر جب سے شہزادہ اعظم اس کی باتوں اور سوالوں کا ہنس کر جواب دینے لگا تھا اس کا خوف جاتا رہا تھا اور حوصلے بڑھ چکے تھے۔ رامنی نے ایک دو بار ایسا بھی کیا کہ جان بوجھ کر شہزادے کے احساس کو آزمانے کے لیے خود کو کمرے میں چھپالیا تاکہ وہ دیکھ سکے کہ شہزادے کے من میں اس کی کس قدر اہمیت اور محبت ہے۔ شہزادہ راہداری سے گزرتے ہوئے بڑی بے چینی سے اسے ڈھونڈتا۔ اس لیے رامنی کو بھی اب یقین ہوچلا تھا کہ شہزادے کے من میں بھی اس کے لیے چاہت اپنا گھر کرچکی ہے۔ رامنی کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

☆☆☆

راہداری میں اس روز راجکماری رامنی اور شہزادہ اعظم خاں کھڑے باتیں کررہے تھے جب ان کے قریب سے گزرتی ایک کنیز ان کی باتیں سنتے ہوئے مسکرائی اور آگے نکل گئی۔ رامنی کو اس کی مسکراہٹ میں چھپے طنز کو دیکھ کر عجیب سا لگا تھا مگر اس نے اسے نظرانداز کردیا۔ کیونکہ شہزادہ والاشان خود اس کے ساتھ محو گفتگو ہوا تھا۔ رامنی اپنی ہی دھن میں کہہ رہی تھی۔ ”آپ کتنے اچھے ہیں صاحب عالم...... جو ایک باندی کے ساتھ یوں گفتگو کررہے ہیں۔ جیسے وہ آپ کے حرم کی رانی ہو......“ شہزادہ اعظم نے آگے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا تو وہ میرا رب ہے جس نے یہ سارا جہاں تخلیق کیا اور ہم جیسے معمولی انسانوں کو پوری مخلوق کی ذمے داری سونپی ہے اور پھر رامنی جی...... آپ کے دل میں کوئی فریب نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو دوسرے بھی خوب صورت نظر آتے ہیں۔“ شہزادے نے جواب دیا۔

”یہ آپ کا حسن نظر ہے اور...... انسان کا من اچھا ہو تو وہ دوسرے کی شکل وصورت نہیں دیکھتا بلکہ اس کی اچھائیوں کو دیکھتا ہے۔“ راجکماری کے اندر کا سچ بولا۔

”ہوں......“ شہزادے نے چھوٹا سا جواب دیا جیسے وہ بھی کامنی کی بات سمجھ گیا ہو۔

”اچھی اور خوب صورت شکل کے تو سب پجاری ہوتے ہیں جہاں پناہ...... مگر بدصورتی کو اپنانا کسی کسی کا کام ہوتا ہے۔ بدصورت جسم میں بھی تو دل بھگوان ہی نے رکھا ہوتا ہے۔ پھر اس سے نفرت کا کیا جواز بنتا ہے......“ رامنی آہستہ آہستہ اپنے مدعا کی طرف آرہی تھی۔

”نہیں رامنی...... بات یہ نہیں۔ تم خود سوچو محل میں اور کتنی شہزادیاں ہیں مگر میں ان سب کو چھوڑ کر صرف تم سے باتیں کرنے کو ترجیح دیتا ہوں، وہ اس لیے کہ ظاہری خوب صورتی کو میں بھی اس قدر اہمیت نہیں دیتا جتنے دوسرے لوگ دیتے ہیں۔ تمہارا اندر اور تمہارا من بہت سندر ہے۔ کیا تم نہیں سوچتیں کہ تمہارے اندر کوئی نہ کوئی تو ایسی خوبی ہے جو تمہیں دوسروں سے الگ کرتی ہے اور تمہاری یہی خوبی ہمیں پسند ہے۔“ شہزادے نے وضاحت سے جواب دیا۔

”کرپا ہے شہزادہ عالم...... آپ کی عنایت ہے یہ...... مگر میں اندر ہی اندر اس بات سے خوف زدہ رہتی ہوں کہ عالم پناہ کے لیے ہم جیسی ناریاں ایک کھلونے سے بھی کمتر حیثیت کی مالک ہوتی ہیں جب تک من چاہا، ان سے کھیلا اور جب جی بھر گیا، اسے پھینک دیا۔ بڑا ہی دکھی ہوجاتا ہے میرا من...... یہ سوچ کر...... پتا نہیں ہمارا میل ہو بھی پائے گا یا نہیں......“ رامنی نے کانپتی آواز میں کہا۔

”اس راہ میں اور تو کوئی رکاوٹ نہیں۔ پھر مجھے آپ جیسی راجکماری کو اپنانا مشکل بھی نہیں۔ میں ولی عہد ہوں...... دلی کے شہنشاہ کا...... میرا جو دل چاہے میں وہ کرنے پر قدرت رکھتا ہوں لیکن ہوسکتا ہے شہنشاہ عالم پناہ کو تمہارا مذہب نہ رکاوٹ ڈالے......“ شہزادہ بولا۔

”کیا آپ کے خاندان میں دوسرے مذہب کی لڑکیاں پناہ لیے ہوئے نہیں ہیں؟ میں نے سنا ہے آپ کے بڑے بھائی کی بیوی بھی ہندو خاندان سے ہے۔ کیا نام ہے ان کا......“ رامنی نے جواب دیا۔

”ہاں...... شہزادے محمد سلطان کی بیوی بائی بھوت ولی ہندو خاندان سے ہے مگر تم یہ سن کر حیران ہوگی کہ وہ بہت تیز مزاج اور شوخ ہے۔ اس کے من میں ہندو اور مسلمانوں کے لیے کوئی تعصب موجود نہیں۔ وہ مسلمانوں کی ترقی اور ان کی دینی ودنیاوی کامیابیوں پر حسد نہیں کرتی اور نہ ہی بغض رکھتی ہے۔“ شہزادے نے سمجھانے کے انداز میں بتایا۔

”پھر آپ کے بڑوں نے بھی اس تفاوت کو اپنی راہ

کا روڑا نہیں جانا۔ خود عالم پناہ کے حرم میں راجا اودے پور کی چہیتی بیٹی بائی اودے پوری موجود ہے۔'' رامنی نے اپنی علمیت سے فائدہ اٹھایا۔

''ارے بھئی میں نے کب یہ کہا ہے کہ مذہبی دوری کبھی ہمارے راستے کی رکاوٹ بنی ہے۔ ہم ہر مذہب کے انسانوں کو اسی قدر اہمیت دیتے ہیں جس قدر اپنے مذہب کے لوگوں کو دیتے ہیں۔ انصاف دینا اور انصاف رکھنا ہماری پہلی ترجیح ہوتی ہے۔ ویسے میں اب تمہاری علمیت کا بھی قائل ہوگیا ہوں۔ یہ تو میں نے ویسے ہی اپنا خدشہ ظاہر کیا تھا۔'' شہزادہ اعظم نے بات ختم کرنے کے انداز میں جواب دیا۔

''یہ مذہب بھی میرے لیے اب رکاوٹ نہ رہے گا عالم پناہ...... میں بہت جلد آپ کے مذہب میں شامل ہو جاؤں گی۔ تاکہ یہ بھی ہماری محبت کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے......'' رامنی نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''میں توڑ ڈالوں گی یہ رکاوٹ اور یہ زنجیر بھی۔''

''یہ تو اور بھی خوشی کا باعث ہوگی پھر یہ سانولا سلونا حسن میرے حرم سرا میں داخل ہو جائے تو مجھے اور بھی خوشی ہوگی۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ میں ان لمحوں کا منتظر رہوں گا۔''

شہزادہ اعظم یہ کہہ کر آگے نکل گیا اور رامنی خوشیوں بھرے من کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی...... اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ خوب ناچے اور گائے۔ آج اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اونچی اونچی آواز میں یہ اعلان کردے کہ دیکھو...... آسامی حسن کی یہ بدصورت سی لڑکی آج کیسے جیت گئی ہے۔ آج اسے یقین ہو چکا تھا کہ محبت میں کس قدر طاقت ہے کہ وہ دلوں کو کس طرح ایک دوسرے کے لیے موم کر دیتی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اپنے بستر پر لیٹ کر نہ جانے کتنی دیر تک سوچتی رہی۔

پھر نہ جانے کب اس کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

''دروازہ کھلا ہے۔ اندر آجاؤ...... کون ہے......''

اندر آنے والی گل بانو تھی...... وہ آتے ہی گویا ہوئی۔

''راجکماری صاحبہ...... نصیب دشمناں طبیعت تو ٹھیک ہے...... آج تو آپ کو خوش ہونا چاہیے تھا۔ بڑی دیر تک شہزادے حضور کی سنگت رہی۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟ راہداری میں اس وقت تو کوئی نہ تھا۔''

''بس شہزادی عالیہ! تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ہمیں بھی کسی نے خبر کر ہی دی۔'' گل بانو خوشی سے بولی۔

''اوہ تو وہ کنیز......'' رامنی نے فوراً بات کی تہ جان لی۔

''ہاں اسی نے مجھے بتایا تھا۔ وہ بڑی بیگم صاحبہ کے پاس جاتے ہوئے آپ دونوں کو باتیں کرتے دیکھ گئی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تو میں نے سختی سے اسے منع کر دیا کہ وہ اس بات کا ذکر کسی اور کے آگے نہ کرے۔''

''کیا...... وہ اس کا ذکر اور بھی کہیں کر سکتی ہے......''

''لالچ بری بلا ہے راجکماری صاحبہ۔ انعام کے لالچ میں یہ اس بات کا ذکر کہیں بھی کر سکتی ہے۔ بہرحال آپ فکرمند نہ ہوں۔ میں ہوں نا سنبھال لوں گی۔''

''شہزادہ عالم بھی تو بڑی بیگم کی طرف گیا تھا۔'' رامنی نے سوچا۔ ''کہیں اس بات کی بھنک بڑی بیگم صاحبہ کے کانوں میں نہ ڈال دی جائے۔ اگر ایسا ہوگیا تو اس کے لیے پھر یہ گھڑیاں قیامت سے کم نہ ہوں گی۔''

''دیکھو گل بانو... تم اس سے مل کر ایک بار پھر سختی سے منع کردو کہ وہ یہ باتیں بڑی بیگم صاحبہ کے گوش گزار نہ کرے......''

''ارے...... ارے راجکماری! آپ تو ایسی باتیں سوچ کر یونہی خوفزدہ ہوئی جارہی ہیں۔ ایسی باتیں اور ایسی ملاقاتیں بیگم صاحبہ بھی جانتی ہیں۔ محل سرا کے معمول کی باتیں ہیں۔ میں بھی ادھر ہی جاتی ہوں۔ آپ بے فکر رہیں، میری دعا ہے اللہ آپ کی محبت کو سلامت رکھے اور اس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ہمت اور حوصلے سے رہیے گا۔'' یہ کہہ کر وہ بھی بڑی بیگم صاحبہ کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

شہزادہ محمد اعظم رامنی کی باتوں سے محظوظ ہوتا ہوا بڑی بیگم صاحبہ کے پاس آگیا تھا مگر آج بڑی بیگم صاحبہ کا موڈ بگڑا ہوا دیکھ کر خوفزدہ سا ہوگیا۔ اس کے اندر کا ڈر اس پر حاوی ہونے لگا تھا۔ کہیں بڑی بیگم صاحبہ کو اس کے پیار کی خبر تو نہیں ہوگئی، یا پھر......

کسی نے اس کی شکایت تو بڑی بیگم صاحبہ کے آگے نہیں کر دی۔ بڑی بیگم صاحبہ کا چہرہ غصے سے تنا ہوا تھا۔ شہزادے کے اندر کے خوف نے اسے اور بھی لرزا دیا تھا۔ اسے لگا کہ بہت جلد اس کی سرزنش ہونے والی ہے۔ پھر ہوسکتا ہے جو خبر یہاں تک پہنچ چکی ہے، وہ شہنشاہ عالم تک بھی پہنچ جائے۔ شہزادہ اعظم آگے بڑھا اور اس نے پیار سے بانہیں بیگم صاحبہ کے گلے میں ڈال دیں، مگر بڑی بیگم صاحبہ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ غصے میں بولیں۔

''کیا ہم نے جو سنا ہے، وہ درست ہے......''

''میری زبان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ آپ کو جھٹلا سکوں......'' شہزادہ اعظم نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''کیا یہ درست ہے کہ تم آسام کے راجے کام روپ کی سپتری سے پیار کرتے ہو...... اس سانولی اور کالی کلوٹی لڑکی سے...... جس کے نہ تو دین کا پتا ہے اور نہ ہی اس کے آباؤاجداد کا علم ہے۔'' بڑی بیگم صاحبہ نے غصے سے پوچھا۔

''بجا فرمایا آپ نے......'' شہزادہ اعظم نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔

''تمہیں اس بات کی بھی پروا نہیں کہ ہم نے تم سے کیا امیدیں لگا رکھی ہیں۔ تم نہیں جانتے...... شاید نہیں جانتے ہو...... تو سنو...... ہم نے اپنے خاندان میں تمہارے لیے خوب صورت لڑکی کا انتخاب کر رکھا ہے۔ وہ لڑکی تمہارے تائے کی بیٹی ہے، جس کے ساتھ ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ پھر تمہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ کام روپ کی بیٹی رامنی کا تعلق دوسرے مذہب سے ہے۔ وہ مسلمان نہیں ہے۔'' بڑی بیگم صاحبہ نے غصے سے کہا۔

''لیکن مذہب کبھی ہماری راہ کی رکاوٹ نہیں بنا...... وہ من کی بہت سندر ہے...... وہ بے حد ذہین ہے......'' شہزادہ اعظم نے ڈرے اور خوف زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''میں مانتی ہوں مگر ابھی تم مسندِ شاہی پر نہیں بیٹھے جو اپنی من مرضی کرتے پھرو اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ وراثت میں شاہی دستار تمہارے حصے میں آتی بھی ہے یا نہیں...... وقت کا کوئی اعتبار نہیں۔ فی الحال تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے اور اپنا اگلا قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا۔ میری یہ خواہش ہے کہ جنگوں اور مہمات میں کامیاب ہونے والا محبت کے اس فریب سے بھی کامیاب ہو کر نکلے اور دشمنوں کا یہ حربہ بھی ناکام و نامراد ہو جائے۔ اب تم جا سکتے ہو......''

شہزادہ محمد اعظم سر نیچا کر کے محل سے باہر آگیا۔

اس روز کی گفتگو کی میٹھی اور خوب صورت بازگشت ابھی تک رامنی کے خیالوں اور سوچوں میں گونج رہی تھی۔ لگتا تھا سرشاری کی اس کیفیت میں ڈوبی ہوئی رامنی اب ہر آہٹ اور ہر چاپ پر کان لگائے شہزادہ محمد اعظم کے آنے کی منتظر رہنے لگی تھی لیکن شہزادے کو محل سرا میں نہ آنا تھا اور نہ ہی وہ آیا۔ کتنے ہی دن انتظار میں بیت گئے تو رامنی کے دل میں مختلف قسم کے وسوسے سر اٹھانے لگے تھے۔

کہیں ان کے پیار کی بھنک ملکہ عالیہ یا بڑی بیگم صاحبہ کو تو نہیں لگ گئی؟ شاید انہوں نے شہزادے کے محل سرا میں آنے پر پابندی لگا دی ہو۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں ایک دن گل بانو سے بھی پوچھا تو گل بانو نے جواب دیا۔

''راجکماری صاحبہ! مجھے بھی اس بات کا علم نہیں کہ کس وجہ سے شہزادہ محمد اعظم محل سرا میں نہیں آتے۔'' رامنی کی تشویش اور بھی بڑھ گئی۔ وسوسوں کی چمگادڑیں اس کی سوچوں میں چمٹی ہوئی تھیں پھر ایک روز ایک خواجہ سرا سے...... جس کا محل میں آنا جانا تھا، رامنی نے اس سے پوچھا تو پتا چلا کہ ایران کا بادشاہ اپنی فوجیں خراسان تک لے آیا ہے اور اس کا ارادہ ہندوستان کے شہنشاہ سے جنگ کا ہے۔ شہنشاہ عالم..... اس کی سرکوبی کے لیے شہزادے کو سپاہ دے کر بھیجنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

آخر وہی ہوا نا......... جس کا رامنی کو ڈر تھا۔ ایسے ہی نہیں وسوسے اس کی سوچوں کا ماس نوچ رہے تھے۔ وہ فوراً بھگوان کے آگے پراتھنا (عبادت) کے لیے کھڑی ہوگئی۔ وہ بار بار ایک ہی دعا مانگ رہی تھی کہ شہزادہ محمد اعظم اس مہم پر نہ جائے مگر پتا نہیں کیوں اس کے من کو چین نہ آرہا تھا۔ جب کسی طرح بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسلمانوں کے خدا کے حضور جھک کر یہ دعائیں مانگنے لگی۔ پھر اسے یوں لگا جیسے اس کے من کو شانتی مل گئی ہے۔ ایک سکون سا آگیا ہے۔ پھر نہ جانے کب وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

اس رات اس نے زندگی کے حسین تر خواب دیکھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ شہزادہ اعظم کے ساتھ پائیں باغ میں گھوم رہی ہے اور پھر تالاب کے نزدیک بنے ہوئے سنگِ مرمر کے ایک تختے پر آکر شہزادہ اعظم بیٹھ جاتا ہے۔ رامنی اس کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جاتی ہے۔ شہزادہ اعظم اس کی گھنیری زلفوں میں ہاتھ کی انگلیاں پھیر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ محبت بھری باتیں بھی کر رہے ہیں۔ اچانک جیسے رامنی کو کچھ یاد آتا ہے۔

''شہزادہ عالم...... اجازت ہو...... تو آپ سے ایک بات پوچھوں......؟'' اس نے شہزادے سے سوال کیا۔

''ہاں کہو رامنی......'' شہزادے نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ کو مجھ سے کتنی محبت ہے......؟'' رامنی نے پوچھا۔

''یہ تو وہی بات ہوئی، شمع نے پروانے سے پوچھا کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا ہے...... تو پروانے نے فوراً خود کو اس کی آگ میں گرا دیا اور اس میں جل کر زندگی ختم کر گیا...... مرتے ہوئے بولا۔ کیا اب بھی تمہیں میری محبت کا

یقین نہیں آیا۔ یہ جان تمہاری امانت تھی، تم ہی پروار دی......اب بتاؤ تم بھی یہی چاہتی ہو۔''شہزادے نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے رامنی سے پوچھا۔

''نہیں عالم پناہ......لیکن اس کا کیا ہو...... کہ مجھے ایک خوف سا لاحق رہتا ہے۔ایک ڈر میری جان سے لپٹا رہتا ہے کہ......''ابھی اس کی بات بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ معاً نقارہ بجنے لگتا ہے۔کبھی اس کی آواز تیز اور کبھی دھیمی پڑتی ہے پھر ایک طرف سے آواز آتی ہے۔''باادب...... باملاحظہ...... ہوشیار...... عالی جاہ، ظلِ الٰہی، خلد آشیانی، جنت مکانی، حضور معظم ابو المظفر حضرت اورنگ زیب بادشاہ غازی تشریف لارہے ہیں۔''

رامنی آواز کی سمت دیکھنے لگتی ہے تو اسی سمت سے ظلِ الٰہی شہنشاہ معظم آتے دکھائی دیتے ہیں جن کی آنکھوں میں قہر و غضب دکھائی دیتا ہے۔رامنی خوف سے آنکھیں بند کرلیتی ہے۔وہ جلدی سے آگے بڑھتے ہیں اور شہزادہ اعظم خاں کا ہاتھ پکڑ کر اسے زور سے اٹھاتے ہیں اور شہزادہ مزاحمت کرتا ہے۔اس کے ساتھ ہی رامنی بھی اسے چھڑانے کی تگ و دو کرتی ہے مگر وہ اسے کھینچ کر دور......اس سے دور لے جاتے ہیں۔رامنی روتی رہی۔شہنشاہ کے پاؤں پڑتی رہی کہ وہ شہزادہ اعظم کو چھوڑ جائیں مگر شہنشاہ نے اس کی ایک نہ سنی۔اس کے رونے سے آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے صبیح و ملیح گالوں پر تیرتے اس کے تکیے کو بھگونے لگے۔تو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔اس نے تیزی سے اپنے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو پونچھا...... کچھ دیر کے بعد جب وہ نیند سے جاگی تو اسے احساس ہوا کہ اس نے جو کچھ دیکھا تھا محض ایک سپنا تھا مگر پھر بھی وہ پریشان ہوگئی پھر پتا نہیں وہ کتنی دیر انہی خیالوں میں الجھی رہی اور دل ہی دل میں یہ دعائیں مانگتی رہی کہ کہیں اس کا یہ سپنا حقیقت کا روپ نہ دھار لے......

☆☆☆

اگلے روز جب وہ بیدار ہوئی تو رات کا سپنا اسے ایک بار پھر یاد آگیا اور ایک انجانے خوف نے اسے پھر سے اپنے گھیرے میں لے لیا۔صبح اٹھتے ہی اس نے سب سے پہلا یہ کام کیا کہ گل بانو کو کسی دوسری کنیز کے ہاتھوں پیغام بھجوایا کہ وہ فوراً اس سے آکر ملے......تھوڑی دیر کے بعد گل بانو اس کے کمرے میں تھی۔

''جی راجکماری صاحبہ...... کیا حکم ہے؟'' گل بانو نے آتے ہی پوچھا۔

''گل بانو...... شہزادہ اعظم جہاں کہیں بھی ہوں انہیں میرا یہ پیغام پہنچادو۔''

''خیریت ہے راجکماری صاحبہ آپ کے چہرے پر کچھ پریشانی کے آثار مجھے نظر آرہے ہیں؟'' گل بانو نے حیرت سے پوچھا۔

''خیریت ہی ہے...... انہیں کہو...... کہ آسام کے مہاراجا کام روپ کی اکلوتی بیٹی رامنی گبھار و بقائمی ہوش و حواس یہ کہہ رہی ہے کہ وہ دائرۂ اسلام میں آنا چاہتی ہے...... مجھے مسلمان کرنے کے انتظامات کیے جائیں......''

''کیا کہا راجکماری صاحبہ......پھر سے کہنا......'' گل بانو رامنی کی بات سن کر اس قدر خوش ہوئی تھی کہ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

''گل بانو...... میں نے ایسی زبان تو استعمال نہیں کی جس کی تمہیں سمجھ نہ آسکے...... تم چاہو تو اس کا ڈھنڈورا پیٹ دو کہ رامنی مسلمان ہورہی ہے......'' رامنی نے دوبارہ وضاحت سے کہا۔

''راجکماری! یہ خوشی تو مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی۔میں ابھی جاتی ہوں۔''

شہزادے نے فوراً اس کا انتظام کر ڈالا۔عالم پناہ اورنگ زیب عالمگیر کو اس کا پتا چلا تو انہوں نے محل سرا میں ایک چھوٹا سا جشن بپا کرنے کا اعلان کردیا۔شہزادہ اسے مسلمان کرنے کے لیے ایک مولانا صاحب کو ساتھ لے کر اس کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔

آج پہلی بار شہزادہ اعظم مولانا کے ساتھ اس کے کمرے میں آیا تو رامنی کی خوشی دیدنی تھی۔گل بانو بھی ان کے ہمراہ تھی، پھر رامنی اسی روز مسلمان ہوگئی۔اس کا اسلامی نام رحمت بانو رکھا گیا۔

اب وہ رامنی کے بجائے رحمت بانو بن چکی تھی۔رحمت بانو بن کر اسے یوں لگا جیسے اس کی کایا کلپ ہوگئی ہو۔نیا روپ دھار کر اسے جتنا مزہ آیا پوری زندگی اسے اتنا سرور نہ آیا تھا۔اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے اس کی اصل زندگی ابھی شروع ہوئی ہے۔شہزادہ اعظم اس خوشی میں شریک ہونے کے لیے اس کے کمرے میں آیا ضرور......ابھی اس کی آنکھوں کی تشنگی ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ وہ واپس چلا گیا۔گل بانو ابھی تک اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔جب ذرا رش ختم ہوا تو رامنی نے بڑی اداسی سے کہا۔

''گل بانو......کیا شہزادہ عالی وقار کو ہمارا اسلام قبول کرنا اچھا نہیں لگا؟''

''یہ آپ کو کس نے کہا؟ وہ تو بے حد خوش ہیں۔اسی لیے تو وہ خود چل کر آپ کے پاس پہنچے تھے۔وہ کبھی کسی کے کمرے میں نہیں جاتے۔اس محل سرائے میں آپ کے علاوہ اور بھی بہت سی شہزادیاں اور کنیزیں موجود ہیں مگر شہزادگان انہیں اہمیت نہیں دیتے۔آپ تو خوش قسمت ہیں۔'' گل بانو نے رکتے رکتے بتایا۔

''کیا تھا...... اگر وہ کچھ دیر ہمارے پاس بھی رک جاتے۔'' رامنی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''اصل میں شاید میں آپ کے گوش گزار نہیں کر پائی کہ آپ کو شہزادے کے ساتھ پیار کی باتیں کرتے ہوئے کسی کنیز نے دیکھ کر بڑی بیگم صاحبہ کے حضور آپ کی شکایت کردی تھی جس پر انہوں نے شہزادے کی سرزنش کرتے ہوئے اسے محل سرا میں آنے سے منع کردیا ہے......'' گل بانو نے بتایا۔

''اوہ...... میں تو سمجھی تھی کہ وہ حکومتی کاموں میں الجھے ہوئے ہیں تبھی ادھر نہیں آتے۔مجھے تو اس بات کا علم ہی نہ تھا۔اب کیا ہوگا......؟'' رامنی نے مایوسی سے پوچھا۔

''آپ فکر کیوں کرتی ہیں راجکماری صاحبہ...... میں ہوں نا...... آپ نے جو بات ان سے کرنی ہو مجھے بتادیا کریں۔میں ان تک پہنچا کر اس کا جواب آپ کو لادیا کروں گی۔'' گل بانو نے جواب دیا۔

گل بانو کی بات سن کر رحمت بانو کو بہت مایوسی ہوئی۔

اس رات کو جب وہ اپنے بستر پر لیٹی تو ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اس دنیا میں اکیلی ہے...... بالکل تنہا......اس کی سوچیں اسے راہ سے بھٹکا رہی تھیں۔

کیا فائدہ ہوا رامنی...... تمہیں اپنا مذہب چھوڑ کر کیا ملا......جس کی چاہت میں تم نے یہ کیا تھا۔اسے بھی تم سے چھین لیا گیا...... اسے اپنے اس ادھورے پن سے نفرت ہونے لگی تھی اور وہ سوچنے لگی تھی کہ کیا......اب وہ ہمیشہ کے لیے شہزادہ اعظم کی دید سے محروم کردی گئی ہے؟ کیا اب وہ محل سرا میں نہیں آیا کرے گا؟ یہ سوچ کر ہی اس کا دل ڈوبنے لگا۔وہ انجانے پن سے اٹھی اور کرشن مہاراج کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہونے لگی تو جیسے اس کے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا۔

''رامنی...... تم یہ کیا کررہی ہو......تم تو اب مسلمان ہوچکی ہو۔تم اب رامنی گبھارو نہیں...... رحمت بانو ہے...... پتھر کی اس مورتی سے تم کیا مانگ رہی ہو...... اگر مانگنا ہی ہے تو اپنے رب سے مانگو...... جواب تمہارا بھی رب ہے......'' یہ سوچ کر اس نے اونچی جگہ پر رکھی کرشن مہاراج کی مورتی کو اٹھا کر چھپادیا۔

''کرتی ہوں تمہارا بھی بندوبست......'' وہ بڑبڑائی...... ''اگر شہزادہ اعظم میرا نہیں رہا......تو......تم بھی نہیں رہوگی۔'' اسے لگا ایک انجانی سی روشنی نے اس کی سوچوں کو نہلا دیا ہو......وہ ان سوچوں سے جان چھڑانے کی بابت سوچنے لگی۔

اگلے روز گل بانو اس کے کمرے میں حسبِ معمول آئی تو رحمت بانو...... خاموشی سے کمرے میں بیٹھی تھی۔اس نے آتے ہی پہلی خبر تو یہ دی...... کہ بڑی بیگم صاحبہ شہزادہ اعظم کی شادی اس کے تایا کی بیٹی دل پذیر بانو سے کرنا چاہتی ہے۔

''کیسی ہے وہ......تم نے دیکھا ہے اسے......؟'' رحمت بانو کے منہ سے اچانک نکلا۔

''بہت خوب صورت اور سندر ہے۔شہنشاہ عالی مرتبت اورنگ زیب بھی اسے بے حد عزیز رکھتے ہیں۔سنا ہے کہ اس کی والدہ اس کے پیدا ہوتے ہی مرگئی تھی۔جس وقت اس کی پیدائش ہوئی، اس کا والد شہزادہ شجاع برہان پور میں دشمنوں سے نبرد آزما تھا۔بن ماں کی بچی کو ہر کوئی پیار کرتا ہے اور وہ خاندان بھر کے اس لاڈ پیار میں پل کر جوان ہوئی ہے۔خاندان بھر کو یہ بچی اس لیے بھی پیاری ہے کہ اس کا نام اس کے جدامجد حضرت ابوظفر شہاب الدین شاہ جہاں نے رکھا تھا۔انہوں نے خصوصی طور پر اسے اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا تھا کہ آج سے یہ ہماری بیٹی ہے۔اس لیے ہر کوئی اسے بے حد پیار سے رکھے۔بعدازاں انہوں نے اپنی بیگم کی جھولی میں ڈالتے ہوئے بھی یہی تاکید کی تھی۔دل پذیر بانو خوب صورتی میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی ذہین و فطین لڑکی ہے۔''

گل بانو کی زبان سے شہزادہ اعظم کے تایا کی بیٹی کی اس قدر تعریف سن کر وہ مارے حسد کے مایوسیوں کی پاتال میں گرگئی اور وہ سوچنے لگی جہاں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت کنواری دوشیزائیں موجود ہوں، وہاں وہ کس حیثیت میں یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ شہزادے کی پسندیدگی کے معیار پر وہ بھی پوری اتر پائے گی۔بنگالی یا آسامی حسن کا جادو تو خود اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔جہاں بڑی عورتوں سے لے کر دوشیزگان اپنے حسن کی چکاچوند سے دلوں کو مسخر کرنے کے سارے ہنر سے آشنا بھی ہوں۔جاری رحمت

بانو...... کیوں اس قدر ٹھنڈے نصیب لے کر تو اس دنیا میں آئی۔ آخری بات سوچتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کے دل سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ گل بانو بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ ”راجکماری صاحبہ کو لگتا ہے کہ شہزادہ محمد اعظم کی بے وفائی کا دکھ اندر ہی اندر سے چاٹنے لگا ہے۔ جو یوں ہر وقت بجھی بجھی سی رہنے لگی ہیں۔“ گل بانو نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں گل بانو...... مجھے دکھ کیوں ہوگا۔ میں اب ایسی باتوں کو دل میں نہیں پالتی۔ جب سے میں نے تمہارے دین کا پلو پکڑا ہے یقین کرو، میری آتما کو بے حد سکون ملا ہے۔ جب ذرا پریشانی ہوتی ہے تو میں قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگتی ہوں اور مجھے اس سے بڑھ کر سکون مل جاتا ہے۔“ رحمت بانو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”نہیں راجکماری صاحبہ! دکھ اور خوشی کوئی چھپانے والی چیز نہیں ہوتی۔ کوئی انہیں لاکھ چھپائے مگر اس کے تاثرات چہرہ عیاں کر دیتا ہے۔ محبت میں ایسا ہوتا ہے مگر آپ گھبرائیں نہ...... آپ کی محبت سچی ہے۔ آپ کی چاہت میں خلوص ہے تو میرا رب آپ کی مدد ضرور کرے گا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو گل بانو...... جب ایک آدمی اپنی تمام چاہتیں اور ساری محبتیں ایک شخص پر قربان کر دے اور اس کی طرف سے بے وفائی کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھنے کو ملے تو دل ٹوٹ جاتا ہے اور آپوں آپ مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ اب پتا نہیں شہزادہ عالم کے من میں کیا ہو مگر میرا دل تو پارہ پارہ ہو گیا ہے کبھی کبھی مجھے اپنے ہونے پر بھی افسوس ہوتا ہے۔“

”ابھی کچھ روز پہلے تو شہزادہ عالم محل میں تشریف لائے تھے۔ کیا اس کی خبر آپ کو نہیں ہوئی تھی......“ یہ ایک اور چرکا تھا۔ رحمت بانو کے لیے......

”تو کیا اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ ان کے محل میں آنے جانے کی بھی خبر نہیں ہوتی۔“ رحمت بانو نے سوچا اور پھر اس کے منہ سے نکلا۔

”کون ہمدرد ہے یہاں میرا...... کون مجھے بتائے گا۔ ایک تمہارا آسرا ہے مگر تم بھی اب گاہے گاہے آنے لگی ہو۔ کھانا کبھی کسی کے ہاتھ اور کبھی کسی کے ہاتھ مجھ تک پہنچ تو جاتا ہے اور کسی قسم کی تکلیف بھی مجھے نہیں...... مگر دل کا دکھ میں کس سے کہوں......“ یہ کہتے ہوئے رحمت بانو کی آنکھیں بھیگ گئیں، قریب تھا وہ چھلک پڑتیں۔ گل بانو نے فوراً ان بھیگی آنکھوں کا پانی اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لیا۔

”راجکماری صاحبہ! اب آپ جس مذہب میں داخل ہو چکی ہیں، وہاں مایوسی گناہ ہے۔ آپ بھی میرے رب پر بھروسا رکھیے۔ وہ یقیناً بہتر کرے گا۔“ گل بانو نے اس کی آس بندھائی۔

مگر جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے نہ چاہتے ہوئے بھی رحمت بانو کے من میں وسوسوں کے جالے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسے میں ایک موہوم سی امید تھی تو وہ شہزادہ محمد اعظم کے وہ محبت بھرے الفاظ اور پیار سے لبریز الفاظ تھے جو اس کی آس اور امیدوں کو سہارا دیے ہوئے تھے۔

1667ء کا زمانہ آ گیا تھا۔ رحمت بانو کو اس محل میں آئے ہوئے پورے پانچ سال ہو چکے تھے۔ ان گزرے پانچ سالوں کا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ایک ایک بات یاد تھی اسے...... ان ساعتوں کی بیتی باتیں اسے دن بدن مایوسی کی پاتال میں کھینچے لے جا رہی تھیں۔ اسے وہ وقت بھی یاد آتا تھا جب پہلے پہل اس کے کانوں میں کنیزوں اور باندیوں کے وہ چونچلے...... اور وہ باتیں پڑتی تھیں جو وہ شہزادگان کے ساتھ کرتی تھیں اور ان ہی باتوں کو سن سن کر...... ان کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر اس کے من میں بھی شہزادے سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا تھا اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب وہ گل بانو سے منتیں کر کے ان باتوں کو سنا کرتی تھی اور اس کے ترلے کرتی کہ وہ شہزادے کے آگے اس کے دل کا حال رکھ کر اس کی آمادگی پر اسے مجبور کر دے پھر ایک دن ایسا بھی آیا۔ جب وہ خود شہزادے کے آمنے سامنے ہو کر اپنے دل کا حال اس پر آشکار کرنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ محبت بھری باتیں...... چاہتوں کی گھاتیں...... یہ سارے مناظر اس کی آنکھوں نے پتا نہیں کیسے سنبھال رکھے تھے۔

اسے تو وہ دن بھی یاد تھا جب شہزادے کے ایما پر اس نے اپنا دین چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور جس پر اس کے والدین، اس کی سکھیاں سہیلیاں اب بھی قائم دائم تھیں۔ یہ محض شہزادے کے حصول میں کیا تھا اس نے...... اور اب یہ وقت آ گیا تھا کہ وہ شہزادے کی قربت حاصل کرنا چاہتی تھی مگر شہزادے کو اس کی دسترس سے دور کر دیا گیا...... کہیں پہلے کی طرح اس کا وہ خواب بھی تو پورا نہیں ہو رہا جس میں اس نے دیکھا تھا کہ شہنشاہ عالم شہزادے کو کھینچ کر اس سے دور لے جا رہے ہیں اور وہ بے بسی کے عالم میں رو رہی ہے، تڑپ

رہی ہے...... اور التجائیں کر رہی ہے کہ شہزادے کو اس سے دور نہ کیا جائے۔ ورنہ وہ مر جائے گی...... مگر ہوتا وہی ہے، جو...... اب وہ دیکھ رہی ہے۔ شہزادہ اب اس کی دسترس سے دور ہو چکا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ بے دم سی ہو کر رہ جاتی۔ دل پذیر...... واقعی اس سے زیادہ خوب صورت ہے اور یہ زمانے کا اصول ہے کہ جو چیز جتنی طاقتور ہوگی زمانے کی چاہتوں کے علاوہ ہر چیز اسی کے پلڑے میں یا تو ڈال دی جاتی ہے یا خود بخود اس میں گر جاتی ہے۔ بلاشبہ وہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہوگی۔ تبھی تو شہزادہ اعظم کی تمام چاہتیں اس پر نچھاور ہونے لگی ہیں اور وہ اس سانولی...... سلونی رنگت کی طرف اب کیونکر نظریں کرے گا۔ حسن و جوانی کسی کو بھی...... کسی وقت بھی راستے سے بھٹکا سکتی ہے...... یہ اس کی سوچوں کا وہ گرداب تھا جس میں پھنسی وہ پانی کی تہوں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ جب سے گل بانو نے اسے بتایا تھا کہ شہزادہ محمد اعظم کئی بار محل میں آیا ہے اور اس سے کنی کترا کر واپس چلا گیا ہے۔ اس رویے نے رحمت بانو کو اور بھی مایوس کر دیا تھا۔ کئی بار تو وہ جھنجلا کر یہ تہیہ کر لیتی کہ اسے بھی اب شہزادے کا سا رویہ اختیار کر لینا ہوگا۔

مگر اسے اپنے دل پر اختیار رہا ہی کب تھا۔ اس کا دل بھی اس کی گرفت سے نکل کر من مانی کرنے لگا تھا۔ اس روز وہ حسب عادت قرآن کی تلاوت میں مشغول تھی جب اس کے کانوں میں پہلے کی طرح کی آوازیں پڑنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے شہزادگان میں سے کوئی شہزادہ محل سرا میں آنے والا ہو۔ اس نے قرآن کریم کو بند کیا اور اسے اونچی جگہ رکھ کر پلٹی ہی تھی کہ گل بانو بھاگتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

رحمت بانو نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ”کیا بات ہے گل بانو...... کیوں بوکھلائی پھر رہی ہو؟“

”راجکماری صاحبہ...... وہ...... وہ شہزادہ عالی مقام تشریف لا رہے ہیں۔“

”تو پھر میں کیا کروں......“ رحمت بانو نے مایوسی اور بے اعتنائی سے جواب دیا۔

”آپ ایک بار ان سے مل تو لیں......“ گل بانو نے سادگی سے کہا۔

”چھوڑو گل بانو...... انسان کو اپنی حیثیت اور اس کے دائرے میں رہنا چاہیے۔ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر ہاتھ بڑھانے سے چھت نیچے نہیں آیا کرتی۔“ رحمت بانو تو مایوسیوں کی پاتال سے کہیں بول رہی تھی۔

”پھر بھی آپ ان سے مل کر یہ تو پوچھ سکتی ہیں کہ آپ کو انہوں نے انتظار کی کس سولی پر چڑھا رکھا ہے۔“ گل بانو نے دلیل دی۔

”بے سود کوشش کرنے کا فائدہ......“ وہ پھر اسی لہجے میں بولی۔

”راجکماری صاحبہ! آپ سمجھدار ہیں۔ ذہین اور پڑھی لکھی ہیں۔ کوشش چھوڑنا بھی تو بے وقوفی ہے۔ آپ اپنی کوشش تو جاری رکھیں اور اس کے نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ بہتر صلہ دینے والا ہے۔“ گل بانو نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے گل بانو...... یہ دل بے صبرا ہوا جاتا ہے۔ تو ٹھیک کہتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے کے دروازے کے پاس آ کھڑی ہوئی جو راہداری میں کھلتا تھا۔ وہ راہداری جو اس کی محبت اور چاہت کی گواہ بھی تھی۔ شہزادہ محمد اعظم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اسی سمت آ رہا تھا۔ جب وہ اس کے قریب سے گزرنے لگا تو رحمت بانو نے دروازے کو جھٹ سے کھول دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی زبان سے نکلا۔

”صاحب عالم...... کیا بات ہے، آج چپ چاپ یوں قریب سے گزر رہے ہیں۔ نصیب دشمناں طبیعت تو ٹھیک ہے......“

”ہاں ذرا جلدی میں ہوں۔ بڑی بیگم صاحبہ کے پاس جا رہا تھا۔“ شہزادے نے جواب دیا۔

”میں بھی والا شان کا وقت ضائع نہیں کروں گی۔ میں نے صرف اتنا بتانا تھا کہ میں مسلمان ہو گئی ہوں اور الحمدللہ قرآن بھی پڑھ رہی ہوں......“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی تو آگے سے جواب ملا۔

”ہاں رحمت بانو...... ہمارے علم میں ہے......“ جواب پھر مختصر تھا۔

”ذرا پھر سے میرا نام دہرائیے...... آپ کے لبوں سے نکلا میرا نام مجھے بے حد اچھا لگا ہے۔“

”رحمت بانو...... اس بار جشن میں آپ کو سب شہزادیوں سے بڑھ کر انعام مل بھی تو رہا ہے......“ شہزادے نے آہستہ آہستہ بتایا۔ ”اور آپ کے رتبے میں بھی اضافہ کیا جا رہا ہے۔“ شہزادے نے مزید کہا۔

”آپ کا ارشاد بجا...... مگر میرے رتبے میں اضافہ تو آپ کی نظر کرم سے ہوگا۔ یہ بات تو آپ کے بھی علم میں ہوگی۔ میری کیا مجال کہ میں آپ کو بتاؤں...... آپ کو پتا ہے، پیار کرنے والوں کے دل کس قدر حساس ہوتے ہیں۔

انہیں جدائی کا ایک ایک لمحہ کانٹوں کی طرح چبھتا ہے۔ روح کو زخم زخم کر دیتے ہیں یہ لمحات...... اور مجھ ایسی بدنصیب کے محسوسات...... تو اس سے بھی سوا ہیں کہ میں ایک پر کٹے پرندے کی طرح بے بسی سے محل کے اس کمرے میں پڑی ہوں جہاں کوئی نہ تو میرا ہمدرد ہے اور نہ ہی کوئی والی وارث...... اللہ کے لیے اس ناتواں جان پر کچھ رحم کیجیے گا۔'' یہ کہتے ہوئے رحمت بانو کی آواز رندھ گئی۔

''نہیں...... نہیں راجکماری...... وہ بات ہرگز نہیں ہے جو تم سوچ رہی ہو...... اور جو تمہارے لیے باعثِ آزار ہے......'' وہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ رحمت بانو نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''راجکماری نہیں...... صرف رحمت بانو کہیے...... تاکہ میرے دل کو حوصلہ رہے اور طمانیت ملتی رہے۔''

شہزادہ بولا۔ ''وسوسے تمہاری راہ سے تمہیں بھٹکا رہے ہیں۔ حوصلہ رکھو...... اللہ بہتر کرے گا۔ لو اب اجازت...... مجھے اس وقت جلدی ہے فرصت ملی تو تمہیں سب بتا دوں گا۔ ویسے بھی تمہیں حکومتوں کے کاموں کا علم ہی ہے...... ہر وقت نئی مہمیں...... نئی جنگیں...... اب دیکھو یوسف زئی افغانوں نے شورشیں شروع کر رکھی ہیں۔ ان کی سرکوبی بھی ضروری ہے۔ ادھر شہنشاہ عالم پناہ کو کسی پر اعتبار بھی نہیں۔ میں ایسے ہی کاموں میں مصروف رہتا ہوں۔ وقت ہی نہیں ملتا۔ اس لیے ادھر بھی کم کم آیا ہوں...... اچھا...... اب میں چلتا ہوں۔''

شہزادہ اعظم سے بات کر کے...... رحمت بانو کو گویا سکون مل گیا تھا۔ دل کے وسوسے اپنی موت آپ مر چکے تھے۔ اب اس کے دل سے شہزادے کی کامیابی کے لیے دعائیں نکلنے لگی تھیں۔ وہ جب دوبارہ کمرے میں مڑی تو گل بانو جا چکی تھی۔ وہ خوشی میں سرشار اپنے بستر پر آ گری۔ اس کا دل ایک بار پھر سے خوشی میں بلا ارادہ دھڑکنے لگا تھا۔ کس قدر بے صبری اور جلدی کی ماری ہے رحمت بانو...... کتنے وسوسے من میں پال رہی تھی۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔

شوال کی آٹھ تاریخ کو جشن منانے کا اعلان کیا گیا۔ یہ رامنی کے لیے پہلا موقع تھا کہ وہ دہلی کی راجدھانی میں منایا جانے والا جشن اپنی آنکھوں سے دیکھنے والی تھی۔

گل بانو بتا رہی تھی کہ اس جشن میں ہاتھیوں کی لڑائی بھی ہوگی۔ رنگ برنگے پکوانوں کی دکانیں ہوں گی۔ اس کے علاوہ سستی اشیا کی خریداری کے علاوہ رعایا کے لیے ایک خصوصی دن بھی ہوگا۔ اس جشن میں شہزادے، شہزادیاں اور رانیاں بغیر پردے کے پہلی بار شامل ہوں گی۔ رحمت بانو کو ایسی باتیں بتا بتا کر گل بانو اس کا اشتیاق بڑھا رہی تھی۔ تبھی وہ اس جشن کو دیکھنے میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔

شہزادہ اعظم سے ملاقات کو ابھی زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ایک روز گل بانو پھر اسی طرف ہڑبڑائی ہوئی اس کے کمرے میں آئی...... تو رحمت بانو اس سے غصے میں مخاطب ہوئی۔

''گل بانو...... کیوں اس قدر تیزی سے آ کر میرا دل دہلا دیتی ہو......''

''میری عادت بن گئی ہے ایسے جلدی میں آنے کی...... اور ہاں وہ تو میں بھول ہی گئی۔ راجکماری صاحبہ! آپ کو بڑی بیگم صاحبہ نے یاد فرمایا ہے......'' اس نے تیزی سے کہا تو رحمت بانو ڈرتے ہوئے بولی۔

''خیریت......؟''

''یہ تو مجھے پتا نہیں......'' گل بانو نے جواب دیا۔

وہ جب سے اس محل سرا میں آئی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ بڑی بیگم صاحبہ نے اسے اپنے حضور یوں طلب کیا تھا...... ''پھر بھی کچھ تو تمہیں بھی علم ہوگا۔'' رحمت بانو نے دوبارہ پوچھا۔

''کچھ نہیں کہہ سکتی...... آپ چل کر دیکھ لیجیے گا۔''

پھر رحمت بانو ڈرتے ڈرتے بڑی بیگم صاحبہ کے حضور پہنچ گئی۔

روشن رائے کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سجے سجائے محل کے اس کمرائے خاص میں جہاں خوب صورت فانوس اور دیوار سے دیوار تک بڑے خوب صورت اور دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ وہ یہ کمرائے خاص دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ دیواروں پر سنگ سرخ سے آرائشی محرابیں بنائی گئی تھیں۔ کمرے کے دائیں جانب سے بادشاہ اس کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ کمرے میں بنی ہوئی کارنس پر لکڑی کے بنے ہوئے ہاتھیوں کے مجسمے رکھے تھے۔ جن پر چاندی کے پتر چڑھائے گئے تھے۔ بالکونی کی اطراف پر ریشمی اور سلک کے پردے پڑے ہوئے تھے اور اس میں گرز بردار چاق و چوبند ملازمین ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چل رہے تھے۔ اس کمرے میں........ اعلیٰ عہدیدار اور منصب داروں کی بیگمات آتی تھیں۔ کمرے کے عین وسط میں بڑی بیگم صاحبہ ایک عالیشان کرسی پر براجمان تھی۔

بڑی بڑی موٹی آنکھیں ملے جلے سیاہ اور سفید بال جن میں سفیدی زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ اپنی عمر کے اس حصے میں بھی بڑی بارعب اور مدبر شخصیت نظر آ رہی تھی۔

گل بانو...... رحمت بانو کو لے کر ان کے حضور پیش ہوئی تو اس نے درباری انداز میں سر جھکا کر ہاتھ کو ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے سلام کیا۔ رحمت بانو نے بھی اسی انداز میں سلام کیا۔ سلام کے بعد گل بانو پچھلے پاؤں واپس چلی گئی۔ اب اس کمرائے خاص میں رحمت بانو اور بڑی بیگم صاحبہ رہ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد بڑی بیگم صاحبہ نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

''لڑکی...... کہاں سے ہو......؟''

''میں...... جی میں آسام کے راجا جے دھواج سنگھا کام روپ کی بیٹی رامنی گیھارو کے نام سے یہاں لائی گئی تھی۔'' رحمت بانو نے آہستگی سے جواب دیا۔

''کیا مطلب...... لائی گئی تھی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''جی...... پچھلے کچھ عرصے سے میں اپنے مذہب سے بدگمان ہو کر مسلمان ہو چکی ہوں اور مجھے نیا نام رحمت بانو کا دیا گیا ہے۔'' رحمت بانو نے ڈرے لہجے میں بتایا۔

''ہوں...... یہ آسام...... بنگال ہی کا حصہ ہے نا......؟'' وہ بارعب لہجے میں گویا ہوئی۔

''جی...... جی وہی......''

''کیا تمہارے والدین نے تمہاری یہی تربیت کی ہے...... کہ شہزادوں پر اپنے جادو کی کمندیں ڈالتی رہو۔'' بیگم صاحبہ اب براہ راست چبھتے ہوئے لہجے میں بات کرنے لگی تھیں۔

''کسی بھی اولاد کے والدین اپنے بچوں کو اس طرح کی تربیت نہیں دیتے۔'' اس نے گلا خشک ہونے کے باوجود بڑی جرات سے جواب دیا۔

''بنگال وہی ہے نا...... جہاں کا جادو بڑا مشہور ہے۔'' وہ پھر بولیں۔

''یہ وہاں کے باشندوں پر بہتان ہے۔ وہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' رحمت بانو آہستہ آہستہ کھلنے لگی تھی۔

''پھر تم نے ہمارے بیٹے پر ایسا کونسا جادو کر ڈالا ہے...... جو وہ تمہاری محبت کا دم بھرنے لگا ہے...... کبھی تم نے شیشے میں اپنے وجود اور رنگ روپ کو دیکھا ہے۔ یا تم...... شہزادہ اعظم سے منسوب ہونے والی شہزادی سے ملی ہو...... اسے کبھی دیکھا ہے......؟'' اس کی آواز میں گھن گرج بڑھتی جا رہی تھی۔

''کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا......'' رحمت بانو نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔

''تو پھر سنو لڑکی...... ہماری نسل اور تمہاری نسل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آسمان کو دور سے دیکھو تو وہ دھرتی کے ساتھ ملا ہوا نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہ واہمہ نظر ہوتا ہے۔ ہم نے شہزادے کو اس کی تایا زاد سے منسوب کر رکھا ہے مگر تم نے ان کے راستے میں اپنی چاہت اور اپنی محبت کا فسوں بکھیر کر اسے اصل راستے سے بھٹکا دیا ہے۔ ہم تو کیا...... خاندان کا کوئی فرد بھی یہ نہیں چاہے گا کہ ان کی چہیتی پیاری اور خوب صورت لڑکی کے حق پر کوئی یوں دن دہاڑے ڈاکا ڈالے...... میرے خیال میں تم میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوگی۔''

''جی بیگم صاحبہ...... مگر میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی......'' رحمت بانو نے آہستگی سے جواب دیا۔

''حرکت نہیں...... جرأت کی ہے...... اور شاید تمہیں علم نہ ہو کہ اس جرأت کو عرفِ عام میں بغاوت کہا جاتا ہے۔ تم نے راجدھانی اور محل سرائے کے اصولوں کو توڑا ہے۔ اس کی سزا تمہاری سوچوں سے بھی زیادہ بھیانک ہو سکتی ہے۔ بس یہی تمہیں سمجھانے کے لیے بلایا تھا کہ ابھی سے اپنی راہوں کو استوار کر لو...... ہمارے لیے مزید الجھنوں کا سبب نہ بننے میں ہی تمہاری عافیت ہے...... اب تم جا سکتی ہو۔''

رحمت بانو کو اپنی اتنی تذلیل برداشت نہ ہو پا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کمرے کو پھلانگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر گئی...... ابھی وہ بستر پر گری ہی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ دوبارہ سے بجا...... رحمت بانو نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ دروازے پر ایک بار پھر ہلکی سی دستک ہوئی پھر کسی نے ہلکے سے دباؤ سے دروازہ کھول لیا اور اندر داخل ہو گیا۔ یہ پتام کی راجکماری تھی...... جس کے ساتھ ہی گل بانو بھی اندر آ گئی تھی...... رحمت بانو کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر دونوں یکبارگی بولیں۔

''خیریت تو ہے راجکماری صاحبہ...... کیا کوئی سانحہ ہوا ہے، جو یوں آنکھیں چھلک اٹھی ہیں؟''

☆☆☆

ذیقعد کی پچیس تاریخ کو جشن وزن قمری شروع ہوا جس میں شہزادہ اعظم کو پچاس ہزاری پیدل اور سات ہزاری سوار کا منصب عطا ہوا۔ دوسری شہزادیوں کے ساتھ رحمت بانو کو بھی انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ انہی دنوں رحمت بانو کو یہ اطلاع ملی کہ بنگال کے کچھ شورش پسند عناصر نے آسام پر

حملہ کر دیا ہے اور آسام کے صدر مقام گواہٹی پر قبضہ کر کے اس کے والد کام روپ کی عمل داری کا خاتمہ کر دیا ہے۔

رحمت بانو کو یہ سن کر بے حد افسوس ہوا۔ اسے وہ وقت یاد آ گیا جب وہ آسام میں تھی۔ اس سے حالات بھی اس قدر بگڑے ہوئے نہ تھے۔ پھر اسے وہ وقت بھی یاد آ گیا جب اس کے والدین نے اپنی جنگ ہار کر دلی کے تاجدار کے آگے ہتھیار ڈالے اور ان کی شرائط پر دو لڑکیوں کی بلی چڑھا دی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ پھر وہ ان کی خبر بھی لیتے مگر وہ تو انہیں بالکل بھول گئے تھے۔ ایسے جیسے وہ ایک بھاری بوجھ تھا جو ان کے سر سے اتر گیا ہو...... کتنا عرصہ وہ ان کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ انہیں یاد کر کے روتی رہی مگر شاید وہ بھول گئے تھے کہ ضمانت کی مد میں دوسرے حکمرانوں کو دی گئی ان کی بیٹیاں تھیں۔ تب ان کی بے حسی کو دیکھ کر وہ بھی انہیں بھول گئی...... پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ اپنے جھوٹے مذہب سے بھی اکتا گئی یا پھر کسی کے پیار میں ڈوب کر اپنے دین کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئی۔ بنگال کی یورش کا سن کر وہ ایک بار پھر سے اپنے والدین کی یادوں میں ڈوب گئی۔ وہاں آسام میں جو تقریبات، تہوار اور تفریحات منائی جاتی تھیں، وہ یکسر طور پر سلطنت دہلی کے دربار میں منائی جانے والی تقریبات سے مختلف تھیں۔ رحمت بانو کے لیے یہ تقریبات اور یہاں کے تہوار یکسر مختلف تھے۔ دربار کی تمام تقریبات بڑے اہتمام سے منائی جاتی تھیں۔ اسے لگا جیسے ان تقریبات کے پس منظر میں نظریہ ٔ بادشاہت کارفرما ہو۔ کیونکہ ان کے ذریعے بادشاہ کو اس بات کا موقع ملتا تھا کہ وہ اپنی شان و شوکت اور عظمت کی قوت و ہیبت کی دھاک عوام پر بٹھائے۔ اس لیے یہ انتہائی ضروری خیال کی جاتی تھیں۔

رحمت بانو نے دیکھا کہ دربار کی ان تقریبات کے اصول وضوابط بھی مقرر تھے جن پر بادشاہ اور درباری پابندی سے عمل کرتے تھے۔ ان سے بادشاہ کو اس بات کا موقع ملتا تھا کہ وہ اپنی شخصیت کو مزید اجاگر کرے۔ اگرچہ رحمت بانو کو ایسی تقریبات سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ وہ تو بنگال میں ہونے والی یورش کی وجہ سے مایوس اور پریشان تھی۔ دوسری پریشانی اسے شہزادہ اعظم کی کج روی سے تھی۔ اس کے دل پر وسوسوں نے مکمل طور پر ڈیرا جما لیا تھا اور اس کی امیدیں دم توڑنے لگی تھیں۔ دربار کی یہ تقریبات گل بانو کے کہنے کے مطابق پورے سات روز کے لیے تھیں۔ ایک روز گل بانو نے گلہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''راجکماری صاحبہ...... کیا وجہ ہے کہ آپ ہر وقت کمرے میں مقید رہتی ہیں۔ کیا آپ کو یہ ہنگامے پسند نہیں ہیں یا پھر آپ کا من ان میں شمولیت سے آپ کو روک رہا ہے؟''

''گل بانو...... ایک بات بتاؤں گی؟'' رحمت بانو نے مایوسی سے پوچھا۔

''پوچھیں......'' گل بانو نے جواب دیا۔

''کبھی تم نے پانی پر تیرتی کاغذ کی کشتی دیکھی ہے؟ جب میں چھوٹی تھی تو اپنی ہم جولیوں اور سکھیوں کے سنگ دریا کنارے کھیلنے جاتی تو کاغذ کی کشتیاں بنا کر ساتھ لے جاتی اور انہیں دریا میں چھوڑ دیتی۔ کچھ دیر میں پانی کی تیز چھل سے یا تو وہ الٹ جاتیں یا پھر تھوڑی دور تک جا کے ڈوب جاتیں۔ جب ہم ہاتھ بڑھا کر انہیں سیدھ میں کرتے تو گیلا کاغذ فوراً پھٹ جاتا۔ آج میرا من بھی محبت کے دریا میں گیلے کاغذ کی اس ڈوبتی تیرتی کشتی کی طرح ہے جس کو پکڑنے کی کوشش بھی کریں تو سوائے چیتھڑوں کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اب تو کنیزیں اور باندیاں جب کسی بات پر ہنستے ہوئے محل کی راہداری سے گزرتی ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھ پر طنز کرتے ہوئے جا رہی ہوں۔'' رحمت بانو نے گویا اپنے من کو اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

''راجکماری صاحبہ! ایسا ہوتا ہے، پیار میں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ چھن جانے کا خوف رہتا ہے یا چھین لیے جانے کا خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا ہے پھر آپ کو تو پتا ہے کہ بڑے لوگوں کے رویوں اور موسموں کے بدلنے میں دیر ہی کہاں لگتی ہے۔ اڑتے بھاگتے لمحے تو اڑنچھو ہو کے ہاتھ سے نکلتے جاتے ہیں لیکن میں ایک بات جانتی ہوں۔ شہزادہ اعظم اپنی دھن اور لگن کے پکے ہیں۔ انہوں نے اگر آپ سے پریت سنبھالنے کا وعدہ کیا ہے تو وہ آپ کو بیچ منجدھار نہیں چھوڑیں گے۔ آپ اٹھیے اور محل سرا میں ہونے والی تقریبات سے لطف اندوز ہوئیے۔ دیکھیں تو سہی محل سرا میں جشن منانے کی تیاریاں کتنا زور پکڑ رہی ہیں۔ ہر طرف ایک ہلچل مچ رہی ہے۔ جدائی اور وچھوڑے کی ان عارضی ساعتوں کو اپنی جان کا روگ نہ بنائیں۔ باہر نکلیے اور لطف اٹھائیے۔ آئیں، میں آپ کو لے کر چلتی ہوں۔ آج جشن وزن یا تولدان کی تقریب ہونے والی ہے۔''

''یہ جشن وزن کیا بلا ہے۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ......''

رحمت بانو نے گل بانو سے استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

''راجکماری صاحبہ! شہنشاہ عالم کے خاندان میں دو مرتبہ اپنی شمسی وقمری سالگرہ کے موقعوں پر یہ جشن منائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر بادشاہ قیمتی اور بیش بہا اشیا کے

ساتھ اناج میں تلا کرتا ہے اور پھر یہ چیزیں سال بھر غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں......'' گل بانو نے بتایا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھی......'' رحمت بانو نے حیرانی سے پوچھا۔

''شمسی سالگرہ کے موقع پر بادشاہ کو ایک بڑے سے ترازو میں بارہ قسم کی اشیا میں تولا جاتا ہے۔ ان چیزوں میں سونا، پارہ، ریشمی کپڑا، خوشبوئیں، تانبا، روح توتیہ، مسالا، گھی اور چاول، دودھ، سات قسم کے اناج اور نمک کے علاوہ بادشاہ کی عمر کے حساب سے اتنی تعداد میں بھیڑ، بکریاں، پرندے غریبوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ پرندوں کو قید سے آزاد کیا جاتا ہے اور قمری سال کے موقع پر بادشاہ آٹھ چیزوں میں تولا جاتا ہے جن میں چاندی، کپڑا، سیسہ، ٹن، پھل، مٹھائی، ترکاریوں اور سرسوں کا تیل شامل ہوتا ہے۔ ایک اور بات...... جس ترازو میں بادشاہ کو تولا جاتا ہے، وہ ترازو سونے کا بنا ہوتا ہے جس کے ایک پلڑے میں بادشاہ کو بٹھا دیا جاتا ہے اور دوسرے پلڑے میں ان اشیا کو رکھا جاتا ہے۔ اس ترازو میں بیٹھنے کے وقت کا تعین دربار کے نجومی کیا کرتے ہیں۔ جب بادشاہ ترازو میں بیٹھتا ہے تو اس کے دونوں سروں کو...... دربار میں موجود دو بزرگ اشخاص پکڑ کر کھڑے ہوتے ہیں جو بادشاہ کے حق میں دعا پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد وزن لکھا جاتا ہے۔ اگر وزن پہلے یا پچھلے سال سے زیادہ ہوتا ہے تو حاضرین دربار اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ درباری حکیم بھی بادشاہ کی صحت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔ بادشاہ کے وزن کے لیے لائی جانے والی اشیا کو محل کی شاہی خواتین بھیجتی ہیں۔''

''وزن کی یہ تقریب کھلی جگہ ہوتی ہوگی......؟''

رحمت بانو نے حیرانی سے سوال کیا۔

''نہیں، یہ اکثر بادشاہ کی والدہ یا بڑی بہن کے محل میں منعقد کی جاتی ہے۔ بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر ایک ریشمی کپڑے میں اس کی سالگرہوں کی تعداد میں گانٹھیں لگائی جاتی ہیں۔ ہر سال یہ گانٹھیں بڑھتی جاتی ہیں اور یہ کپڑا حرم میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اس موقع پر ضرب کرائے گئے چاندی کے سکے بھی عوام میں بطور خیرات بانٹے جاتے ہیں۔ یہ محفل اور یہ تقریب آدھی رات تک اور کبھی کبھی تو اگلی صبح تک جاری رہتی ہے۔ شہزادے سال میں ایک مرتبہ اپنی شمسی سالگرہ کے موقعے پر تلا کرتے ہیں۔ ان کے وزن کی پہلی تقریب بارہ سال کی عمر میں ہوا کرتی ہے۔ پہلے سال ان کو ایک چیز کے مقابل تولا جاتا ہے اور پھر ہر سال ایک شے کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد بارہ تک ہو جاتی ہے۔ بارہ سے زیادہ اشیا سے تلنے کی اجازت نہیں ہوتی......'' گل بانو نے پوری تفصیل رحمت بانو کے گوش گزار کی۔

''بڑی عجیب اور دلچسپ بات ہے......'' رحمت بانو نے جواب میں کہا۔

''ان تقریبات کے علاوہ جشن صحت، جشن گلابی، جشن تاج پوشی اور جشن ماہتابی بھی بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے مگر ہمارے شہنشاہ چونکہ زیادہ اسلامی ذہن کے مالک ہیں، اس لیے وہ آہستہ آہستہ ان کو چھوڑتے جا رہے ہیں۔ شاید یہ بھی جشن قمری آخری ہو...... شہنشاہ عالمگیر نے اپنی تخت نشینی کے کچھ عرصے بعد نوروز کے تہوار کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اس کے بجائے عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے ساتھ رمضان کے دنوں میں افطار کی تقریبات کو زیادہ ترجیح دی جانے لگی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے شہزادگان کو بھی نوروز کی تقریب کرنے سے منع کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ انہیں خبر ملی کہ شہزادے داراشکوہ نے نوروز کا تہوار منایا ہے تو انہوں نے اسے لعنت ملامت سے بھرا خط لکھا تھا کہ......

''ہمیں معتبر اور بارسوخ ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ تم نے اس سال نوروز کا جشن منایا ہے جو کہ وحشی ایرانیوں کا تہوار ہے۔ اس کو خدا کے نام پر اپنے اصولوں، روایات اور دستور سے نکال دو۔ تمہیں اپنی روایات اپنے اصولوں اور دستور کا پابند رہنا چاہیے۔ نئی روایات نہیں اختیار کرنی چاہئیں۔''

گل بانو نے کچھ اس انداز سے ان تقریبات کی تفصیل بتائی تھی کہ رحمت بانو اپنی مایوسی اور پریشانی بھول گئی۔ ''ان تقریبات کے آخر میں بادشاہ سلامت کے لیے درباری اور امرا تحائف لاتے ہیں۔ بادشاہ بھی ان مواقع پر درباریوں اور محل میں موجود شہزادیوں، شہزادوں میں ان کی خدمات کے صلے میں انہیں انعامات سے نوازا کرتا ہے۔ خواتین میں تحفے اور خلعتیں تقسیم کی جاتی ہیں۔''

''مگر ایسے موقع پر میں کیا تحائف پیش کر سکتی ہوں؟'' رحمت بانو نے پریشانی سے پوچھا۔

''آپ کو راجکماری کچھ دینے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ آپ کونسا ان کے خاندان سے ہیں۔ اسی جشن کے حساب سے کل ہاتھیوں کی لڑائی کا دن ہے...... یہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔''

گل بانو ابھی باتیں بتارہی تھی مگر رحمت بانو اب ایک نئی سوچ میں مبتلا ہوچکی تھی کہ کاش وہ بھی درباری خواتین کا ایک حصہ اور ان میں شامل ہوتی تو وہ بھی بادشاہ سلامت کو اپنی طرف سے تحائف دیتی۔ اس کی سوچ پھر سے بدل کر اسی سوچ پر آکر رہ گئی...... کہ یہ تو تب ہی ہوتا اگر اس کی شادی شہزادہ اعظم سے ہوگئی ہوتی۔ ابھی تک تو وہ اسی گومگو میں مبتلا ہے کہ شہزادہ اس کی محبت کے ساتھ مخلص بھی ہے یا اس کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

تقریبات پورے جوش وخروش سے جاری تھیں اور مینا بازار بھی انہی تقریبات کا ایک حصہ تھا۔ یہاں پر مختلف امراء کو مختلف اسٹال تقسیم کردیے جاتے تھے۔ وہ رنگ برنگے شامیانے کھڑے کر کے ان میں دلچسپ اور خوب صورت اشیا بادشاہ کے ملاحظہ کے لیے رکھتے۔ بادشاہ ان اسٹالوں کا معائنہ کرتا۔ جو سب سے زیادہ خوب صورت سجا ہوتا، اس کی تعریف کرتا۔ شاہی خواتین اور امراء کی بیگمات کے لیے علیٰحدہ مینا بازار لگا کرتا۔ اس بازار میں تمام دکاندار اور خریدار اعلیٰ خاندانوں کی عورتیں ہوتی تھیں اور کسی مرد کو اس بازار میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بادشاہ اور اس کی بیگمات، شہزادیاں اگر دکاندار سے خوش ہوجاتیں تو چیز کی قیمت دگنی ادا کرتیں۔ گل بانو...... مینا بازار میں رحمت بانو کو ساتھ لے کر مختلف دکانوں پر اشیا دیکھ رہی تھیں کہ اچانک گل بانو اسے کھینچتے ہوئے ایک طرف لے گئی اور ایک نہایت خوب صورت، نوجوان دبلی پتلی لڑکی کے سامنے لے جاکر رک گئی۔ اس کی رنگت ایسی تھی جیسے میدے میں سیندور ملا کر اس کے چہرے پر پوت دیا گیا ہو۔

''راجکماری صاحبہ! ان سے ملو...... یہ دل پذیر بانو ہیں۔ شہزادہ محمد اعظم کی تایا زاد بادشاہ زادے محمد شجاع کی بیٹی...... اور شہزادی یہ آسام کی راجکماری رحمت بانو ہیں۔''

''بھئی آپ کے اس ہاتھی کی محل میں بڑی تعریف ہورہی تھی جو آپ نے شہنشاہ عالی جاہ کی خدمت میں نذر کیا ہے۔ شہنشاہ ذی وقار نے اس کو خصوصی طور پر پسند کیا ہے اور وہ بھی اس کی بے حد تعریف کررہے تھے۔ بہت خوب صورت انداز میں آداب بجالاتا ہے۔'' وہ ہاتھی کی تعریف کررہی تھی اور رحمت بانو اس کے حسن کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے بات ختم کی تو گل بانو نے رحمت بانو کو ٹہوکا دیا...... وہ باتیں کرتی کرتی دوسری طرف چلی گئی۔ مینا بازار میں شاہی خاندان کی اور بھی خواتین موجود تھیں۔ اس کے ایک طرف جاتے ہی گل بانو بولی۔

''راجکماری صاحبہ...... آپ تو تحفہ دینے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ یہ دل پذیر بانو کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔ شہنشاہ کو تحفے میں ہاتھی کس نے بھجوایا؟ آپ کو کچھ علم ہے......''

''گل بانو...... مجھے تمہاری قسم...... مجھے نہیں پتا یہ کس نے انہیں بھجوایا ہے۔ میں تو جانتی تک نہیں......'' رحمت بانو نے جواب دیا پھر وہ سوچنے لگی...... اگر دل پذیر کی کہی ہوئی بات سچ ہے تو وہ کون ہے جس نے اس کا نام لے کر شہنشاہ معظم کے حضور یہ ہاتھی نذر کیا...... کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہی تھی؟ اس نے یہی سوال گل بانو سے کیا۔

''تم دیکھ رہی تھیں۔ دل پذیر بانو کہیں مذاق میں تو نہیں کہہ رہی تھی۔ بھلا میرے میں اتنی سکت کہاں کہ میں ان کو کچھ نذر کرسکوں۔ میں تو خود اس محل سرا میں بے آسرا ہو کر رہ رہی ہوں......''

''نہیں راجکماری صاحبہ...... آپ کی اور دل پذیر بانو کی میری دانست میں یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے تو وہ آپ کو جانتی تک نہیں تھیں۔ پھر وہ آپ کے ساتھ مذاق کیسے کرسکتی ہیں۔'' وہ درست کہہ رہی تھی۔

پھر وہ دوسرا کون ہوسکتا ہے۔ رحمت بانو کو تشویش ہوئی۔ سارا دن وہ اسی کشش وپنج میں مبتلا رہی کہ اس کی طرف سے یہ تحفہ کس نے بادشاہ کو دیا ہے۔

جشن وزن قمری کی ابتدا پچیس ذیقعد کو ہوئی تھی۔ اس جشن کا آج تیسرا یا چوتھا روز تھا۔ جب دربار کو بڑے خوب صورت قمقموں اور فانوس کے ساتھ رنگ برنگیوں جھنڈیوں سے سجا دیا گیا تھا۔ دربار کے علاوہ میناروں، گنبدوں اور شاہی محل کے تمام حصوں کو رنگ برنگے چراغوں سے مزین کردیا گیا تھا۔ مختلف رنگوں سے جھلکتی ہوئی روشنی جب آتی تو لگتا محل سرا پھولوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ علی الصباح نوبت خانے سے نوبت کی آواز کے ساتھ دن کا آغاز ہوا۔

کچھ دیر بعد شہنشاہ عالم اورنگ زیب اپنے تخت پر براجمان ہوئے۔ ان کے بعد بڑی بیگم صاحبہ ان کے پہلو میں رکھی نشست پر جلوہ افروز ہوئیں۔ ان کے بعد رانیاں اور شہزادیاں اپنی اپنی نشستوں پر آکر بیٹھ رہیں۔ شہزادگان اور امراء وزراء بھی اپنی جگہوں پر مسند نشین ہوچکے تھے کہ ان شہزادیوں کی ذاتی کنیزیں تھالوں میں رکھے تحائف لے کر ان کے قریب زمین پر بیٹھ گئیں پھر بڑی ترتیب کے ساتھ ایک ایک کنیز اپنی جگہ سے اٹھی اور تحائف کا تھال

بادشاہ کے حضور پیش کرنے لگیں۔ اس کے ساتھ ایک ہرکارہ اس شہزادی یا رانی کے نام کا اعلان کرتا جاتا جس کی طرف سے حضور والاشان کی خدمت میں تحائف پیش کیے جاتے۔ سب سے آخر میں رحمت بانو کی طرف سے پیش کیے گئے تحفے مرصع ہاتھی کا ذکر کیا گیا۔ تب سامنے دور بیٹھے شہزادہ اعظم کی نظریں اس جانب اٹھیں جدھر رحمت بانو بیٹھی تھی۔ دونوں کی نظریں ایک لمحے کو آپس میں ملیں۔ جب تمام اپنے تحائف پیش کرچکیں تو شہنشاہ عالم نے ان سب کو انعام واکرام سے نوازا۔

☆☆☆

ذی الحجہ 1668ء کی پہلی تاریخ تھی جب ارکان دولت اور امرائے سلطنت، افسران سپاہ جو صوبہ جات میں جانفشانی وخیر خواہی سے بادشاہ کی خدماتِ شاہی انجام دے چکے تھے، اپنی اپنی لیاقت کے موافق رتبے اور منصب پاکر ممتاز وسرخرو ہوئے۔ لوگوں کی پیشانیاں اس گراں قدر عنایت کے شکریہ میں چمک اٹھیں۔ زبانوں سے صدائے تہنیت بلند ہوئی۔ شہزادوں اور شہزادیوں کو بھی حسب مراتب یا ان کی خدمات شاہی کی مناسبت سے انعام واکرام سے نوازا گیا تھا۔ مگر ان انعامات ومنصب کی ترقی وانعام پانے والوں میں شہزادہ اعظم کا نام کہیں بھی شامل نہ تھا۔ سب لوگ اس بات پر حیران وششدر تھے کہ شہزادہ اعظم کو نظر انداز کیوں کیا گیا۔ حالانکہ شہنشاہ سب سے زیادہ انہی پر اعتماد کرتے تھے اور سب سے زیادہ جنگی مہمات بھی انہی کی وجہ سے سر ہوئی تھیں۔ جب ہرکارے کی طرف سے اس پہلی نشست کے اختتام کا اعلان ہوا تو سب امراء ووزرا چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ آخر شہزادہ اعظم سے کیا خطا سرزد ہوئی کہ انہیں انعام واکرام سے محروم رکھا گیا ہے۔ بڑی بیگم صاحبہ سے لے کر نوکرانیوں اور کنیزوں باندیوں تک اپنی اپنی رائے دے رہی تھیں۔

''شہزادے نے لگتا ہے، شہنشاہ معظم کے کسی حکم سے روگردانی کی ہے جس کی وجہ سے انہیں نظر انداز کردیا گیا ہے۔'' کوئی کہتا۔ ''شہزادہ اعظم نے بڑی بیگم صاحبہ کو ناراض کیا ہے۔ اسی لیے سزا کے طور پر انہیں انعام واکرام سے نہیں نوازا گیا......'' اور ان سب سے الگ رحمت بانو خود کو اندر ہی اندر کوس رہی تھی کہ شاید شہزادہ اعظم کو نظر انداز کیے جانے کا سبب اس کی ذات ہو...... اسے رہ رہ کر بڑی بیگم صاحبہ کی وہ بات یاد آرہی تھی کہ انسان کو اپنی حیثیت کے مطابق ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔ ایڑیاں اٹھا کر چھت تک پہنچنے کی کوشش میں چھت نیچے نہیں آجاتی۔

نشست برخاست ہوئی تو سب جانے کے لیے اٹھے اور قطار کی شکل میں دربار سے نکلنے لگے۔ رحمت بانو ابھی تک آخری نشستوں پر بیٹھی تھی جب شہزادہ اعظم باہر جانے کے لیے اس کے قریب سے گزرا۔

''شہنشاہ ذی شان کو آپ کا بھیجا ہوا تحفہ بے حد پسند آیا۔ ان کی طرف سے شکریہ قبول کرو۔''

''آپ نے جو میری عزت بڑھائی اس کے لیے میں ساری زندگی آپ کی ممنون رہوں گی۔'' رحمت بانو نے بھی آہستگی سے جواب دیا۔

''شام کو ایک خصوصی نشست ہورہی ہے۔ میں اس میں تمہاری شمولیت کا منتظر رہوں گا۔'' جاتے جاتے شہزادہ اعظم نے نصیحت کی۔

''مگر آپ کی پذیرائی کرنا شاید شہنشاہ جنت مکانی کرنا بھول گئے یا جان بوجھ کر آپ کو نظر انداز کردیا گیا ہے......'' رحمت بانو نے جلدی سے سوال کیا۔

''یہ تحفے تحائف تو میرے نزدیک بہت چھوٹی باتیں ہیں۔ بندہ لے تو پھر کوئی بڑا سا تحفہ لے...... کوئی اونچا سا مرتبہ لے......'' شہزادے نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''بہرحال شام کی نشست میں ضرور آنا......'' یہ کہہ کر شہزادہ اعظم چلے گئے۔

رحمت بانو بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے اٹھ کر باہر آگئی تو اسے لگا جیسے گل بانو پہلے سے اس کا انتظار کررہی ہو۔ وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔

''راجکماری صاحبہ! کچھ پتا چلا، آپ کی طرف سے دیا گیا تحفہ کس نے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا ہے؟''

''نہیں گل بانو......'' رحمت بانو نے آہستگی سے جواب دیا۔ حالانکہ اسے دل وجان سے پتا چل گیا تھا مگر اخفائے راز کی خاطر اس کو جواب دیا۔

''آج دوپہر کو ہاتھیوں کی لڑائی ہے، بادشاہ عالی وقار جھروکے میں بیٹھ کر اس کا نظارہ کریں گے۔ آپ دیکھنا پسند کریں گی؟''

''نہیں گل بانو...... میرے تو اپنے اندر دو ہاتھیوں کی لڑائی ہورہی ہے۔ نہ جانے اس میں کس کو شکست ہوتی ہے اور کس کی جیت ہوتی ہے۔'' رحمت بانو نے افسردگی سے جواب دیا۔ اسے جشن کے شروع ہوتے ہی اس بات کا نہ جانے کس طرح احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اور دل پذیر بانو...... دونوں ہاتھیوں کی طرح ہیں اور پیار کی اس لڑائی

میں جو بھی جیت جائے گا، میدان اسی کے ہاتھ رہے گا۔ جو دوسرے کو پچھاڑے گا...... سرخرو اور انعام کا حق دار وہی ٹھہرایا جائے گا۔ وہ محل کی راہداری سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے میں آکر بستر پر گر گئی اور شہزادہ اعظم کے اپنے ساتھ اب تک کے رویّے سے متعلق سوچنے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کے ساتھ شہزادہ کونسا کھیل کھیل رہا ہے اور اب شام کی نشست میں حاضری کا حکم سنا گیا تھا۔ اسی شام شہنشاہ عالی وقار نے ایک بڑی اور مخصوص نشست رکھی تھی جس میں اردگرد کی قریبی ریاستوں کے راجے اور مہاراجوں کے ساتھ ان کی بیگمات اور محل سے بیگمات کے علاوہ بڑی بیگم صاحبہ خصوصی طور پر مدعو کی گئی تھیں۔ دربار کو اب دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ راجے، مہاراجے اور ریاستوں کے بادشاہوں کے علاوہ خصوصی امراء کو ایک طرف بٹھا دیا گیا تھا اور دوسری طرف پردے میں خواتین کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس اجلاس کا مقصد بادشاہ سے اظہارِ وفاداری تھا۔ دربار میں ان کی نشستوں کو حسبِ مراتب رکھا گیا تھا۔ جب سارے مہمانانِ گرامی اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ رہے، تبھی بڑی بیگم صاحبہ نے اچانک گل بانو کو طلب کیا۔ گل بانو ڈرتے ڈرتے بڑی بیگم صاحبہ کے حضور حاضر ہوئی۔

''گل بانو...... یہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ آج کی یہ دوسری نشست کیوں سجائی گئی ہے؟''

''بڑی بیگم صاحبہ! مجھ سے زیادہ آپ بہتر جانتی ہیں یا شہنشاہ جنت مکانی کو علم ہوگا۔ یہ ناچیز اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہے۔''

''وہ محمد اعظم کدھر ہے...... اگر آج اس کی عزت افزائی نہیں ہوئی اگر آج اسے انعام واکرام سے نہیں نوازا گیا تو کونسی قیامت بپا ہوگئی ہے۔ پورے محل میں اسی کو اچھالا جارہا ہے۔ کبھی محمد معظم کو انعام واکرام سے نہیں نوازا گیا۔ کبھی سلطان کے نام عزت وتوقیر کا باب نہیں کھلا تو کسی کو اس کی پروا نہیں ہوئی۔ کام بخش کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا تو اس قدر ہنگامہ نہیں اٹھا جس قدر اس اعظم کے لیے اٹھایا جارہا ہے۔ یہ سب اس سانولی سلونی رحمت بانو کا کیا دھرا ہے۔ وہ تو کہنے کو مسلمان ہوئی ہے، ویسے تو بنگال کی جادوگرنی ہے...... جب سے وہ اس محل میں آئی ہے، مجال ہے کسی کو ایک پل کے لیے چین ملا ہو۔ گل بانو...... بتا دینا اسے جاکر...... کہ اگر اس نے اپنی فسوں کاری بند نہ کی تو میں اس کی گردن کٹوا دوں گی۔ کہہ دینا اسے...... کہ وہ میری بیٹی دل پذیر کی جگہ لینے کی کوشش نہ کرے۔ ابھی روشن رائے زندہ ہے۔ وہ کبھی یہ نہ چاہے گی کہ اس کی یتیم ومسکین بیٹی کی خوشیوں پر کوئی یوں شب خون مارے۔''

''جی...... جی...... بڑی بیگم صاحبہ...... بہت بہتر......'' ابھی وہ جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ بڑی بیگم صاحبہ دوبارہ دہاڑیں۔

''میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو...... جاتی کیوں نہیں ہو......''

گل بانو فوراً پلٹی اور رحمت بانو کے کمرے کی طرف دوڑی۔

رحمت بانو اور شہزادہ اعظم اسے راہداری میں ہی مل گئے۔ وہ رحمت بانو کو بڑی بیگم صاحبہ کا پیغام دینا چاہتی تھی کہ اسی لمحے ایک خواجہ سرا جس کی ڈیوٹی محل کے اندر اور باہر لگی ہوئی تھی، گل بانو کو پرے دھکیلتے ہوئے ان دونوں کے سامنے آگیا اور شہزادہ اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''شہزادہ صاحب...... جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں......؟''

''کہو...... کیا بات ہے جو یوں بوکھلائے پھر رہے ہو؟''

''شہنشاہ خلد مکانی آپ دونوں کو یاد فرما رہے ہیں۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''چلو رحمت بانو...... اب تمہیں یقین آگیا کہ شہنشاہ حضور ہم دونوں کو اپنے حضور دیکھنے کے متمنی ہیں مگر تم ہو...... تمہیں پہلے کی طرح میری بات کا یقین ہی نہیں آرہا۔'' شہزادہ اعظم ہنستے ہوئے بولا۔

''مجھے آپ کی بات پر اعتبار اس لیے نہیں آرہا تھا کہ میں نے پہلے کئی بار آپ کی باتوں پر اعتبار کرکے اپنے من کو دکھوں میں کئی بار گرتا ہوا دیکھا تھا۔ میرا دل بے اعتباری کی دلدل میں گھرا ہوا تھا اس لیے......'' رحمت بانو مطمئن لہجے میں پہلی بار بولی۔

گل بانو حیرانی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے بھی اعتبار نہیں آرہا تھا کہ آج کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے لگا ہے...... ان کی باتیں سن کر وہ چپکے سے ایک طرف کو ہولی۔

راجکماری اور شہزادہ اعظم کو اس شام شرفِ ماہتاب کے وقت جلوسِ اقدس میں بڑی شان وشوکت کے ساتھ لایا گیا۔ اس وقت شہنشاہ عالم کے روئے مبارک پر خوشیوں کے کھلتے ہوئے پھول دیدنی تھے لیکن اس کے مقابلے میں بڑی بیگم صاحبہ کے چہرے پر مایوسی اور اداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اسی تقریب میں پیغام کی

شہزادی کا ایک پیغام رحمت بانو کو ملا کہ آسام دوبارہ جے دھواج سنگھا نے دشمنوں سے چھین لیا ہے۔ وقتی طور پر رحمت بانو کو افسوس ہوا...... تو کیا اس کے والد کو اپنی بیٹی سے زیادہ آسام پیارا تھا؟ کبھی ان کے ذہن میں بیٹی کو دوبارہ اپنے پاس لے جانے کا خیال تک نہیں آیا۔ اسے اس موقع پر افسردہ دیکھ کر شہزادہ اعظم اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بولا۔ ''اگر خود کو سجا سنوار نہیں سکیں تو چہرے کے تاثرات پر تو خوشی سجالو......''

رحمت بانو شہزادے کی اس بات کو نہ سمجھ سکی تھی۔ خوشی اس کے بس میں تھوڑا تھی کہ وہ اسے اپنے چہرے پر کہیں سے پکڑ کر سجا لیتی۔ تقریب شروع ہوچکی تھی۔ مہمانانِ گرامی، ریاستوں کے راجے، شہزادے اپنی اپنی باری پر اٹھتے اور شہنشاہ کے حضور اپنے حصے کے تحفے تحائف نذر کرتے اور دوبارہ اپنی نشست پر جاکر بیٹھ جاتے۔ ان کی بیگمات اور ساتھ آئی خواتین اپنے تحائف بڑی بیگم صاحبہ اور ملکہ عالیہ کی خدمت میں پیش کرتیں۔ جب یہ کام ہوچکا تو شہنشاہ کی طرف سے ان مہمانوں کو تحائف اور انعام واکرام دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ درباریوں اور مخصوص لوگوں کو ایک بار پھر سے قیمتی تحائف سے نوازا جانے لگا۔ خطابات اور جاگیریں عنایت کی جانے لگیں۔ اعلیٰ منصب پر ترقیاں اور ان کی تنخواہوں کے ساتھ مشاہرے بڑھانے کا اعلان کیا جاتا رہا۔

رحمت بانو کے من میں ایک بار پھر پہلی خواہش نے سر اٹھایا کہ دیکھیں اس بار شہزادہ اعظم کو کیا انعام واکرام عطا کیا جاتا ہے، جیسے جیسے انعام واکرام کی بارش اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی، رحمت بانو کے دل میں مایوسی اپنا گھر کرتی جارہی تھی۔ پھر سب مہمانوں کو تحائف اور خطابات وجاگیریں عطا کردی گئیں۔ شہزادہ اعظم کو ایک بار پھر نظرانداز کردیا گیا تھا۔ رحمت بانو نے شہزادے کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو...... ایسی کونسی خطا آپ سے سرزد ہوئی کہ آپ کو اس بار بھی نظرانداز کردیا گیا ہے' اس کی بے چین نظریں شہزادے کے چہرے سے ہوکر بڑی بیگم صاحبہ تک گئیں تو اس کو محسوس ہوا کہ بڑی بیگم صاحبہ کے چہرے پر بے چینی کی لکیریں صاف پڑھی جاسکتی ہیں۔ وہ بار بار جھک کر ملکۂ عالیہ سے کچھ بات کرتی اور پھر مطمئن ہوجاتی مگر اگلے ہی لمحے پھر اس کی طرف چہرہ جھکا لیتی۔ رحمت بانو کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کونسا ایسا گہرا معاملہ ہے جس نے بڑی بیگم صاحبہ کو مضطرب کیا ہوا ہے۔

جب تمام کام اپنے انجام کو پہنچ چکے تو شہنشاہ عالم پناہ کی طرف سے ایک انتہائی اہم پیغام پڑھے جانے کی نوید سنائی دی۔ پیغام پڑھنے والے کی آواز گونجی۔

''آج کے اس جشن وزن قمری کے خوب صورت دن ہم شہنشاہ اورنگ زیب بخوشی اعلان کرتے ہیں کہ شہزادہ محمد اعظم کا نکاح بعوض ایک لاکھ اسی ہزار حق مہر رحمت بانو سپتری راجہ آسام سے کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور یہ نکاح ابھی اور آج ہی انجام پائے گا۔ یہ فرض شاہی مسجد کے امام ادا کریں گے۔''

اس اچانک اعلان نے سب کو حیران وششدر کر ڈالا۔ راجکماری کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے۔ وہ من ہی من میں خدا کے حضور جھک گئی جس نے ان کے پیار کی لاج رکھ لی تھی اور جس کے حضور مانگی ہوئی رحمت بانو کی دعائیں قبول ہوگئی تھیں۔ اسی وقت دونوں کا نکاح کردیا گیا اور محل میں ایک کمرائے خاص ان کو عطا کردیا گیا۔ رحمت بانو نے ایک اچٹتی سی نظر بڑی بیگم صاحبہ کے چہرے پر ڈالی۔ اس نے دیکھا بڑی بیگم صاحبہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے نفرت وحقارت کے شعلے برس رہے تھے۔ رحمت بانو کو اچانک ملنے والی خوشی نے اس کے سارے دکھ ختم کر ڈالے تھے اور وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ خوشی سے خوب اچھلے، کودے اور ناچے۔ وہ تو اس بارے میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ خوشیوں کے کھلے پھول اچانک اس کی جھولی میں ڈال دیے جائیں گے۔

آج کی تقریب اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی مگر جشن ابھی جاری تھا۔

محل سرا میں ایک بار پھر افواہوں نے سر اٹھالیے تھے۔ سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ضرور کوئی انہونی سازش ہوئی ہے مگر بڑی بیگم صاحبہ کے ساتھ کچھ خواتین کا یہ کہنا تھا کہ یہ سب ضرور اس جادوگرنی کا کیا دھرا ہے جو بنگال سے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی اور بیگم صاحبہ تو پورے وثوق سے یہ کہہ رہی تھیں کہ اس رحمت بانو نے شہزادہ اعظم کو اپنے سحر میں قابو کیا ہوا ہے اور شہنشاہ عالم پر بھی اسی کا اثر ہے۔ تبھی تو اتنی جلدی اور اچانک یہ معاملات طے پاگئے۔ ادھر رحمت بانو بھی شہزادے پر رعب ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''شہزادہ عالم! یہ سب میری دعاؤں کا نتیجہ ہے......

جو میرے رب نے سلطنتِ دہلی کے ہونے والے فرماں روا اور شہزادہ محمد اعظم کو میری جھولی میں ڈال دیا۔''

''ارے جا...... یہ میری محنتوں کا ثمر ہے۔ پتا ہے بڑی بیگم صاحبہ تو آخر تک تمہیں مان رہی تھیں۔'' شہزادے نے جتلایا۔

''اچھا تو بتایئے...... شہنشاہ عالم کے گوش گزار ہماری محبت کی ساعتوں کو کس نے کیا تھا......؟'' رحمت بانو نے پیار سے پوچھا۔

''راجکماری صاحبہ...... بہت بھولی ہو...... دیکھتی نہیں محل سرا کی ہر دیوار ایک مخبر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات بہت پہلے شہنشاہ عالم کے علم میں آچکی تھی۔ کسی کنیز...... کسی باندی یا پھر کسی خواجہ سرا نے ہماری باتیں سن کر اپنا فرض منصبی ادا کر دیا ہوگا...... ان لوگوں کو ایسے ہی کاموں کے انعامات اور بخششیں دی جاتی ہیں۔ خوشیوں بھری یہ ساعتیں بہت پہلے ہمارے نصیبوں کے آنگن میں اتر آتیں۔ اگر بڑی بیگم صاحبہ درمیان میں مزاحم نہ ہوتیں......'' شہزادہ اعظم نے مسکرا کر کہا۔

''میں اب اپنی خوشیوں کو کسی اور کو کبھی چھیننے کا حق نہیں دوں گی۔'' رحمت بانو نے اپنا سر شہزادہ اعظم کے سینے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''میں دیکھ رہی تھی، بڑی بیگم صاحبہ کے چہرے پر شہنشاہ عالم کے اس اعلان کی وجہ سے پژمردگی چھائی ہوئی تھی لیکن کیوں...... یہ میں نہیں جان پائی...... وہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہیں؟'' رحمت بانو نے استفسار کیا۔

''بڑی بیگم صاحبہ اپنے سگے بھائی اور میرے تایا جان کی بیٹی دل پذیر بانو سے میری شادی جو کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی دلیل تھی کہ وہ میرے تایا کی بیٹی اور یتیم ہونے کے سبب اس کے ساتھ زیادہ انس رکھتی ہیں۔ پھر اسے پالا پوسا بھی تو انہی نے ہے۔ اس کی والدہ اس کے پیدا ہوتے ہی انتقال کر گئیں اور بعدازاں اس کے والد کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کے مطابق وہ ہمدردی کی زیادہ مستحق تھی۔ وہ تو شہنشاہ عالم نے ان کی چلنے نہ دی...... اب دیکھو...... آگے کیا ہوتا ہے......'' شہزادہ اعظم نے پوری تفصیل کے ساتھ ساری بات بتادی۔

''ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آرہی شہزادہ جان...... ایک مرد تو کسی عورت کی دشمنی میں اس حد تک جا سکتا ہے مگر ایک عورت بھی عورت کی دشمن ہو سکتی ہے، مجھے آج پتا چلا ہے۔'' رحمت بانو نے سنجیدگی سے کہا۔

محلاتی سازشوں اور بڑی بیگم صاحبہ کی اس معاملے میں شکست دن بدن جوان ہوتی جارہی تھی۔ انہیں یہ گوارا ہی نہیں تھا کہ جس محل سرا میں ان کے حکم کے بغیر ایک تنکا بھی نہیں ہلتا تھا، وہاں انہیں اتنی بڑی شکست سے دوچار کر دیا جائے۔ وہ اپنی اس شکست کو ہر حال میں کامیابی وکامرانی سے بدلنا چاہتی تھی۔ پھر ایک روز انہیں اس کا بھی موقع مل گیا۔ شہنشاہ عالم محل سرا میں اس روز تشریف لائے۔ وہ بڑی بیگم صاحبہ سے حسب عادت ملنے گئے تو بڑی بیگم صاحبہ نے افسوس زدہ لہجے میں گلہ کیا۔

''شہزادہ محمد اعظم کے آنگن میں گہن لگا چاند اتار کر تمہیں سکھ اور شانتی مل گئی؟''

''وہ دونوں کی پسند تھی......'' شہنشاہ عالم نے دلیل دی۔

''عالمگیر...... تم کتنے کٹھور ہو...... تمہیں تو اپنی یتیم بھتیجی کا خیال بھی نہ آیا اور تو اور پہلے ہر کام میں میری مرضی کا دھیان رکھتے تھے۔ مگر اس معاملے میں مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ وہ میری چاہت نہ تھی اور نہ ہی اس کا تعلق ہمارے خاندان سے تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں اس کی شادی پہلے اپنی پسند سے کروں پھر وہ جہاں چاہتا شادی کر لیتا مگر تم نے تو میری امنگوں پر پانی ڈال دیا۔'' بڑی بیگم صاحبہ نے کہا۔

''آپ کو اب بھی اختیار ہے۔ آپ محمد اعظم کی دوسری جگہ شادی کر سکتی ہیں۔'' شہنشاہ عالم نے جواب دیا۔

''چنانچہ اگلے سال رجب کی بیس تاریخ کو رامنی...... رحمت بانو کی شادی کے ٹھیک چھ ماہ بعد شہزادہ اعظم کی دوسری شادی محمد شجاع کی بیٹی دل پذیر بانو کے ساتھ کر دی گئی۔ رحمت بانو نے اپنی سوتن کے ساتھ بڑی بے دلی کے ساتھ نباہ کرنے کی ہامی بھر لی...... مگر اسے ساری زندگی افسوس رہا تو اس بات کا کہ عورت ہی عورت کی دشمن نکلی۔ جب تک عورت، عورت کی دشمن رہے گی، انہیں کسی اور دشمن کا خطرہ نہیں ہے۔

ماخذات:

مآثر عالمگیری، مستعد خاں۔ سیر المتاخرین، خدا بخش۔ روزنامچہ عہد عالمگیر، برنیئر۔ فانی خان، 3 جلدیں، کبیر الدین احمد۔ مآثر امرا، محمد حسام الدولہ۔ اورنگ زیب عالمگیر، ڈاکٹر اوم پرکاش۔ عالمگیر نامہ، کاظم محمد۔ ہسٹری آف آسام، گیٹ ایڈورڈ۔ سولھویں صدی کا بنگال، جے این داس گپتا

اصلی نقلی

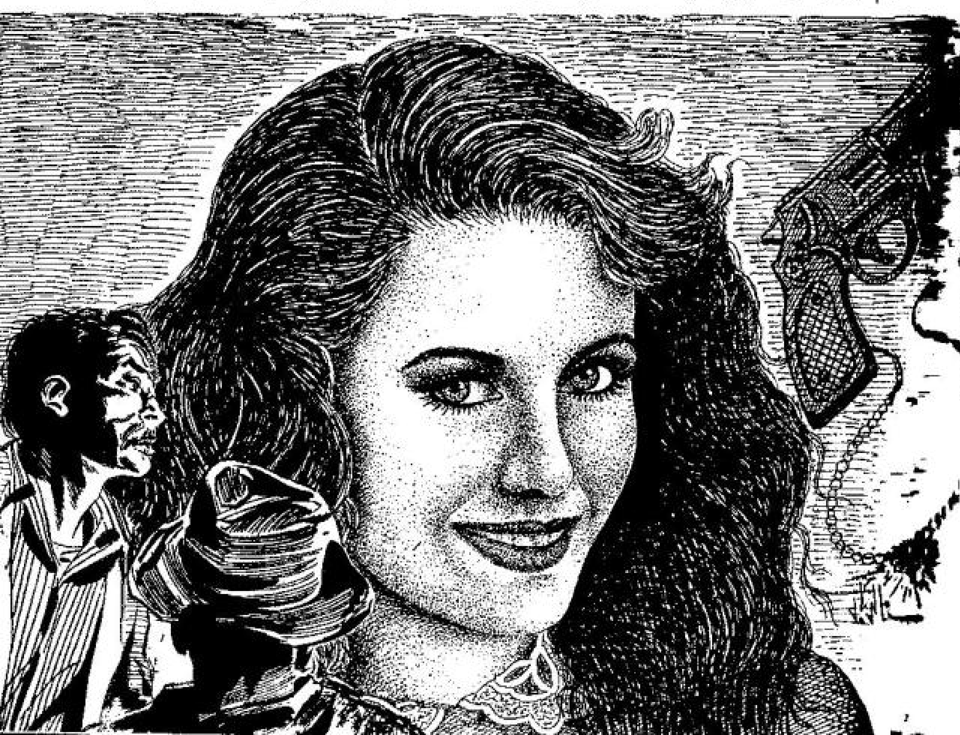
انجم فاروق ساحلی

بعض اوقات سلجھے ہوئے حالات کو بھی الجھا ہوا ذہن سمجھ نہیں پاتا مگر... اکثر الجھے ہوئے معاملات کو سلجھا ہوا ذہن بہت آسانی سے ترتیب دے کر اصل حقائق جان لیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ان ٹوٹے پھوٹے واقعات میں بھی پوشیدہ تھا جنہیں سمجھنے کے لیے پولیس فورس بھی ناکام رہی مگر... جب اس کی گہری نگاہ اصل حقائق کی تہ میں اتری تو معمولی سے فرق نے غیر معمولی سچائی کو جان لیا۔

ایک باریک بین سراغ رساں کے فطری تجسس کا ماجرا

سانتا آنا میں اس دن ہوا میں نمی کا تناسب نہ ہونے کے برابر تھا جس کے باعث فضا میں تپش بڑھ گئی تھی۔ رچرڈ کو اگر انتہائی ضروری کام درپیش نہ ہوتا تو وہ ایسے واہیات موسم میں کبھی گھر سے باہر نکلنا پسند نہ کرتا مگر ایک شخص کی تلاش کے سلسلے میں اسے تقریباً تین گھنٹے ایونیو اور اس سے ملحقہ علاقوں میں آوارہ گردی کرنی پڑی تھی۔ رات کا کھانا بھی اس نے اسی علاقے کے ایک ہوٹل میں کھایا تھا۔

پھر آج کا کام کل پر ڈال کر وہ گھر واپس جانے کے



لیے بس اسٹیشن پہنچ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ بس سے اترا تو خشک ہوا کے باعث اس کے اعصاب تھکن کا شکار تھے۔ وہ اگرچہ بدترین حالات میں محنت و مشقت کا عادی تھا مگر اس موسم نے دوسروں کی طرح اس کے بھی کس بل نکال دیے تھے۔ وہ گھر پہنچ کر آرام کرنا چاہتا تھا مگر ایک ریسٹورنٹ کے باررومکا نیون سائن دیکھ کر اس کے قدم خود بخود اس کی طرف اٹھنے لگے۔ اس کا خیال تھا کہ گھر جانے سے پہلے اگر سادہ بیئر یا کسی مشروب کا ایک گلاس پی لیا جائے تو اعصابی تھکن اتر سکتی ہے۔ یہ ریسٹورنٹ اس کے اپارٹمنٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کا مالک لیو نامی ایک نوجوان تھا جو دن بھر کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا یا تو گلاس صاف کرتا رہتا یا مکھیاں مارتا رہتا۔ اسے اس علاقے کے باسیوں سے شکوہ تھا کہ وہ اسے خدمت کا موقع نہیں دے رہے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ یہاں بہت کم لوگوں کی آمدورفت تھی۔ جب رچرڈ بارروممیں داخل ہوا تو وہاں صرف ایک گاہک تھا۔ درمیانے قد کا وہ بھاری بھرکم شخص دروازے کی طرف پشت کیے بار کاؤنٹر کے سامنے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کاؤنٹر پر کچھ سکے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ کی انگلیاں مسلسل سکوں سے کھیل رہی تھیں اور دوسرے ہاتھ میں مشروب کا گلاس تھا جس سے وقفے وقفے سے وہ چسکیاں لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے اپنے علاوہ کسی کی موجودگی یا آمدورفت کا احساس نہیں۔ اس نے رچرڈ کی آمد کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

رچرڈ سرسری انداز میں اس کی طرف دیکھتا ہوا کاؤنٹر کے آخری سرے پر رکھے ہوئے اسٹول پر ٹک گیا اور نوجوان لیو کو مشروب کا آرڈر دے کر سامنے الماری کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے لڑکے، تمہارا کام نہیں چلا؟ میں نے بہت کم لوگوں کو یہاں آتے دیکھا ہے۔“ رچرڈ نے گلاس اپنی طرف سرکاتے ہوئے لیو کو مخاطب کیا۔

”نیا نیا کاروبار ہے، جمنے میں وقت لگے گا۔ غالباً آپ پہلے بھی یہاں آچکے ہیں؟“ لیو بولا۔

”ہاں ایک دو مرتبہ یہاں آنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں یہاں سے قریب ہی برگنزا بلڈنگ میں رہتا ہوں۔“ رچرڈ نے جواب دیا۔

”میں نے آپ کو اکثر اس طرف سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔“ لیو کہتے ہوئے آگے کو جھک گیا اور دوسرے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ ”اسے جانتے ہیں آپ؟“

”نہیں۔“ رچرڈ نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ شخص چھ بجے سے یہاں بیٹھا پی رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں اب اسے زبردستی ٹیکسی میں بٹھا کر اس کے گھر بھیج دیا جائے۔“

”جانتے ہو کہاں رہتا ہے؟“ رچرڈ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں لیکن گھر کا پتا پوچھا جاسکتا ہے۔ دو چار گلاس اور چڑھا گیا تو شاید اپنا نام بھی نہ بتا سکے۔“ لیو نے کہا۔

رچرڈ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی باہر کسی تیز رفتار گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور کچھ ہی دیر میں ایک شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ اندر آنے کے بجائے دروازے کا پٹ تھام کر کھڑا ہوگیا اور تجسس بھری نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا، وہ عجلت میں ہے۔ وہ ایک دراز قامت اور صحت مند شخص تھا۔ نیلی شرٹ میں اس کے بازوؤں کے مسل ابھرے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ اعصابی تناؤ کا شکار ہے۔

اجنبی چند لمحے اسٹول پر بیٹھے ہوئے شرابی کی پشت کو دیکھتا رہا جو ایک ہاتھ سے مشروب کی چسکیاں لیتا ہوا دوسرے ہاتھ سے سکوں سے کھیل رہا تھا۔ اجنبی کی نظریں رچرڈ کی طرف اٹھ گئیں پھر وہ دروازہ چھوڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کاؤنٹر کے سامنے پہنچ گیا۔ شرابی اس وقت بھی اپنے آپ میں گم تھا۔

قریب پہنچ کر اجنبی نے ایک بار پھر سرسری انداز میں رچرڈ کی طرف دیکھا۔ پھر لیو کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کوئی عورت تو نہیں آئی تھی۔ لمبا قد، کمر تک سیاہ بال، ہلکے نیلے رنگ کا اسکرٹ اور اس رنگ سے میچ کرتا ہوا کریپ کا ریشمی بلاؤز، بالوں میں سفید رنگ کا ہیئر بینڈ اور کانوں میں سونے کے ٹاپس۔“

”نہیں، اس حلیے کی کوئی عورت یہاں نہیں آئی۔“ لیو نے جواب دیا۔

”شکریہ۔ ایک گلاس مجھے بھی ذرا جلدی۔“ اجنبی بولا۔

لیو نے مطلوبہ مشروب کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ اجنبی نے چند سکے نکال کر کاؤنٹر پر ڈال دیے اور گلاس ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف چل پڑا۔ لیکن تین چار قدم اٹھانے

کے بعد ہی اسٹول پر بیٹھے شرابی کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس وقت شرابی کا چہرہ سامنے تھا۔ اجنبی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

شرابی کے ہونٹوں پر بڑی پراسرار مسکراہٹ تھی۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے جیب سے پستول نکال لیا جس کا رخ اجنبی کی طرف تھا۔ اس وقت شرابی کو دیکھ کر یہ کہنا دشوار تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو یہاں تین گھنٹوں سے بیٹھا شراب نوشی کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں یا چہرے پر نشے کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اجنبی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سڑک پر سے شور مچاتا ہوا ایک ٹرک گزر رہا تھا۔ شرابی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اعشاریہ دو دو کے پستول کو ذرا سی حرکت دی۔ انگلی نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا اور دو گولیاں اجنبی کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔

”خدا حافظ والڈو۔“ شرابی کے منہ سے غراہٹ نکلی اور پستول کا رخ لیو اور رچرڈ کی طرف مڑ گیا۔ رچرڈ کی نظریں اجنبی پر جمی ہوئی تھیں جو دونوں ہاتھ پھیلائے خون اگلتا ہوا لہرا کر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ شرابی نے دوسرے ہاتھ سے کاؤنٹر پر پڑے ہوئے سکے اٹھا کر جیب میں ڈالے اور ان دونوں کو پستول کی زد پر لے کر الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ رچرڈ اپنی جگہ پر پستول نہ ہونے کے سبب بے حس و حرکت کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے کنکھیوں سے لیو کی طرف دیکھا جو سکتے کی کیفیت میں بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

شرابی دروازے کے قریب پہنچ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی رچرڈ بھی بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکا، پھر جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا، سڑک پر کھڑی ایک کار جھٹکے سے حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ رچرڈ کار کی طرف دوڑا مگر وہ زیادہ دور تک اس کا تعاقب نہ کرسکا۔ خوش قسمتی سے وہ کار کا نمبر نوٹ کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ چند لمحے فٹ پاتھ پر کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر بارروممیں واپس آگیا۔ لیو دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر ٹکائے ابھی تک ساکت و سامت کھڑا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر پڑی لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ رچرڈ نے قریب جاکر سگریٹ سلگایا اور دھواں اڑاتے ہوئے بولا۔ ”لاش کو گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو، پولیس کو فون کردو۔“

”یہاں فون نہیں ہے۔“ یہ کہتا ہوا لیو کاؤنٹر سے باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لاش کا بہتا ہوا خون اس کے جوتوں پر لگا تو اسے جھرجھری سی آگئی۔ رچرڈ لاش کے قریب جاکر جھک گیا۔ چند لمحے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر بڑی احتیاط سے اسے سیدھا کردیا۔ والڈو کے سینے میں دل کے مقام پر دو سوراخ دکھائی دے رہے تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ دونوں گولیاں ٹھیک دل میں پیوست ہوئی تھیں۔ وہ سیدھا کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ لیو باہر جاچکا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ دروازے سے اندر داخل ہوا تو اس نے بتایا کہ وہ پولیس کو اطلاع دے چکا ہے۔

تقریباً دس منٹ بعد باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ لیو اس وقت کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا دن بھر کی کمائی کا حساب لگا رہا تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی اس نے نوٹ کاؤنٹر کی دراز میں ٹھونس دیے۔ پولیس والے لاش کا معائنہ کر رہے تھے اور رچرڈ ایک کرسی پر بیٹھا والڈو کی لاش کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ نیلے اسکرٹ والی وہ لڑکی کون تھی جس کی تلاش میں والڈو یہاں آیا تھا پھر اس نے باررومیں آتے ہوئے اپنی کار کا انجن چلتا ہوا کیوں چھوڑ دیا تھا اور اسے اتنی عجلت کیوں تھی اور وہ شرابی کون تھا؟ کیا وہ والڈو کے انتظار میں یہاں بیٹھا تھا یا ان کا سامنا ہونا محض اتفاق تھا۔

ایک پولیس والا اب والڈو کے لباس کی تلاشی لے رہا تھا۔ وہ اس کا پرس نکال کر دیکھنے لگا جس میں بڑی مالیت کے کرنسی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ پھر وہ سیدھا ہوتے ہوئے ان دونوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ رچرڈ نے پولیس کو واقعے کی نوعیت سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ قاتل غالباً والڈو کی کار میں فرار ہوا ہے جس کا انجن وہ چلتا ہوا چھوڑ آیا تھا۔ اس وقت پولیس کی ایک اور گاڑی باہر آکر رکی اور چار آدمی اندر گھس آئے۔ ان میں سے دو پولیس والے تھے۔ ایک فوٹو گرافر اور ایک کا تعلق پولیس اسپتال سے تھا۔ فوٹو گرافر مختلف زاویوں سے لاش کی تصویریں لینے کے بعد فنگر پرنٹس اٹھانے لگا۔

جبکہ دو پولیس والے خاموش کھڑے یہ ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ان میں ایک درمیانے قد کا بھاری بھرکم آدمی تھا جس کے چہرے پر ملاحت اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی جبکہ دوسرا لمبے قد کا آدمی تھا۔ چھوٹے قد والے کے جسم پر بھی انسپکٹر کی وردی تھی لیکن وہ غالباً دوسرے سے جونیئر تھا۔ اسی نے والڈو کی مختلف جیبوں سے برآمد ہونے والی چیزیں ایک رومال میں جمع کی تھیں۔

دراز قد انسپکٹر، رچرڈ کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ایک میز پر لے گیا۔ ’’اپنی جیبیں خالی کردو۔‘‘ انسپکٹر کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ’’میں انسپکٹر کوپر ہوں۔ اگر تم اس شہر میں رہتے ہو تو میرا نام تمہارے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔ جرائم پیشہ میرے نام سے تھر تھر کانپتے ہیں۔‘‘

’’یقیناً کانپتے ہوں گے، تمہاری صورت ہی ایسی ہے۔‘‘ رچرڈ نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی جیبوں سے چیزیں نکال کر میز پر ڈھیر کردیں۔

انسپکٹر کوپر نے اس کا پرس اٹھالیا اور پھر اس سے برآمد ہونے والا ایک کارڈ دیکھ کر وہ بڑبڑایا۔

’’خوب، تو تم پرائیویٹ سراغ رساں ہو، یہاں تمہاری موجودگی بے معنی نہیں ہوسکتی۔‘‘

’’میں یہاں قریب میں برگنزا بلڈنگ میں رہتا ہوں۔ گھر جانے سے پہلے مشروب کا ایک گلاس پینے کے لیے یہاں آگیا تھا۔‘‘ رچرڈ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

’’تم جیسے لوگ ہمارے راستے میں بہت رکاوٹیں پیدا کرتے ہو، بہرحال میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔ خیال رہے کہ غلط بیانی نہیں چلے گی۔ میں حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔‘‘ اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے رچرڈ کو کم از کم تین مرتبہ واقعے کی تفصیل کو دہرانا پڑا۔ کوپر کے چہرے پر مختلف نوعیت کے تاثرات بنتے اور بگڑتے رہے۔ بالآخر اس کے خاموش ہونے پر وہ بولا۔

’’نیلے اسکرٹ والی اس لڑکی پر توجہ دینا پڑے گی۔ اگر والڈو کو یہ پتا نہ ہوتا کہ وہ لڑکی یہاں آسکتی ہے تو اندر بیٹھے قاتل کو بھی یہ یقین نہ ہوتا کہ والڈو یہاں آئے گا۔‘‘

’’بہت گہری سوچ ہے۔‘‘ رچرڈ اس کی طرف دیکھ کر طنزاً مسکرایا۔

’’مجھے احمق سمجھتے ہو کیا۔‘‘ کوپر کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ’’اس نے دو آدمیوں کی موجودگی میں قتل کیا اور اطمینان سے نکل جانے میں کامیاب ہوگیا۔‘‘

’’اس میں غلطی مقتول ہی کی تھی۔ اگر والڈو اپنی کار کا انجن چلتا ہوا نہ چھوڑتا تو قاتل اتنی آسانی سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہوتا۔‘‘ رچرڈ نے تبصرہ کیا۔

’’کیا قاتل واقعی نشے میں تھا؟‘‘ کوپر نے اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

’’جس انداز سے اس نے فائرنگ کی تھی اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نشے میں نہیں تھا۔‘‘ رچرڈ نے جواب دیا۔

’’میرا بھی یہی خیال ہے۔‘‘ انسپکٹر کوپر نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ’’اگر وہ پیشہ ور ہے تو پولیس کے پاس اس کا ریکارڈ ہوگا۔ فنگر پرنٹ کی مدد سے اسے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا اور جس طرح والڈو نے اس لڑکی کا حلیہ بتایا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہاں آنے سے کچھ دیر پہلے بھی اس سے مل چکا تھا۔‘‘

بالآخر لاش اٹھوا دی گئی اور پولیس کے ساتھ ان دونوں کو بھی ہیڈ کوارٹر جانا پڑا۔ جہاں رچرڈ کو ایک بار پھر اس واقعے کی تفصیل دہرانا پڑی۔ لیو کا بیان سننے کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ پولیس کی اگلی ہدایات تک اپنا بار بند رکھتا کیونکہ ممکن ہے اس دوران پولیس کو ایک بار پھر وہاں کسی قسم کے نشانات تلاش کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔ رچرڈ کو پولیس سے بھرپور تعاون کے وعدے پر ہی نجات مل سکی تھی۔

انسپکٹر کوپر نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے کیس ختم ہونے سے پہلے پولیس کی اجازت کے بغیر سانتا آنا سے باہر جانے کی کوشش کی تو اسے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کردیا جائے گا۔ رچرڈ نے مسکراتے ہوئے کوپر اور اس کے ساتھی انسپکٹر جون سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل آیا۔ پولیس کی طرح وہ بھی قاتل اور مقتول کے بارے میں لاعلم تھا۔ والڈو کی جیب سے برآمد ہونے والی کسی چیز سے اس کی شناخت نہیں ہوسکی۔

رچرڈ جب اپنی گلی میں واپس پہنچا تو دس بج رہے تھے۔ برگنزا بلڈنگ میں داخل ہونے سے پہلے وہ چند گز آگے سڑک کی دوسری جانب واقع بار کی طرف دیکھتے ہوئے بلڈنگ کی لابی میں داخل ہوگیا۔ پھر آٹومیٹک لفٹ میں داخل ہوکر اس نے چار ہندسے والا بٹن دبایا۔ چوتھی منزل پر وہ جیسے ہی لفٹ سے باہر نکلا، اس کی نظر ایک دراز قد لڑکی پر پڑی جو غالباً وہاں لفٹ کے انتظار میں کھڑی تھی۔ لمبا قد، سڈول جسم، صبیح و ملیح چہرہ، غزالی آنکھیں اور لمبی سیاہ پلکیں، اس کے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ سر پر سفید رنگ کا ہیئر بینڈ اور کانوں میں طلائی ٹاپس بھی موجود تھے۔ وہ نیلے اسکرٹ اور اس سے میچ کرتے ہوئے رنگ کا بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ رچرڈ کے اندازے کے مطابق اس کی عمر چھبیس اور اٹھائیس کے درمیان رہی ہوگی۔

’’کیا تمہارا یہ بلاؤز کریپ کا ہے؟‘‘ رچرڈ نے اشارہ کیا۔

’’ہاں......‘‘ لڑکی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

’’براہِ کرم راستہ چھوڑ دیجیے، مجھے ذرا جلدی ہے۔‘‘

رچرڈ ایک طرف ہٹنے کے بجائے اس طرح کھڑا ہوا کہ لفٹ تک پہنچنے کا راستہ بند ہوگیا۔ وہ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر لڑکی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے تاثرات ابھر آئے۔

’’میرا مشورہ ہے کہ اس لباس میں سڑک پر جانے کی کوشش مت کرنا۔‘‘ رچرڈ اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے بولا۔

’’کک......کیا مطلب؟ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟‘‘ لڑکی ہکلا گئی۔

’’میں کسی قسم کا مذاق نہیں کررہا۔‘‘ رچرڈ پُرسکون لہجے میں بولا۔ اس دوران لفٹ نے دوبارہ نیچے کا سفر شروع کردیا تھا۔

’’پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ انہیں تمہارا جو حلیہ بتایا گیا ہے اس میں اس لباس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میں مذاق نہیں کررہا۔ اگر موقع دو تو اپنی بات کا مطلب سمجھا سکتا ہوں۔‘‘

لڑکی کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ متوحش نگاہوں سے راہداری میں جھانکنے لگی لیکن اس نے اپنے آپ کو فوراً سنبھال لیا اور لہجے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ’’تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مسز لیری ہوں اور اکتیس نمبر فلیٹ میں رہتی ہوں۔‘‘

’’اکتیس نمبر اپارٹمنٹ تیسری منزل پر ہے جبکہ تم اس وقت چوتھی منزل پر ہو۔‘‘ رچرڈ نے اسے گھورا۔ اس دوران لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکنے کے بعد دوبارہ اوپر آنے لگی تھی۔

’’لفٹ اوپر آرہی ہے، شاید یہ پولیس والے ہی ہوں۔ میں بیالیس نمبر فلیٹ میں رہتا ہوں۔ فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے پاس صرف چند سیکنڈ ہیں، سوچ لو۔‘‘

لڑکی کی آنکھوں میں اب خوف نمایاں ہوگیا تھا۔ اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتے ہوئے اس کی نظریں لفٹ کے دروازے کے اوپر لگی ہوئی پلیٹ کی طرف اٹھ گئیں جہاں دو کا ہندسہ روشن ہوکر بجھ گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ لفٹ دوسری منزل پر چند لمحے رکنے کے بعد پھر اوپر آرہی تھی۔ وہ رچرڈ کی طرف مڑ گئی۔ ’’میں یہاں نہیں رہتی، فلیٹ کے بارے میں، میں نے جھوٹ بولا تھا۔‘‘ وہ رک رک کر بولی۔ ’’کیا پولیس واقعی مجھے تلاش کررہی ہے؟‘‘

’’ہاں، لیکن میرے خیال میں وہ گھروں کی تلاشی نہیں لیں گے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک والڈو کی شناخت نہیں ہوجاتی۔‘‘

’’والڈو۔‘‘ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

’’کیا تم والڈو کو نہیں جانتیں؟‘‘ رچرڈ نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

’’نہیں۔‘‘ لڑکی نے نظریں چراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات کچھ اور گہرے ہوگئے پھر وہ اچانک سسک کر بولی۔

’’خدا کے لیے مجھے اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔‘‘

رچرڈ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اسے اشارہ کرتا ہوا اپنے فلیٹ کی طرف مڑ گیا جو لفٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوتے ہوئے بجلی کا سوئچ آن کردیا۔ لڑکی اس کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ روز آئل کی خوشبو رچرڈ کے نتھنوں سے ٹکرائی اور اس نے گھوم کر دروازہ بند کردیا۔ اس دوران لڑکی چند قدم آگے چل کر اس میز کے قریب رک گئی جس پر بچھی شطرنج کی بساط پر مہرے اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے کوئی ادھوری بازی چھوڑ کر اٹھ گیا ہو۔

’’اوہ! تو تم شطرنج کے کھلاڑی ہو۔‘‘ لڑکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں اب خوف کی جھلک نہیں تھی۔ غالباً وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔

’’ہاں! لیکن میرا کوئی ساتھی نہیں۔ اکیلا ہی کھیل کر نئی چالیں سوچا کرتا ہوں۔‘‘ رچرڈ نے جواب دیا اور پھر خاموش ہوکر باہر کسی قسم کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ لفٹ کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی پھر راہداری میں بھاری قدموں کی آواز ابھرنے لگی جو اس کے دروازے کے سامنے سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ قدموں کی آواز جیسے ہی معدوم ہوئی لڑکی کے چہرے پر طمانیت آگئی۔

رچرڈ مسکراتا ہوا ملحقہ کچن میں داخل ہوگیا جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دو کپ چائے بنانے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس دوران لڑکی اسی جگہ کھڑی رہی جہاں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا مگر اب اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا آٹومیٹک پستول نظر آرہا تھا جس کا رخ اس کی طرف تھا۔

’’اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔‘‘ اس نے لڑکی کی طرف کپ بڑھاتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ’’مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں

ہوں۔ جو محض اتفاق سے اس واقعے میں ملوث ہوگیا ہوں، اگر تم چاہو تو میں اس واقعے کی تفصیل بتا سکتا ہوں، اس طرح شاید تم صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ لگا سکو۔"

لڑکی کا چہرہ ایک بار پھر سفید پڑ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں پستول سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے کپ لے کر میز پر رکھ دیا اور خود بھی کرسی پر ٹک گئی۔ رچرڈ نے اپنا کپ چھوڑ کر جیب سے شناختی کارڈ نکال کر لڑکی کی طرف بڑھایا جسے دیکھ کر اس کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت لوٹ آئی۔ اس نے پستول بیگ میں رکھ لیا اور کچھ کہے بغیر چائے کا کپ اٹھا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے کپ میز پر رکھ دیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے اب تم رقم کا مطالبہ کرو گے۔" یہ کہتے ہوئے لڑکی کا ہاتھ ایک بار پھر بیگ پر پہنچ گیا۔

"کوئی نتیجہ بعد میں اخذ کرنا، پہلے میری بات سن لو۔" رچرڈ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "والڈو جس کا میں نے ذکر کیا تھا، طویل القامت آدمی تھا قد تقریباً پانچ فٹ گیارہ انچ، جسم صحت مند، چہرہ لمبوترا اور آنکھیں بھوری، نیلی شرٹ اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھا۔ جب وہ تمہاری تلاش میں بار روم میں داخل ہوا تو خاصی عجلت میں نظر آرہا تھا۔"

"ٹھیک ہے، یہ حلیہ والڈو کا ہے۔" وہ کپ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "لیکن تم اس کے بارے میں کیا بتانا چاہتے ہو؟"

"ایک افسوس ناک بات، وہ بار اس گلی میں چند قدم آگے سڑک کے دوسری طرف ہے لیکن اس سے پہلے میں تمہاری شام کی مصروفیت کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔"

"میرا زیادہ تر وقت اپنی کار میں ہی گزرا تھا جسے میں شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑا رہی تھی۔" لڑکی نے قدرے ناگوار لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"والڈو تمہیں پوچھتا ہوا اس بار میں آیا تھا۔ اس نے بڑی وضاحت سے تمہارا حلیہ دہرایا تھا۔" رچرڈ نے کہتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اتفاق سے اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا۔ میرے علاوہ ایک اور شرابی بھی تھا جو بارٹینڈر کے بیان کے مطابق بہت دیر سے وہاں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ اس دوران والڈو تمہیں پوچھتا ہوا بار روم میں داخل ہوا اور جب واپس جانے لگا تو......" وہ ایک بار پھر خاموش ہو کر لڑکی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا پھر بولا۔ "والڈو جیسے ہی شرابی کے قریب سے گزرا، شرابی نے اچانک ہی پستول نکال لیا اور والڈو کو مخاطب کرتے ہوئے دو گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔"

"اوہ۔ اب سمجھی۔" لڑکی نے گہرا سانس لیا۔ "میرے شوہر نے میری نگرانی کے لیے تمہاری خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ یہ سب مجھے بہت پہلے سمجھ لینا چاہیے تھا۔ میں اپنے شوہر کو اتنا حاسد اور احمق نہیں سمجھتی تھی۔ کم از کم ایک شوفر کے معاملے میں اس کی سوچ غلط ہے۔ اگر اس کے حاسدانہ جذبات سینڈر کے بارے میں ہوتے تو بات سمجھ میں آنے والی تھی لیکن جوزف کے بارے میں ایسا سوچنا حماقت کے سوا کچھ نہیں جو محض شوفر ہے اور جسے میں منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتی۔"

"میرا خیال ہے ہم دونوں میں سے کوئی ایک غلط فہمی کا شکار ہے۔" رچرڈ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ "سینڈر اور جوزف یہ دونوں نام میرے لیے اجنبی ہیں، کیا تم کچھ وضاحت کرو گی تاکہ میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔"

"نہیں مسٹر رچرڈ!" لڑکی کا ہاتھ ایک بار پھر بیگ پر چلا گیا۔ "تم جیسے پرائیویٹ سراغ رسانوں کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں، اس لیے میں تمہاری کسی چال میں نہیں آؤں گی۔ تم مجھے دھوکے سے اس فلیٹ میں لے آئے ہو۔ اب تم نہ صرف مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کرو گے بلکہ میرے حوالے سے یہی حربہ میرے شوہر پر بھی آزماؤ گے۔ بہرحال میں تمہارا منہ بند کرنے کے لیے اپنی جیب کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کتنی رقم چاہیے بولو؟" رچرڈ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگایا اور کش لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"تو گویا اصلی نام جوزف ہے مگر قاتل نے اسے والڈو کے نام سے مخاطب کیا تھا۔"

"اب اس من گھڑت قصے کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ کتنی رقم چاہیے۔" لڑکی کے لہجے میں تلخی آگئی۔

"تم جوزف سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟" رچرڈ نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں اس سے اپنی ایک چیز کا سودا کرنا چاہتی تھی جسے وہ چرا کر لے گیا تھا۔ اس کی مالیت پندرہ ہزار ڈالر سے کسی طرح کم نہیں ہوسکتی۔ وہ چیز میرے لیے بہت اہم ہے۔ وہ میرے محبوب کی نشانی تھی جسے وہ تحفے میں دینے کے کچھ عرصے بعد ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ اب اگر تم چاہو تو میرے شوہر کو یہ سب کچھ بتا سکتے ہو لیکن

نہیں، میں تم جیسے گھٹیا آدمی کو اس کا موقع نہیں دوں گی۔ میں خود ہی اسے اصلیت سے آگاہ کر دوں گی۔ میں جوزف سے اس لیے نہیں ملتی کہ اس سے محبت کرتی ہوں۔ اسے ملازم بھی میں نے نہیں رکھا تھا۔ وہ دو ٹکے کا آدمی کسی لحاظ سے بھی اس قابل نہیں تھا کہ نگاہِ التفات سے اس کی طرف دیکھا جائے اور اب تم......"

وہ اسے گھورتی ہوئی ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔ "میں جا رہی ہوں، ہمت ہو روک لو۔ تم اپنے آپ کو پرائیویٹ سراغ رساں ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو جبکہ ایسے کارڈ کوئی بھی چھپوا سکتا ہے۔"

"درست کہا لیکن میں دو سال سے اس فلیٹ میں اس لیے نہیں رہ رہا تھا کہ ایک روز تم یہاں آؤ گی تو میں تمہیں بلیک میل کروں گا لیکن بات کو آگے بڑھانے سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم اس عمارت میں کیا کر رہی تھیں۔ تیسری منزل پر کس کا فلیٹ ہے، جوزف کا؟" رچرڈ نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"ہاں!" لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں نے والڈو کا جو حلیہ بتایا ہے، وہ تمہارے جوزف سے مختلف تو نہیں؟"

"نہیں، یہ وہی ہے۔" لڑکی نے اعتراف کیا۔

"چلو ایک بات تو طے ہوئی کہ والڈو ہی جوزف تھا۔ پولیس والڈو کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتی مگر انہیں ایک ایسی لڑکی کی تلاش ضرور ہے جس کا حلیہ اس نے مرنے سے پہلے بتایا تھا، اب بھی کچھ سمجھیں یا نہیں؟"

"اوہ......" لڑکی کے چہرے پر خوف کے سائے رقص کرنے لگے۔ "وہ اس بات سے قطعی خوف زدہ نہیں تھا کہ اس کے ایڈریس سے باخبر ہو کر میں اس کے خلاف کارروائی بھی کر سکتی ہوں۔ بلیک میلر شاید ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس نے مجھ سے عمارت کے سامنے گلی میں ملنے کو کہا تھا لیکن مجھے یہاں آنے میں دیر ہوگئی۔ جب میں گلی میں پہنچی تو بار کے سامنے پولیس کی گاڑی دیکھ کر کچھ دیر تک اپنی گاڑی میں بیٹھی رہی پھر موقع پا کر اس عمارت میں داخل ہوگئی اور تیسری منزل پر جوزف کے فلیٹ پر دستک دی۔ لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو دوبارہ کار میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تین مرتبہ جوزف کے فلیٹ پر گئی مگر ہر بار مایوس لوٹنا پڑا۔ چوتھی مرتبہ لفٹ میں داخل ہوئی تو غلطی سے چوتھی منزل کا نمبر دب گیا۔ اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں لفٹ سے نکل کر راہداری میں کافی آگے جا چکی تھی۔ میں واپسی کے لیے لفٹ کا انتظار کر رہی تھی کہ تم سے ملاقات ہوگئی۔"

"تم نے اپنے شوہر کا ذکر کیا تھا، وہ اس وقت کہاں ہوگا؟" رچرڈ نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"ایک کاروباری میٹنگ میں۔ میرے شوہر کا کاروبار پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا زیادہ وقت مختلف ممالک کے دوروں اور کانفرنسوں میں گزرتا ہے۔"

"بہرحال جوزف ختم ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ چیز بھی ہمیشہ کے لیے پردۂ راز میں چھپی رہے گی جس کی تمہیں تلاش تھی۔"

"کیا......کیا واقعی جوزف ختم ہو چکا ہے؟" اس نے غیر یقینی نگاہوں سے رچرڈ کی طرف دیکھا۔

"ہاں، تمہیں میری بات کا یقین کرنا ہی پڑے گا۔" رچرڈ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ باہر جانے سے پہلے یہ لباس بدل لو ورنہ عمارت سے باہر قدم رکھتے ہی پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ گی۔ اس کیس کا انچارج انسپکٹر کوپر بہت گھٹیا آدمی ہے۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اوچھے ہتھکنڈوں سے بھی باز نہیں آتا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنی ایک پینٹ اور شرٹ مستعار دے سکتا ہوں۔ اس پردے کے پیچھے بیڈروم کا دروازہ ہے۔ وارڈروب اسی کمرے میں ہے۔"

لڑکی کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر پردہ اٹھا کر دوسرے کمرے میں غائب ہوگئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ رچرڈ کی پینٹ اور شرٹ اسے بالکل فٹ آئی تھی۔ اسکرٹ، بلاؤز اور ہیئر بینڈ اس نے میز پر رکھ دیا۔ جسے یہ کہتے ہوئے رچرڈ نے پردے کے پیچھے پھینک دیا کہ کسی مناسب وقت پر واپس آ کر وہ اپنی چیزیں واپس لے جائے۔ لڑکی نے جھک کر میز پر رکھا ہوا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا ہی تھا کہ اسی منزل پر لفٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ رچرڈ بھی چونک گیا اور قدموں کی آواز سننے لگا جو راہداری میں ابھر رہی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے لہرا گئے۔ قدموں کی آواز دروازے کے سامنے آ کر رک گئی۔ وہ کوئی ایک ہی آدمی تھا۔ رچرڈ سوچ رہا تھا وہ کون ہوسکتا ہے کہ اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز ابھری تو رچرڈ نے لڑکی کو اشارہ کیا۔ وہ اپنا ہینڈ بیگ سنبھال کر دبے پاؤں بیڈروم کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ لڑکی نے دوسرا اشارہ پا کر میز پر رکھا ہوا کپ

اٹھایا اور تیزی سے بیڈروم میں گھس گئی اور پردہ برابر کردیا۔

لیکن دروازہ پوری طرح بند کرنے کے بجائے اس میں معمولی سی درز رہنے دی۔ اس وقت رچرڈ نے سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ وہ بلاوجہ اپنے آپ کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش کیوں کررہا ہے لیکن اب ایسی باتیں سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اس دوران دستک دوبارہ ابھری۔ اٹھتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر کرسی کو اس طرح گھسیٹا کہ اس کی آواز باہر تک سنائی دے پھر وہ بلند آواز میں جماہی لیتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا اور کسی احتیاط کا مظاہرہ کیے بغیر دروازہ کھول دیا اور یہی اس کی غلطی تھی۔

رچرڈ پہلی نظر میں اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم اور تنگ سی پیشانی، اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس شخص کو کب اور کہاں دیکھا ہے۔ مگر اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اعشاریہ دو دو کے پستول نے اسے سب کچھ یاد دلادیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ شخص اسے پستول سے دھکیلتا ہوا اندر لے آیا اور بڑے محتاط انداز میں دوسرے ہاتھ سے دروازہ بند کردیا۔ رچرڈ اس صورت حال سے خوفزدہ نہیں ہوا تھا لیکن ایک لمحے کے لیے اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اجنبی اسے دھکیلتا ہوا کچھ اور پیچھے لے آیا۔ اس کی آنکھوں میں سانپ کی سی چمک تھی۔ اس کی نظریں میز پر بچھی بساط کی طرف اٹھ گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ سانپ کے مانند پھنکارا۔ ”تمہارے علاوہ اور کون ہے یہاں؟“

”کوئی نہیں، میں اکیلا ہی بیٹھا شطرنج کی چالیں سوچتا رہا ہوں۔ تم چاہو تو اپنا اطمینان کرسکتے ہو۔“ رچرڈ نے جواب دیا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی اور ہوا تو اس سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”پولیس ابھی فنگر پرنٹس کے ذریعے مجھ تک نہیں پہنچ سکتی۔ میرا کمال یہی ہے کہ آج تک کہیں بھی اپنی انگلیوں کے صحیح نشانات نہیں چھوڑے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میرے جرم کے دو چشم دید گواہ موجود ہیں۔ ایک تم اور دوسرا وہ لڑکا۔ تم دونوں میں سے کسی کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔“

”تم نے والڈو کو قتل کیوں کیا تھا؟“ رچرڈ نے گھورتے ہوئے پوچھا۔ وہ اسے باتوں میں لگا کر کچھ وقت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

”ہم دونوں نے مل کر مشی گن میں ایک بینک لوٹا تھا۔ منصوبہ والڈو ہی کا تھا لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ وہ مجھے بھی دھوکا دے جائے گا۔ اس نے مجھے پھنسادیا اور خود رقم لے کر رفوچکر ہوگیا۔ مجھے چار سال کی سزا ہوئی تھی۔ مشی گن کی جیل میں گزرے ہوئے یہ چار سال میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔“

”کیا تمہیں یقین تھا کہ وہ بار میں آئے گا؟“

”نہیں۔“ اجنبی نے سر ہلایا۔ وہ باتوں کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ ”میں اس کی تلاش میں تھا۔ مجھے پتا چلا کہ وہ اس علاقے میں کسی جگہ رہائش پذیر ہے۔ گزشتہ رات اس گلی میں، میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی لیکن بھیڑ کی وجہ سے وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ آج بھی اس کی تلاش میں صبح سے اس علاقے میں گھوم رہا تھا۔ وہ زندہ ہے یا......؟“

”مرگیا۔“ رچرڈ نے اس کا جملہ مکمل کردیا۔

”مجھے اس دھوکے باز کی موت کا کوئی افسوس نہیں اور نہ......“ اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پستول کی نال رچرڈ کی ٹھوڑی کے نیچے لگادی۔ رچرڈ کا ہاتھ بے اختیار اوپر اٹھ گیا۔ وہ غالباً ارادی طور پر پستول کو پکڑنا چاہتا تھا مگر اجنبی پستول کو جھٹکا دیتے ہوئے غرایا۔

”نہیں میرے دوست! میں تمہیں کسی ایسی حرکت کی اجازت نہیں دے سکتا۔“ رچرڈ نے دونوں ہاتھ پہلوؤں میں گرا کر ہتھیلیاں کھول دیں تاکہ وہ کسی قسم کا شبہ نہ کرسکے۔ اجنبی نے ابھی تک اس کی تلاشی لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ غالباً اسے پروا نہیں تھی کہ رچرڈ کے پاس پستول بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں یہاں کس طرح پہنچا؟“

”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے، میں بارٹینڈر کو بتا رہا تھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ تم نے یقیناً ہماری باتیں سنی ہوں گی۔“ رچرڈ نے جواب دیا۔

”سمجھ دار ہو۔“ اجنبی معنی خیز انداز میں مسکرادیا۔

”تمہارے بعد اس لڑکے کی باری آئے گی۔ میں نے پولیس ہیڈکوارٹر سے تعاقب کرکے اس کا گھر معلوم کرلیا ہے لیکن پہلے تم سے نمٹنا چاہتا ہوں۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں والڈو کی کرائے کی کار میں پولیس ہیڈکوارٹر کے آس پاس ہی رہا ہوں۔ ہماری پولیس بڑی ذہین ہے۔ اصل مجرم ان کی نظروں کے عین سامنے موجود ہوتا ہے لیکن وہ اس کی طرف دیکھ نہیں پاتی۔“

”کیا تم یہ پستول یہاں سے ہٹا کر بات نہیں کر

سکتے؟“ رچرڈ بولا۔

اس شخص نے پستول کی نال نرخرے سے ہٹا کر اس کے سینے پر لگادی۔ اسی دوران رچرڈ کو احساس ہوا کہ پردے کے پیچھے بیڈروم کا دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا ہے۔ ایک انچ، دو انچ، چار انچ۔ پھر دروازہ اس حد تک کھل گیا کہ پردے کے پیچھے سے لڑکی کا چہرہ جھانکتا ہوا نظر آیا۔ رچرڈ اپنے سامنے کھڑے شخص کو کسی قسم کے شبہے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ براہِ راست اس شخص کی آنکھوں میں جھانکتا رہا تاکہ اسے کسی اور طرف توجہ دینے کا موقع نہ مل سکے۔ اس نے اپنے اوپر ایسی کیفیت طاری کرلی جیسے بے حد خوفزدہ ہو۔ اجنبی اس کی حالت دیکھ کر محظوظ ہوا۔ اسی دوران لڑکی ایک ہاتھ میں پستول سنبھالے پردے کی آڑ سے نکل آئی۔

”کیا تم ساری رات مجھے اسی طرح کھڑا رکھو گے؟“ رچرڈ نے ایک بار پھر اجنبی کو باتوں میں الجھانا چاہا۔

”بہت جلدی ہے...... مگر تمہیں خوف سے تھرتھر کانپتے دیکھ کر مجھے مزہ آرہا ہے۔“ اجنبی بولا۔

لڑکی دبے پاؤں اجنبی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ رچرڈ کو اس کی ذہانت کی داد دینا پڑی۔ وہ لڑکی تو بلی سے بھی زیادہ دبے قدموں چل رہی تھی۔ اس کے اور اجنبی کے درمیان فاصلہ کم ہورہا تھا۔ ”فرض کرو اگر میں چیخنا شروع کردوں تو؟“ رچرڈ نے اجنبی کو مخاطب کیا۔

”یہ شوق بھی پورا کرلو۔ تمہارا منہ کھلتے ہی گولی حلق میں اتر جائے گی۔“ اجنبی نے پستول کو حرکت دی۔ اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی لڑکی نے پستول کا دستہ پوری قوت سے اس کی کھوپڑی پر رسید کردیا۔ وہ شخص کراہ کر اچھلا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ رچرڈ نے موقع پاکر اس کے پیٹ میں گھونسا رسید کردیا۔ وہ شخص دہرا ہوگیا۔ اس مرتبہ رچرڈ نے اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس شخص کی ٹھوڑی پر جمادیا۔ اجنبی جیسے ہی سیدھا ہوا لڑکی نے اس کے سر پر ایک اور ضرب لگادی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا میز سے ٹکرایا اور فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ رچرڈ نے غصے کے عالم میں اس کے سینے پر زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ دوسری ٹھوکر لگاتے لگاتے رک کر وہ شطرنج کے مہروں کی طرف دیکھنے لگا جو میز سے گر کر بکھر گئے تھے۔

پھر اس کی نظریں لڑکی کی طرف اٹھ گئیں جو مبہوت سی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ ”گڈ! واقعی اس وقت تم نے کام دکھایا۔“ رچرڈ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ لڑکی کوئی جواب دینے کے بجائے الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ رچرڈ کی طرف تھا۔ دروازے کے قریب جاکر مڑے بغیر اس نے ٹٹول کر ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے گھمادیا۔ دروازہ کھل گیا۔

لڑکی ہوا کی طرح کمرے سے نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہوگیا۔ کمرے کی فضا میں چند لمحوں تک سکوت طاری رہا پھر رچرڈ بھاری سانسیں سن کر اس شخص کی طرف متوجہ ہوگیا جو فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے بیڈروم سے ایک رسی لاکر اس کے دونوں ہاتھ باندھ دیے اور اس کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ وہ شخص گہرے گہرے سانس لے رہا تھا جو اس کے ہوش میں آنے کی علامت تھی۔ رچرڈ ایک بار پھر بیڈروم میں گھس گیا۔

پردے کے پیچھے دروازے کے قریب ہی اس لڑکی کا لباس پڑا ہوا تھا۔ اس نے ساری چیزیں چھپادیں۔ اس کام سے فارغ ہوکر وہ کچن میں آگیا۔ اپنے لیے کافی کا ایک کپ بنایا اور چسکیاں لیتا ہوا پھر اس کمرے میں آگیا جہاں وہ شخص فرش پر پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اسے روز آئل کی خوشبو کا احساس ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی تاکہ سینٹ کی بھینی بھینی مہک کسی کو یہاں اس لڑکی کی آمد کی گواہی فراہم نہ کرسکے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کھڑکی بند کردی اور ٹیلی فون کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ چند چسکیاں لینے کے بعد اس نے کافی کا کپ ایک طرف رکھا اور فون کا ریسیور اٹھا کر پولیس ہیڈکوارٹر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ کال انسپکٹر کوپر نے ہی ریسیو کی تھی۔

”ہیلو انسپکٹر! مجھے یقین تھا کہ تم اس وقت بھی پولیس ہیڈکوارٹر میں ہی ہوگے۔ والڈو کے قاتل کا کچھ پتا چلا؟“ رچرڈ نے پوچھا۔

”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ تمہارا مفاد اس میں ہے کہ خود کو اس معاملے سے الگ رکھو۔“ ریسیور پر انسپکٹر کی غراہٹ سنائی دی۔

”مجھے افسوس ہے کہ اب میرا اس مسئلے سے الگ رہنا ممکن نہیں۔ والڈو کا قاتل اس وقت میرے فلیٹ پر موجود ہے، اسے آکر لے جاؤ۔“

”کیا مطلب؟“ آواز سے رچرڈ نے اندازہ لگایا جیسے وہ اپنی سیٹ سے اچھل پڑا ہو۔

”ایک منٹ۔“ انسپکٹر کوپر کی آواز سنائی دی۔ ”ہاں اب کہو میں سن رہا ہوں۔“

"میں نے کہا تھا کہ والڈو کا قاتل یہاں موجود ہے اسے آکر لے جاؤ۔ میں چونکہ اس کے جرم کا چشم دید گواہ تھا اس لیے وہ مجھے ختم کرنے آیا تھا لیکن خود پھنس گیا۔"

"تمہارے ساتھ اور کون ہے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "اور کون ہوسکتا ہے، اکیلا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں آرہا ہوں، چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔"

اس نے کپ میں بچی ہوئی کافی حلق میں انڈیلی اور فرش پر پڑا ہوا اعشاریہ دو دو کا پستول اٹھا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی بھاری قدموں کی آواز راہداری میں گونجی اور پھر دروازے پر تیز دستک سنائی دی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ انسپکٹر کوپر اکیلا ہی تھا۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کردیا اور فرش پر پڑے ہوئے آدمی کی طرف دیکھنے لگا جو ابھی تک گہرے سانسوں کے باوجود ہوش میں نہیں آسکا تھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ والڈو کو اسی نے گولی ماری تھی؟" انسپکٹر کوپر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" رچرڈ نے اثبات میں سر ہلادیا۔ "انسپکٹر جون کہاں ہے؟"

"وہ کسی اور کیس میں مصروف ہے۔" انسپکٹر کوپر نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ پاکر رچرڈ نے بے ہوش آدمی کے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسی کھول دی۔ کوپر نے اسے اوندھا کردیا اور اپنی بیلٹ میں اڑسی ہوئی ہتھکڑی نکال کر اس شخص کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ اس دوران قاتل بھی ہوش میں آچکا تھا۔ صورتِ حال سمجھ میں آنے کے بعد وہ رچرڈ کی طرف خونخوار نگاہوں سے دیکھنے لگا پھر دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے مسٹر! پولیس مجھے زیادہ دیر تک بند نہیں رکھ سکے گی۔ جیل سے نکلتے ہی میں سب سے پہلے تم سے نمٹوں گا۔"

انسپکٹر کوپر نے جھک کر ایک بھرپور گھونسا اس کے منہ پر رسید کردیا۔ اس کا سر فرش سے ٹکرایا اور وہ بے اختیار کراہ اٹھا پھر اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا۔ کوپر چند لمحے اس شخص پر جھکا رہا پھر سیدھا ہوتے ہوئے رچرڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

"اب بتاؤ، میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔" رچرڈ نے اس شخص کی آمد کی پوری تفصیل دہرادی لیکن لڑکی کا ذکر گول کرگیا۔ اس نے وہ پستول بھی کوپر کے حوالے کردیا جسے اس نے جیب میں ٹھونس لیا۔ وہ پلک جھپکے بغیر رچرڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ رچرڈ نے میز پر بکھرے ہوئے مہرے ڈبے میں بند کردیے۔ وہ ڈبا مینٹل پیس پر رکھ کر مڑا ہی تھا کہ انسپکٹر کوپر بولا۔

"جو شخص اعشاریہ دو دو کا پستول استعمال کرتا ہو۔ اس سے کسی حماقت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ تمہارے بیان کے مطابق دستک کے جواب میں جب تم نے دروازہ کھولا تو یہ شخص پستول کی زد میں تمہیں دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔ یہ تمہیں قتل کرنے کے ارادے سے یہاں آیا تھا تاکہ اس کے خلاف کوئی گواہی نہ دے سکو، گویا ہر لحاظ سے تم اکیلے تھے۔ اس وقت تمہارے پاس پستول وغیرہ بھی نہیں تھا لیکن اس پر یہ خطرناک شخص اپنے ارادے میں کامیاب ہونے کے بجائے تمہاری گرفت میں آگیا۔ بات کچھ حلق سے نہیں اترتی۔"

"کیا مطلب...... کیا کہنا چاہتے ہو؟" رچرڈ نے اسے گھورا۔

"میری زندگی کا بیشتر حصہ پولیس کی ملازمت میں گزرا ہے۔ تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟" انسپکٹر کوپر کی آنکھوں سے شبہ جھانک رہا تھا۔

"میں ایک ایسا خطرناک مجرم تمہارے حوالے کررہا ہوں جس کی تلاش میں تم عمر بھر بھٹکتے رہتے، اب اور کیا چاہتے ہو؟"

"تم نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ تمہارا قانونی اور اخلاقی فرض تھا۔ میں کچھ اور جاننا چاہتا ہوں۔" کوپر کی تیز نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔" رچرڈ نے گہرا سانس لیا۔ "یہاں میرا ایک دوست بھی موجود تھا جو میرا مددگار ثابت ہوا۔ جب دروازے پر دستک کی آواز ابھری ہم دونوں بیڈروم میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ وہ تو وہیں بیٹھا رہ گیا اور میں دروازہ کھولنے کے لیے اس طرف آگیا پھر صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہی وہ پردے کے پیچھے چھپ گیا اور موقع پاکر اس نے پیچھے سے اس شخص پر حملہ کردیا پھر اس پر قابو پانا زیادہ مشکل نہیں ہوا۔ میں نے اپنے دوست کو فوراً ہی رخصت کردیا تھا۔"

"اس کا نام اور پتا؟" انسپکٹر کوپر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے افسوس ہے۔" رچرڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "میں اپنے دوست کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔"

"اس کے لیے میری ایک شرط ہوگی۔"

"وہ کیا؟" رچرڈ نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہیڈ کوارٹر میں تم بیان دو گے کہ میں اس کیس کے سلسلے میں کچھ معلومات حاصل کرنے یہاں بیٹھا تم سے باتیں کررہا تھا کہ یہ شخص پستول تانے اندر گھس آیا۔ وہ ہم دونوں کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس پر حملہ کرکے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا۔" رچرڈ مسکرایا۔

"میرے لیے اس معمولی سی بات کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔ اگر تم میری مدد کرو گے تو میں تمہارے ساتھ تعاون کرتا رہوں گا۔"

"اور اگر انسپکٹر جون کو اس کی بھنک لگ گئی تو؟" رچرڈ بولا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" انسپکٹر کوپر نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ "تم اپنی زبان پر کنٹرول رکھنا، اس کہانی میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔"

☆☆☆

کمرے میں پانچ افراد تھے۔ انسپکٹر جون دیوار کے قریب ایک کرسی پر لاتعلق سا بیٹھا تھا جبکہ انسپکٹر کوپر بڑے فخریہ انداز میں اپنے کارنامے کی تفصیل بتارہا تھا جسے اسٹینو گرافر نوٹ کرتا جارہا تھا۔ میز پر والڈو کی ایک تصویر بھی نظر آرہی تھی۔ پولیس کے فوٹو گرافر نے تصویر کھینچتے وقت اپنی پوری مہارت صرف کردی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ تصویر لاش کی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زندہ سلامت سامنے بیٹھا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کا تاثر بھی تھا۔

رچرڈ جب واپس لوٹا تو رات اپنا نصف سفر طے کرچکی تھی۔ وہ برگنزا بلڈنگ کے دروازے سے چند گز دور ہی تھا کہ ایک سرگوشی سن کر ٹھٹک گیا۔ رچرڈ کو وہ نسوانی آواز پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا سڑک کے کنارے سیاہ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی جس کی تمام روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ سرگوشی کی آواز اس گاڑی سے ابھری تھی۔ وہ آگے بڑھ کر کھڑکی پر جھک گیا۔

"تم انتہائی احمق ہو۔ شاید تمہیں صورتِ حال کی نزاکت کا احساس نہیں۔" اس کا لہجہ بھی دھیما تھا۔

"اندر آجاؤ۔" گاڑی کے اندر سے پھر نسوانی آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی پسنجر سائڈ کا دروازہ کھل گیا۔ رچرڈ کے بیٹھتے ہی انجن اسٹارٹ ہوا اور گاڑی حرکت میں آگئی۔ پھر چرچ روڈ پر آتے ہی رفتار کم ہوگئی اس دوران، ان دونوں میں سے کسی نے زبان نہیں کھولی تھی۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی ایک پارکنگ میں داخل ہوگئی۔ رچرڈ نے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکی اس وقت میرون رنگ کا اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ ہاتھوں پر سفید دستانے بھی تھے اور گاڑی کے اندر روز آئل کی بھینی بھینی سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

"مجھے افسوس ہے میں وہاں زیادہ دیر نہیں رک سکی تھی۔ میرے جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟" لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر استفسار کیا۔

"میں نے اسے انسپکٹر کوپر کے حوالے کردیا تھا اور اس کی گرفتاری کا سارا کریڈٹ بھی اسے دے دیا تھا۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ والڈو کا قاتل تھا۔"

"اوہ......" لڑکی کے ہونٹوں سے سیٹی کی سی آواز نکلی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے انسپکٹر کوپر کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"تمہارے بارے میں تو میں کچھ جانتا بھی نہیں تھا، پولیس کو کیا بتاتا۔"

"ہاں، واقعی میں نے اپنے بارے میں تمہیں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔" لڑکی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ "میرا نام ایلن ہے، تم مجھے مسز فرینک بھی کہہ سکتے ہو۔ سانتا آنا میں الیکٹرونکس انڈسٹری کے حوالے سے مسٹر فرینک بارسلے کا نام تمہارے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔"

"فرینک بارسلے۔" رچرڈ چونک گیا۔ "لیکن تم واپس کیوں آئی ہو...... کیا اپنا اسکرٹ اور بلاؤز لینے کے لیے؟ مجھے بلڈنگ کے سامنے ہی بتادیا ہوتا میں بھاگ کر لے آتا۔"

"مجھے اسکرٹ اور بلاؤز کی کوئی فکر نہیں، میں تو اپنے موتی واپس لینا چاہتی ہوں۔"

"موتی!" رچرڈ اس طرح اچھل پڑا جیسے سیٹ میں کانٹے نکل آئے ہوں۔ اس وقت ایک تیز رفتار کار سامنے سڑک پر سے گزر گئی۔ وہ چند لمحے دور ہوتی ہوئی کار کی عقبی سرخ بتیوں کو دیکھتا رہا پھر ایلن کی طرف متوجہ ہوتا ہوا بولا۔

"بات...... ایک قتل سے شروع ہوئی تھی۔ جو گزرتے وقت کے ساتھ پیچیدگی اختیار کرتی چلی گئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نادانستگی میں جس لڑکی کی مدد کی ہے، وہ فرینک بارسلے جیسے شخص کی بیوی ثابت ہوگی اور موتی کا معاملہ...... صورتِ حال کچھ پراسرار رنگ اختیار کرتی جارہی ہے۔ میں اس

سلسلے میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے موتیوں کے بارے میں۔"

"میں والڈو یا باالفاظِ دیگر جوزف سے پانچ ہزار ڈالرز میں موتیوں کی اس مالا کا سودا کرنے آئی تھی جسے وہ چالاکی سے چرا کرلے گیا تھا۔"

"لیکن اس کی جیب سے مالا تو کیا ایک موتی بھی نہیں نکلا تھا۔ البتہ اس کی جیب سے ایک بڑی رقم برآمد ہوئی تھی۔ تلاشی میرے سامنے لی گئی تھی۔ ممکن ہے وہ مالا اس نے اپنے فلیٹ میں ہی کہیں چھپا رکھی ہو۔ بہرحال مسٹر فرینک اس وقت کہاں ہیں؟ کیا انہیں معلوم ہے کہ تم اس وقت کہاں گھوم رہی ہو؟"

"وہ اس وقت ایک کاروباری میٹنگ میں ہے اور میری سرگرمیوں سے قطعی لاعلم ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولنے لگی۔ "موتیوں کی وہ مالا مجھے سینڈر نے دی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ سچے موتی تھے جن کی قیمت پچیس ہزار ڈالرز کے قریب تھی۔ اکتالیس موتی تھے۔ اگر سینڈر ہوائی حادثے کا شکار نہ ہوتا تو آج میں اس کی بیوی ہوتی۔ سینڈر کا نام بھی تمہارے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔"

"بولتی رہو، میں سن رہا ہوں۔" رچرڈ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"وہ موتی چاندی کی زنجیر میں تھے۔ جن کے بیچ میں ایک سرخ ہیرا بھی جڑا ہوا تھا۔" ایلن کہنے لگی۔ "فرینک بارسلے سے شادی کے بعد میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ یہ مالا میں نے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے چند ڈالرز میں خریدی تھی۔ میں نے اسے موتیوں کی اصلیت سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ بہت حاسد اور شکی مزاج کا مالک ہے۔ پچھلے دنوں فرینک کاروباری سلسلے میں یورپ گیا تو میں نے تنہائی محسوس کرتے ہوئے جوزف کو ملازم رکھ لیا تھا۔ کبھی کبھار ہم لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے یا کسی ریسٹورنٹ میں رک کر چائے یا کولڈ ڈرنک وغیرہ لے لیتے۔ اس سے زیادہ میں نے اسے بے تکلف ہونے کی ہرگز اجازت نہیں دی تھی۔"

"گویا تم نے اسے موتیوں کی مالا کے بارے میں بتا دیا تھا؟" رچرڈ نے کہا تو چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایلن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، جب فرینک یورپ کے دورے سے واپس آیا تو اس نے جوزف کو ملازمت سے نکال دیا اور وہ جاتے ہوئے چالاکی سے مالا بھی لے گیا۔ کیونکہ وہ موتیوں کی اصلیت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے پانچ ہزار ڈالرز کا مطالبہ کر ڈالا۔ میں اس کے خلاف پولیس سے مدد بھی نہیں لے سکتی تھی، کیونکہ اس طرح شوہر کے سامنے موتیوں کا راز کھل جاتا۔ جوزف بھی شاید اسی لیے مجھ سے خوف زدہ نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنی رہائش گاہ کا پتا بھی بتا دیا تھا۔"

"اور تمہارے خیال میں وہ مالا جوزف کے اپارٹمنٹ ہی میں کسی جگہ ہو سکتی ہے۔ فلیٹ کا نمبر تم نے اکتیس ہی بتایا تھا نا؟" رچرڈ نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، کیا تم میرا یہ کام کر سکتے ہو؟ میں تمہیں اس کا معاوضہ دوں گی۔" ایلن نے پُرامید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں صبح کے اخبار میں جوزف کی تصویر کی اشاعت کے بعد اس کے اپارٹمنٹ پر پولیس پہنچ جائے گی لیکن میں آج ہی رات کوشش کروں گا۔ اب تم مجھے برگنزا بلڈنگ کے قریب کہیں اتار دینا۔" رچرڈ نے کہا۔

گاڑی اسٹارٹ ہو کر پارکنگ لاٹ سے نکل آئی۔ اس مرتبہ رفتار تیز تھی۔ کچھ ہی دیر بعد کار برگنزا بلڈنگ سے تقریباً دو سو گز دور ایک گلی کے موڑ پر رک گئی۔ رچرڈ نے دروازہ کھول دیا۔

"کیا میں یہاں رک کر تمہارا انتظار کروں؟" ایلن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

رچرڈ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کوئی جواب دیے بغیر نیچے اتر آیا اور تیز قدموں سے اپنی گلی کی طرف چل دیا۔ بلڈنگ کے سامنے پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ لابی سنسان پڑی تھی۔ وہ لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر چلا گیا اور محتاط نگاہوں سے راہداری میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا دبے قدموں فلیٹ نمبر اکتیس کے سامنے پہنچ گیا۔ فلیٹ میں تاریکی تھی۔ اس نے احتیاطاً ہلکی سی دستک دی پھر کوئی جواب نہ پا کر جیب سے فلیٹ کی چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی منتخب کر کے دروازے کے قفل میں داخل کر دی۔ تالا کھولنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ کمرے کے اندر موجود تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی تمباکو کی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ لائٹ جلا کر متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میز پر ایش ٹرے میں سگریٹ کے چار ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔

وہ وہاں سے ہٹ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ اس نے باتھ روم کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جہاں مالا چھپائی جا سکتی ہو۔ وہ لیونگ روم میں آ گیا۔ اسے یہاں موتیوں کی مالا ملنے کی توقع نہیں تھی۔ نہ وہ اس مقصد سے یہاں آیا تھا۔ وہ تو کچھ اور ہی دیکھنے کے لیے فلیٹ میں داخل ہوا تھا۔

رچرڈ نشست گاہ میں مختلف چیزوں کو دیکھتا ہوا خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں کھول کر دیکھیں لیکن کوئی کام کی چیز نظر نہیں آئی۔ وہ بیڈ کی پچھلی طرف چلا گیا جہاں دیوار پر ایک بھاری پردہ آویزاں تھا۔ اس بلڈنگ کے تمام فلیٹ ایک ہی جیسے تھے اور وہ جانتا تھا کہ اس پردے کے پیچھے وہ مختصر سی جگہ ہے جسے اسٹور روم کا نام دیا گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹایا اور دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔

وہ یقیناً ایک لاش تھی۔ درمیانہ قد، دبلا پتلا جسم، کنپٹیوں پر سفید بال، آنکھیں باہر کو ابلتی ہوئی اور زبان باہر کو لٹک رہی تھی۔ اس کے گلے میں ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ رچرڈ کے اندازے کے مطابق اس شخص کی عمر چالیس پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ آگے بڑھ کر بڑی احتیاط سے اس کے لباس کی تلاشی لینے لگا لیکن سگریٹ کیس کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی جس سے شناخت ہو سکتی ہو۔ ایک اور خیال کے تحت اس نے سگریٹ کیس کھول لیا اور پھر اس کے اندر سگریٹوں کے نیچے کاغذ کی ایک چٹ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

چٹ پر گرین وڈ کے ایک مکان کا پتا لکھا ہوا تھا۔ یہ پتا ذہن نشین کرتے ہوئے اس نے سگریٹ کیس دوبارہ اس کی جیب میں ڈال دیا مگر کوٹ درست کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر چونکنا پڑا۔ کوٹ کے نیچے ایک بغلی ہولسٹر بھی موجود تھا جس سے نو ایم ایم کے پستول کا دستہ جھانک رہا تھا۔ اس پستول کی موجودگی اسے پیشہ ور ثابت کر رہی تھی لیکن وہ غالباً اپنے فن میں اتنا ماہر نہیں تھا...... کسی نہتے سے مار کھا گیا تھا۔ گلے میں رسی کا پھندا اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ اسے انجام تک پہنچانے والے نے کسی ہتھیار سے مدد نہیں لی تھی۔ رچرڈ لاش کا جائزہ لیتے ہوئے سوچنے لگا کہ اس کے مرنے سے پہلے صورتِ حال کیا ہوگی۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑوں کی موجودگی سے اندازہ لگایا کہ مقتول نشست گاہ میں بیٹھا ہوا والڈو سے کسی مسئلے پر بات کر رہا ہوگا کہ والڈو نے اچانک ہی اچھل کر اس کا گلا دبوچ لیا اور اس شخص کو اپنا پستول استعمال کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

والڈو کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے اس شخص کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر اسے اسٹور روم میں ڈال دیا اور انتہائی عجلت میں فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ اسے غالباً ایلن کی تلاش تھی۔ یہ اس کی عجلت ہی تھی کہ وہ بار میں داخل ہوتے وقت اپنی گاڑی کا انجن چلتے ہوئے چھوڑ گیا تھا اور بعد میں اس کے قاتل نے فرار ہونے کے لیے وہی گاڑی استعمال کی۔ رچرڈ کچھ سوچ کر ایک بار پھر لاش کی تلاشی لینے لگا۔ اس مرتبہ اسے پتلون کی جیب سے ایک رومال اور چابیوں کا ایک گچھا مل گیا جس کے ساتھ پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا گول ٹکڑا بھی منسلک تھا جس پر سرخ حروف میں پیکارڈ ہاؤس لکھا ہوا تھا۔ اس نے چابیوں کا گچھا جیب میں ڈال لیا اور رومال سے ہر جگہ اپنی انگلیوں کے نشانات مٹاتا ہوا باہر نکل گیا۔ جب وہ عمارت سے باہر نکل کر گلی کے موڑ پر پہنچا تو کار وہاں موجود تھی۔

ایلن اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی۔ رچرڈ کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے جلدی سے پسنجر سیٹ پر جھکتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

"تمہارے سینٹ کی خوشبو سے تو میرا دم گھٹ جائے گا۔" رچرڈ نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا رہا؟" ایلن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے امید افزا لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں، تم اب خاموشی سے گھر جاؤ اور بھول جاؤ کہ کبھی مجھ سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ سمجھو کہ تم نے زندگی میں کبھی مجھے دیکھا تک نہیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔" رچرڈ نے کہا۔

"لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" رچرڈ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ضرورت ہوئی تو میں خود تم سے رابطہ قائم کروں گا۔" وہ دروازہ کھول کر نیچے آ گیا۔ ایلن چند لمحے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

رچرڈ اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک کہ کار کی جلتی سرخ بتیاں اندھیرے میں مدغم نہ ہو گئیں۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ اسے چرچ روڈ پر واقع اس پارکنگ لاٹ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی جہاں کچھ دیر پہلے ایلن کے ساتھ آیا تھا۔ ایک گاڑی اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کر دیا سلائی

جلائی اور اس کی روشنی میں ونڈ اسکرین پر چسپاں اسٹیکر کا جائزہ لینے لگا۔ اسٹیکر پر پیکارڈ ہاؤس کے الفاظ ماچس کی سرخ روشنی میں چمک رہے تھے۔

اس نے دیا سلائی بجھا کر چابیوں کا وہ گچھا نکال لیا جو والڈو کے فلیٹ میں لاش کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ چابی لگاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور اگلے ہی لمحے وہ انجن اسٹارٹ کر رہا تھا۔

☆☆☆

کنکسلے کے علاقے میں واقع وہ مکان چاروں طرف سے شاہ بلوط کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ اصل عمارت اگرچہ زیادہ بڑی نہیں تھی مگر اس کے چاروں طرف زمین ہی زمین تھی جسے تقریباً چار فٹ اونچی دیوار نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ گیٹ کے سامنے دائیں طرف گیراج تھا جس کا گیٹ کھلا ہوا تھا مگر اس کے اندر کوئی گاڑی کھڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ پورچ میں بھی کوئی گاڑی نہیں تھی۔

رچرڈ گاڑی سے اتر کر برآمدے میں پہنچ گیا اور اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ دروازہ دو منٹ سے پہلے نہیں کھلا۔ وہ لڑکی ناکافی لباس میں تھی اور اس کے ہونٹوں میں ایک سگریٹ ہولڈر دبا ہوا تھا۔ ”کیا بات ہے مسٹر؟“ اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”میں تمہاری گم شدہ کار لوٹانے کے لیے آیا ہوں، تمہیں شاید ابھی تک اپنی کار کی گمشدگی کا علم نہیں ہوسکا۔“

”میری کار؟“ لڑکی کے لہجے میں حیرت تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر برآمدے کی بتی جلا دی۔

”ہاں تمہاری کار۔“ رچرڈ نے اس سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ وہ گہری نظروں سے لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی عمر بیس اکیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ اگرچہ حسین نہیں تھی لیکن اسے قبول صورت کہا جاسکتا تھا۔ کار کے ذکر پر وہ کچھ بدحواس سی ہوگئی۔ رچرڈ اس کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دروازے میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک مختصر سا ہال کمرا تھا جس کی دیواروں پر خوب صورت رنگین شیڈ والے الیکٹرک لیمپ روشن تھے۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور قیمتی فرنیچر آراستہ تھا۔

”اپنا تعارف نہیں کراؤ گی؟“ رچرڈ اس کی طرف مڑ کر مسکرایا۔

”میں انیتا ہوں مگر تم کون ہو اور اس طرح گھر کے اندر گھس آنے کا مطلب کیا ہوسکتا ہے؟“ لڑکی نے ناگوار نگاہوں سے گھورتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

رچرڈ نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی نے کارڈ ہاتھ میں لیے بغیر آگے جھک کر دیکھا پھر سیدھی ہوتی ہوئی بڑبڑائی۔

”پرائیویٹ سراغ رساں! کیا چاہتے ہو؟“

”یہ کار کس کے استعمال میں تھی؟“ رچرڈ نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

اسی لمحے جھالروں والے پردے کے پیچھے سے کسی مرد کے کھانسنے کی آواز آئی۔ لڑکی اس طرح اچھل پڑی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، پھر فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے مسکرائی۔ ”کار یہاں تک لانے کا شکریہ۔ میرا خیال ہے انعام کے طور پر دس ڈالر کافی ہوں گے۔“

”بالکل نہیں۔“ رچرڈ بالکل پُرسکون لہجے میں بولا۔

”وہ مر چکا ہے۔“ لڑکی ایک بار پھر اچھل پڑی۔ اس مرتبہ اس کے چہرے پر خوف کے سائے ابھر آئے تھے۔ اسی لمحے پردے کی دوسری طرف میز پر کوئی بھاری چیز رکھنے کی آواز ابھری۔ رچرڈ کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ ایک بھاری ہاتھ نے جھالروں کا پردہ ایک طرف ہٹا دیا اور ایک ادھیڑ عمر بھاری بھر کم شخص سامنے آگیا۔ اس کے جسم پر ریشمی گاؤن تھا اور سیدھا ہاتھ گاؤن کی جیب میں تھا۔ رچرڈ کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس کی جیب میں پستول موجود ہے۔ لیکن اس کا چہرہ دیکھتے ہی وہ چونک گیا، وہ فرینک بارسلے تھا۔

”کیا بات ہے ہنی! یہ شخص کون ہے اور اتنی رات گئے اس کے یہاں آنے کا کیا مطلب ہے؟“ فرینک انیتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں ناگواری اور تلخی تھی۔

”میں مس انیتا کی کار واپس کرنے آیا تھا۔“ رچرڈ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا۔

”وہیں رک جاؤ۔“ فرینک کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ”تمہاری بات میں وہاں سے بھی سن سکتا ہوں۔ خیال رہے میری جیب میں پستول موجود ہے اور میں اس کا استعمال بھی جانتا ہوں۔ اب بتاؤ تم کار کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟“

”جو شخص کار لے کر گیا تھا وہ اب اس قابل نہیں رہا کہ کار کو واپس لا سکتا۔“ رچرڈ نے کہتے ہوئے اسے بھی اپنا کارڈ دکھایا پھر بولا۔ ”کیا ہم اطمینان سے بات نہیں کرسکتے؟“

”ٹھیک ہے تم اندر آجاؤ۔ انیتا! میں اس سے بات

کرلیتا ہوں۔“ فرینک نے انیتا کو اشارہ کیا۔ وہ باری باری ان دونوں کو دیکھتی ہوئی پردے کے پیچھے چلی گئی۔

فرینک پھر رچرڈ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم نے کسی مردہ شخص کی جیب سے چابیاں نکالیں اور کار لے کر یہاں چلے آئے لیکن پولیس کا کام پرائیویٹ سراغ رسانوں نے کب سے سنبھال لیا۔ بہرحال میں تمہارا موقف سننے کو تیار ہوں۔ اندر آجاؤ۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے جھالروں کا پردہ ہٹا دیا۔

رچرڈ اندر داخل ہوگیا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے رچرڈ نے اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکتے دیکھے۔ یہ شاید کسی خوف کا نتیجہ تھا۔ یہ ایک وسیع کمرا تھا جو خوب صورت طریقے سے آراستہ تھا۔ ایک طرف آرام دہ مسہری بچھی ہوئی تھی۔ انیتا مسہری پر نیم دراز تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے فرینک ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک جیب میں پستول کے دستے پر تھا۔ غالباً وہ کسی قسم کی غفلت نہیں برتنا چاہتا تھا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہنی!“ فرینک انیتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر رچرڈ نے کسی مردہ شخص کی جیب میں پیکارڈ کی چابیاں دیکھیں تو انہیں خیال آیا کہ شاید ہمیں اس معاملے سے کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے۔ اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو چائے بنا لاؤ۔“

انیتا کمرے سے چلی گئی۔ رچرڈ نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کش لیتے ہوئے فرینک کو اس واقعے کی تفصیل بتانے لگا لیکن اس میں کسی حد تک مبالغہ آمیزی بھی تھی۔ جوزف عرف والڈو کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ بھی اس عمارت کے ایک اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھا اور رچرڈ ایک معاملے میں اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے لیو کے بار روم میں پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بھی بتائی لیکن ایلن کا ذکر گول کر گیا۔

”پولیس ابھی تک جوزف کو شناخت نہیں کرسکی ہے جبکہ مجھے اس کے فلیٹ میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔“ رچرڈ نے آخر میں بتایا۔

”کیوں تم اس کے فلیٹ میں کیوں گئے تھے؟“ فرینک نے اسے گھورا۔

”میرے کام کی نوعیت سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ مجھے کچھ خطوط کی تلاش تھی جن کے بارے میں خیال تھا کہ وہ جوزف کے فلیٹ میں ہی ہوں گے۔“ رچرڈ نے دروغ گوئی کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ اس دوران انیتا چائے لے کر آگئی۔ رچرڈ نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”مجھے وہاں مطلوبہ خطوط تو نہیں مل سکے البتہ ایک آدمی کی لاش نظر آگئی۔ درمیانے قد کے اس شخص کی عمر چالیس اور پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔“ رچرڈ اسے مقتول کا حلیہ بتانے لگا۔

”اوہ! کیا تم بلیک میلنگ کے کسی کیس پر کام کر رہے ہو؟“ فرینک نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ جوزف کے فلیٹ میں پائے جانے والے مقتول کے پاس ایک عدد پستول بھی تھا جسے استعمال کرنے کا اسے موقع نہیں مل سکا شاید۔“

”کیا اس کی جیب میں پانچ ہزار ڈالرز کی رقم موجود تھی؟“

”نہیں، البتہ جوزف کو جب بار میں قتل کیا گیا تو اس کی جیب سے اچھی خاصی رقم برآمد ہوئی تھی۔“

”ہوں۔“ فرینک نے ہنکارا بھرا۔ ”میں نے جوزف کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ مجھ پر کسی کے قتل کا الزام تو عائد نہیں ہوسکتا لیکن میں چشم تصور سے دیکھ رہا ہوں کہ میری بیوی مجھ سے طلاق حاصل کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔“

مونچھیں

مونچھیں تراشنا ایک مشکل فن ہے کہ بندہ ساری زندگی یہ کام کرنے کے بعد بھی اس میں ماہر نہیں ہوتا البتہ وہ متحمل مزاج اور متوازی شخصیت کا مالک ضرور ہو جاتا ہے۔ مونچھیں تراشنا جلد باز اور انتہا پسند شخص کے بس کا روگ نہیں۔ مونچھیں تراشنے والا تو جیب تراش کی طرح ہوتا ہے کہ ذرا سی غلطی سے دونوں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ جب تک مونچھ نہ ہو کوئی پنجابی فلم نہیں بن سکتی۔ پہلے تو اردو فلموں میں بھی اس کی ضرورت پڑتی تھی اور ہیرو کی ناک کے نیچے یوں پٹی ہوتی جیسے کسی اہم سطر کو انڈر لائن کیا گیا ہو۔

مونچھیں تو آپ کے برے وقت کی ساتھی ہیں۔ آپ کسی کی گردن نہیں مروڑ سکتے۔ آپ کو باغبانی کا شوق ہے تو مونچھوں کی پرورش اور کانٹ چھانٹ کر اپنا یہ شوق پورا کرلیں۔

(ڈاکٹر یونس بٹ)

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

رچرڈ کے دل میں تو آئی کہ وہ اس سے پوچھے کہ ایلن جیسی حسین بیوی کو چھوڑ کر اس بازاری عورت کے ساتھ کیوں ہے لیکن اس کے بجائے اس نے دوسرا سوال کر ڈالا۔ ”یہ دوسرا آدمی کون تھا جس کی لاش میں جوزف کے فلیٹ میں دیکھ کر آیا ہوں؟“

”ولسن! وہ میرا قابل اعتماد آدمی تھا۔ یہیں رہا کرتا تھا انیتا کے ساتھ۔ دراصل کچھ عرصہ پہلے انیتا نے میرے اکاؤنٹ سے کچھ شاپنگ کی تھی جس کے بل ڈیپارٹمنٹل اسٹور نے یہاں بھیج دیے تھے۔ ادائیگی کے وہ بل میں نے اپنے بریف کیس میں رکھ لیے جو کسی طرح جوزف کے ہاتھ لگ گئے۔ وہ ان بلوں کی واپسی کے لیے سودے بازی کرنا چاہتا تھا۔ آج میں نے ولسن کو رقم دے کر بھیجا تھا تا کہ اس کا منہ بند کر کے بل واپس لے آئے کیونکہ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے رقم نہ دی تو وہ تمام بل ایلن کے حوالے کر دے گا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا ہوگا؟“

”سیدھی سی بات ہے۔“ رچرڈ نے کہا۔ ”سودے بازی میں ان دونوں میں تلخی ہوگئی ہوگی اور پھر اس سے قبل کہ تمہارے ولسن کو پستول نکالنے کا موقع ملتا، جوزف کا داؤ چل گیا۔ اس نے ولسن کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کے بعد اس نے ولسن کی جیب سے رقم بھی نکالی اور اپنے دوسرے شکار سے ملاقات کے لیے چل دیا ہوگا۔“

”بڑی عجیب سی صورت حال ہے۔ معاملہ اچھا خاصا الجھ چکا ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکتے ہو؟“ فرینک نے کہا۔

”میں اگرچہ ایک دوسری پارٹی کے لیے کام کر رہا ہوں لیکن تمہارا کیس لینے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ تمہارے کیس پر کام کر سکتا ہوں۔“ رچرڈ نے کہا۔

”تم شاید بھول رہے ہو کہ مطلوبہ خطوط بھی ان میں شامل ہو سکتے ہیں۔“ فرینک نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں پھر کسی وقت تم سے رابطہ قائم کروں گا۔“ رچرڈ کہتا ہوا اٹھ گیا۔

رچرڈ جب برگنز ابلڈنگ کے سامنے پہنچا تو رات کے تین بج چکے تھے۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی اس کی چھٹی حس خطرے کا اعلان کرنے لگی۔ چوتھی منزل پر لفٹ سے راہداری میں نکلتے ہوئے بھی وہ خاصا محتاط تھا۔ وہ چوکنا قدموں سے اپنے فلیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر اس نے جیب سے چابی نکال کر قفل میں لگائی۔ دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو کر بتی جلانے کے لیے اس نے دیوار کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ چٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ کمرا روشنی میں نہا گیا۔ وہ تیزی سے مڑا۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایزی چیئر کے قریب میز پر رکھا ہوا لیمپ روشن ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں انسپکٹر کوپر کے چہرے پر جم گئیں جو ایزی چیئر پر بیٹھا ہوا اس کی طرف معنی خیزی سے دیکھ رہا تھا۔ دائیں طرف دیوار کے قریب دوسری کرسی پر انسپکٹر جون براجمان تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”مجھے علم نہیں تھا کہ تمہیں رات رات بھر آوارہ گردی کا بھی شوق ہے۔“ انسپکٹر کوپر نے مسکرانے کی کوشش میں پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کی۔

رچرڈ نے جواب دینے کے بجائے دروازہ بند کر دیا اور انسپکٹر جون کی طرف دیکھنے لگا جو خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یوں اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ اس بے جا مداخلت پر تاسف کا اظہار کر رہا ہو۔

”میں اس طرح کی مداخلت کو پسند نہیں کرتا، کیا میں اس کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟“ رچرڈ نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھی تم جیسے لوگ یعنی پرائیویٹ سراغ رساں بالکل پسند نہیں۔“ کوپر بولا۔ ”آج پہلی مرتبہ دل کے ارمان نکالنے کا موقع ملا ہے۔“ اس کے دوسرے جملے میں خباثت بھری ہوئی تھی۔ اس نے جھک کر میز کے نیچے سے نیلے رنگ کا اسکرٹ اور بلاؤز نکال کر میز پر رکھ دیا۔ ”ایسے لباس تم نے کب سے پہننے شروع کر دیے مسٹر رچرڈ؟“

رچرڈ جواب دینے کے بجائے خاموش کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ انسپکٹر کوپر اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا اور دوسرے ہی لمحے چٹاخ کی آواز کے ساتھ ہاتھ رچرڈ کے منہ پر پڑا۔ رچرڈ کا دماغ ہل گیا لیکن اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ انسپکٹر جون کسی اور طرف دیکھنے لگا تھا۔ کوپر کے منہ سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی۔ ”تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تم جیسے لوگ......“ غصے کی شدت سے وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ وہ بار بار مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ ”یہ کپڑے تم نے کہاں سے لیے تھے؟“ وہ غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”یہ ایک خاتون کی ملکیت ہیں۔“ رچرڈ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ ایسا لباس صرف ایک عورت ہی استعمال کر سکتی ہے۔ میں اس کا نام جاننا چاہتا ہوں۔“ انسپکٹر کوپر دہاڑا۔ ”میں بتاتا ہوں، یہ اس لڑکی کا ہے

جسے تلاش کرتا ہوا والڈو بار میں گیا تھا اور اس کے دو منٹ بعد موت کا شکار ہو گیا تھا۔

”تم نے مجھے اس لڑکی کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ ذاتی مفاد کے لیے اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ تم اس لڑکی کے بارے میں جانتے تھے اور تمہیں یہ بھی علم تھا کہ والڈو کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ تم یہ بھی جانتے تھے کہ والڈو کا اصل نام جوزف ہے اور وہ اپنے اپارٹمنٹ میں ایک آدمی کو قتل کر چکا ہے اور فرار کی راہیں تلاش کر رہا ہے لیکن ناگہانی طور پر یہ لڑکی درمیان میں ٹپک پڑی۔ اسے پولیس کی نگاہوں سے بچانے کے لیے تم نے اسے دوسرا لباس فراہم کر کے یہ لباس اپنے گھر میں چھپا دیا۔ شرم آنی چاہیے تمہیں مسٹر رچرڈ! پولیس سے تعاون کرنے کے بجائے تم ہمارے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہو۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

”یہ درست ہے کہ لڑکی کو یہاں سے نکلنے کے لیے میں نے دوسرا لباس فراہم کیا تھا لیکن والڈو کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔“ رچرڈ کے لہجے میں معصومیت تھی۔

اس کی اس بے نیازی پر انسپکٹر کوپر کے جبڑے بھنچ گئے مگر اسے کچھ کہنے یا کرنے کا موقع دینے سے پہلے انسپکٹر جون اٹھ کر قریب چلا گیا اور رچرڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”والڈو ڈکیتی کی وارداتوں میں متعدد شہروں کی پولیس کو مطلوب تھا۔ آخری مرتبہ مشی گن میں ایک بینک لوٹنے کے بعد وہ روپوش ہو گیا مگر اس کا ساتھی ٹسولی پولیس کے ہاتھ آ گیا جسے چار سال کی سزا ہو گئی۔ سزا بھگتنے کے بعد ٹسولی، والڈو کو تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا اور پھر یہ محض اتفاق ہی تھا کہ گزشتہ شام بار میں ان دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا اور ٹسولی نے اسے گولی مار دی۔“

رچرڈ نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ انسپکٹر کوپر چند لمحے کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر غراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تم پر شروع سے ہی شبہ تھا۔ تمہارے فلیٹ سے ٹسولی کی گرفتاری کے بعد میرے شبے کو کچھ اور تقویت ملی۔ میں تم سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے جون کو ساتھ لے کر یہاں آ گیا۔ اتفاق سے والڈو کی تصویر اس وقت میری جیب میں تھی میں نے عمارت کے چوکیدار کو تصویر دکھائی تو اس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ چوکیدار کے بیان کے مطابق وہ جوزف کے نام سے فلیٹ نمبر اکتیس میں رہائش پذیر تھا۔ چنانچہ ہم اس فلیٹ میں گھس گئے جہاں ایک لاش نے ہمارا استقبال کیا۔ لاش کے گلے پر انگلیوں کے نشانات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اسے والڈو ہی نے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا تھا لیکن ابھی تک مقتول کی شناخت نہیں ہو سکی۔“

”ہوں......“ رچرڈ نے گہرا سانس لیا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ شاید تم مجھے قتل کے الزام میں پھانسنے کی کوشش کرو گے۔“

”تمہیں آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے لیے میرے پاس اور بہت سے جواز موجود ہیں۔“ انسپکٹر کوپر غرایا۔ ”مثال کے طور پر ہمیں وہ کار مل گئی ہے جو والڈو نے کرائے پر حاصل کی تھی اور کار سے برآمد ہونے والی کچھ چیزیں بھی ہمارے قبضے میں آ چکی ہیں۔“

رچرڈ چونک گیا۔ اس نے سگریٹ کا آخری کش لگا کر اسے ایش ٹرے میں مسل دیا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے انسپکٹر کوپر کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ دیکھو۔“ کوپر نے کہتے ہوئے ایک پوٹلی سی پتلون کی جیب سے نکال کر میز پر رکھ دی۔ کوئی چیز رومال میں بندھی ہوئی تھی۔ اس نے گرہیں کھول کر رومال کو پھیلا دیا۔ رچرڈ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ وہ موتیوں کی مالا تھی جس کے موتی بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ ”مسٹر سراغ رساں!“ انسپکٹر کوپر اسے طنزیہ لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم ان موتیوں کے بارے میں کوئی کہانی سنانا پسند کرو گے؟“

رچرڈ میز کے قریب پہنچ گیا۔ اس کی نظریں مالا پر جمی ہوئی تھیں جس کا سب سے بڑا موتی حجم میں ایک تہائی انچ کے قریب تھا۔ باقی موتی تقریباً یکساں جسامت کے تھے۔ اس نے جھک کر مالا اٹھالی۔ ”گڈ!“ وہ باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب میں کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ ان موتیوں نے بہت سے ہنگاموں کو جنم دیا ہے۔ یہ یقیناً بہت قیمتی ہیں۔“

”قیمتی!...“ انسپکٹر جون نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”ایسے نقلی موتیوں کی مالا چند ڈالر میں کہیں سے بھی خریدی جا سکتی ہے۔“

”نقلی کیا مطلب؟“ رچرڈ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”موتیوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔ یہ نقلی ہیں۔“ انسپکٹر مسکرا کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ والڈو بے چارہ مفت میں ہی مارا گیا۔“ رچرڈ نے افسوس کا اظہار کیا۔ وہ انسپکٹر کوپر کو نہیں دیکھ سکا تھا جو اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا

تھا۔ اسے پتا تو اس وقت چلا جب کوپر کا گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ رچرڈ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ وہ زبان پر خون کا ذائقہ محسوس کر رہا تھا۔

''یہاں بیٹھ جاؤ اور ساری بات تفصیل سے بتاؤ۔ تمہاری وجہ سے ہمیں جو ذلت اور تکلیف اٹھانی پڑی ہے میں گن گن کر اس کا حساب چکاؤں گا۔ یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اگر جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو بھیجا اڑا دوں گا۔'' انسپکٹر کوپر سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔

رچرڈ کرسی پر بیٹھ کر رومال سے ہونٹ صاف کرنے لگا۔ وہ چند لمحے خونخوار نگاہوں سے کوپر کی طرف دیکھتا رہا پھر انسپکٹر جون کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''موتیوں کی یہ مالا تمہیں والڈو کی کار سے ملی تھی کیا، اس کے ساتھ کسی قسم کے کاغذات بھی تھے؟''

''نہیں۔'' جون نے نفی میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے اب میرے لیے بھی چھپانا بیکار ہے۔'' رچرڈ کہنے لگا۔ ''گزشتہ شام بار میں داخل ہونے سے پہلے میں نے کبھی والڈو کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑکی کے بارے میں بھی میں نے پہلی مرتبہ اس سے سنا تھا پھر جب میں بار سے نکل کر برگنزا بلڈنگ پہنچا تو چوتھی منزل کی راہداری میں اس حلیے کی ایک لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ اس کیس میں پولیس کے لیے اہم گواہ ثابت ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ میں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ اگر وہ لڑکی فوری طور پر سامنے آ گئی تو کسی مصیبت میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ اس کا احساس خود اس لڑکی کو بھی نہیں تھا۔ میں اسے اپنے فلیٹ میں لے آیا لیکن موقع پاتے ہی اس نے ہینڈ بیگ سے پستول نکال لیا۔''

انسپکٹر کوپر ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ رچرڈ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''والڈو نے یہاں آ کر اپنا نام جوزف رکھ لیا تھا۔ وہ شوفر کی حیثیت سے ایلن نامی اس لڑکی کے ہاں ملازم تھا۔ اس کا شوہر ان دنوں ملک سے باہر تھا۔ موتیوں کی یہ مالا ایلن کے محبوب نے شادی سے بہت پہلے اسے تحفے میں دی تھی مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد ایک ہوائی حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا اور ایلن نے اپنے موجودہ شوہر سے شادی کر لی۔ مالا کے بارے میں اس نے اپنے شوہر کو یہی بتایا تھا کہ موتی نقلی ہیں اور یہ مالا اس نے چند ڈالر میں ایک دکان سے خریدی ہے۔ وہ موتیوں کی اصلیت بتا کر اپنے شوہر کے دل میں اپنے محبوب کے لیے حاسدانہ جذبات پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''بہرحال ایلن کا شوہر جب یورپ کے دورے سے واپس آیا تو اس نے جوزف کو ملازمت سے نکال دیا کیونکہ اس کے خیال میں جوان بیوی کی موجودگی میں ایک جوان اور خوبرو شخص کو گھر میں ملازم نہیں رکھنا چاہیے۔ گھر سے رخصت ہوتے ہوئے جوزف کا داؤ چل گیا اور وہ موتیوں کی مالا بھی ساتھ لے گیا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ جوزف کو معلوم نہیں تھا کہ یہ موتی نقلی ہیں؟'' انسپکٹر جون نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اگر یہ موتی نقلی ہیں تو مجھے شبہ ہے کہ اس دوران موقع پا کر جوزف نے مالا کے موتی بدل دیے ہوں گے۔'' رچرڈ نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہو سکتا ہے بہرحال آگے کہو۔'' انسپکٹر جون نے کہا۔

''ایلن کے گھر سے نکالے جانے کے وقت جوزف مالا کے علاوہ اس کے شوہر مسٹر فرینک کے بریف کیس سے کچھ ایسے کاغذات بھی چرا کر لے گیا جو کسی اور عورت سے اس کے ناجائز تعلقات کا ٹھوس ثبوت فراہم کر سکتے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی کو بلیک میل کرتا رہا اور لطف کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں اس حقیقت سے لاعلم تھے کہ وہ ایک ہی شخص کے ستم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہیں یا نہیں؟'' اس نے رک کر انسپکٹر کوپر کی طرف دیکھا۔

''احمق نہیں ہوں، سمجھ رہا ہوں۔ تم اپنی بکواس جاری رکھو۔'' انسپکٹر کوپر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

''جوزف ان سے خوف زدہ نہیں تھا۔'' رچرڈ نے کہنا شروع کیا۔ ''یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی رہائش گاہ کا پتا بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ گزشتہ شام ایلن پانچ ہزار ڈالرز لے کر آئی تھی تاکہ اس سے اپنی مالا واپس لے سکے۔ ان دونوں نے ایک طے شدہ وقت پر گلی میں ملنے کا پروگرام طے کیا تھا لیکن جوزف وہاں نہیں پہنچا تو ایلن عمارت میں داخل ہو گئی جہاں میری اس سے ملاقات ہوئی اور میں اسے اپنے فلیٹ میں لے آیا۔ اسی دوران تسولی بھی آ گیا۔ اس نے میرے سامنے والڈو کو قتل کیا تھا۔ میں اس کے جرم کا چشم دید گواہ تھا اور وہ مجھے ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے فلیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایلن بیڈروم میں چھپ گئی تھی۔ ہماری باتوں کے دوران اس نے موقع پا کر پیچھے سے تسولی کے سر پر ضرب لگائی جس سے مجھے تسولی پر قابو پانے کا موقع مل گیا۔''

انسپکٹر کوپر کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے دفتر میں انسپکٹر جون اور اپنے چیف کے سامنے ڈینگ ماری تھی کہ تسولی کو گرفتار کرنے کے لیے اس نے جان کی بازی لگا دی تھی۔

پولیس چیف کی طرف سے تسولی کی ڈرامائی گرفتاری کی خبر اور انسپکٹر کوپر کے کارنامے کو بڑھا چڑھا کر اخبارات میں دے دیا گیا تھا۔ لیکن اب انسپکٹر جون کے سامنے اس کا راز فاش ہو گیا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا رچرڈ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ جیسے اس کے لیے غصہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہو۔ انسپکٹر جون نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر رچرڈ کی طرف گھومتے ہوئے بولا۔ ''بس یا کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو؟''

''والڈو کے اپارٹمنٹ کا نمبر مجھے ایلن نے ہی دیا تھا۔'' رچرڈ کہنے لگا۔ ''میں اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تو مجھے ایک لاش کا سامنا کرنا پڑا۔ تلاشی کے دوران اس کی جیب سے پیکارڈ کی چابیوں کا ایک گچھا برآمد ہوا۔ چابی سے منسلک ایک اسٹیکر کے ذریعے میں مسٹر فرینک کی داشتہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں فرینک بھی موجود تھا۔ اس نے اپنے ایک آدمی ولسن کو ایک خطیر رقم دے کر والڈو کی طرف بھیجا تھا تاکہ اس سے اپنے وہ کاغذات واپس لے سکے جن کی بنا پر والڈو اسے بلیک میل کر رہا تھا۔ لیکن غالباً ولسن نے رقم دینے کے بجائے دھونس دھمکی سے کاغذات واپس لینے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔''

''ہوں!'' انسپکٹر جون نے ہنکارا بھرا۔ ''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''یہ کیا چاہتا ہے۔'' انسپکٹر کوپر دہاڑا۔ ''اس نے پولیس کی کارروائی میں رکاوٹیں پیدا کیں، قانون کو ہاتھ میں لیا اور تم پوچھتے ہو یہ کیا چاہتا ہے۔ اس کا انعام تو اسے میں دوں گا۔''

''ہوش میں رہو۔'' انسپکٹر جون نے اسے گھورا۔ ''تسولی کی گرفتاری کے سلسلے میں تم نے چیف کو اپنی بہادری کی جو فرضی کہانی سنائی تھی۔ وہ اخبارات تک پہنچ چکی ہے۔ حقیقت کیا ہے، یہ میں جان چکا ہوں۔ اگر عوام اور افسرانِ بالا کو پتا چل گیا تو سمجھ سکتے ہو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ تمہیں رچرڈ کا ممنون ہونا چاہیے اس نے کوئی قانون شکنی نہیں کی۔ اگر یہ مداخلت نہ کرتا تو ہم مہینوں اس کیس کو حل نہ کر سکتے۔ اسے تعاون کا صلہ ملنا چاہیے، جہاں تک میرا سوال ہے تو یوں سمجھ لو کہ تسولی کی گرفتاری والے سلسلے میں میری زبان بند رہے گی۔''

انسپکٹر کوپر کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اس کے چہرے پر بے بسی کے آثار ابھرے اور پھر اس نے شکست خوردہ انداز میں نظریں جھکا لیں۔

جون رچرڈ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میں نے پوچھا تھا کہ اب تم کیا چاہتے ہو مسٹر رچرڈ؟''

''نقلی موتیوں کی مالا اور ایلن کے کپڑے۔'' رچرڈ نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے یقین ہے پولیس کو شہادت کے لیے ان چیزوں کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ایلن اور فرینک کا نام اس کیس میں نہ آئے۔''

انسپکٹر جون چند لمحے سوچتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''ٹھیک ہے یہ چیزیں تم رکھ سکتے ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم ان سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرو گے۔''

''مطمئن رہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' رچرڈ نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور اپنا خون آلود ہونٹ پونچھنے لگا۔ انسپکٹر جون اور کوپر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ انسپکٹر کوپر نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ رچرڈ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

☆☆☆

ان دونوں کے جانے کے بعد رچرڈ نے اپنے لیے چائے بنائی اور میز پر پڑی مالا کو دیکھنے لگا جس کے موتی بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اصلی موتیوں جیسی آب و تاب ہونے کے باوجود یہ موتی نقلی تھے اور اسے حیرت تھی کہ ایلن انہیں محبوب کی نشانی کے طور پر اصلی اور سچے موتی سمجھتے ہوئے ان کی حفاظت کرتی رہی۔

محبوب کے خیال سے اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ سینڈر کروڑ پتی تھا۔ اس سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی محبوبہ کو نقلی موتیوں کی مالا تحفے میں دے گا۔ پندرہ ہزار ڈالر کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ موتی یقیناً اصلی ہی ہوں گے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصلی موتیوں کی مالا پھر کہاں گئی۔ کسی نے بڑی ذہانت سے نقلی موتیوں کی مالا تیار کروا کے اصلی غائب کر دی۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گیا۔ رات کی تاریکی رخصت ہو رہی تھی۔ موسم میں خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ چہرے سے ٹکرانے والے ہوا کے جھونکے نے نمی کا عجیب سا تاثر دیا جہاں اندھیرا بہت غیر محسوس انداز میں اجالے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ دفعتاً ذہن میں ایک اور خیال کے آتے ہی وہ اچھل پڑا اور کھڑکی سے ہٹ کر ٹیلی فون کے قریب آ گیا۔ ڈائریکٹری سے انیتا کا فون نمبر تلاش کرنے میں اسے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف سے جلد ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ آواز انیتا کی تھی۔

''میں مسٹر فرینک سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ بہت ضروری بات ہے۔'' رچرڈ نے اپنا نام بتاتے ہوئے جلدی

سے کہا۔ ریسیور پر چند لمحے خاموشی رہی پھر فرینک کی بھاری آواز سنائی دی۔

"ہیلو مسٹر رچرڈ! اس کام کا کیا رہا؟"

"اگر تم ایک گھنٹے کے اندر اندر اصلی موتیوں کی مالا میرے حوالے کردو تو تمہاری ازدواجی زندگی تباہ ہونے سے بچ سکتی ہے۔" رچرڈ بولا۔

"کیا مطلب؟ کیسی مالا؟" فرینک کے لہجے میں حیرت تھی لیکن لہجے کا کھوکھلا پن رچرڈ سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔

رچرڈ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "انجان بننے کی کوشش مت کرو مسٹر فرینک، تم بہت پہلے ایلن کی اس مالا کی حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ حاسدانہ جذبات نے تمہیں مضطرب کر رکھا تھا۔ تم نے نقلی موتیوں کی مالا تیار کروائی اور موقعے کی تلاش میں رہے۔ پھر یورپ کے دورے سے واپسی پر تم نے مالا تبدیل کردی اور دوسرے دن جوزف کو ملازمت سے برطرف کردیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ جوزف جاتے ہوئے مالا چرا کر لے گیا۔ تمہارے کچھ کاغذات بھی اس کے ہاتھ لگ گئے تھے جن کی بنیاد پر وہ تمہیں بلیک میل کر رہا تھا۔ تم ایک ایسے شخص کے خلاف اپنے دل میں نفرت و حسد کے جذبات کو پروان چڑھا رہے ہو جس سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا، وہ مر چکا ہے۔" رچرڈ نے مزید کہا۔

"اگر تم مالا واپس کردو تو تمہاری ازدواجی زندگی تباہی سے نکل سکتی ہے۔ ایلن نے تم سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔ اگر وہ اپنے آنجہانی محبوب کی نشانی اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے تو اس میں تمہارا کیا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری وفادار ہے اور وفادار رہے گی لیکن اگر اسے اپنا سے تمہارے تعلقات کا پتا چل گیا تو اس کا نتیجہ تم خود سوچ سکتے ہو۔"

ریسیور پر چند لمحے تک تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دیتی رہی پھر فرینک کی آواز ابھری۔ اس مرتبہ لہجہ بدلا ہوا تھا۔ "اور وہ کاغذات؟"

"ان کا پتا نہیں چل سکا۔ والڈو مر چکا ہے۔ اب تمہیں ان کاغذات سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے لیکن اگر تم نے مالا واپس نہ کی تو میں زندہ ہوں...... کہو کتنی دیر میں آرہے ہو؟" رچرڈ نے کہا۔

"ٹھیک ہے پتا بتاؤ۔ میں ایک گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔" فرینک کی شکست خوردہ سی آواز سنائی دی۔

"میں برگنزا بلڈنگ کے سامنے تمہارا انتظار کروں گا۔" رچرڈ نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد فرینک بارسلے کی گاڑی برگنزا بلڈنگ کے سامنے رکی۔ اس نے کچھ کہے بغیر مالا رچرڈ کے حوالے کردی اور گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ دوبارہ فلیٹ میں پہنچ کر رچرڈ نے دونوں مالائیں میز پر چھوڑ دیں اور فون کے قریب جا کر ایلن کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ کال فوراً ہی ریسیو کرلی گئی جس کا مطلب تھا کہ ایلن جاگ رہی ہے۔

"تمہاری امانت میرے پاس موجود ہے اگر ایک گھنٹے بعد سی بریز میں شاندار قسم کا ناشتا کرانے کا وعدہ کرو تو مالا تمہیں واپس مل سکتی ہے۔" وہ سلسلہ ملنے پر بولا۔

"ٹھیک ہے میں ایک گھنٹے میں سی بریز پہنچ رہی ہوں۔" ایلن کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اور فرینک کہاں ہے...... سو رہا ہے کیا؟" رچرڈ نے پوچھا۔

"نہیں وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔" ایلن نے جواب دیا۔

"اب آئندہ شاید وہ ان میٹنگز میں زیادہ وقت نہ دے سکے۔ بہرحال میں سی بریز پر تمہارا منتظر رہوں گا۔" رچرڈ نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ ساحل سمندر پر واقع سی بریز ریسٹورنٹ پہنچا تو ایلن اس کی منتظر تھی۔ اس نے فوراً ہی مالا کا مطالبہ کرتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیا۔

"مالا میرے پاس موجود ہے لیکن پہلے ناشتا۔" رچرڈ مسکرایا۔

ایلن کو مزید آدھا گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ رچرڈ نے اطمینان سے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد داہنی جیب سے مالا نکال کر اس کے حوالے کردی جسے ہاتھ میں لیتے ہی اس نے زنجیر کے لاک کو چیک کیا اور مسکرا دی۔

"ہاں...... یہی ہے۔ یہ دیکھو میرا اور سینڈر کا نام کندہ ہے۔"

اس کے بعد وہ وہاں نہیں رکی۔ رچرڈ مسکراتا ہوا ریسٹورنٹ سے نکل کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا بڑی فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ سمندر کی ہلکی ہلکی لہریں چٹان سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے ایک سگریٹ سلگا لیا۔ چند لمحے ہلکے ہلکے کش لگاتا رہا پھر پتلون کی جیب سے دوسری مالا نکال کر اس کی نقرئی زنجیر توڑ دی اور ایک ایک موتی نکال کر نیچے چٹان سے ٹکراتی ہوئی لہروں میں اچھالتا رہا۔ آخر میں اس نے چاندی کی نازک سی زنجیر بھی پانی میں اچھال دی۔

کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر ایک طرف کو چل دیا۔

البتہ ایک بات اسے اب پریشان کر رہی تھی کہ اس نے زنجیر کا لاک نہیں دیکھا تھا۔ اگر غلطی سے وہ اصلی مالا ایلن کو دینے کے بجائے لہروں کے سپرد کر دیتا تو اس وقت اس کا کیا حشر ہوتا۔

اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کرتا۔

اس کا نام شیر زمان تھا۔ پھلوں کا ٹھیلا لگایا کرتا۔ میں اس طرف سے گزرتے ہوئے اس سے کچھ پھل وغیرہ لے لیا کرتا تھا۔ اس طرح اس سے سلام دعا ہو گئی تھی۔

وہ ایک محنت کش انسان تھا۔ مجھ سے کہتا۔ "بابو صاحب۔ یہ سیب لے جاؤ۔ بہت زبردست ہیں۔ اس کو کھاؤ گے تو تمہارے گال بھی کشمیری سیب کی طرح خوبصورت ہو جائیں گے۔"

راہ نما

منظر امام

جب انسان غلطی کرے اور بھول جائے تو وقت کی گرفت اسے بار بار بہانے بہانے سے احساس دلاتی ہے لیکن یہ نادان انسان سمجھ نہیں پاتا... وہ بھی ایک ایسی ہی بھول میں مبتلا تھا مگر... اکثر غلطی کی طرح کوئی نہ کوئی نیکی بھی اسے نہ صرف بچاتی ہے بلکہ راہنمائی بھی کرتی ہے کہ کیسے وہ اس گرداب سے نکلے۔ اسے بھی ایک ایسی ہی راہنمائی مل گئی تھی جس نے اسے اس جہنم سے نجات دلا دی تھی۔

محبت کو ٹھکرانے اور تہمتوں کی پستی میں گرنے والوں کا انجام



''ارے شیر زمان۔ اب اس عمر میں گالوں کو خوبصورت بنانے کا کیا فائدہ؟''

''بابو صاحب۔ تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ ابھی تمہارا عمر ہی کیا ہوا ہے۔ صرف پچاس سال۔ اس عمر میں تو لوگ شادی بناتا ہے۔''

میں اس کی ایسی باتوں پر ہنس دیتا۔ وہ زندہ دل آدمی تھا۔ اس زمانے میں میری پوسٹنگ اسلام آباد میں تھی۔ میں نے اسلام آباد کے سیکٹر G-8 میں کرائے کا ایک مکان لے رکھا تھا۔ میری بیوی اور بچے کراچی میں تھے۔

میں ہر دوسرے تیسرے مہینے بچوں سے ملنے کراچی چلا جایا کرتا۔ اس وقت شیر زمان کا رویہ کچھ عجیب ہوتا۔ جب میں اسے یہ بتاتا کہ شیر زمان میں کل کراچی جارہا ہوں۔ تو وہ ڈھیر سارے پھل شاپرز میں باندھ کر دے دیا کرتا اور ان کے پیسے بھی نہیں لیتا تھا۔

میں جب اس سے کہتا۔ ''شیر زمان، یہ کیا کرتے ہو، کم از کم پیسے تو لے لیا کرو۔''

''نہیں جعفری صاحب۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تم اپنے بچوں کے پاس جارہے ہو۔ وہ میرے بھی بچے ہیں۔ یہ میں اپنی طرف سے دے رہا ہوں۔''

خود اس نے شادی نہیں کی تھی۔ میرے دریافت کرنے پر بتایا۔ ''ارے جعفری صاحب۔ ہماری طرف شادی ایک مشکل کام ہے۔ میں ایک غریب آدمی، کہاں سے پیسے لاتا۔ میرا باپ کینسر کا مریض تھا، میں اس کا علاج کراتا رہا۔ اس لیے شادی کا موقع بھی نہیں مل سکا۔''

''چلو اب تو کرلو۔''

''نہیں۔ اب کیا کرنا ہے شادی کرکے۔'' وہ ہنس دیتا۔

وہ ہر حال میں خوش رہنے والا انسان تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے میں اسے بہت پریشان دیکھ رہا تھا۔ پہلے جب میں اس کے پاس جاتا تو وہ مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرلیا کرتا بلکہ چائے بھی منگواتا اور ہم چائے پینے کے دوران گپ شپ بھی کیا کرتے۔

لیکن اب وہ کسی سوچ میں رہنے لگا تھا۔ کھویا کھویا سا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ''شیر زمان! خیریت تو ہے نا۔ تم آج کل پریشان رہنے لگے ہو؟''

''ہاں جعفری صاحب۔'' اس نے اعتراف کرلیا۔

''میں واقعی بہت پریشان ہوں۔''

''لیکن کیوں؟''

''تم میرا مذاق تو نہیں اڑاؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں۔ مذاق کیوں اڑاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''تم بتاؤ کیا پرابلم ہے؟''

''جعفری صاحب۔ آج کل ایک خواب نے پریشان کیا ہوا ہے۔''

''خواب نے!'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیسا خواب ہے کیا دیکھتے ہو؟''

''خواب کچھ یوں ہے صاحب کہ میں ایک سرنگ سے گزر رہا ہوں۔ کوئی دوست نہیں ہے، ہر طرف اندھیرا ہے۔ چاروں طرف سے ڈرا دینے والی آوازیں آرہی ہیں۔ میں بھاگ جانا چاہتا ہوں لیکن بھاگ نہیں سکتا۔ دور بہت دور ایک چھوٹی سی روشنی دکھائی دے رہی ہے لیکن میں اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ کیونکہ میرے پاؤں ایک ایک من کے ہوگئے ہیں اور اسی میں میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ جاگ جانے کے بعد بھی بہت دیر تک ڈر لگا رہتا ہے اور انتہائی پسینے پسینے ہوجاتا ہوں۔ جعفری صاحب۔ کیا ہے یہ؟''

''خدا معلوم لیکن تم عبادت کرتے رہو اور خدا سے بہتری کی امید رکھو۔''

کئی دنوں کے بعد میرا گزر جب اسی راستے سے ہوا تو اس کا ٹھیلا وہاں نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے اسے کبھی چھٹی کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اب یا تو وہ بیمار پڑ گیا تھا یا پھر اپنے آبائی گاؤں چلا گیا تھا۔ مجھے اس کا پتا بھی نہیں معلوم تھا کہ میں جا کر اس کی خیریت ہی معلوم کرلیتا۔ چار پانچ دنوں کے بعد میں جب وہاں سے گزرا تو وہ اپنی جگہ موجود تھا۔ میں جلدی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔

''ارے کیا ہوا تھا شیر زمان۔ خیریت تو تھی نا؟''

''جعفری صاحب۔ میں تم ہی کو یاد کر رہا تھا۔'' اس نے کہا۔

''میں تو تمہیں یہاں دیکھ کر گیا تھا لیکن تم نہیں تھے۔''

''ہاں جعفری صاحب۔ میں بیمار ہوگیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اسی خواب نے بیمار کردیا تھا۔''

''خواب نے بیمار کردیا تھا۔ وہ کس طرح؟''

''کیا بتاؤں جعفری صاحب۔ اب اس خواب کا مطلب میری سمجھ میں آنے لگا ہے۔ اس لیے مارے ڈر کے بیمار پڑ گیا۔''

''اچھا۔'' یہ اس نے نئی بات بتائی تھی۔ ''کیا مطلب ہوا اس خواب کا؟''

''جعفری صاحب۔ اب تم سے کیا چھپاؤں۔ وہ جو سرنگ ہے نا۔ وہ جہنم کا راستہ ہے۔ کیونکہ میں نے اس بار جو

خواب دیکھا اس میں یہ دیکھا کہ سرنگ کی دیواروں سے آگ نکل رہی تھی۔ وہ آگ میری طرف بڑھ رہی تھی جعفری صاحب اور جو دور روشنی سی دکھائی دیتی ہے وہ جنت ہے۔ وہاں سکون ہے لیکن میں وہاں تک جا نہیں سکتا۔ میرے پاؤں دو دو من کے وزنی ہوگئے ہیں۔ گرمی ہے کہ بڑھتی جارہی ہے۔ بڑھتی جارہی ہے۔ بس اس خوف نے مجھ کو بیمار کردیا۔ میں نے بستر پکڑ لیا۔''

''لیکن کیوں شیر زمان! تم کو اتنا خوف کیوں ہے؟ کیا تم سے ایسی کوئی غلطی ہوئی ہے کہ اپنے آپ کو جہنم میں سمجھنے لگے ہو۔''

''جی ہاں جعفری صاحب۔ غلطی نہیں گناہ ہوگیا ہے۔ بہت بڑا گناہ۔''

تم چاہو تو مجھ سے اپنے دل کا حال کہہ سکتے ہو۔ شاید تمہارے دل کا غبار دھل جائے۔''

''جعفری صاحب۔ میں آپ کو اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤں گا۔ اچھا ہے۔ اس طرح دل کا بوجھ اتر جائے گا۔ آپ آیا کریں، اگر فرصت ہو تو میرے گھر آجائیں۔''

''یار شیر زمان۔ اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو یہاں سے پاس ہی رہتا ہوں۔ تم میرے پاس آجاؤ۔ میرے گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ اطمینان سے باتیں ہوں گی۔''

میں نے اسے اپنے گھر کا ایڈریس بتادیا۔ جو وہاں سے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا.... وہ وعدے کے مطابق پہنچ گیا تھا اور ساتھ میں کچھ پھل وغیرہ بھی لیتا آیا تھا۔

''ارے یہ سب کیا لے آئے ہو؟''

''کیا ہوا جعفری صاحب۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے کھائیں گے۔'' اس نے کہا۔

میں اس کے لیے چائے بنانے لگا۔ اس دوران اس نے سیب کاٹنے شروع کردیے تھے۔ بہرحال اس نے اپنی جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں تھی۔

''جعفری صاحب۔ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکی تھی۔ راشدہ نام تھا اس کا۔ وہ ایک غریب گھرانے کی بیٹی تھی۔ ہمارے گاؤں میں تو سب ہی غریب ہیں جعفری صاحب۔ وہاں امیر کون ہے۔ بس دو چار گھر ایسے ہیں جہاں تھوڑی بہت خوشحالی ہے۔''

''کہاں ہے تمہارا گاؤں؟''

''نہروں کے پاس۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت خوب صورت جگہ ہے۔ چاروں طرف ہریالی ہریالی، اونچے اونچے پہاڑ، صاف پانی کی ندی، کیا نہیں ہے، صرف پیسے نہیں ہیں اور جب پیسے نہ ہوں تو پھر سب فضول ہوتا ہے۔ ہم پہاڑوں اور پھولوں کو لے کر کیا کرتے۔''

''کیا تمہارا کوئی بھائی وغیرہ نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک چھوٹا بھائی ہے۔ وہ بھی پھلوں کا کام کرتا ہے۔ اس کا کاروبار تو ٹھیک ٹھاک جارہا ہے۔ اس نے لاہور میں پھلوں کی دکان بنالی ہے۔ وہ میری طرح ٹھیلا نہیں لگاتا بلکہ شان کے ساتھ دکان پر بیٹھتا ہے۔''

''چلو۔ یہ تو اچھی بات ہوئی۔''

''صاحب۔ میں راشدہ کی بات کررہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی لیکن اس میں ایک کمی رہ گئی تھی اور اس کمی کی وجہ سے یہ سب ہوا تھا۔''

''کیا کمی تھی، کھل کر بتاؤ۔''

''وہ گونگی تھی جعفری صاحب۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ بول نہیں سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اس کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔''

''یہ تو بہت اچھی بات تھی شیر زمان۔ اس میں گناہ کا پہلو کہاں سے نکل آیا۔'' میں نے کہا۔

''آپ آگے بھی تو سن لیں جعفری صاحب۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''ایک بات یہ بتادوں کہ چاروں گاؤں والے راشدہ اور اس کے گھر والوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے۔ عام طور پر تو ہمارا خاندان صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتا آیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ مگر راشدہ کا خاندان کچھ عرصے پہلے ہماری طرف آکر آباد ہوا تھا۔''

''سمجھ گیا۔'' میں نے لقمہ دیا۔ ''آگے چلو۔''

''ہم صرف اتنا جانتے تھے کہ اس کا ایک باپ ہے، ماں ہے اور دو راشدہ سے چھوٹی بہنیں ہیں۔ بس یہ تھا ان کا خاندان، راشدہ کا باپ لکڑی کا کاریگر تھا صاحب۔ وہ بہت اچھے شیشم کے دروازے اور کھڑکیاں وغیرہ بنایا کرتا۔ ہمارے گھر والوں نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک گونگی لڑکی ہے اور اس کے ماں باپ اس کے رشتے کے لیے بہت پریشان ہیں۔ ان کے ہمارے گاؤں میں آنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہاں راشدہ کے لیے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ کوئی اس گونگی کو اپنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے وہ کسی امید پر ہمارے گاؤں میں چلے آئے تھے۔''

''افسوس ہوا اس کا حال سن کر۔''

''ہاں جعفری صاحب۔ ہم کو بھی بہت افسوس ہوا تھا پھر جب میں نے ایک بار اس کو دیکھ لیا تو خدا کی قدرت نظر آگئی۔ وہ

بہت خوبصورت تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا یا خدا۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو بے زبان کرکے تو کیوں اس کا امتحان لے رہا ہے۔ بہرحال پھر یہ ہوا کہ میں نے راشدہ کے لیے اپنا رشتہ بھیج دیا۔"

"تم نے تو بہت اچھا کیا۔ ثواب کا کام تھا۔"

"ہاں جعفری صاحب لیکن میرے گھر والوں نے ہنگامہ کردیا تھا مگر میں اپنے فیصلے پر قائم رہا اور آہستہ آہستہ سب کو راضی کرلیا۔ ہماری شادی کی تیاریاں بھی ہوگئیں۔ پھر وہ واقعہ ہوگیا۔ جس نے مجھے برباد کرکے رکھ دیا۔"

"کیا ہوگیا تھا شیر زمان۔"

"جعفری صاحب۔ ایک شام میں نے اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے آب شار کے پاس راشدہ کو کسی کے ساتھ دیکھ لیا۔"

"کیا!" مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ "کس کے ساتھ دیکھ لیا تھا؟"

"بتا رہا ہوں صاحب۔ وہ ایک نوجوان تھا۔ بہت خوبصورت۔ راشدہ کی طرح۔ دونوں ایک ساتھ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اس وقت ان سے کچھ فاصلے پر تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ راشدہ نے اس کے کندھے سے اپنا سر لگا دیا تھا۔"

"اوہ.... تو ایسی نکلی وہ لڑکی۔" میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

"ہاں صاحب۔ میں نے جو دیکھا تھا۔ وہ بتا دیا ہے۔ میں نے اس وقت ان لوگوں کو کچھ نہیں کہا لیکن گھر واپس آکر میں نے اپنے گھر والوں کو ساری بات بتادی اور راشدہ سے شادی سے انکار کردیا۔ جعفری صاحب۔ گاؤں، شہروں جتنے بڑے تو نہیں ہوتے۔ جہاں بڑی سے بڑی بات ہوجائے تو کسی کو پتا نہیں چلتا۔ گاؤں میں تو ذرا سی بات ہوتی ہے اور آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ پورے گاؤں کو اس لڑکی کے خراب ہونے کا پتا چل گیا ہوگا۔"

"جی ہاں، پورے گاؤں کو، خود اس لڑکی کے گھر والوں کو بھی اور یہیں سے میرے گناہ کی کہانی سامنے آتی ہے صاحب۔ اب میں یہ بتادوں کہ ہماری روایت بہت الگ ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں قتل کوئی اتنا بڑا جرم نہیں سمجھا جاتا بلکہ کسی بات پر کسی کا قتل کرنے والے کو بہادر سمجھتے ہیں۔ غیرت مند سمجھتے ہیں لیکن جو سب سے زیادہ شرم کی بات ہوتی ہے، وہ ہے چوری، چوری تو ایسا جرم ہے جس کو کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔"

"یہ تو ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "میں تمہارے معاشرے کی بات نہیں کررہا۔ خود اپنے یہاں بھی میں نے ایسے کیسز دیکھے ہیں۔ قتل کرنے والے کے گھر والے اور رشتے دار قاتل کی ضمانت کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ جیل میں ہے تو اس سے ملنے کے لیے جاتے ہیں لیکن اگر کسی نے چوری کی ہے تو اس سے نفرت کی جاتی ہے۔ یہ سمجھو کہ اس کو بہت گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔"

"جی ہاں جعفری صاحب۔ ہمارے یہاں تو اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس کو خاندان سے الگ کردیا جاتا ہے۔ گھر والے پھر اس سے کوئی رابطہ بھی نہیں کرتے۔"

"شیر زمان۔ تمہاری اس کہانی میں چوری کا ذکر کہاں سے آگیا۔" میں نے پوچھا۔

"وہی بتا رہا ہوں صاحب۔" شیر زمان نے کہا۔ "راشدہ کا ایک بھائی بھی تھا۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا۔"

"جی ہاں۔ سب کو یہی بتایا گیا تھا۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا اور وہ چور تھا۔"

"اوہ۔"

"راشدہ کا باپ اس بدنامی کے ڈر سے اپنا گاؤں چھوڑ کر ہماری طرف آگیا تھا۔" شیر زمان نے بتایا۔

"اس نے ظاہر یہی کیا تھا کہ وہ راشدہ کے رشتے کی طرف سے پریشان ہوکر آیا ہے لیکن اصل کہانی یہ تھی کہ اس کا بیٹا چور تھا۔ وہ یہ بدنامی برداشت نہیں کرسکا اور اس نے گاؤں چھوڑ دیا۔"

"افسوس کی بات ہے۔" میں اتنا ہی کہہ سکا۔

"راشدہ کا بھائی جب جیل سے چھوٹ کر آیا تو اسے پتا چلا کہ اس کے گھر والے کہیں اور چلے گئے ہیں۔ وہ تلاش کرتا ہوا ہمارے گاؤں میں آگیا۔ گھر جانے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ اسے اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔ اس نے کسی طرح راشدہ کے پاس اپنا پیغام بھجوادیا۔ وہ بے چاری اس سے ملنے آئی تھی کہ بدقسمتی سے میں نے دیکھ لیا اور میں نے اسے خراب لڑکی سمجھ کر اسے پورے گاؤں میں بدنام کردیا۔"

"شیر زمان۔ یہ واقعی بہت بڑا گناہ ہوا ہے تم سے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لو کہ تمہاری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔"

"جعفری صاحب۔ اس کے بعد میں بھی اپنے گاؤں میں نہیں رہ سکا۔ اندر ایک آگ لگی ہوئی ہے اور میں جو کچھ خواب میں دیکھتا ہوں، وہ میرا یہ گناہ ہے جو مجھے جہنم کی طرف لے جارہا ہے اور جنت بہت دور ہے۔ میں مر رہا ہوں جعفری

صاحب۔ بتائیں میں کیا کروں؟"

"خدا سے اس گناہ کی معافی مانگتے رہو۔ اپنی اس غلطی پر جتنا شرمندہ ہوسکتے ہو، ہوتے رہو۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ تم کو سکون مل جائے گا۔"

وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک ایک سناٹے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔ اس کہانی سے ایک بات یہ پتا چل گئی کہ شیر زمان اندر سے ایک اچھا آدمی تھا۔ اس لیے اس کی ایک غلطی نے اس کے وجود میں آگ سی لگادی تھی اور اسے ایسے خواب آرہے تھے۔

اس کے بعد بھی جب میں اس کو دیکھتا تو اس کی حالت غیر ہی نظر آتی۔ شاید وہ بہت خوفزدہ ہوگیا تھا پھر میں نے یہ سوچا کہ اب میں اسے کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے چلوں گا کیونکہ ایک اچھا سائیکاٹرسٹ ہی اس کا علاج کرسکے گا۔

پھر یہ سوچ کر میں ایک دن جب اس کے پاس گیا تو اس کی حالت بالکل مختلف دکھائی دی۔ وہ خوش تھا، اس کے چہرے پر جو خوف اور پریشانی کے تاثرات ہوا کرتے تھے، وہ بالکل غائب ہوچکے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ لپک اٹھا۔ "ارے جعفری صاحب۔ میں دو دن سے آپ کو یاد کررہا ہوں۔ لو، پہلے مٹھائی کھالو۔"

اس نے ٹھیلے پر رکھا ہوا ایک ڈبا میری طرف بڑھا دیا۔

"خدا تمہیں خوشیاں دے شیر زمان۔ یہ تو بتاؤ یہ کس بات کی مٹھائی ہے؟"

"میرا مسئلہ حل ہوگیا ہے صاحب۔" اس نے بتایا۔ "اب کوئی بات نہیں ہے۔ اب میں جہنم کے راستے پر نہیں ہوں بلکہ جنت کی طرف جارہا ہوں۔"

"میں نہیں سمجھا۔ اب کیا بات ہوئی۔"

"میں تمہیں بتاتا ہوں صاحب۔" اس کی آواز سے اس کی خوشی کا اظہار ہورہا تھا۔ "میں نے پھر وہی خواب دیکھا تھا۔ وہی سرنگ۔ وہی آگ لگنے کا احساس اور وہی دور نظر آنے والی روشنی۔ جس کی طرف میں جانا چاہتا ہوں لیکن جا نہیں پاتا۔ میرے دونوں پاؤں وزنی ہوگئے ہیں۔ میں چل نہیں سکتا۔"

"یہ سب تو تم پہلے سے دیکھتے آرہے ہو۔" میں نے کہا۔

"سنتے تو جاؤ جعفری صاحب۔ میں چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن میرے پاؤں جم گئے ہیں۔ گرمی بڑھتی جارہی ہے۔ پھر اچانک کچھ بچے میرے پاس آجاتے ہیں۔"

"بچے آجاتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ بچے۔ وہ میرا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ کہتے ہیں آؤ چاچا! ہم تمہیں اس روشنی تک لے جاتے ہیں اور میں ان کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔ ابھی میرے پاؤں بھی آزاد ہوگئے ہیں۔ میں بہت آسانی سے چل سکتا ہوں۔ بہت ہلکا پھلکا ہوگیا ہوں اور وہ بچے اس روشنی تک پہنچا کر غائب ہوجاتے ہیں۔ بس صاحب کیا بتاؤں۔ اس کے بعد کتنا سکون ہے۔"

"وہ بچے کہاں سے آگئے... کیا تم ان کو پہچانتے ہو؟"

"ہاں صاحب۔ سب کو پہچانتا ہوں۔ یہ شہید بچے تھے۔"

"شہید بچے۔"

"صاحب...... میں اپنے گاؤں سے نکل کر اسلام آباد میں آیا تھا بلکہ میں پشاور میں پھلوں کا ٹھیلا لگانے لگا تھا۔" اس نے بتایا۔ "میرا ٹھیلا اس اسکول کے سامنے ہوتا تھا جس کے بچوں کو شہید کردیا گیا تھا۔ بچے چھٹی کے بعد میرے پاس آجاتے تھے۔ وہ سب مجھے چاچا کہا کرتے۔ میں بھی خوش ہوکر اپنی طرف سے ان کو پھل وغیرہ دے دیا کرتا تھا۔ ان بچوں سے بڑی محبت ہوگئی تھی صاحب۔ اتفاق سے میں ان دنوں اپنے گاؤں گیا ہوا تھا جب ان بچوں کے ساتھ یہ حادثہ ہوا۔ میں تو یہ سب سن کر پاگل ہوگیا تھا صاحب۔ میں نے ان بچوں کی تصویریں دیکھیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے۔ جو میرے پاس آیا کرتے اور میرے خواب میں وہی بچے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اس روشنی تک لے گئے تھے۔ جہاں راشدہ بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ میں نے راشدہ اور ان بچوں کو پہچان لیا تھا۔ میرے خدا نے مجھے میرے گناہ کی سزا تو دی تھی لیکن ان بچوں کی محبت میرے کام آگئی۔"

"شیر زمان۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے تعریف کی۔ "تمہارا خواب سچا ہے۔ جب ان شہیدوں کی محبت تم کو جنت تک لے جاسکتی ہے تو خود سوچو ان کے ماں باپ کے کیسے درجے ہوں گے۔ تم خوش نصیب ہو شیر زمان اور تم سے کہیں زیادہ ان بچوں کے والدین خوش نصیب ہیں۔"

"اس کے بعد ہم واپس گاؤں گیا اور بہت مشکل سے اس غمزدہ لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرلیا کیونکہ جو گناہ ہوا تھا مجھے اس کا ازالہ بھی کرنا تھا۔ میں نے اپنا گناہ تسلیم کرکے سب سے معافی مانگ لی ہے۔"

"بہت خوب شیر زمان...... اگرچہ خود کو غلط کہنا مشکل ترین عمل ہے مگر جو اسے اپنا لیتا ہے وہ ایک عظیم انسان ہوتا ہے۔"

اس وقت شیر زمان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔

ساتواں حصہ

رنگ آسماں

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی دُھندلی و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جذبے... واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدانِ جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہِ شالیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں کی دلکش وادیوں میں ایک مختصر قافلہ محوِ سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جستجو اسے لندن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی نیلی آنکھوں والی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً تجسس پسند اور مہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اُدباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیا بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، ادھیڑ عمر خانساماں میاں بیوی نندو اور شانتا کے علاوہ ایک بانکا سجیلا کڑیل نوجوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جنرل مائیکل شا کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً گھمنڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار بستی کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہِ شالیہ کی تین خود مختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانباز گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریحان ہے جو فوجِ آزادی کے سپہ سالار جنرل شمیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذاتِ خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروہ ”کاروانِ مجاہد“ کہلاتا ہے۔ باقی دو ساتھی شرجیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شبہ تھا کہ منتشر مسلم باغی گروہ کوہِ شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کر سکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا ”سلسلۂ تسلط“ کوہِ شالیہ کی ان تینوں قابلِ ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لہٰذا مکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بہ ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں ترپال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جا سکے۔ ترپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی نجو بائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی نجو بائی کی ایک جواں سال خوبصورت بیٹی سونجنا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایش کمار کا راستہ صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہاپجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ مہارانی نجو بائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملوا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا پی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کرواتا ہے۔ شک نجو بائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب نجو بائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو گئی تھی۔ وہ ریاستی امور میں دخل نہیں دے سکتی تھی۔ ادھر علی ترپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انسپکٹر اسے نواب کے بھائی سراج کے پاس لے جاتا ہے۔ جیپ رکتے ہی وہ سمجھ جاتا ہے کہ وہ کسی جال میں پھنسنے والا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”سراج صاحب اندر تشریف رکھتے ہیں؟“ انسپکٹر منظور شاہ نے ان دونوں مسلح پہرے داروں سے گمبھیر لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں! وہ اندر موجود ہیں۔“ ایک پہرے دار نے علی ریحان پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد منظور شاہ کو جواب دیا۔ وہ شاید اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔

”وہ مصروف تو نہیں ہیں؟ مجھے اسی وقت ایک بہت اہم معاملے کے سلسلے میں ان سے ملنا ہے۔“ اس نے کہا۔

”مل لیجیے...... لیکن پہلے انہیں مطلع کرنا پڑے گا۔“ دوسرا پہرے دار بولا۔

”آپ اندر تشریف لے آئیں...... مگر...... یہ کون ہے؟“ اس نے آخر میں یہ کہتے ہوئے پوچھا۔

”اس بات کو چھوڑو اور اندر سراج صاحب کو فوراً مطلع کرو۔“ انسپکٹر منظور نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ علی کو صاف محسوس ہوا تھا کہ منظور شاہ کا سراج کے ان پہرے داروں پر بھی خاصا رعب تھا۔

انہیں فوراً مکان کے اندر لایا گیا اور ایک کشادہ سی نشست گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ باقی دو پولیس اہلکار اور ڈرائیور باہر گاڑی میں موجود رہے تھے۔

علی اس کا جائزہ لینے لگا۔ نشست گاہ بہ ظاہر عام سی نظر آتی تھی۔ فرنیچر کے نام پر چند کرسیاں، ایک میز، کونے پر دھرا پلنگ، جہاں صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا۔ ایک بڑی سی کھڑکی تھی، جہاں سے باہر پہاڑیوں اور نیلے آسمان کا مقدور بھر منظر آنکھوں کو بھلا لگتا تھا۔

تھوڑی دیر گزری ایک خادم قسم کا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں ایک بڑی سی طشتری تھام رکھی تھی۔ اس میں چائے اور کافی کا سامان تھا اور کچھ کھانے پینے کی اشیا تھیں۔ وہ اس نے ان کے درمیان پڑی تپائی پر رکھ دی۔

خادم ایک درمیانی عمر کا آدمی لگتا تھا۔ خاصا دراز قامت اور تنومند تھا۔ رنگت سیاہ تھی اور آنکھیں چھوٹی۔ سر کے بال اڑے اڑے سے تھے۔ موٹی سی ناک اور دائیں آنکھ کے ایک کونے پر سیاہ رنگ کا ایک موٹا سا ابھرواں مسّہ اس کے چہرے کو خاصا بدنما بنائے ہوئے تھا۔

اس نے ایک نظر علی پر ڈالنے کے بعد انسپکٹر منظور شاہ سے مؤدبانہ مخاطب ہو کر کہا۔

”صاحب جی کو بتا دیا گیا ہے، وہ تھوڑی دیر بعد آپ سے ادھر ہی آ کر مل لیں گے۔“ انسپکٹر منظور شاہ نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور پھر خادم کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ اس پر جھکا تو اس نے کان میں اس سے کچھ کہا۔ خادم نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا اور جاتے جاتے ایک عجیب سی نظر علی پر ڈالتے ہوئے واپس لوٹ گیا۔

”لو...... چائے اور کافی دونوں حاضر ہیں۔ اپنے سراج صاحب بہت مہمان نواز اور دل نواز انسان ہیں۔“ انسپکٹر منظور شاہ نے طشتری کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے علی سے مسکرا کر کہا لیکن علی کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منظور شاہ ایک تو اسے زبردستی یہاں لے آیا تھا، دوسرا اس نے خادم سے نہ جانے کان میں کیا کہا تھا۔ یہ اسے پتا نہیں چل سکا تھا۔ اس کا کچھ کھانے پینے کو جی تو نہیں کیا، مگر بھوک بھی اپنی جگہ تھی۔ ناچار اس نے کچھ اٹھا کر منہ میں ڈالا اور چائے پینے لگا۔

یہاں پہنچنے کے بعد علی ریحان کو اپنی ایک غلطی پر پچھتاوا سا ہونے لگا تھا۔ وہ یہ کہ اس نے انسپکٹر منظور شاہ کے اصرار پر اسے اس پیغام سے متعلق اتنا ضرور بتا دیا تھا کہ...... وہ پیغام زبانی کلامی نہیں تھا بلکہ کاغذ پر لکھ کر اسے محفوظ رکھنے کے لیے کھال کے ایک ٹکڑے پر چسپاں کر دیا گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ پیغام اس سے چھینا بھی جا سکتا تھا۔ تاہم اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کسی نے ایسی کوئی کوشش کی بھی تو وہ اتنی آسانی سے یہ پیغام ان کے حوالے نہیں کرے گا اور جان لڑا دے گا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہی خادم دوبارہ اندرونی دروازے سے نمودار ہوا اور انسپکٹر منظور کو آنے کا کہا۔

”تم آرام سے کھاؤ پیو، میں ابھی آتا ہوں۔“ منظور شاہ نے اس سے کہا اور خالی کپ تپائی پر رکھنے کے بعد خادم کے ساتھ اسی دروازے سے اندر چلا گیا۔

علی اندر ہی اندر بری طرح تلملا رہا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ اس سے پوچھے کہ وہ اسے چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے مگر اس نے اپنی اس خواہش کو دبا دیا اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔

اس کے سینے میں دھکڑ پکڑ سی مچی ہوئی تھی۔ انسپکٹر منظور شاہ کی اب تک کی ساری حرکتیں اور وہ باتیں اس کی سچائی کی نفی کر رہی تھیں، جو اس نے نواب شہباز خان کے متعلق اس سے کہی تھیں کہ وہ انگریز سامراج کے وفادار تھے۔ بلکہ علی کا خیال اس کے برعکس تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بھی ہلچل ہو رہی تھی کہ انسپکٹر کی یہ حرکت مشکوک اور خالی از علت نہ تھی کہ...... وہ تنہا اندر سراج خان سے کیوں ملنے گیا تھا۔ کیا وہ کوئی ایسی باتیں کرنا چاہتا تھا جو اس کے سامنے نہیں کر سکتا تھا؟

یہ صورتِ حال دیکھ کر علی کا ارادہ مزید پختہ ہو گیا کہ وہ انسپکٹر یا سراج خان کو اب کچھ بھی نہیں بتائے گا، جب تک کہ نواب شہباز سے مل کر اور اس سے تسلی نہیں ہو جاتی کہ ان دونوں بھائیوں میں کون سچا تھا؟

تھوڑی دیر اور گزر گئی تو اسی دروازے سے انسپکٹر منظور شاہ نمودار ہوا۔ علی نے دیکھا کہ اس کے ہمراہ ایک گٹھی ہوئی جسامت اور چھوٹے قد کا شخص برآمد ہوا۔ اس کی شخصیت میں علی کو کوئی رعب داب یا وقار جھلکتا محسوس نہیں ہوا تھا۔ بجز اس کے کہ اس نے نہایت قیمتی لباس اور سر پر ریشمی کپڑے کا پگڑ نما صافہ باندھ رکھا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ اس نے اپنی شخصیت کو نوابوں جیسی بنانے کی سعی لاحاصل کی تھی۔

اس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں سونے اور یاقوت کی انگشتریاں تھیں۔ ان کے عقب میں وہ کرخت رو خادم بھی اندر چلا آیا تھا۔

سراج خان کی آمد کا اندازہ کرتے ہوئے علی بھی طوعاً و کرہاً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سلام وغیرہ کرنے کے بعد انسپکٹر نے ہولے سے علی کو بتایا کہ یہی "سراج صاحب" تھے۔

علی کی مشاق نظریں اور سراج خان کی بھانپتی ہوئی نگاہیں، چند ثانیے تک ایک دوسرے کے چہروں پر جمی رہی تھیں۔ علی کو یہ آدمی صورت سے ہی کچھ اچھے قماش کا نہیں لگا تھا۔ تاہم وہ خاموش رہا۔ گفتگو کی ابتدا انسپکٹر منظور نے ہی کی اور ہولے سے کھنکھار کر ایک نظر علی پر ڈالتے ہوئے سراج خان سے مخاطب ہو کر تعارفاً بولا۔

"سراج صاحب! یہ وہ بہادر نوجوان علی ریحان ہے، جو اپنی جان پر کھیل کر ایک بہت ہی اہم اور خفیہ پیغام آپ کے لیے لایا تھا۔ یہ پہلے آپ کے بڑے بھائی نواب شہباز خان سے ملنا چاہتا تھا لیکن میں نے ہی اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ نواب صاحب سے ملنے سے زیادہ بہتر آپ سے ملاقات کرنا ہو گا۔"

علی کو انسپکٹر کی بات پر سخت طیش آیا مگر وہ مسلسل ضبط سے کام لے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دونوں پہلے ہی اندر کسی قسم کا "صلاح مشورہ" کرنے کے بعد ہی یہاں آئے تھے۔

"بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر اور یہ بھی جان کر کہ تم ایک بہادر نوجوان ہو اور انگریز سماج کے خلاف اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک نیک کاز میں مصروف ہو۔"

سراج خان نے اپنی شخصیت سے ہم آہنگ کھردری اور کھرکھراتی آواز میں علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جبکہ علی کو اس کی شخصیت نے ہی نہیں بلکہ اس کی باتوں نے بھی متاثر نہیں کیا۔ جو تعریفی کلمات اس نے اس کے اور اس کے جرّی ساتھیوں کے لیے استعمال کیے تھے علی کو اس کا لہجہ مکارانہ اور فریب دیتا محسوس ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے انسپکٹر منظور شاہ کی دروغ بیانی پر بھی غصہ آیا تھا۔ لہٰذا وہ ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے سراج خان کی طرف دیکھتے ہوئے تلخ قسم کی صاف گوئی سے بولا۔

"سراج صاحب! مجھے بھی آپ سے مل کر یقیناً خوشی ہوتی...... لیکن اس صورت میں جب مجھے اپنی مرضی سے یہاں لایا جاتا۔"

علی اتنا کہہ کر دانستہ ذرا خاموش ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ منظور شاہ نے اپنی کارگزاری دکھاتے ہوئے سراج خان سے یہی کہا ہو گا کہ وہ اسے چالاکی سے گھیر گھار کر یہاں تک لایا ہے۔

اس نے دیکھا کہ انسپکٹر منظور شاہ کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے تھے، جبکہ سراج خان بھی تھوڑا جزبز سا ہوتا نظر آنے لگا، تاہم بولا۔

"ایسی بات نہیں ہے نوجوان! منظور شاہ نے تمہیں یہاں لا کر عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ ورنہ تم وہ اہم پیغام اپنی نادانی میں آ کر غلط شخص کے حوالے کر ڈالتے جس کا خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑتا۔"

"سراج صاحب! وہ پیغام جو حسنِ اتفاق سے میرے ہاتھ لگا ہے، میں اسے ایک مقدس امانت سمجھتا ہوں، جو مجھے ایک مرتے ہوئے آدمی نے دی ہے۔ وہ مجھے کسی غلط آدمی کو یہ پیغام دینے کا کیسے کہہ سکتا ہے؟" علی نے بغیر مرعوب ہوئے سراج خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"وہ آدمی میرے بھائی نواب شہباز کا ہی ایک مخبر تھا جو فرنگی سامراج کے لیے کام کرتا تھا۔" سراج خان نے علی کی جانب دیکھتے ہوئے اس بار لہجے کو قدرے سخت اور بارعب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہو گا کہ یہ پیغام ہمارے حوالے کر دو، اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔"

علی کو اس کے لہجے سے دھمکی اور جارحانہ عزائم کی بو آتی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اگر جوش اور غصے سے کام لیا تو اس سے وہ پیغام زبردستی بھی چھین لیا جائے گا اور وہ اس وقت سراج خان کی جاگیر میں موجود تھا۔ لہٰذا اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے سراج صاحب! میری آپ سے بھی ملاقات ہو گئی۔ لیکن اب میں ایک ملاقات نواب شہباز سے بھی کرنا

چاہتا ہوں۔ درحقیقت میں ایک مخمصے کا شکار ہو گیا ہوں۔ اس کی وجہ انسپکٹر منظور شاہ کا وہ رویہ ہے جو یہ مجھ سے اب تک روا رکھے ہوئے ہیں۔ یہی بات مجھے ...... معاف کیجیے گا، مزید شبہے میں ڈال رہی ہے۔ آخر میرے ساتھ یہ زبردستی کیوں کی جا رہی ہے؟ اس لیے میری آپ سے بھی گزارش ہے کہ برائے کرم آپ منظور شاہ سے کہیں کہ وہ اب مجھے نواب صاحب کی حویلی پہنچا دے۔ میں انہیں کوئی پیغام نہیں دوں گا۔ جب تک کہ ان کی طرف سے کسی قسم کی مجھے تسلی نہیں ہو جاتی۔ بعد میں ہی حتمی فیصلہ کروں گا...... کہ یہ پیغام آپ میں سے کس کے حوالے کرنا چاہیے مجھے۔"

علی کی بات پر سراج خان کے چہرے پر تندی کی چمک ابھری تھی۔ صاف عیاں ہوتا تھا کہ وہ اپنے اندر کے ابال کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کم و بیش یہی حالت منظور شاہ کی بھی ہو رہی تھی لیکن علی نے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ دونوں جارحانہ عزائم رکھنے کے باوجود اس کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر ہی نظر آ رہے تھے۔ اس کی وجہ علی کو یہی سمجھ میں آئی تھی کہ یہ دونوں نواب شہباز خان سے بھی ڈرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ اس کے ساتھ زبردستی کرتے تو علی، ان کی شکایت نواب صاحب سے ضرور کرتا اور بات چھپی نہیں رہتی۔

"اچھا ٹھیک ہے نوجوان! جیسے تمہاری مرضی۔" اچانک سراج خان نے کہا۔ پھر وہ انسپکٹر منظور شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اسے ہمارے بڑے بھائی صاحب نواب شہباز سے لے جا کر ملوا دو۔"

اتنا کہنے کے بعد سراج خان اٹھ کر چلا گیا۔ انداز ...ایسا ہی تھا جیسے وہ ناراض ہو کر گیا ہو مگر علی کو اس کی پروا نہ تھی۔ وہ تو خوش تھا کہ جان چھوٹی۔

"چلو، اگر تمہاری یہی ضد ہے تو۔" سراج خان کے کمرے سے نکلتے ہی منظور شاہ نے علی سے کہا اور علی جانے کے لیے فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

کمرے سے نکلتے وقت علی کی غیر اختیاری نظریں ایک کونے میں کھڑے خادم پر پڑی تھیں۔ وہ اسے بہت عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔

وہ دونوں باہر آ گئے اور احاطے میں کھڑی جیپ میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔

ایک بل کھاتے کچے راستے پر جیپ مناسب رفتار سے دوڑنے لگی۔ جب نیم جھنڈدار درختوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اچانک ایک موڑ مڑتے ہی ڈرائیور کو جیپ روکنا پڑی۔ سامنے پانچ عدد گھڑسواران کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ وہ سب ڈھاٹا پوش اور مسلح تھے۔

"یہ راہزن لگتے ہیں جناب! ہمیں مقابلہ کرنا چاہیے۔" پیچھے علی کے ہمراہ بیٹھے دو اہلکاروں میں سے ایک نے منظور شاہ سے کہا۔

"بے وقوف! لڑائی کی صورت میں ہم ہی مارے جائیں گے۔ یہ راہزنوں کا پورا ٹولا لگتا ہے، ان کے باقی ساتھی بھی کہیں آس پاس چھپے ہوں گے۔ حملے کی صورت میں وہ سب ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ پہلے دیکھو یہ چاہتے کیا ہیں؟" انسپکٹر منظور شاہ نے جھڑکا۔ علی کے جسم میں لاتعداد چیونٹیاں سی دوڑنے لگی تھیں۔ اسے پہلے ہی کسی خطرے نے بے چین کیے رکھا تھا۔

جیپ رکتے ہی وہ پانچوں مسلح ڈھاٹا پوش گھڑسواران کے قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک قدرے مضبوط تن و توش کے مالک شخص نے خونخوار لہجے میں ان سے ہتھیار پھینک کر گاڑی سے نیچے اترنے کو کہا۔

یہ لوگ اپنے ہتھیار پھینک کر حکم کی تعمیل میں نیچے اتر آئے۔

ڈھاٹا پوش راہزن بھی گھوڑوں سے نیچے اتر آئے تھے۔ انہوں نے ان پر اپنی بندوقیں تان لی تھیں۔ ان کی پشت پر تلواریں بھی جھولتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

"تمہارے پاس جو کچھ ہے نکال کر باہر رکھ دو۔" وہ جو ان میں سرغنہ نظر آتا تھا، اس نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔

سب نے فوراً اپنی جیبیں خالی کر دیں۔ علی کے پاس کچھ نہ تھا، ماسوائے اس کاغذی پیغام کے جو اس نے اپنی قمیص کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔

"تم اپنی جیبیں کیوں نہیں خالی کر رہے ہو؟" سرغنہ نے درشت نظروں سے اسے گھورتے ہوئے غرا کر کہا۔

علی ...... جو مسلسل اور بڑے غور سے اسی کی طرف بھانپتی ہوئی نظروں سے تکے جا رہا تھا، اسے سرغنہ کی آنکھوں کی چمک سے جس قسم کا جارحانہ تاثر مترشح ہوتا تھا، وہ اسے شناسا سا ہی محسوس ہو رہا تھا جبکہ سرغنہ کا لہجہ بھی یوں لگتا تھا جیسے وہ اسے بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

تب ہی اسے سرغنہ کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

اس نے سرغنہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ "میری حیثیت قیدیوں جیسی ہے، میرے پاس بھلا کیا ہو سکتا ہے۔"

”بکواس بند کرو اپنی......“ سرغنہ خونخوار غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے بولا۔ ”میں خود تمہاری جیب کی تلاشی لوں گا۔“ کہتے ہوئے وہ اس کی جانب بڑھا۔ اس نے علی کی جیبوں کی تلاشی لی تو اسے اس کھال کے ٹکڑے کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

”یہ کیا ہے؟“ سرغنہ نے پوچھا۔

”یہ کوئی پیغام ہے، جو مجھے نواب صاحب کو دینا تھا۔ یہ مجھے واپس کردو، تمہارے کام کا نہیں ہے یہ......“ علی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

سرغنہ نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”مجھے تو یہ کاغذ کا ٹکڑا کسی خزانے کا نقشہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ میرے پاس رہے گا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے جیسے ہی کھال کے اس ٹکڑے کو اپنے لانبے چولے کی جیب میں اڑسنے کی کوشش کی تو علی ایک دم حرکت میں آگیا۔

☆☆☆

صرف ایک پل کے لیے اس کے اندر یہ مایوسانہ خیال ابھرا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس پر ایک فرنگی کے ہاتھوں اپنی عزت بچانے کا جوش غلبہ پا گیا۔

اریبہ بھی کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ دراز قامت اور صحت مند جسم کی مالک تھی۔ لہٰذا جیسے ہی لیف بروجر نے اس کی چیخ روکنے اور اس پر غالب ہونے کی شیطانی نیت سے اپنا ایک ہاتھ اس کے منہ پر اور دوسرا ہاتھ اس کے گریبان پر رکھا اور چاہتا تھا کہ اسے تار تار کر ڈالے، اریبہ نے ہمت سے کام لیا اور اپنی ایک ٹانگ کا گھٹنا سکیڑ کر اس کی زوردار ضرب لیف بروجر کے پیٹ پر ناف کے عین نیچے جڑ دی۔

بروجر کے لیے یہ ضرب غیر متوقع اور شاید اس سے زیادہ کاری ثابت ہوئی۔ اس کے حلق سے ”اوغ“ کی کریہہ انگیز چیخ ابھری۔ اریبہ کی ہمت سوا ہوگئی تو اس نے بروجر کو خود سے پرے دھکیل دیا۔

وہ تکلیف میں تھا اور گھٹنے کی ضرب اس کی بہت ”نازک“ جگہ پر لگی تھی۔ وہ ابھی تک درد سے سنبھل نہیں پایا تھا، مگر جیسے ہی اس نے اریبہ کو اپنے شیطانی چنگل سے فرار ہوتے دیکھا تو اس نے دوبارہ شکرے کی طرح اس پر جھپٹا مارا...... اریبہ اس کی گرفت میں تو نہ آئی البتہ اس کے ہاتھ کا دھکا لگنے سے اور کچھ گھبراہٹ کے باعث اس کا پاؤں رپٹا، وہ گر پڑی اور دیوار کے کونے میں جا پڑی۔ بروجر بھیڑیے جیسی غراہٹیں خارج کرتا ہوا پھر اس کی جانب لپکا۔ اریبہ نے دیوار کا سہارا لے کر اٹھنے اور سنبھلنے کی کوشش کی کہ تنومند بروجر نے اسے وہیں دبوچ لیا۔

وہ اریبہ پر اب پوری طرح سے سوار ہو چکا تھا۔ اریبہ کو اس کے وجود سے ہی گھن آنے لگی تھی۔ وہ اس کا لباس تار تار کرنے کے درپے ہو رہا تھا تاکہ جلد از جلد اریبہ کے حسین اور جوان شباب کے ساتھ ہوس انگیز کھیل کھیل سکے کہ اچانک ہی اریبہ کا بچاؤ میں متحرک ایک ہاتھ بروجر کی پشت پر پڑا اور اسے بیلٹ پر بندھے ہوئے خنجر کے دستے کا احساس ہوا۔ اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ خنجر کھینچ لیا اور جوش سے ایک غراہٹ خارج کرتے ہوئے خنجر بروجر کے دائیں پہلو میں دستے تک اتار دیا۔

بروجر کے حلق سے کریہہ انگیز چیخ خارج ہوگئی۔ وہ تڑپ کر اس پر سے ہٹا مگر اریبہ کا غیظ کم نہیں ہوا تھا۔ اس نے خنجر نکال کر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ بروجر کے حلق سے برآمد ہونے والی آخری چیخ بڑی دل دوز تھی۔ اس کے پہلو اور پیٹ سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ وہ بے حس و حرکت ہوگیا تھا۔

اسی وقت دروازہ دھڑاکے سے کھلا۔ اندر دو اہلکار داخل ہوئے اور یہ منظر دیکھ کر ایک لمحے کو تو ان کے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ ان کا آفیسر لیف بروجر خون میں لت پت پڑا تھا۔ انہوں نے فوراً اریبہ کو گرفت میں لے لیا۔

☆☆☆

اریبہ کو گئے جب کافی دیر بیت گئی تو شاہ زمان کو اس کی فکر ہوئی۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ ان کا ڈراما پوری کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا اور مزید یہ کہ اریبہ اب بھی اس فرنگی آفیسر کو بڑی خوب صورتی سے بے وقوف بنا رہی ہوگی، مگر وہ ہوس کار لیف بروجر کے شیطانی منصوبے سے شاید واقف نہ تھا۔

چنانچہ...... جب اریبہ کو اس فرنگی سپاہی کے ساتھ گئے ہوئے کافی دیر ہوگئی تو اسے اریبہ کی طرف سے تشویش لاحق ہونے لگی۔ اس نے سوچا کہیں اریبہ کسی مصیبت کا شکار نہ ہوگئی ہو۔ وہ اٹھا اور ابھی باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کے کانوں سے شور کی آواز ٹکرائی۔ وہ باہر آیا تو ایک دل خراش منظر دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔

اریبہ کا لباس خون سے لتھڑا ہوا تھا اور اسے فرنگی سپاہیوں نے دبوچ رکھا تھا۔ اریبہ کو اس حالت میں دیکھ کر شاہ زمان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ سمجھا شاید اریبہ کو زخمی کردیا گیا ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح اس کی طرف لپکا۔

”اریبہ......! کیا ہوا......؟ تت...... تم ٹھ...... ٹھیک تو ہونا......؟“ اریبہ کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے اوسان ہی خطا ہوگئے تھے اور وہ اسے اصلی نام سے پکار بیٹھا تھا لیکن وہاں اس قدر ہڑبونگ مچی ہوئی تھی کہ کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ جبکہ اریبہ نے شاہ زمان کو اشارے سے ”سنبھالا“ لینے کو کہا تو اس کی سمجھ میں آگئی کہ وہ کیا غلطی کرنے والا تھا۔

”پرے ہو جاؤ...... تمہاری پتنی نے لیفٹیننٹ بروجر کا خون کردیا ہے۔“

ایک فرنگی سپاہی نے اس سے کرخت لہجے میں کہا تو شاہ زمان سرتاپا لرز کر رہ گیا۔ پل کے پل اس کے گمان میں سمایا کہ اریبہ کے ساتھ اس خنزیر جہنم واصل فرنگی نے کیا حرکت کی ہوگی۔ اس کا جی چاہا کہ ایک ہی ہلے میں وہ اریبہ کو ان ظالم فرنگیوں کے چنگل سے چھڑا کر اس منحوس راج محل سے نکل بھاگے لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔

”میری پتنی مینا خون نہیں کرسکتی، ضرور اس کے ساتھ بروجر نے کوئی انیائے (ظلم) کرنے کی کوشش کی ہوگی۔“ وہ حلق کے بل چلّا کر بولا۔ ”میں راجا پرتاب کمار سے انصاف چاہوں گا۔“

”خبردار! اب ایک لفظ بھی آگے مت کہنا۔“ ایک فرنگی نے اسے ڈپٹا۔ ”ورنہ تمہیں بھی گرفتار کرلیا جائے گا۔“

تھوڑی دیر بعد اریبہ کو فرنگی سپاہی اپنے ساتھ لے گئے اور اریبہ حسرت زدہ نگاہوں سے شاہ زمان کو تکتی رہ گئی۔ اس کے چہرے کی بے بسی اور آنکھوں سے جھلکنے والی مایوسی نے شاہ زمان کو بری طرح تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ اسے بھی دو سپاہیوں نے دبوچ لیا تھا تاکہ راستہ نہ روک سکے۔

اس کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد اسے سارے واقعے کی بھنک پڑ چکی تھی۔ وہ انصاف کے لیے راج محل کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا کہ اسے محافظوں نے روک دیا۔

”میں...... میں راجا پرتاب کمار سے انصاف چاہتا ہوں، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میری پتنی مینا کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔“ وہ پاگلوں کی طرح چیختا رہ گیا مگر کسی نے اس کی ملاقات راجا پرتاب کمار سے نہیں ہونے دی۔

تاہم ایک مصاحب خاص...... نے اس سے یہی کہا کہ اس مقدمے کا جائزہ لینے کے بعد ہی اس کی بھی پیشی ہوجائے گی، وہ اس سلسلے میں کوئی چنتا نہ کرے، وغیرہ۔

ناچار شاہ زمان منہ لٹکائے اور شکست خوردہ سا مہمان خانہ میں آگیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ بس...... اب اریبہ اس سے چھین لی جائے گی، ہمیشہ کے لیے اس سے دور کردی جائے گی اور وہ کچھ نہیں کر پائے گا۔

”ہرگز نہیں......“ وہ ایک دم فرطِ جوش سے آپوں آپ چیخ پڑتا۔

”میں اریبہ کو ان ظالموں کے ہتھے کبھی نہیں چڑھنے دوں گا، چاہے مجھے اس پورے راج محل کو آگ ہی کیوں نہ لگانی پڑ جائے۔“ وہ جوش و غیظ سے سرخ ہونے لگا لیکن پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی۔

ایک فطری ردعمل سے گزرنے کے بعد اس نے ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کا جائزہ لیا اور اسے جلد ہی اس امر کا احساس ہونے لگا کہ وہ جس کاز کے لیے یہاں راج محل میں مقیم تھا، وہ اریبہ سے بہرحال بڑا اور اہم تھا اور یہی بات اریبہ بھی اس سے کئی بار کہہ چکی تھی۔ تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ وہ اریبہ کی طرف سے بالکل ہی منہ موڑ لیتا۔ وہ اس کی ہر ممکن مدد کرنے کا پختہ عزم کر چکا تھا۔

اریبہ بہرحال ایک بڑی مصیبت کا شکار ہو چکی تھی۔ اسے بچانے کے لیے جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت تھی۔

اس نے بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا اور ایک بات پر اسے کسی حد تسلی ہوئی تھی کہ ابھی تک ان کا بھانڈا نہیں پھوٹا تھا۔ اریبہ نے اگر اس تخم خنزیر فرنگی آفیسر کا خون کیا تھا تو ایسا اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے کیا تھا مگر کون تھا جو اس بات کی گواہی دیتا؟ یہ الگ مسئلہ تھا۔ ڈر بھی تھا کہ اس طرح ان کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ اس بات کا بھی اسے قدرے اطمینان تھا کہ وہ آزاد تھا۔ اسے اریبہ کے ساتھ گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ اگر ایسا ہوجاتا تو وہ کیا کرلیتا لیکن جلد ہی اسے اس خطرے کا بھی احساس ہونے لگا کہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ بھی گرفتار کرلیا جاتا۔ یہ خیال آتے ہی اس کی تشویش آمیز پریشانی فزوں تر ہونے لگی۔

اسے نئے گدی نشین راجا پرتاب کمار کے بارے میں پتا تھا جو ایک انصاف پسند شخص تھا۔ شاہ زمان نے سوچا کہ کاش! اس کی فریاد راجا پرتاب کمار تک پہنچ جائے یا اس کی طلبی ہوجائے تو وہ اسے سارا حال سنانے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا وہ اسی کا منتظر رہا۔

اب اس کا آرام و چین چھن چکا تھا۔ رہ رہ کر اسے اریبہ کی یاد ستانے لگی۔ اس کی پرشوخ باتیں، دلنشین مسکراہٹ اور حسین چہرہ...... اس کی کون کون سی ادائے دلربا کو یاد کرتا۔ اس کی تو سب ہی ادائیں نرالی اور لاجواب تھیں۔

جلدی ہی اسے پتا چل گیا کہ اریبہ کو راج محل کے

زندان میں ڈال دیا گیا ہے اور عنقریب اریبہ کے سلسلے میں راجا پرتاب کمار ہی کوئی فیصلہ کرنے والے ہیں۔

اریبہ کو زندان میں ڈالنے پر شاہ زمان تڑپ اٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان راجاؤں اور مہاراجاؤں کے محلات کے زندان خانے کس قدر ہولناک ہوتے تھے جن کی قید و بند کی صعوبتوں کو سہنا بڑے دل گردے کا کام ہوتا تھا۔ اکثر تو ہول کھا کے زندان میں دم توڑ جایا کرتے تھے۔

شاہ زماں کو احساس تھا کہ اریبہ نے ان کے کاز کی خاطر یہ سب کچھ کیا ہے۔ اب اسے بچانا اسی کی ذمے داری ہے۔ شاہ زمان اپنی سی کوشش کرتا رہا تھا کہ اسے راجا پرتاب کمار تک باریابی کی اجازت مل جائے مگر تا حال ایسا نہ ہو سکا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نئے راجا پرتاب کمار کو راگ اور موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ورنہ شاہ زمان کے لیے راجا تک رسائی حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہ ہوتی۔

ابھی شاہ زمان پر یہ قیامت ٹوٹی تھی کہ اسے راج محل سے ہی نہیں بلکہ ریاست سے بھی بے دخلی کا حکم نامہ مل گیا۔ وہ اریبہ کے بغیر کسی صورت میں بھی ریاست تو کجا راج محل سے بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔

اس نے سوچا کہ داد فریاد کرے اور شور ڈال دے، مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اریبہ کو ظلم و جبر کی چکی میں پیسا جانے والا تھا۔ اس کا جرم ناقابلِ معافی تھا۔ اس نے ایک انگریز آفیسر کا قتل کیا تھا مگر کوئی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کر رہا تھا کہ بروجر ایک ہوس کار شیطان تھا اور اس نے اریبہ کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔

تاہم جب راج محل کے مصاحبِ خاص نے اسے بے دخلی کا حکم نامہ تھمایا تو اس نے نہایت ملتجیانہ انداز میں اس مصاحبِ خاص سے درخواست کی۔

''بھگوان کے لیے مجھے اتنا تو بتا دو کہ میری پتنی مینا کوری کے بارے میں کب فیصلہ ہوگا؟''

اس مصاحبِ خاص کا نام گرباش سنگھ تھا۔ وہ ایک تنومند اور درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ اس کے ہمراہ دو ساتھی بھی تھے۔ اس نے جواب میں شاہ زمان سے کہا۔

''ممکن ہے کہ تمہاری پتنی کا فیصلہ انگریز سرکار کے سپرد کر دیا جائے کیونکہ مینا نے انہی کے بڑے آفیسر کا قتل کیا ہے۔'' اس کی بات سن کر شاہ زمان دہل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اریبہ کو انگریز سرکار کے حوالے کرنے کا مطلب اذیت ناک موت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس نے فوراً .... مصاحبِ خاص کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور روہانسے انداز میں بولا۔

''یہ تو اس بے چاری کے ساتھ ناانصافی ہوگی، بھلا انگریز سرکار سے انصاف کی امید کیسے کی جا سکتی ہے؟ میری معصوم مینا کی اس درندے فرنگی آفیسر نے عزت لوٹنے کی ملیچھ حرکت کی تھی۔ کیا وہ اپنا دفاع نہ کرتی؟ بھگوان کے لیے کچھ سوچو...... مینا بے قصور ہے، اگر اس نے جرم کیا بھی ہے تو راج محل میں ہی اس کا فیصلہ ہونا چاہیے۔''

مصاحبِ خاص گرباش سنگھ چونکہ خود بھی ..... سکھ تھا اور وہ اریبہ اور شاہ زمان کو بھی مینا اور بھوپت کے ناموں کے حوالے سے ہم مذہب ہی سمجھے ہوئے تھا، اس لیے وہ ذرا دیر کے لیے اس کی بات سننے کو ٹھہر گیا تھا۔ بولا۔

''ابھی اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے، لیکن راجا صاحب کے زیادہ تر مشیروں کا یہی فیصلہ ہے، ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو۔'' اس نے تسلی دینا چاہی۔

''میں جانتا ہوں وہ انصاف پسند ہیں۔'' شاہ زمان نے جلدی سے کہا۔ ''یہ معاملہ ان کی ریاست اور انہی کے راج محل میں ہوا ہے تو فیصلہ بھی ادھر ہی ہونا چاہیے۔'' شاہ زمان نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''تم...... تم میرے بھائی! مجھے ایک ذرا راجا پرتاب کمار سے تو ملوا دو...... صرف ایک بار، اس کے بعد جوان کا حکم ہوگا مجھے منظور ہوگا۔ لیکن یہ تو میرے ساتھ ظلم ہوگا کہ میری پتنی کو قید خانے میں ڈال رکھا ہے اور اس کے پتی کو نکال باہر کیا جا رہا ہے۔ یہ تو انیائے ہے، میں اس کی فریاد لے کر کہاں جاؤں گا؟''

گرباش سنگھ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں سیناپتی موج سنگھ سے اس بارے میں بات کرتا ہوں۔ تم ابھی ٹھہر جاؤ۔''

''بہت دیالو ہو آپ سردار جی! میں غریب انسان آپ کا یہ احسان ساری عمر نہیں بھلا پاؤں گا۔'' شاہ زمان نے جلدی سے خوش ہو کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

وہ لوٹ گیا۔ پھر شام تک اس کا ایک خادم اس کے پاس آیا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ شاہ زمان یہی سمجھا کہ شاید راجا پرتاب کمار کا بلاوا آ گیا ہے، مگر ایسی بات نہ تھی۔ اسے سیناپتی موج سنگھ نے بلایا تھا۔ وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مصاحبِ خاص گرباش سنگھ بھی وہاں پہلے سے موجود تھا۔

شاہ زمان نے اسے پرنام کیا اور دونوں ہاتھ جوڑے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

شاید گرباش سنگھ سیناپتی کو شاہ زمان کی باتیں بتا

چکا تھا۔

ناگرہ ریاست کے سیناپتی موج سنگھ کا سامنا کرتے ہوئے شاہ زمان پہلے تھوڑا گھبرا سا گیا تھا مگر پھر دل ہی دل میں اللہ کو یاد کر کے حوصلہ کیے کھڑا رہا۔ موج سنگھ نے اس کی طرف بہ غور ایک نظر ڈالی پھر بھاری آواز میں بولا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ لیف بروجر تمہاری پتنی پر بری نگاہ رکھتا تھا؟ جبکہ اسے تم دونوں پر اس بات کا وشواس کی حد تک شبہ تھا کہ تم دونوں میاں بیوی باغیوں کے جاسوس ہو؟''

اس کی بات پر شاہ زمان کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا لیکن پھر فوراً پورے اعتماد سے جواب میں بولا۔

''جناب! وہ فرنگی آفیسر ایک بدطینت شخص تھا۔ میری پتنی پہلے بھی اس کے بارے میں شکایت کر چکی تھی کہ وہ اسے گندی نظروں سے گھورتا ہے۔ آپ کے سپاہیوں نے بھی تو دیکھا ہوگا کہ وہ اکثر میری پتنی کو بہانے بہانے سے اپنے پاس بلایا کرتا تھا۔ اس روز بھی اس نے مینا کو بلایا تھا جب میری اپنی پتنی سے کسی بات پر لڑائی ہو گئی تھی۔ بس! اسی روز ہی دن میری مینا کے لیے بھاری پڑ گیا۔''

''ہمیں کچھ ایسے شواہد ملے تو ہیں۔'' موج سنگھ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ شاہ زمان کے کان ایک دم کھڑے ہو گئے۔ اندر مسرت جاگی۔ وہ ترنت بولا۔

''سرکار! پھر آپ ہی انصاف کیجیے۔ میری مینا نے تو کبھی چڑیا بھی نہیں ماری، لیکن اپنی اجت (عزت) بچانے کو تو عورت جان بھی قربان کر دیتی ہے، وہ بھی ایک فرنگی کے ہاتھوں۔'' شاہ زمان نے اسے اکسایا۔

''ہم راجا پرتاب کمار سے اس سلسلے میں آج رات ہی بات کرتے ہیں۔'' بالآخر موج سنگھ نے کہا تو شاہ زمان کے چہرے پر خوشی اور تشکر کے جذبات امڈ آئے۔

☆☆☆

گنجی کھوپڑی والا بڈھا گدھ...... بچھورام المعروف...... بچھورام...... ایک ایسا خواب دیکھ رہا تھا جس کی تعبیر اسے مہارانی، جواب محض نجو بائی بن کر رہ گئی تھی، کے پُرلطیف قرب کو حاصل کرتے ہی اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگی تھی۔

وہ واقعی ایک خود گزیدہ بچھو بن چکا تھا۔ پاگل اور دیوانہ بچھو...... اور اس کی نفس پرستی پاگل بچھو کی طرح خود کو ہی ڈنک مارنے کے مترادف تھی۔ وہ نفسانی اور جاہ طلبی کی ہوس میں اپنی اوقات بھلا بیٹھا تھا۔ البتہ نجو بائی کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس نے اپنی اوقات نہیں بھلائی تھی۔ وہ چڑھتے اترتے سورج کی پجارن تھی۔ جانتی تھی کہ سورج جب آسمان پر ہو تو سوا نیزے برساتا ہے اور جب اتر جائے تو ہر شے دبیز تاریکی کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ وہ خود کو بھی ایسا ہی ڈھلتا ہوا سورج سمجھ رہی تھی اور تاریکی کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ تاریکی میں ہی وہ دوبارہ ابھرنے کے لیے کوشاں تھی۔ اسی لیے وہ اپنے غلام بچھورام کے ساتھ سیاہ کاری کی پستیوں میں گر چکی تھی۔

جس طرح بچھورام کی مثال ایک خود گزیدہ پاگل بچھو کی سی ہو گئی تھی، بہ عین اسی طرح نجو بائی بھی ایک ایسی مادہ مکڑی بن چکی تھی جو نر کو اپنی قربت سے آشنا تو ضرور کرتی ہے مگر پھر اسے ہڑپ بھی کر جاتی ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان دونوں کا یہ عجیب گٹھ جوڑ ''پاگل بچھو اور کینہ پرور مکڑی'' کا ثابت ہونے والا تھا۔

ودھوا (بیوہ) نجو بائی نے اپنے اور بچھورام کے بیچ ''خفیہ معاملات'' پر بات چیت اور تبادلہ خیال کرنے کے لیے راج محل کے ہی ایک دور افتادہ گوشے میں ''تخلیہ گاہ'' قائم کر لی تھی۔ جہاں وہ بظاہر پوجا پاٹ کرتی تھی اور اپنے آنجہانی پتی چندر گپتا کے سورگ باش ہونے کی کامناؤں میں مصروف رہتی تھی۔ اس کے در پردہ یہاں ان دونوں کے بیچ کیا سازشیں پکتی رہتی تھیں، یہ بچھورام اور نجو بائی کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

یوں نجو بائی بہ ظاہر دھارمائین کے روپ میں سفید سوتی ساڑی پہنے جاپ الاپ میں مصروف رہتی۔ رات کے کسی پہر میں بچھورام چوری چھپے ادھر ہی آ کر نجو بائی سے ''ملاقاتیں'' کیا کرتا تھا اور دونوں عیش و عشرت کے بعد آئندہ کی منصوبہ بندیوں کے سلسلے میں تبادلہ خیال کرتے۔

طلوعِ آفتاب سے قبل...... بچھورام تخلیہ گاہ سے چوروں کی طرح برآمد ہوا اور سیدھا اپنے اقامتی گوشے میں آ کر دم لیا۔ وہ بہت مسرور تھا۔ اس پر ماضی کی مہارانی اور حال کی نجو بائی کے حسن و شباب کا سرور طاری تھا۔ ساتھ ہی وہ خود کو مستقبل کے مہاراجا کے روپ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ شطرنج کی ایک ایسی بساط آپوں آپ ہی اس کی جھولی میں آ پڑی تھی جس کے ایک پٹتے ہوئے مہرے کو ''ڈھائی گھر'' چال پر رکھنے کا اسے بڑا سنہری موقع ملا تھا اور وہ اسے ضائع نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔

اس نے تھوڑا آرام کیا...... غسل وغیرہ سے فارغ ہو کے شاہی طعام گاہ میں جا کر ''پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا'' کے مثل ناشتا وغیرہ کیا اس کے بعد اچھی پوشاک چڑھائی اور سیدھا راج محل کے ''نیا خانے'' کا رخ کیا۔

خطوط اور پیغام رسانی کی ترسیل کے اس شعبے میں بچھورام کا ایک اپنا آدمی موجود تھا۔ اس کا نام مرلی تھا۔ بچھورام اس کے پاس پہنچا۔ وہ ایک میز کے پاس کرسی پر بیٹھا، چھلکے اور ترکاری کا ناشتا کررہا تھا۔ بچھورام کو دیکھتے ہی چہک کر بولا۔

"پدھاریے...... پدھاریے...... مہاشے جی! کیسے آنا ہوا؟ ہمیں بلالیا ہوتا۔ خود کیوں کشٹ کیا؟" اس کے لہجے میں چاپلوسی تھی۔ حالانکہ کون نہیں جانتا تھا کہ بچھورام، مہارانی نجو بائی کا خاص الخاص غلام تھا۔ اسی وجہ سے اس کا بھی رعب رہتا تھا مگر اب صورتِ حال بدل چکی تھی، لیکن اگر مرلی اب بھی اسے وہی عزت دے رہا تھا تو وہ جانتا تھا کہ بچھورام وقت کی چال کو کس طرح اپنے حق میں موڑنے والا شاطر دماغ بھی رکھتا تھا۔

یوں بھی وہ بچھورام کا خیرخواہ اور گہرا دوست بھی تھا۔ اس سے بڑھ کر محسن نواز...... کیونکہ بچھورام نے ہی مرلی کو اس کی خواہش کے مطابق مہارانی کی سفارش سے ٹپاخانے میں نوکری پر لگوایا تھا۔

"مرلی! مجھے اسی وقت بتاؤ کہ راج پور کے دیوان صاحب شیورائے بھولکر اس وقت کہاں ہوسکتے ہیں؟" مرلی تاڑ گیا کہ بچھورام اس وقت کسی اور بات کرنے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہے۔ اسی لیے بہ یک جنبش بولا۔

"ابھی لو مہاشے جی! یہ کون سا مشکل کام ہے۔" کہتے ہوئے مرلی نے فوراً چوبی خانوں میں دھرے پڑے تازہ خطوط اور دیگر کاغذوں کا جائزہ لیا اس کے بعد بچھورام سے بولا۔

"بھولکر پرسوں صبح اور کل شام تک دلی میں جنرل مائیکل شا کے ہاں تھے۔ اس کے بعد وہ راج پور جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے کہ انہیں ریاست مدھرنا کے ریزیڈنٹ کرنل اینڈرسن کا ترنت بلاوا آگیا تھا۔ لہٰذا شیورائے بھولکر کل رات سے مدھرنا ریزیڈنسی میں ہی مقیم ہیں۔"

بچھورام سوچ میں پڑگیا۔ آج صبح شیورائے بھولکر کا کیا پروگرام ہوسکتا تھا، اس کا علم نہ تھا۔ اس نے مرلی سے پوچھ لیا۔

"کچھ بتاسکتے ہو کہ وہاں ان کے قیام کی مدت کتنی ہوگی؟"

"مہاشے جی! معاملہ کوئی اہم لگتا ہے، کیونکہ گورنر رڈنی کاسٹوفر بھی وہیں آئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے، وہ آج رات تک تو وہیں ٹھہریں گے اگر نہ بھی مل سکے تو راج پور وہاں سے کون سا دور ہے، وہ آخر میں وہیں جائیں گے۔"

بچھورام کو مرلی کی تجویز بھلی لگی۔ اس نے اپنے چولے کی جیب سے چاندی کی ایک گنی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمادی اور تاکید کی کہ اگر کوئی اس کے بارے میں پوچھے تو یہی بتائے کہ وہ گنیش دیوتا کے میلے میں شرکت کے لیے پالن پور گیا ہے۔

بچھورام نے اسی وقت روانگی کی تیاری باندھ لی۔ بچھورام نے راج محل کے ہر شعبے میں اپنے آدمی رکھے ہوئے تھے۔ ڈاک گاڑی کے کوچبان کو بھی اس نے یہی سبق پڑھا کر جو مرلی کو رٹایا تھا، اس میں سوار ہوا اور بمبئی کی راہ لی۔

ڈبل گھوڑے کی تیز رفتار ڈاک گاڑی نے اسے دو تین گھنٹوں میں ہی بمبئی پہنچادیا۔ وہاں سے بچھورام نے موٹر بس میں سواری کی اور سہ پہر تک مدھرنا کی ریزیڈنسی جا پہنچا۔

ریاست مدھرنا بمبئی سے سو کلومیٹر دور اور کولا پور سے محض بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ایسی چھوٹی سی ریاست تھی جہاں مکمل طور پر انگریز سرکار کا قبضہ تھا۔ چونکہ یہاں کی ریاستیں آزاد نہیں کہلاتی تھیں اور وہاں کے والیان انگریز سرکار کے ہی متعین کردہ تھے اور کچھ پرانے وظیفہ خور اور "عنایت یافتہ" ان کے وفادار تھے۔ (آج کے ہندوستان میں یہ ریاستیں جدید اور ماڈرن شہروں کا منظر پیش کرتی ہیں اور لفظ ریاست ناپید ہوگیا ہے)۔

اسی طرح ریاست مدھرنا کا کچھ علاقہ ساحلی بھی کہلاتا تھا۔ بندرگاہ کے نام پر وہاں عارضی طور پر ایک گودی بھی بنائی گئی تھی کیونکہ یہاں سے بمبئی کی بندرگاہ قریب پڑتی تھی اور ٹھاٹھیں مارتا سمندر بہتا تھا۔ ساحلی جنگلوں کی بھی بہتات تھی۔

بہرکیف...... ریزیڈنسی کی عمارت تک پہنچتے پہنچتے بچھورام کو رات ہوگئی تھی۔ وہاں پہنچا تو اس نے یہ سن کر اطمینان کی سانس لی تھی کہ شیورائے بھولکر ابھی تک ادھر ہی تھا، البتہ گورنر رڈنی کاسٹوفر جاچکے تھے۔

بچھورام نے گیٹ پر متعین انگریز محافظوں کو بتایا کہ وہ ریاست ناگرہ سے آیا ہے اور شیورائے سے ملنا چاہتا ہے تو انہوں نے فوراً اندر اس کا پیغام پہنچادیا۔

اندر پیغام پہنچنے کی دیر تھی کہ اس کا فوراً بلاوا آگیا۔ اسے ایک آرام دہ اور دیدہ زیب نشست گاہ میں بٹھادیا گیا اور اس کی خاطر مدارت کی گئی۔

نشست گاہ کی دیواروں پر کرنل اینڈرسن اور اس کی فیملی کی تصاویر...... کے علاوہ، وہ تصاویر بھی ٹنگی ہوئی تھیں جس میں کرنل اینڈرسن کو اپنے شکاری ٹولے کے ساتھ خنزیر اور تیندوے کا شکار کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ایک تصویر سندربن کے جنگل کی بھی تھی۔ ایک شکاری کیبن کے سامنے

بھی کرنل اینڈرسن کی تصویر تھی جس میں اس نے سولہ بور کی بندوق پکڑ رکھی تھی اور ایک مردہ شیر کے پیٹ پر لات رکھے تنا کھڑا تھا۔

بچھورام جانتا تھا کہ شیورائے بھولکر کی انگریز سرکار کے سامنے کیا حیثیت تھی۔ بھولکر اگرچہ دیگر ہندوستانیوں کی طرح ''کالا غلام'' تھا مگر اس کی عزت انگریز خادم بھی اسی طرح کرتے تھے جیسے وہ کالا غلام نہیں بلکہ ان کا افسر ہو اور یہ بات حقیقت بھی تھی۔ ایسے ہی تو نہیں اسے راج پور کا دیوان بنایا گیا تھا۔ بھولکر انگریزوں کا کٹر وفادار تھا اور ان کا مراعات یافتہ بھی۔ سرکارِ انگلشیہ سے لے کر برٹش آرمی تک اس کی رسائی تھی۔

بچھورام جانتا تھا کہ نجو بائی کو اقتدار کی بساط پر ڈھائی گھر چلانے کی چال میں صرف بھولکر ہی اس کی مدد کرسکتا تھا۔ یہ بچھورام کی خوش قسمتی تھی کہ سیاست کی اس بساط پر چال چلنے کا یہ بہترین موقع تھا۔

بچھورام بے چینی سے بھولکر کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

شوکی کی آنکھ بہت سے دیر سے لگی تھی۔ وہ رات گئے تک جاگتا رہا تھا۔ امجد خان البتہ اس سے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سو گیا تھا اور اب اس کے خراٹے خیمے میں گونج رہے تھے۔ شوکی بھی سویا ہوا تھا مگر اس کی نیند اب بھی ''کھٹکے'' والی تھی۔

دفعتاً کسی تیز چبھن کے باعث اس کی آنکھ کھلی۔ یہ ''چبھن'' ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تھی، جنہوں نے اس کے خیمے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے شدید تپش، جلن اور گھٹن کا احساس ہوا۔

خیمے کے اندر دھواں بھرنے کے باعث ایک تو اسے صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا، دوسرے اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ چاہتا تو ایک ہی جست میں اس جلتے بھڑکتے خیمے سے باہر ہوتا مگر اسے اپنے ملازم پیشہ ساتھیوں (نندو بابا اور اس کی بیوی) بالخصوص اپنے دوست امجد خان کی فکر ہوئی۔ خیمے نے اگرچہ ابھی پوری طرح آگ نہیں پکڑی تھی، مگر وہ جہنم زار کا منظر ضرور پیش کرنے لگا تھا۔ اسے سیاہ دھوئیں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم ایک محتاط اندازے سے اس نے جھپٹا مار کر ایک کونے میں سوئے پڑے امجد خان کو جھنجوڑ دیا۔

بدقسمتی سے وہ بے چارہ خیمے کی چادر والی دیوار کے قریب ہی فرشی بستر بچھائے لیٹا ہوا تھا اور نندو بابا اور اس کی بیوی بھی دوسری دیوار کے کونے کی طرف سوئے پڑے تھے۔ یوں آگ نے انہیں فوراً جالیا تھا، جبکہ اس کے برعکس شوکی خیمے کے وسط میں لیٹا ہوا تھا اور وہ فوری طور پر بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں آنے سے سردست محفوظ رہا تھا۔ تاہم امجد جیسا روح فرسا حشر نندو بابا اور اس کی بیوی کا بھی ہوا تھا۔

شوکی کے ہاتھوں کو سلگتے ہوئے شعلوں نے لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امجد خان کا پورا جسم آگ کی زد میں آگیا تھا۔

شوکی کے وجود میں کرب کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا دوست امجد زندہ جل رہا تھا اور وہ اسے جل مرنے کی بھیانک اذیت سے بچانے سے قاصر تھا۔ نہ ہی وہ نندو بابا اور اس کی بیوی کو بچا سکا تھا بلکہ اب تو خود اس کی اپنی زندگی کے بھی لالے پڑنے لگے تھے۔ اس نے اندازے سے نکاسی والے حصے کی جانب جست بھری اور خیمے سے باہر آگیا۔ مگر شعلوں نے اس کے کپڑوں کو جالیا تھا۔ شوکی نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی جلتی سلگتی شرٹ اتار پھینکی تو یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے کہ دیگر دو خیموں کو بھی اسی طرح آگ نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

آگ کا عفریت خیمے نگلنے میں مصروف تھا اور شوکی اس روح فرسا تصور سے ہی دہل کر رہ گیا کہ کیا رینا کا حشر بھی امجد خان جیسا ہونے والا تھا ؟

رینا کا خیال آتے ہی وہ دیوانہ وار اس کے خیمے کی طرف بڑھا تھا کہ اس نے رینا کی چیخیں سنیں، وہ مزید تشویش زدہ ہوگیا اور آگ کے اس جہنم زار میں اتر گیا۔

اندر شعلوں اور دھوئیں کا رقص جاری تھا۔ شوکی نے رینا کو تلاش کیا اور تب ہی اس کی دوسری چیخ سنائی دی۔ وہ سلیپنگ بیگ میں ہونے سبب کے آگ سے فوری طور پر بچی ہوئی تھی، نیز ابھی اس کے خیمے کو پوری طرح آگ نے نہیں گھیرا تھا۔

اس نے رینا کو سلیپنگ بیگ سمیت ہی اپنے دونوں توانا بازوؤں پر اٹھا لیا اور لے کر گویا آگ کے سمندر سے باہر آن کودا۔

''گگ...... گارشیا اور رابرٹ......'' رینا اپنے سلیپنگ بیگ سے برآمد ہوتے ہوئے چیخ کر بولی۔ اس کے سلیپنگ بیگ کو آگ نے پکڑ لیا اور تب ہی شوکی ان کے خیمے کی طرف بڑھا اور ابھی تھوڑا ہی قریب پہنچا تھا کہ اس نے رابرٹ کو سلیپنگ بیگ سمیت خیمے سے باہر آتے دیکھا۔ اس نے ایک اور سلیپنگ بیگ اٹھا رکھا تھا۔ اسے بھی آگ لگ چکی تھی۔

شکر تھا کہ قریب ایک ندی بہہ رہی تھی، ان سب نے وہیں چھلانگ لگادی۔ یخ بستہ پانی نے ان کے کپڑوں کی آگ پل کے پل بجھا ڈالی تھی۔

تھوڑی دیر تک یہ چاروں ندی کے پانی میں ہی رہے۔ ان کے جسم جلنے سے بچ تو گئے تھے، تاہم جسم کے چند مقامات میں دس سے پندرہ فیصد حصوں کو آگ اور بھڑکتے ہوئے شعلوں نے ضرور متاثر کیا تھا۔

رینا کچھ بچی رہی تھی، رابرٹ اور گارشیا بھی معمولی سے ہی متاثر ہوئے تھے، کیونکہ وہ سلیپنگ بیگ میں تھے۔ البتہ شوکی کا معاملہ ان سے مختلف تھا۔ ملازموں کے پاس کوئی سلیپنگ بیگز نہیں تھے۔ شوکی کی تو آنکھ بروقت کھل گئی تھی، مگر امجد خان، نندو بابا اور اس کی بیوی جانبر نہ ہوسکے تھے۔

خود شوکی بھی آگ سے متاثر ہوا تھا۔ امجد خان وغیرہ کو بچانے اور پھر اسی جلتے سلگتے خیمے سے باہر آکر دوبارہ رینا کے آتش بار خیمے میں گھس کر اسے بچانے کے باعث وہ خاصا زخمی ہوگیا تھا۔

اس کے جسم پر چھالے پڑنے لگے تھے۔ یہ تو شکر تھا کہ شوکی نے فوراً ندی کے یخ بستہ پانی میں چھلانگ لگادی تھی۔ باہر نکل کر وہ نڈھال ہوکے ندی کے کنارے آن پڑا اور اب سردی کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ بلکہ وہ سب ہی سردی سے ٹھٹھرنے لگے، لیکن ان تینوں کی حالت شوکی سے قدرے بہتر تھی۔ رینا اور گارشیا ہی اسے سنبھالنے لگی تھیں، جبکہ رابرٹ کو شوکی پر طیش آگیا اور وہ غصے سے اس پر آنکھیں نکال کر چڑھ دوڑا۔

''خیموں میں کیسے آگ لگی؟ کیا تم سو گئے تھے؟ کس نے کہا تھا تم سے سونے کو؟ تمہیں ساری رات پہرا دینا چاہیے تھا۔''

''رابرٹ، پلیز! اسے کچھ مت کہو۔ اسی نے تو میری جان بچائی ہے، ورنہ تو میں بھی امجد اور نندو بابا کی طرح آگ میں جل کر مر چکی ہوتی۔'' وہ شوکی کو اس حالت میں دیکھ کر روہانسی ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شوکی نے ایک بار پھر اپنی جان پر کھیل کر اس کی زندگی بچائی تھی۔

''تب پھر یہ آگ اس نے خود لگائی ہوگی۔'' رابرٹ غصے سے دانت پیس کر بولا۔ ''یہ ہم سب کو ختم کرنا چاہتا... ہوگا۔ تمہاری جان اسی لیے بچائی اس نے تاکہ کوئی اس پر شبہ نہ کرے۔''

''برادر پلیز! ابھی ان باتوں کو چھوڑو، دیکھ نہیں رہے کہ آگ تینوں خیموں میں لگی ہے، یہ کوئی اور چکر معلوم ہوتا ہے۔''

گارشیا نے اپنے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

تینوں خیمے ان کے سامان کے ساتھ جل کر راکھ ہوگئے تھے۔ وہ اب ایک طرح سے بے خانماں و برباد ہوگئے تھے۔

گارشیا کے سمجھانے پر رابرٹ خاموش تو ہوگیا تھا، مگر اس نے شوکی کو سنبھالنے میں کوئی مدد نہ کی۔

شوکی فطرتاً دلیر اور کمال قوتِ ارادی کا مالک شخص تھا۔ اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے رابرٹ کی بھی بکواس سن لی تھی۔ رینا اور گارشیا اسے سہارا دے کر اس طرف لے آئے تھے جہاں خاکستر پڑتے خیموں کی آگ مدھم سی ہونے لگی تھی۔ تپش کے باعث شوکی کو ٹھنڈ کا احساس کم ہونے لگا۔

رات ہنوز آخری پہر میں سرک رہی تھی اور جلے ہوئے خیموں سے چٹخنے کی کریہہ انگیز آوازیں ابھر رہی تھیں۔ وہاں کبھی کوئی چنگاری ایک لمحے کو زور سے بھڑک کر مدھم پڑ جاتی تھی۔ چہار سو اب بھی ہو کا عالم تھا۔

''میں اپنی اس بے پروائی سے سخت شرمندہ ہوں۔'' بالآخر تھوڑی دیر بعد جب وہ پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں آگیا تو اس نے شرمساری سے کہا۔

''مجھے یا امجد کو رات بھر پہرا دینا چاہیے تھا۔ یہ آگ ہمارے دشمنوں میں سے ہی کسی نے لگائی ہے۔''

''جب تمہیں دشمنی کی اس فضا کا علم تھا تو تم اتنی اہم بات بھول کیسے گئے؟''

رابرٹ نے اسے شرمندہ دیکھ کر ایک بار پھر اپنے دل کا غبار نکالا۔ ''مجھے پورا یقین ہے، یہ حرکت تمہاری ہی ہوسکتی ہے۔''

''رابرٹ، پلیز! خاموش ہوجاؤ اب...... مت کرو ایسی باتیں...... شوکی ہمارا سچا ساتھی اور مددگار ہے۔''

رینا نے فوراً اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا تو گارشیا نے بھی رابرٹ کو خاموش رہنے کا اشارہ کردیا۔ وہ شوکی کو برا بھلا کہہ کر رینا کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ بات رابرٹ بھی جانتا تھا۔ یوں جیسا کہ مذکور ہوچکا، ان دونوں مکار بہن بھائیوں نے اپنے اپنے مفادات کی خاطر شوکی سے متعلق اپنی پالیسی تبدیل کرڈالی تھی اور وہ اس پر کاربند رہنے کا مشترکہ طور پر فیصلہ بھی کرچکے تھے۔

شوکی کو امجد اور نندو بابا وغیرہ کے مرنے کا بے حد دکھ تھا۔ امجد تو اس کا دوست تھا۔ انہیں یاد کرکے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

تھوڑی دیر اور بیت گئی تو یہ چاروں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

آنجہانی سالار پروفیسر ہنری برنارڈ کے بنائے ہوئے اس قافلے میں اب صرف یہ چار افراد ہی باقی بچے تھے۔

رینا اور گارشیا کا خیال تھا کہ یہ آگ کالی دیوی کے مندر کے بدمعاش پجاریوں نے لگوائی ہے۔ رابرٹ، شوکی پر شبہ کیے ہوئے تھا۔ تاہم گارشیا کے ٹوکنے پر اب وہ اس کا بار بار اظہار نہیں کر رہا تھا جبکہ شوکی بھی کسی حد تک رینا اور گارشیا کے خیال سے متفق تو تھا مگر اب بھی وہ اس سے متعلق کچھ الجھا ہوا تھا۔ بولا۔

”اس کینہ پرور مہا پجاری بدری ناتھ کی دشمنی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے اس نے ہمارے خلاف جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکا۔ اس کا پہلا شکار پروفیسر ہنری تھے اور اس مردود کی ہمارے خلاف دوسری سازش یہ تھی کہ ہمیں راج محل سے بے دخل کر دیا جائے۔ اس کے یہ دونوں مذموم مقاصد پورے ہو چکے۔ لہٰذا اب میں نہیں سمجھتا کہ وہ ہمیں مزید چھیڑنے کی کوشش کرے گا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ رینا نے فوراً شوکی کی تائید کی۔ ”تو پھر تمہارا کیا خیال ہے شوکی! یہ حرکت اب کس کی ہو سکتی ہے؟“ اس نے آخر میں شوکی کو اپنی نیلی اور دلنشیں آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سے جوش کی کیفیات کروٹیں لے رہی تھیں۔

”میں اس سلسلے میں تھوڑا کھوج لگانا چاہتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ رینا نے اسے سہارا دیا۔ رینا کے بھیگے بھیگے اور نرم و گداز لمس نے شوکی کی رگوں میں خون کی گرمی دوڑا دی۔ اس کے مرمریں بدن کی خوشبو سے اس کا پژمردہ سا جسم ایک دم جاگ پڑا۔

شوکی غور غور سے خیموں کے مقام اور اس کے اردگرد زمین کا جائزہ لینے لگا۔

جلد ہی وہ چونک پڑا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے چہرے کے تاثرات بھی ایکا ایکی متغیر سے ہو گئے اور وہ ایک دم چوکنا نظر آنے لگا۔ تب ہی اچانک گارشیا کی چیخ کی آواز ابھری۔ رینا اور شوکی دونوں چونک کر پلٹے۔ وہاں کا منظر دیکھتے ہی رینا کے حلق سے خوف بھری چیخ خارج ہو گئی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں، شوکی کے چہرے پر بھی سناٹا عود کر آیا تھا۔

تاروں کی مدھم سی روشنی میں ان کی آنکھوں کے سامنے منظر ہی ایسا عجیب و غریب اور چونکا دینے والا تھا۔ تین عجیب الخلقت انسانوں نے رابرٹ اور گارشیا کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان کے عزائم ٹھیک نہیں لگتے تھے۔ گارشیا سہم کر اپنے بھائی رابرٹ سے جا لگی تھی۔ خود رابرٹ بھی ڈرا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔

شوکی ابھی ان کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیے ہوئے ہی تھا کہ اچانک تھمی ہوئی فضا وحشیانہ چیخوں سے گونج اٹھی۔ اسی طرح کے تین اور چوپائے نما انسان قریب کی جھاڑیوں سے ایک دم نمودار ہوئے اور...... بیک وقت شوکی اور رینا پر چھلانگیں لگا دیں...... ایک حملہ آور نے تو رینا پر جھپٹتے ہی اسے زمین پر گرا دیا جبکہ باقی دو شوکی پر پل پڑے تھے۔

یوں شوکی بھی اس اچانک حملے سے بوکھلا کر ان سمیت ہی زمین پر آ رہا مگر اس نے اپنے مختل پڑتے حواسوں پر فوراً ہی قابو بھی پا لیا، نہ صرف یہ بلکہ اس نے ایک حملہ آور کے چہرے پر گھونسا بھی رسید کر دیا۔ دوسرا اس کے سینے پر سوار ہو گیا، جسے شوکی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پرے اچھال دیا۔

جلد ہی شوکی کو اندازہ ہو گیا کہ چوپائے نما یہ انسان کسی فطری ردعمل کے طور پر ان پر حملہ آور تو ہوئے تھے ان میں لڑنے کی بھی صلاحیت تھی اور وہ جنگجوانہ خو بو بھی رکھتے تھے، لیکن جسمانی طاقت بس ان میں جیسے حرکت کرنے کی ہی تھی۔ اسی سبب دو حملہ آور شوکی کے جوابی ہلے پر ہی ڈھیر ہو گئے اور حلق سے عجیب و غریب آوازیں خارج کرنے لگے۔

شوکی رینا کی طرف متوجہ ہوا، وہ بھی اپنے بچاؤ کی حد تک حملہ آور سے نبرد آزما تھی، جس نے اس کے سنہرے بال دبوچ رکھے تھے۔ شوکی نے اسے بھی ایک لات رسید کر دی اور وہ کسی پلّے کی طرح چلاتا ہوا دور جا پڑا۔

ادھر رابرٹ کو بھی شاید اسی قسم کا کچھ اندازہ ہو چلا تھا۔ اس نے بھی جوابی ”ہلے“ کے طور پر جب ایک حملہ آور کو لات رسید کی تو وہ دور جا گرا۔ یوں اس کی بھی ہمت سوا ہوئی، یہ دیکھ کر کہ یہ لوگ کمزور ہیں تو وہ شیر ہو گیا۔ اس نے دوسرے حملہ آور کو دبوچ لیا اور اس کا گلا دبانے لگا، وہ حملہ آور چیخنے اور تڑپنے لگا۔

”اسے چھوڑ دو رابرٹ......! یہ لوگ کمزور ہیں، ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ اسی وقت شوکی نے رابرٹ سے چیخ کر کہا مگر رابرٹ مارے طیش کے اس کا گلا دبوچے جا رہا تھا، تب شوکی کو حرکت میں آنا پڑا۔ گارشیا اور رینا بھاگ کر ایک دوسرے سے آن ملی تھیں اور حیرت اور سہمی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف تکے جا رہی تھیں۔

شوکی نے آگے بڑھ کر رابرٹ کے چنگل سے ایک حملہ آور کو چھڑا لیا۔

فضا ایک دم جیسے جامد ہو گئی تھی۔ یہ چھ کے چھ حملہ

آور ان کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ چاروں بھی بڑے غور غور سے انہیں تک رہے تھے، اور حملہ آور انہیں۔

رینا آگے بڑھی۔ وہ شوکی کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔

”تم لوگ کون ہو؟ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ کیا تم لوگوں نے ہی ہمارے خیموں کو آگ لگائی تھی؟“ رینا نے ان پر ایک ساتھ سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

شوکی نے دیکھا کہ رینا ان کے اس اچانک ہلّے کے باوجود سنبھلنے کے بعد اب ان سے مسکرا کر بات کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جبکہ وہ عجیب الخلقت افراد بھی اب اپنی جارحانہ روش بھلا کر آنکھیں پٹپٹائے ان کی جانب خاموشی سے گھورے جا رہے تھے۔ وہ ہنوز چوپایوں کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں زمین پر رکھے ہوئے، ان سے ذرا فاصلے پر کھڑے تھے۔

”دیکھو...... ہم تمہارے دوست ہیں اور تمہاری مدد کرنے کے لیے ہی ہم یہاں تمہاری بستی میں آئے تھے۔“ رینا نے کوشش جاری رکھی۔ وہ اب خوف اور سراسیمگی کی کیفیت سے نکل آئی تھی اور اس کی جگہ اب ایک قسم کے جوش نے لے لی تھی۔ وہ آگے بولی۔

”کیا تم لوگ میری بات سمجھ رہے ہو؟ تمہیں سمجھ میں آ رہی ہیں میری باتیں؟“

رابرٹ، گارشیا اور شوکی کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ اب انہیں بالکل بے ضرر محسوس ہونے لگے تھے، پھر رینا کی باتوں سے ان کے چہروں پر طاری جارحانہ تاثرات بھی ماند پڑنے لگے تھے۔ وہ اب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

شوکی بہت غور اور قریب سے ان کا جائزہ بھی لینے میں مصروف تھا۔ وہ ننگ دھڑنگ تھے۔ بادی النظر میں لاغر اور کمزور ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان کے گال اور چہرے پتا نہیں کسی کمزوری کے باعث لبوترے اور پچکے ہوئے دکھائی دیتے تھے یا پھر یہ تھے ہی ایسے۔

وہ لوگ آپس میں کچھ کھسر پسر کرتے رہے، اس کے بعد ان سب نے اپنے سیدھے ہاتھ بیک وقت بلند کر دیے اور ساتھ ہی اپنے سروں کو بھی جھکا دیا۔ رینا کا چہرہ فرط مسرت سے جگمگا اٹھا۔ وہ انہیں رام کر چکی تھی۔ اسے بے انتہا خوشی ہو رہی تھی کہ وہ اپنے مرحوم باپ کے ایک اہم مقصد کو پورا کرنے میں کامیاب ہو رہی تھی۔

تب ہی رینا جوشِ مسرت سے ان کی جانب بڑھی اور ان کے فضا میں بلند ہاتھوں کو بڑی محبت سے باری باری تھام لیا۔ پھر ان کے چہروں اور سروں پر بھی پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی اور ایک عجیب جذبات تلے ان سے کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں، تم لوگ طویل عرصے سے ایک موذی بیماری کا شکار بنا دیے گئے ہو اور ایسا ظلم کس نے تم لوگوں کے ساتھ کیا تھا، میں اسے بھی جانتی ہوں۔“

پتا نہیں وہ رینا کی زبان سمجھ رہے تھے یا نہیں، لیکن محبت اور خلوص کی ایک ہی زبان ہوتی ہے جو الفاظ سے ہی نہیں رویے سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہی شے ان چھ عجیب الخلقت انسانوں کو بھی سمجھ میں آ گئی تھی کیونکہ اب ان کے انداز و اطوار سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ انہیں اپنا ہمدرد اور دوست سمجھنے لگے تھے۔

”تم لوگ بھی قریب آؤ۔ ان سے ڈرو نہیں، یہ بے چارے بے حد دکھی ہیں اور ہم نے ان کی مدد کرنی ہے۔ یہ بھی ہمارے ہی دشمنوں کے ستائے ہوئے ہیں۔ پلیز، شوکی، گارشیا اور تم رابرٹ......! فار گاڈ سیک...... کم آن......“

رینا کا لہجہ فرطِ جذبات سے لرزاں ہو رہا تھا۔ انسانیت کو تکلیف میں دیکھ کر رینا کا لہجہ پسیجنے لگا تھا۔ کرب سے اس کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔

انسانیت کی تڑپ میں ایک فرنگن دوشیزہ کو اس قدر جذباتی اور رقیق زدہ دیکھ کر شوکی بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ رینا صرف حسین ہی نہیں بلکہ اس کے سینے میں ایک خوبصورت اور دردمند دل بھی تھا۔

رینا اشاروں کی بین الاقوامی زبان جانتی تو نہیں تھی مگر اسے کچھ اشاروں پر عبور حاصل تھا اور ان کی بنیادی سوجھ بوجھ بھی رکھتی تھی۔ انہیں اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی زبان اور بولی سمجھنے سے قاصر تھے اور اسی بات سے رینا کو اندازہ ہوا تھا یہ واقعی قدیم قبیلہ تھا۔ جیسا کہ اس کے مرحوم باپ پروفیسر ہنری کی ڈائری میں لکھا تھا۔

اپنے باپ کا صندوقچہ اور اس میں رکھی ڈائری اور دیگر کاغذات کے جل کر خاکستر ہونے کا بھی اسے سخت ملال ہو رہا تھا، تاہم اس نے اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ سب اس نے اسی رات حسنِ اتفاق سے پڑھ لیا تھا اور ان کی تحریریں اسے ازبر ہو چکی تھیں۔

اچانک ان میں سے ایک فرد نے اپنے حلق سے عجیب سی مگر قدرے بلند آواز خارج کی۔ اس کے بعد تو جیسے ٹڈی دل نمودار ہو گیا۔ ان کے اردگرد کی جھاڑیوں سے لاتعداد، انہی جیسے لوگ برآمد ہونے لگے۔ اس قدر کہ یہ چاروں ان کے درمیان گھر کر رہ گئے۔

اس صورتِ حال پر ایک بار پھر گارشیا اور رابرٹ کچھ

خوف زدہ سے نظر آنے لگے۔ کہیں یہ لوگ ان پر ایک بار پھر ہلا ہی نہ بول دیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

یہ سب لوگ انسان نما چوپائے تھے اور مختلف عمروں کے نظر آرہے تھے۔ بوڑھے، بچے، جوان، عورتیں سب ہی...... لیکن وہ سب جھکی جھکی کمر اور ہاتھوں کو چوپایوں کے انداز میں زمین پر رکھے ہوئے تھے۔

پھر ان چھ میں سے دو افراد نے الگ الگ گروہ میں بٹ کر اپنی بولی میں اپنی قوم سے کوئی مختصر سا خطاب کیا اور تب رینا اور شوکی وغیرہ نے دیکھا کہ ان سب کے لبوترے چہروں پر خوشی اور انبساط کے آثار نمودار ہونے لگے۔ تب ہی انہوں نے ان چاروں کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ رینا اور شوکی کو تو بالکل نہیں البتہ رابرٹ اور گارشیا کو تامل ہوا تو رینا نے انہیں سمجھایا۔

”دیکھو ہم ایک اہم مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یقین کرو میری بات کا۔ میں ان کی مدد کرسکتی ہوں اور انہیں اس عذاب سے نجات دلا سکتی ہوں۔ یوں ہمیں بھی اب ان کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے رینا نے انہیں اپنے باپ کی ڈائری کے متعلق بتایا۔ اس اسرار کے متعلق رینا کی زبانی سن کر رابرٹ اور گارشیا ہی نہیں شوکی بھی حیران رہ گیا تھا۔

بہرطور...... یہ چاروں ان کی معیت میں چل پڑے۔ کہیں دور نہیں جانا تھا۔ یہ لوگ اپنی ہی بستی میں تھے۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کی تنگ و تاریک گھپائیں اور سرکنڈوں کے جھونپڑے دکھائی دے گئے۔

جلد ہی یہ عقدہ کھلا کہ ان کا سردار بھی تھا۔ وہ ایک نسبتاً بڑے جھونپڑے سے برآمد ہوا تھا۔ پانچ اور افراد کا ٹولا ان سے آن ملا۔ ان میں اکثریت بوڑھوں کی تھی۔ پھر انہی میں سے ایک بوڑھے نے، اپنے آدمی کا اشارہ پا کر رینا کی طرف رخ کیا اور ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں رینا سے کچھ کہا۔

رینا اس چوپائے بوڑھے کو ہندوستانی بولتے دیکھ کر حیران اور خوش ہوئی۔

تب ہی اس نے اس بوڑھے کو ساری باتوں سے بالتفصیل آگاہ کر دیا۔

شوکی، گارشیا اور رابرٹ نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ بوڑھا رینا کی یہ ساری داستان سن کر آب دیدہ ہو گیا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ جھریوں بھرے چہرے پر تشکر کے جذبات ہویدا تھے۔ اس سے بھی زیادہ جذبات انگیز منظر اس وقت دیکھنے میں آیا جب اس بوڑھے نے اپنی بولی میں سردار سمیت ان سب کو رینا...... اور اس کے ساتھیوں (شوکی، گارشیا اور رابرٹ وغیرہ) سے متعلق نیک مقاصد سے بھی آگاہ کیا۔ پھر تو جیسے سب لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے اور اپنے دونوں ہاتھ کبھی سینے پر رکھتے اور کبھی جوڑنے کے انداز میں ان کے سامنے باندھنے لگتے۔

ان سب باتوں کے علاوہ رینا نے ان کے ان چھ ساتھیوں کی شکایت بھی کر ڈالی جنہوں نے ان کے خیموں کو آگ لگا دی تھی اور جس کے نتیجے میں ان کے تین ساتھی، امجد، نندو بابا اور اس کی بیوی ہلاک ہو گئے تھے۔ بوڑھے کو یہ سن کر بے حد دکھ ہوا۔ تاہم اس نے بتایا کہ ایسا غلط فہمی میں ہوا اور وہ لوگ خود کو ہر قسم کی سزا کے لیے ان کے سامنے پیش کرنے پر تیار ہیں۔

بوڑھے کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ وہ چھ افراد کرالنگ کرتے ہوئے ان کے سامنے آکے ان کے قدموں پر لیٹ گئے۔

”انہوں نے ہر قسم کی سزا کے لیے خود کو پیش کر دیا ہے۔“ بوڑھے نے رینا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم چاہو تو انہیں بدلے میں ہلاک کر ڈالو، ہمیں کوئی افسوس نہ ہوگا نہ ہی ان لوگوں کو......“ بوڑھا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ رینا بھی چپ رہی۔ وہ انہیں معاف کرنے پر تیار تھی، لیکن وہ یہ حق صرف اپنے لیے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ اس نے انصاف کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے تینوں ساتھیوں سے پوچھا۔ یہ بھی بتا دیا کہ وہ خود انہیں معاف کرنے پر رضامند ہے لیکن شوکی کا معاف کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ آخر کار امجد اور نندو بابا اس کے ساتھی اور دوست تھے۔ شوکی کیا جواب دیتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسا ان لوگوں نے نادانی میں کیا ہے، کسی دشمنی کے نتیجے میں نہیں، بلکہ اب تو انہیں نہ صرف اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے اور خود کو ہر قسم کی سزا کے لیے بھی پیش کر دیا ہے۔

رابرٹ اور گارشیا خاموش رہے تھے۔ یوں جیسے انہیں اس بات سے کوئی سروکار تھا ہی نہیں۔

رینا اور شوکی نے دیکھا کہ جہاں وہ چھ افراد ان کے سامنے لیٹے تھے، وہیں چند لوگ اپنے چہروں پر اداسی، معافی اور دکھ بھرے تاثرات لیے آن موجود ہوئے تھے۔ ان میں بوڑھے، عورتیں اور بچے بھی تھے۔ یہ سب چوپائے تھے۔

رینا کو ہی نہیں بلکہ شوکی کو بھی ان کی بے چارگی پر ترس آ گیا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ ان کے خاندان کے افراد تھے۔ یہ بے چارے پہلے ہی ایک موروثی عذاب کا شکار تھے۔ شوکی نے رینا سے کہہ دیا کہ وہ انہیں معاف کرتا ہے، پھر جب رینا نے بوڑھے کو یہ بات بتائی تو ان سب کے اترے ہوئے

پژمردہ چہرے ایک دم سے کھل اٹھے۔

پتا چلا جو بوڑھا ہندوستانی زبان بول رہا تھا، وہ اس راکاشی قبیلے کا روحانی پیشوا تھا۔ وہ بھی انہی کی طرح چوپائے کی حالت میں تھا اور اس نے رینا کو اپنا نام غافر بتایا تھا۔

☆☆☆

علی نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی تھی۔ اس نے جھپٹا مار کر سرغنہ راہزن کے ہاتھ سے نہ صرف وہ پیغام چھین لیا تھا بلکہ اسی بلا خیز پھرتی کے ساتھ اس نے بندوق بھی اس سے جھپٹ لی...... سرغنہ راہزن ایک لمحے کے لیے توہکا بکا سا ہی رہ گیا۔ ہوش تب آیا جب علی ریحان اس کی کنپٹی سے بندوق لگا چکا تھا۔ اس کے باقی ساتھی بھی حیران رہ گئے تھے۔

علی کی مشاق نظروں نے فوراً ہی بھانپ لیا تھا کہ وہ بدمعاش تو تھے لیکن ان کے انداز و اطوار سے جھلکتا نہیں تھا کہ یہ کوئی پیشہ ور راہزن ہو سکتے تھے۔

”خبردار......! اگر کسی نے کوئی ذرا بھی غلط حرکت کی...... تو میں گولی چلا دوں گا۔“ علی ریحان گرجدار آواز میں چلایا۔ انسپکٹر منظور شاہ کے چہرے پر کچھ عجیب قسم کے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔

”تم مارے جاؤ گے نوجوان! بہتر یہی ہے کہ بندوق میرے حوالے کر دو۔ ہم تم جیسے کنگلے آدمی کو کچھ نہیں کہیں گے۔“ راہزن سرغنہ نے درشت لہجے میں علی کو دھمکایا۔ اسی وقت علی نے بندوق کی لبلبی دبا دی۔ گولی چلنے کا زوردار دھماکا ہوا۔

فائر کرنے سے پہلے وہ اپنی بندوق کی نال کو پھرتی سے ہٹا کر اس کے چار میں سے ایک ساتھی کو نشانہ بنا چکا تھا، جو اس کی جانب اپنی بندوق کو غیر محسوس انداز میں حرکت دینے میں مصروف تھا۔ گولی اس کے ہاتھ میں لگی تھی اور وہ چیخ مار کر اپنے گھوڑے سے گر پڑا تھا۔ تب ہی سرغنہ نے حرکت کی اور علی کو اپنے کندھے کی ضرب رسید کر دی۔ علی کے لیے اس کی یہ حرکت غیر متوقع نہیں تھی، یہی سبب تھا کہ علی اس کے کاندھے کی ضرب تو کھا گیا مگر اس نے فوری طور سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی اور نہ ہی بندوق اپنے ہاتھ کی گرفت سے نکلنے دی تھی۔ وہ اس نے نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح سرغنہ کے رسید کر دی، جو اس کی کنپٹی پر لگی، ضرب زوردار ثابت ہوئی۔ پٹاخے جیسی آواز چھوٹی تھی اور سرغنہ ڈھیر ہو گیا۔

اس کے باقی ساتھی، جو چوتھے کے زخمی ہو کر گرنے کے بعد اب تین رہ گئے تھے، ایک ہاتھ سے اپنے بے قابو ہوتے گھوڑوں کی باگیں سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے جو گولی کی آواز سے بدکنے کے لیے پر تولے ہوئے تھے مگر ان تینوں نے کمال ہوشیاری سے انہیں سنبھال رکھا تھا۔

ان تینوں نے بیک وقت اپنی بندوقیں علی پر تان لیں۔ علی نے ایک قلابازی لگائی تھی اور اسی وقت تین دھماکے یک بیک گونجے تھے۔ ایک گولی گاڑی کی ونڈ اسکرین سے ٹکرائی، دوسری اس کی باڈی میں پیوست ہو گئی، جبکہ تیسری اس سپاہی کی ٹانگ پر لگی تھی جو موقع دیکھ کر گاڑی کی جانب دوڑا تھا تاکہ اپنا ہتھیار اٹھا کر ان پر حملہ کرے کہ گولی لگتے ہی وہ بے چارہ چیخ مار کر گر پڑا۔

انسپکٹر منظور شاہ، دوسرا سپاہی اور ڈرائیور ہکا بکا کھڑے تھے اور علی کو ان پر حیرت ہوئی تھی کہ ان لوگوں نے (ماسوائے ایک سپاہی کے) ابھی تک موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ”حرکت“ کیوں نہیں کی تھی؟

ایک بڑا سوالیہ نشان اپنے سینے میں چھوڑ کر علی نے جوابی گولی داغی اور بندوق وہیں پھینک کر اس نے پاس کی گھنی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔

دوڑتا وہ بلا تکان اور اندھا دھند تھا اسی لیے اسے بندوق بھی ایک بوجھ سے کم نہیں لگی تھی۔ حالانکہ وہ رات بھر کا جاگا ہوا اور تھکا ہوا بھی تھا، مگر اس وقت اس کی تھکن پر ایک نیک مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا جذبہ غالب آ گیا تھا۔

وہ کافی دیر تک دوڑتا رہا، یہاں تک کہ جنگل کی حدود ایک بہتی ندی کے کنارے اختتام پذیر ہو رہی تھی جس کا پاٹ زیادہ چوڑا تو نہ تھا مگر اتنا چھوٹا بھی نہ تھا کہ اسے چھلانگ لگا کر پار کر لیتا۔

لہٰذا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ندی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ تیرنا جانتا تھا۔ ندی اس نے تیر کر پار کر لی۔ عقب میں اس نے دو تین بار گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں۔

ندی کے دوسرے کنارے پر آتے ہی اس نے اپنے عقب میں دیکھا تو اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ وہی تینوں باقی ماندہ راہزن اپنے گھوڑوں کو ندی میں اتار چکے تھے۔ شاید وہ بھی جانتے تھے کہ یہ ندی کم گہری تھی اور اس کا پاٹ بھی زیادہ بڑا نہ تھا۔

ایک گولی اس کے عقب میں اور داغی گئی تھی۔ علی کنارے کی جھاڑیوں میں جا گھسا اور وہاں سے اس نے پھر آگے دوڑ لگا دی۔

اس کا سانس اب بری طرح پھولنے لگا تھا، کیونکہ ندی

میں تیزی سے تیرنے کے سبب بھی اس کی کافی توانائی صرف ہوگئی تھی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ بے دم ہوکر گر پڑتا، اچانک ...... سات آٹھ مسلح افراد نے اسے گھیر لیا۔ انہیں دیکھ کر علی کی رہی سہی ہمت اور طاقت بھی دم توڑ گئی اور وہ وہیں گھاس پر گھٹنوں کے بل گرسا گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ پہلے یہی سمجھا تھا کہ یہ بھی کوئی راہزنوں کا ٹولا ہوگا لیکن اس کی نظر دو گھوڑوں کی ایک بگھی پر بھی پڑی۔ اس کے بعد وہ سینے کے بل گھاس پر گرا اور اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب دوبارہ آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک صاف ستھرے کمرے میں پایا۔ کمرا زیادہ بڑا تو نہیں تھا مگر اتنا چھوٹا بھی نہ تھا۔ اس کی سنگی دیواروں پر بارہ سنگھے اور شیر کے سر ٹنگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر کالے شیر کی کھال چسپاں تھی۔ دو فریم شدہ تصاویر دیکھ کر وہ چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔

ایک تصویر گھنی مونچھوں اور اونچی سی طرے دار پگ باندھے ایک پختہ العمر شخص کی تھی جو ایک اونچی پشت گاہ والی نقشین کرسی پر ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بارعب انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کے برابر میں ایک تصویر اور بھی تھی جو سائز میں پہلی والی تصویر سے چھوٹی تھی۔ یہ ایک خوبرو نوجوان کی تھی۔ دونوں کی شکلوں میں مماثلت پائی جاتی تھی اور علی کو یہ اندازہ قائم کرنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ یہ دونوں باپ بیٹے ہی ہوسکتے تھے۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں تھا؟ اور کن لوگوں کے ہتھے چڑھ چکا تھا۔ اسے وہ چھ، سات مسلح افراد بھی یاد تھے اور وہ بگھی بھی جوان سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی، کوچبان کو تو وہ دیکھ سکا تھا مگر اس کے سواروں کو نہ دیکھ پایا تھا اور وہ بے دم ہوکر گر پڑا تھا۔

یہ خیال آتے ہی اس نے جلدی سے پہلے اپنی پشت پر بندھے ہوئے اس کھال کے ٹکڑے کی موجودگی کی تسلی کی اور مطمئن ہوگیا۔ وہ پیغام ایک پٹی بند کے ساتھ اس کی کمر سے بندھا ہوا محفوظ تھا۔

''ہوش آگیا تمہیں......'' اچانک ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا جہاں ایک دراز قامت جوان شخص کھڑا تھا۔ یہ وہی جوان تھا جس کی تصویر ادھیڑ عمر بارعب نظر آنے والے شخص کی بڑی تصویر کے ساتھ آویزاں تھی۔ علی کو اس کے قیمتی لباس سے یہ اندازہ لگانے میں مطلق دیر نہیں لگی تھی کہ وہ ...... ایک کھاتے پیتے اور اعلیٰ گھرانے سے ہی تعلق رکھتا ہوگا۔ اسے کچھ امید اور تسلی ہوئی کہ وہ اس بار غلط لوگوں کے نرغے میں نہیں تھا۔

علی نے سلام کیا تو اس نوجوان نے بھی دوستانہ انداز میں اسے سلام کا جواب دیا۔ علی کو اس کے انداز کلام سے بھی تسلی ہوگئی کہ وہ کوئی خاندانی آدمی معلوم ہوتا تھا۔

''تمہارے پیچھے کچھ راہزن لگے ہوئے تھے اور تم شاید انہی سے بچ کر بھاگ رہے تھے؟'' اس نوجوان نے قریب آتے ہوئے اس سے کہا۔ ''مگر ہماری سواری دیکھ کر وہ الٹے پاؤں بھاگ جانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ ویسے تم ہو کون؟''

علی ایک مسہری پر لیٹا تھا، اب اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ بہت کسلمندی اور تھکاوٹ محسوس کررہا تھا۔ اس قدر کہ اسے بات کرنا بھی دوبھر ہورہا تھا۔ بیش قیمت پوشاک میں ملبوس اس نوجوان کو بھی شاید اس کی ہیت کذائی کا احساس ہوگیا اور اس نے اپنا سوال موقوف کرتے ہوئے کسی کو آواز دے ڈالی۔

دو افراد دست بستہ اندر داخل ہوگئے۔

''اس شخص کے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کرو...... فوراً......'' اس نے بردبارانہ تحکم سے کہا اور اس کے ذرا ہی دیر بعد علی کے سامنے ایک تپائی پر کھانا رکھ دیا گیا۔ بھنا ہوا گوشت، گرما گرم پراٹھے، شہد...... میٹھا اور خوش ذائقہ مشروب۔

علی نے خوب ڈٹ کر کھانے سے انصاف کیا۔ اس عرصے میں وہ شخص اس کے پاس ہی ایک کرسی پر براجمان ہوگیا تھا۔ جبکہ ان دونوں خدمت گزاروں میں سے ایک تو لوٹ گیا تھا، دوسرا کمرے میں ہی موجود رہا تھا۔

''کیا میں معزز میزبان کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟'' علی نے کھانا چٹ کرنے کے بعد اس جوان شخص کی طرف دیکھا جو اسی کی عمر کا نظر آتا تھا۔

''خوب...... سوال تو پہلے ہم نے کیا تھا۔'' وہ مسکرا کے بولا۔ ''چلو...... بتائے دیتے ہیں۔ ہم نواب شہباز خان کے فرزند اقبال خان ہیں۔ یہاں سعید پور شکار کے لیے آئے تھے۔ کچھ لگان بھی وصول کرنا تھا۔ یہ مکان اسی غرض سے بنایا گیا ہے، یہاں ہم یا کبھی کبھار ہمارے ابا حضور نواب شہباز خان صاحب عارضی طور پر قیام کرتے ہیں۔ اب تم اپنے بارے میں بتاؤ نوجوان......!'' وہ اتنا بتا کر علی کا چہرہ دیکھنے لگا۔

علی ریحان نے بے اختیار حلق سے سکون کی سانس خارج کی کہ وہ اب کی بار اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ لہٰذا اس نے ابتداً تشکر پن سے کرتے ہوئے فرزند نواب سے مخاطب ہوکر کہنا شروع کیا۔

''سب سے پہلے میں آپ کی اس مہمان نوازی کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں، ایک اجنبی کے لیے یہ قدر افزائی آپ کی خاندانی نجابت اور اعلیٰ خانوادے سے تعلق داری کو ظاہر کرتی ہے۔ میرا نام علی ریحان ہے اور میں ریاست ناگرہ سے ایک انتہائی اہم اور حساس نوعیت کی خبر لے کر نواب شہباز خان صاحب سے فوری طور پر ملنے کا متمنی تھا۔ بڑی مشکلوں اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر میں پہلے تو فرنگی گھڑسوار سپاہیوں سے بچتا ہوا ایک مال گاڑی میں یہاں تک پہنچا ہوں، مگر راستے میں ایک عجیب واقعہ میرے ساتھ پیش آگیا۔

''کسی قریب المرگ شخص نے مجھے ایک اور اہم پیغام، جو تحریری صورت میں میرے پاس محفوظ ہے، دیتے ہوئے تاکید کی کہ یہ میں تریپال کے نواب صاحب تک ہر قیمت پر پہنچادوں۔ اس شخص کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی، یوں لگتا تھا جیسے اس نے بے حد کرب ناک اور انسانیت سوز تشدد برداشت کیا ہو اور اس پیغام کو پہنچانے کے لیے اپنی جان بھی داؤ پر لگادی۔ بعد میں اس کا نام مجھے خاور حیات معلوم ہوا، یہ بھی ایک الگ قصہ ہے......''

یہ سب بتاتے ہوئے بالآخر علی ریحان نے فرزند نواب اقبال خان کو انسپکٹر منظور شاہ سے لے کر اس کے چاچا سراج خان کے بارے میں بھی بتادیا اور پھر خاموش ہوگیا۔

اقبال خان یہ ساری کتھا سن کر متحیر سا رہ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے علی کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق کو گھور رہا ہو۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ اسے علی کی ایک ایک بات پر پورا یقین واثق تھا، نہ صرف یہ بلکہ وہ اس سے بے حد متاثر بھی نظر آرہا تھا۔ اس کی نظروں میں علی کے لیے خراجِ تحسین کے جذبات عود کر آئے تھے۔ علی کی باتوں میں کئی ایسے ٹھوس شواہد کو اقبال خان نے محسوس کرلیا تھا جسے وہ جھٹلا نہیں سکتا تھا اور نہ ہی کسی جھوٹ پر محمول کرسکتا تھا۔

اس نے بے اختیار اٹھ کر علی کو گلے سے لگالیا اور اس کی پیشانی پر بوسہ بھی دے ڈالا پھر بولا۔

''تم میرے دوست اور بھائی ہو اب...... میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم کون بہادر جوان ہوسکتے ہو اور تمہارا کن جری اور دلیر جوانوں کے گروپ سے تعلق ہوسکتا ہے۔ باقی باتیں حویلی چل کر ابا حضور کے سامنے ہوں گی۔ اس وقت ہمیں ترنت یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

یہ کہنے کے بعد ہی اقبال خان نے روانگی کا حکم دے دیا۔ اقبال خان نے علی کو اپنے ساتھ ہی بگھی پر بٹھایا تھا۔ باقی تمام گھڑسوار تھے۔ یہ قافلہ روانہ ہوگیا اور اس نے حویلی پہنچ کر ہی دم لیا۔

تریپال پور کے نواب ابن نواب شہباز خان کی پرشکوہ حویلی کو دیکھ کر علی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ آبادی سے قدرے الگ تھلگ ایک اونچی پہاڑی پر، جسے ایک خاص کٹاؤ کے ساتھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ حویلی کی بیرونی دیواریں ایک قلعے کا منظر پیش کرتی تھیں۔

ایک پختہ اور قدرے چوڑی روش سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی احاطے کے بیرونی دیوہیکل گیٹ تک چلی جاتی تھی۔ پہاڑی پتھروں کی دیواروں نے .... اس پرشکوہ بلندوبالا حویلی کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور یہی نہیں ...... علی کو گیٹ کے دائیں بائیں ...... سنگی طاقوں سے آٹھ سے بارہ پونڈ کی توپوں کے فولادی بیرل بھی جھانکتے نظر آئے تھے۔ وہ دنگ رہ گیا تھا۔ گویا نواب شہباز نے فرنگی غاصبوں سے ممکنہ جنگ اور ہر طرح کی مزاحمت کے لیے پہلے ہی سے انتظامات کررکھے تھے۔ اس نے سوچا کہ جب نواب صاحب کو یہ معلوم ہوگا کہ انگریز سامراج نے ان کے خلاف کس قسم کی جنگی حکمتِ عملی تیار کررکھی ہے تو یہ خبر ان کے لیے کس قدر مفید ثابت ہوسکتی ہے لیکن پھر وہ اس دوسرے پیغام کے بارے میں سوچنے لگا جو اسے خاور حیات نے مرتے وقت تھمایا تھا۔

آخر وہ کیا پیغام تھا؟ علی کو اسی پیغام کے کھوجنا کی زیادہ بے چینی ہورہی تھی۔ یوں علی کے پاس دو پیغامات تھے۔ ایک تو وہ جس کے بارے میں پوری جان کاری رکھتا تھا اور دوسرا وہ پیغام جس کے متعلق اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کس نوعیت کا تھا تاہم اس کا عقدہ بھی اب یہاں پہنچ کر کھلنے ہی والا تھا۔

بگھی اسی روش پر دوڑتی ہوئی حویلی کے بیرونی گیٹ سے اندر داخل ہوگئی تھی۔

اندر کی سج دھج بھی کم نہ تھی۔ یہاں بھی سنگی فصیلوں کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھ عدد توپیں نصب تھیں۔ مسلح پہرے دار ہر طرف چوکس نظر آرہے تھے۔ ان کے درمیان خدام بھی تھے۔ حویلی کا مرکزی دروازہ ان کے سامنے تھا۔ لکڑی کے ایک پھاٹک پر کچھ کندہ تھا جسے وہ پڑھ نہ سکا۔ حویلی کی بیرونی سجاوٹ میں مغل لکھوری اینٹیں اور سنگِ مرمر کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا گیا تھا۔ اس میں چونے کے مارٹر کو بڑی مہارت سے کام میں لایا گیا تھا۔

بگھی رک گئی اور چار خدام اس طرف کو لپکے۔ اقبال خان کے چہرے پر اس وقت بڑی گہری سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی اور اس نے علی سمیت بگھی سے اترتے ہی، اس کا ہاتھ تھام

کرایک خدمت گار سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا تھا۔
ایک خادم نے نہایت ادب سے جب یہ بتایا کہ نواب صاحب اپنے کمرے میں آرام فرما رہے ہیں تو اقبال نے ترنت ان کی طرف پیغام پہنچانے کو کہا کہ انہیں مطلع کیا جائے کہ ہم ان سے اسی وقت ملنا چاہتے ہیں اور ہمارے ساتھ ایک خاص مہمان بھی ہے۔
پیغام فوراً پہنچا دیا گیا۔ تب تک اقبال خان، علی کو لیے اندر ایک کمرے میں آ گیا۔
یہاں کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ ہر شے سے لکھنوی طرز کی قدامت اور دل فریب تزئین، سجاوٹ اور شاہانہ سار کھ رکھاؤ نظر آتا تھا۔ دیواروں پر خاندان کے پرکھوں کی فریم شدہ تصاویر.... بلند چھت سے جھولتے فانوس دیدہ زیب نظر آ رہے تھے۔ حنوط شدہ جانوروں کے مجسموں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ نواب صاحب خود بھی شکار کے رسیا تھے۔
بارہ دریاں دالان اور غلام گردشوں کے جلو میں شہ نشین، چکنے فرش اور بلند چھتیں اس حویلی کی شان و شوکت کی بہترین عکاسی کر رہی تھیں۔ علی کو ایک بات پر حیرت ہوئی تھی کہ ایسی شان دار حویلی کا کوئی نام نہیں نظر آتا تھا۔ ورنہ تو نواب قسم کے لوگ حویلی کا کوئی نہ کوئی نام ضرور تجویز کرتے تھے لیکن جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ یہ حویلی ''پری محل'' کے نام سے موسوم تھی۔
علی کی یہاں بھی آؤ بھگت کی گئی مگر اسے نواب سے ملنے اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کی زیادہ بے چینی تھی۔ ذرا دیر بعد ہی نواب صاحب تشریف لے آئے۔ اقبال خان اور علی ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔
نواب شہباز خان بیش قیمت پوشاک زیب تن کیے ہوئے تھے۔ عمر ساٹھ پینسٹھ کے درمیان تھی، مگر قابل رشک صحت دیکھ کر ان پر ''ساٹھا پاٹھا'' کی مثل عین صادق آتی تھی۔ ان کے ایک ہاتھ میں قیمتی پتھروں کی انگشتریاں نظر آتی تھیں۔ انداز شاہانہ اور پُر تمکنت تھا۔ قامت دراز تھی۔ آنکھوں سے جلال ٹپکتا تھا۔ تاہم وہ حلیم طبع تھے جس کا اندازہ جلد ہی علی کو ان کے ساتھ گفتگو کے دوران ہوا۔
علی نہایت احترام کے انداز میں ان سے ملا نواب شہباز نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خود بھی ایک منقش پشت گاہ والی کرسی پر براجمان ہو چکے تھے۔ اقبال خان ان کے برابر والی کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ دونوں باپ بیٹا اب بڑے غور سے علی کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد پہلے تو اقبال خان نے باپ کو علی کی آمد اور غرض و غایت سے آگاہ کیا پھر ساری بات بالتفصیل جو علی نے اسے بتائی وہ سب نواب شہباز خان کے گوش گزار کر دی۔
یہ ساری کتھا سننے کے بعد نواب شہباز کا چہرہ مختلف کیفیات کی آماجگاہ بنا نظر آنے لگا۔
علی نے خود بھی انہیں اپنی زبانی فرنگیوں کی غاصبانہ سازشوں اور راجا چندر گپتا کے ساتھ انگریز سامراج کا گٹھ جوڑ، تریپال سمیت پالن پور پر عنقریب حملے سے لے کر بھی ان کے چھوٹے بھائی سراج خان کی دھوکا دہی سے متعلق سب بتا دیا۔
اس کے بعد سب سے آخر میں اپنے کمر بند سے وہ پیغام بھی نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔
بلند چھت والے اس کمرے کی فضا ایکا ایکی سناٹے دار ہو گئی تھی۔ علی کو اب اس پراسرار پیغام کے جاننے کی بے چینی ہونے لگی جو اسے خاور حیات نے مرتے وقت تھمایا تھا۔
لیکن اس وقت علی ریحان کی بے چینی مزید سوا ہو گئی جب نواب شہباز خان نے اپنی گفتگو کی ابتدا ریاست نا گرہ کے مہاراجا چندر گپتا کے انتقال کر جانے سے کی...... علی کے لیے یہ اطلاع چونکا دینے والی تھی۔
☆☆☆
راج محل میں اداسی اور سوگواری کی فضا طاری تھی۔
راجا پرتاب کمار باپ کے مرنے کے بعد خود کو تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ تنہائی تو وہ اسی وقت سے محسوس کرنے لگا تھا جب اسے اپنی ماں کی دائمی جدائی سہنا پڑی تھی۔ باپ کا پیار اسے کم ہی ملا تھا۔ اب مزید اس کے اندر ایک خلا پیدا.... ہو گیا تھا۔
باپ کے مرنے کے بعد اب اسے بہت سے ایسے مسائل اور معاملات کو نئے سرے سے دیکھنا تھا جس میں سب سے اہم معاملہ انگریز سرکار سے وہ معاہدہ تھا جو آنجہانی مہاراجا چندر گپتا اپنی زندگی میں کر چکا تھا۔ اب اسے تکمیل تک پہنچانا اگرچہ پرتاب کمار کی ذمہ داری تھی مگر وہ ابھی اس سلسلے میں اپنا آخری فیصلہ محفوظ کیے ہوئے تھا۔ وہ اس معاہدے کی خلاف ورزی تو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر کچھ تحفظات کے بارے میں وہ ابھی یک رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔
بہرحال...... چندر گپتا کے انتقال کر جانے کی اطلاع دلی میں مقیم جنرل مائیکل شا کو بذریعہ خط کر دی گئی تھی۔
سوگ کے لیے آنے والے مہمانوں، عزیزوں اور دوستوں کی آمد کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ دن بھر راجا انہیں ہی بھگتا تا رہتا تھا۔ رات کو تھک کر اپنے کمرے میں آ جاتا...

اور پھر کسی سے ملاقات نہیں کرتا تھا۔
وہ اس وقت بھی اپنے کمرے میں تنہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ اس وقت اس کے دل و دماغ میں ایک ہی صورت بسی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں جبکہ وہ خود کو تنہا سمجھ رہا تھا، وہی شخص زیادہ یاد آتا ہے جو دل کے قریب ہو۔ اس کے دل کی بے چینی اور تنہائی کو سوا کرنے والی رینا کے حسین تصور سے وہ ایک لمحہ کو بھی غافل نہیں رہا تھا۔
وہ اس وقت نیلی آنکھوں والی نازک اندام گڑیا سی مثل اپسرا...... رینا کو ہی یاد کر رہا تھا اور اندر ہی اندر سرد آہیں بھرے جا رہا تھا۔ جب سے اسے راج محل سے بے دخل کیا گیا تھا پرتاب کمار کو ایک پل کے لیے بھی چین نصیب نہ ہو سکا تھا۔ وہ اندر ہی اندر اپنے دل کے کسی نہاں خانے میں اس رینا کو چاہنے لگا تھا، دل دے بیٹھا تھا۔ نرم و نازک سی حسین یہ انگریز دوشیزہ اسے بہت اچھی لگنے لگی تھی، وہ اس کی پیاری سی صورت کو اپنے دل میں بٹھا چکا تھا۔
وہ اب بھی اسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا مگر......
افسوس تھا اسے...... صد افسوس کہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔ محبت پر اس نے اپنی نجابت داری، حیثیت اور خاندانی جاہ و جلال و حشمت کو ترجیح دیتے ہوئے اسے راج محل سے نکال باہر کیا تھا۔ اب وہ نجانے کہاں کہاں در بدر ہو رہی ہو گی۔ وادی کے ان پر خطر و خار زار...... جنگلوں اور سنگلاخ و برف زار ویرانوں میں بھٹک رہی ہو گی۔ وہ خود بھی خطرے میں ہو گی اور اس کی عزت بھی۔ وہ اس کے دکھ سے واقف تھا۔ اسے اپنے باپ کی موت بلکہ قتل کا بے حد صدمہ پہنچا تھا اور وہ ہر قیمت پر اپنے باپ کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا عزم کیے ہوئے تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کے باپ کو ایک سازش کے تحت جن لوگوں نے قتل کیا تھا ان کا تعلق کالی مندر سے ہی تھا۔ رینا نے انصاف کے لیے اس سے بھی امیدیں باندھی تھیں مگر وہ اسے انصاف دلانے میں ناکام رہا تھا۔
''لیکن وہ اب جنگلوں میں کیا کرنے گئی تھی؟ کیا وہ راج محل سے بے دخلی کے بعد بھی اسی کوشش میں تھی؟'' راجا پرتاب کمار نے سوچا۔ پھر جب اس کے دل کی تڑپ اور بے قراری بڑھنے لگی تو وہ اٹھ کر پشت پر ہاتھ باندھے کمرے میں ٹہلنے لگا۔
وہ سوچ رہا تھا کہ اسے رینا کو ڈھونڈنا چاہیے۔ اس کی مدد کرنا چاہیے اور اسے دوبارہ راج محل میں لانے کا بندوبست کرنا چاہیے لیکن پھر اسے کالی کے مندر کے پجاریوں کا خیال

فرمانبردار

استاد نے شاگرد کو سزا دیتے ہوئے کہا۔ ''پچاس بار اٹھک بیٹھک کرو اور زور زور سے کہتے رہو۔ میں بے وقوف ہوں۔''
شاگرد نے جواب دیا۔ ''جناب میں اٹھک بیٹھک تو سو دفعہ کر سکتا ہوں۔ مگر آپ کو بے وقوف نہیں کہہ سکتا۔''

وضع داری

پرانے وقتوں کی بات ہے۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ دوست، رشتے دار طلاق دینے کا سبب پوچھنے آئے۔ اس شخص نے کہا کہ وہ ابھی عدت میں ہے اور ابھی تک وہ میری بیوی ہے۔ میں اس سے رجوع کر سکتا ہوں۔ لہٰذا ابھی کچھ کہنا مناسب نہ ہو گا۔ اس کی عدت کی مدت پوری ہونے دیں۔
لوگ انتظار کرتے رہے۔ حتیٰ کے اس کی عدت پوری ہو گئی اور اس شخص نے اس عورت سے رجوع نہیں کیا۔ لوگوں نے پھر آ کر طلاق دینے کی وجہ جاننا چاہی تو اس شخص نے کہا اگر میں اب اس کے بارے میں کچھ کہوں تو یہ اس کی شخصیت مسخ کرنے کے مترادف ہو گا اور کوئی بھی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ تھوڑے دن گزرے، اس عورت کی دوسری جگہ شادی ہو گئی۔ دوست احباب پھر آئے اور کہا کہ بھائی اب تو اس عورت کی دوسری جگہ شادی ہو گئی ہے۔ اب تو وجۂ طلاق بتا دیں۔ وہ شخص مسکراتے ہوئے ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ دوستو...... بات کچھ یوں ہے کہ اب وہ کسی دوسرے کی عزت ہے اور مروت کا تقاضا ہے کہ میں اس پرائی اور اجنبی عورت کے ماضی کے بارے میں اپنی زبان بند رکھوں تاکہ وہ عزت سے اپنے شوہر کے ساتھ زندگی گزار سکے۔
مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاکپتن شریف

آنا کہ وہ دوبارہ مذہب کی آڑ میں کوئی فتنہ کھڑا کردیں گے۔ ریاست کی پرجا کو اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کریں گے، جس سے لوگوں میں اس کے خلاف بددلی اور نفرت پروان چڑھے گی۔

درحقیقت وہ خود بھی ان پجاریوں کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ ایک بار تو اس کے خون نے جوش مارا بھی کہ وہ ریاست کا راجا ہے، بادشاہ اور ان داتا ہے۔ کس کی جرأت ہے جو اس کے اقدام پر ایک لفظ بھی بولے لیکن وہ اپنی ریاست میں کسی فتنے کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ پھر کیا کیا جائے؟ وہ سوچتا رہا......

تب ہی اچانک اس کے دل میں ایک خیال آیا کہ اگر وہ خفیہ طور پر رینا کی مدد کرے اور کسی طرح ان پجاریوں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کرلے تو یقیناً نہ صرف وہ رینا کا دل جیت لے گا بلکہ اسے اپنے راج محل کی مہارانی بھی بنا سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اسے ایک تدبیر سجھائی دی۔

اگلے دن کا سورج طلوع ہوا تو راج محل سے ایک شخص عام سے حلیے اور لباس میں نکلا اور اس نے سیدھا جنگل کا رخ کیا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور اس نے راج محل کے راجا پرتاب کمار کی جاری کردہ مہر ساتھ رکھ لی تھی جسے دربانوں کو دکھا کر وہ راج محل میں جب چاہے آجا سکتا تھا۔ اگر کوئی اس شخص کی اصلیت جان لیتا تو اس پر یقیناً حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔ کیونکہ عام سی پوشاک میں ملبوس یہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ خود راجا پرتاب کمار ہی تھا۔ اس نے خود ہی رینا کو تلاشنے اور خفیہ طور پر اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اپنے اس کام میں اپنے کسی آدمی کو بھی شامل نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس حساس اور نازک معاملے میں پوری رازداری رکھنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس کے اپنے بھی کچھ وفادار ساتھی تھے لیکن وہ ابھی انہیں اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ گھوڑے پر نکلا اور سیدھا جنگل کا رخ کیا۔

جس روز رینا اور اس کے ساتھیوں کو راج محل سے بے دخل کیا گیا تھا، ان کی سواری کا بندوبست خصوصی طور پر اسی نے کیا تھا اور ڈاک گاڑی کے کوچبان کو تاکید کی تھی کہ جہاں یہ لوگ کہیں انہیں وہیں تک چھوڑ آجائے۔ اس کوچبان نے ہی واپس لوٹنے کے بعد پرتاب کمار کو بتادیا تھا کہ وہ انہیں جنگل میں کس مقام پہ چھوڑ کر آیا ہے۔ لیکن کوچبان اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکا تھا، کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ رینا اور اس کے ساتھیوں کی اصل منزل کون سی تھی؟

لہٰذا......راجا پرتاب کمار اس مقام تک تو پہنچ ہی گیا تھا جہاں ڈاک گاڑی نے انہیں اتارا تھا۔ اب وہ شش وپنج میں پڑ گیا تھا کہ رینا کو کہاں تلاش کرے؟ اس نے رینا کو ڈھونڈنے اور اس سے ملنے کا پورا تہیہ کرلیا تھا۔ اب وہ پیچھے ہٹنے والا بھی نہ تھا، چنانچہ اس نے اسی راستے پر کھڑے ہوکر پہلے بائیں رخ پر گھوڑے کو موڑا اور روانہ ہوگیا۔

اس حصے میں کافی دیر تک ادھر ادھر گھوڑا دوڑاتا رہا لیکن رینا وغیرہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ دوبارہ اسی جگہ پر آگیا جہاں سے چلا تھا۔ یہاں سے اس نے پھر دائیں جانب کے علاقے کا رخ کیا اور دن بھر تلاش جاری رکھی، مگر وہاں بھی اس کی تلاشِ بسیار کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، بالآخر جب اس نے سامنے کے رخ پر تلاشنے کے لیے آگے بڑھنے کا ارادہ تو اسے شام گہری پڑتے دیکھ کر اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

اس نے سوچا کہ اب رات سر پر آنے والی ہے۔ اس آخری راستے کا علاقہ وہ کل دن میں تلاشنے کی کوشش کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ واپس راج محل کی جانب پلٹ گیا۔

اگلے دن وہ پھر اسی عزم اور اسی ارادے کے ساتھ عام آدمی کے بھیس میں راج محل سے نکلا اور تیسرے، سامنے کے رخ والے علاقے میں دن بھر گھوڑا دوڑاتا رہا۔ اسے پوری امید تھی کہ اس طرف تو رینا کا سراغ مل ہی جانا چاہیے۔

راجا پرتاب کو اس گم گشتہ......راکاشی وادی کا بالکل بھی علم نہ تھا جہاں رینا اور شوکی وغیرہ فروکش تھے۔ تاہم وہ یہاں داخل ہوچکا تھا۔

☆☆☆

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ شیورائے بھولکر...... اپنے چیچک زدہ چہرے اور سیاہ خاکستری سی رنگت کے ساتھ اس کے سامنے نمودار ہوچکا تھا۔ اس کے بھدے ٹھگنے اور بے ڈول جسم پر سفید تنگ کا چغا تھا، جس پر سنہری کڑھائی کی گئی تھی۔

بچھورام اسے دیکھتے ہی چہرے پر خوشامدانہ مسکراہٹ لیے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پُرجوش ملاقات اور رسمی گفتگو کے دوران بچھورام نے ناگرہ ریاست اور راج محل سے متعلق وہ تمام حالات اس کے گوش گزار کرنے کے بعد بالآخر بھولکر کو اپنے اور نجوبائی کے "مقاصد" سے بھی آگاہ کردیا اور ساتھ ہی اس سے مدد کی بھی درخواست کرڈالی۔

جیسا کہ مذکور ہوچکا ہے کہ شیورائے بھولکر...... ایک پستہ قامت ہندوستانی تھا۔ وہ راج پور کا دیوان تھا۔ تمام خلم ناموں کو قانونی شکل دینا اسی کا کام تھا۔ مہاراجوں کی محلاتی

سازشوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھنا، بلکہ ان "نتائج" کو برٹش سرکار کے لیے "مفید کیسے بنایا جاتا ہے"...... یہ بھی اس کا کام تھا۔ اس کی رنگت سیاہ روغنی اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے، آنکھیں چندی چندی سی تھیں۔ وہ بار بار اپنی کمر پر بندھے خنجر پر ہاتھ پھیرتا تھا، یہ اس کی عادت تھی۔

اس نے اپنی چندی چندی آنکھیں میچ کر، بچھورام کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بڑے غور سے اس کی باتیں سنی تھیں۔ یہ ساری معلومات اس کے لیے نہایت اہم اور سود مند تھیں اور اس سے بڑھ کر ضروری بھی۔

بچھورام کم وبیش ایک گھنٹے تک بہت سکون اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اسے یہ ساری تفصیل سناتا رہا، یہاں تک کہ اختتام تک بھی بھولکر نے درمیان میں بالکل دخل نہیں دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک ایک لفظ ذہن نشین کرتا جارہا ہو یا اسی تیزی کے ساتھ اس کا ذہن ان معلومات کو انگریز سرکار کے لیے "کارآمد" بنانے پر غور بھی کرتا جارہا ہو۔

بچھورام کے خاموش ہونے کے بعد بھی وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ اس کے بعد اس نے بچھورام سے جو پہلا سوال کیا وہ یہ تھا۔

"تم نے بھوجن پانی کرلیا ہے؟"

بچھورام نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس کے بعد بھولکر نے اس سے چند سوالات کیے جس کے جوابات بچھورام نے بڑے سکون سے دیے تھے۔ سب سے آخر میں بھولکر نے بچھورام سے پوچھا۔

"کیا تمہیں واپس لوٹنے کی جلدی ہے؟"

"کچھ ایسی خاص جلدی تو نہیں ہے مہاشے جی!" بچھورام نے جواب دیا۔ "آپ کہیں تو میں یہاں رک جاتا ہوں۔"

"زیادہ دن نہیں رکنا پڑے گا۔" بھولکر نے کہا۔ وہ مختصر اور صرف ضروری جملے بولنے کا عادی تھا۔ ہر جملہ ادا کرنے کے بعد وہ چند سیکنڈ کے لیے کچھ سوچتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

"تمہیں کہیں بھی رکنا نہیں ہے۔ میرے ساتھ رہنا ہو گا۔ جہاں میں ٹھہروں گا، تمہیں بھی میرے ساتھ ہی قیام کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے ایسا چند دنوں کے لیے ہو......"

"ٹھیک ہے مہاشے جی! جیسا آپ کہیں۔" بچھورام بولا۔

"ممکن ہے کہ آج کی رات ہی ہمیں روانہ ہونا

پڑے، یا پھر اگلے دن صبح تڑکے۔ یہاں کے ریزیڈنٹ کرنل اینڈرسن کے ساتھ ایک گمبھیر مسئلہ پیش آگیا ہے۔'' بھولکر نے کہا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات تھے۔ ''اس کے علاوہ کچھ دیگر اہم معاملات بھی زیر بحث آئیں گے آج رات۔ یہ آخری نشست ہوگی میری کرنل صاحب کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے مہاشے جی! میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' بچھورام نے کہا اور پھر شاید یونہی برسبیلِ تذکرہ پوچھ لیا۔ ''ویسے مہاشے جی کرنل صاحب کے ساتھ ایسا کیا مسئلہ پیش آگیا ہے؟''

یہ بچھورام کی فطرت تھی وہ غیر متعلقہ باتوں کی بھی ''سن گن'' لینے کا عادی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طرح اسے اکثر بہت سی ایسی باتوں کا پتا چل جاتا تھا جس کی خوبو وہ بھی رکھتا تھا۔

''بہت ہی گمبھیر مسئلہ ہوگیا ہے کرنل صاحب کے ساتھ......'' شیورائے بھولکر نے یہ کہتے ہوئے تشویش زدہ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے...... آگے بولا۔

''کچھ روز پہلے کرنل صاحب کی بیٹی مس ماریا جو شکار کی رسیا تھی، کوہ شالیہ کی طرف اپنے مختصر شکاری ٹولے کے ساتھ روانہ ہوئی تھی۔ وہ ہردوار کے جنگلات میں شکار کھیلنا چاہتی تھی لیکن اب تک اس کی کوئی خیر خیریت نہیں معلوم ہوسکی۔ خداموں اور سپاہیوں کو اس کی تلاش میں دوڑایا گیا تو عقدہ کھلا کہ مس ماریا کا شکاری ٹولا کسی بڑے حادثے کا شکار ہوگیا ہے اور ان کا کچھ پتا نہیں۔ ابھی یہ سب کچھ چل ہی رہا تھا کہ اسی بدنصیب شکاری ٹولے کا ایک فرد یہاں تک لوٹنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسی نے ان سارے حالات سے کرنل اینڈرسن کو آگاہ کردیا جن کا وہ شکار ہوئے تھے۔

''درحقیقت کرنل اینڈرسن کی بیٹی ماریا کو کچھ نامعلوم لوگوں نے اغوا کرلیا ہے اور اس کے باقی ساتھیوں کو مار ڈالا تھا۔ یہ آخری ساتھی خوش قسمتی سے بچ کر نکل آنے میں کامیاب ہوگیا تو اصل حقیقت کا ہمیں کل ہی پتا چل سکا۔ اسی سلسلے میں کرنل اینڈرسن نے آج کی رات کی نشست میں آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ شاید خود کوہ شالیہ کی طرف جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔''

بھولکر اتنا بتا کر خاموش ہوا تو بچھورام ایک دم چونک پڑا۔ اس کا دھیان فوراً کالی کے مندر کے پجاریوں اور مہا پجاری بدری ناتھ کی طرف چلا گیا۔ کیونکہ یہ اور نجو بائی وغیرہ ایک دوسرے کے کالے کرتوتوں سے واقف تھے۔ اسی سبب یہ سن کر بچھورام چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔

تلے اوپر مہا پجاری بدری ناتھ کی دو چالیں بری طرح ناکام ہوجانے کے بعد نجو بائی کا اس سے دل خراب ہوچکا تھا مگر وہ اس کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھی۔ جبکہ بچھورام کا بھی یہی خیال تھا کہ بدری ناتھ کو صرف اپنے ہی مفادات عزیز رہتے ہیں اور مزید یہ کہ اس کی یہ دونوں چالیں ناکام نہیں بلکہ کامیاب ہی گئی ہیں، لیکن اپنے لیے...... اس کا اظہار وہ یعنی بچھورام، نجو بائی سے کرتا رہتا تھا۔

بچھورام کے چالاک ذہن نے ترنت سوچ لیا تھا کہ یہی وقت ہے، بدری ناتھ کو اس کی مکاری اور دھوکے بازی کا مزہ چکھانے کا، کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ کرنل اینڈرسن کی بیٹی کو کون لوگ اغوا کرسکتے ہیں۔ لیکن بغیر ٹھوس ثبوت کے ایسی بات منہ سے نکالنا بھی اپنے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

''کیا بات ہے...... تم کچھ بدک گئے یہ سن کر......؟'' زیرک نظر شیورائے بھولکر اسے چونکتا اور سوچتا پا کر بہ یک جنبش بولا۔

''مہاشے جی! کچھ اندازہ تو ہوتا ہے کہ یہ حرکت کن لوگوں کی ہوسکتی ہے۔'' اس نے گومگو سے لہجے میں کہا۔

''کون لوگ ہیں وہ......؟ کیا تم جانتے ہو انہیں......؟ ترنت بتاؤ مجھے...... یہ تمہارا صاحب بہادر (انگریز سرکار) پر بڑا احسان ہوگا۔'' بھولکر نے اسے اکسایا۔

''یہ راہزنوں کا ایک ٹولا ہے۔ میں ان کی خفیہ کمین گاہوں سے واقف ہوں۔'' بچھورام نے کسی ..... مصلحت کے تحت بات بدل دی۔ آگے بولا۔ ''پرنتو مہاشے جی! آپ بالکل چنتا مت کریں۔ میں خود کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہوں اور ترنت آپ کو بتادوں گا۔''

''نہیں ابھی بتاؤ، تاکہ ان کے خلاف جنگی بنیادوں پر کارروائی کی جاسکے۔'' بھولکر نے جوش سے کہا تو بچھورام گھبرا سا گیا، تاہم بولا۔

''مہاشے جی! انگریز سرکار کے کام آنا تو ہمارا کرتویہ ہے، کہا نا آپ چنتا نہ کریں۔ یوں لشکر کشی کرنے سے معاملہ خراب ہوسکتا ہے اور نتیجہ بھی کچھ برآمد نہ ہوگا۔''

''پھر...... تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں اپنی سی خفیہ کھوجنا کروں گا، مجھے اپنی کھوجنا پر پورا وشواس ہے، میں اس ناری کا پتا لگا لوں گا۔''

''ہوں......'' اس کی بات شاید بھولکر کی سمجھ میں آگئی تھی۔ تاہم آنکھیں سکیڑ کر وہ بچھورام کے چہرے کی طرف

دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو کیا میں آج رات کی نشست میں کرنل صاحب سے اس سلسلے میں بات کرلوں؟ تاکہ انہیں کچھ تسلی ہو۔ کے اور ہردوار کے جنگلوں میں ابھی کوئی ایسی جنگجو ٹیم روانہ نہ کریں۔ سوچ کے جواب دینا بچھورام......! یہ معاملہ بہت حساس اور نازک ہے۔''

''آپ بالکل چنتا نہ کریں مہاشے جی!'' بچھورام پورے اعتماد سے بولا۔ ''آپ کرنل صاحب بہادر سے بے شک کہہ ڈالیں، میں یہ کام ترنت نمٹاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں کرلوں گا یہ کام۔''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ شیورائے بھولکر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بچھورام بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''بچھورام! اگر تم نے یہ کام کردیا تو سمجھو مجھ پر ہی نہیں صاحب بہادر لوگوں پر بھی احسان کردیا۔ یہ تمہیں اتنے انعامات سے نوازیں گے کہ تم سنبھالے نہیں سنبھال سکو گے۔''

''مہاشے جی! اوش...... اوش...... میں جانتا ہوں۔ تو میرے لیے یہی احسان کافی ہوگا کہ مجھے ریاست ناگرہ کا مہاراجا بنوا دیجیے۔''

''ضرور...... تم شاید نہیں جانتے کہ عنقریب...... انگریز سرکار ریاست ناگرہ میں اپنی کٹھ پتلی حکومت بنانے والی ہے۔ تم بالکل بروقت یہاں آئے ہو۔ میں کل صبح ہی تمہیں لے کر دلی روانہ ہوتا ہوں۔ جنرل مائیکل شاہی نہیں بلکہ گورنر صاحب بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ انہیں تمہارے جیسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔''

شیورائے بھولکر نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور بچھورام کا دل عجیب سی مسرت تلے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ وہ تصور میں خود کو نجو بائی کا شوہر اور ناگرہ کا مہاراجا سمجھنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ریاست کی پرجا اس پر سخت ترین احتجاج کرے گی مگر وہ انہیں انگریز سرکار کے ''ڈنڈے'' سے خاموش کرانا جانتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد رات گئے کی نشست میں بھولکر کرنل اینڈرسن کو اس کی بیٹی ماریا سے متعلق پوری تسلی دے رہا تھا۔

☆☆☆

پورن ماشی کی اس بھیانک، خونیں اور...... رنگین منحوس رات کو بیتے آج دوسرا روز تھا۔

موسم بہ خود سی رات اپنے ابتدائی پہر میں کسی بھاری سل کی طرح سرک رہی تھی۔ رات کے آسمان پر کالے بادل ٹکڑیوں کی صورت میں تیرتے نظر آرہے تھے۔ اخیر راتوں کا چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا۔ ٹمٹماتے تاروں کو کالے بادلوں نے جیسے ڈھانپ رکھا تھا۔ کبھی کوئی ٹکڑا تاروں کی کہکشاں سے ذرا دیر کو سرک جاتا تو کالی کے مندر کا کلس طلسماتی انداز میں چمک اٹھتا تھا۔ ہلکی ہلکی سبک خرام ہوا میں ٹھنڈ کا اثر غالب تھا۔

کالی کے مندر کے اطراف میں اس وقت تاریک سناٹے اور ہو کا عالم تھا۔ اس کے گرد و پیش ایستادہ چھتنار سے پیڑ کالی کے مندر کو دم بہ خود سی غیر مرئی نظروں سے گھورتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہاں اب خاموشی کا راج تھا۔ اتھاہ خاموشی......

مندر کے ایک کمرے میں مہا پجاری بدری ناتھ موجود تھا۔ صرف اس کا خاص چیلا جو مندر کا بڑا پروہت بھی کہلاتا تھا، اس کے ساتھ موجود تھا۔ دونوں آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے سامنے دیسی تاڑی کی ایک صراحی اور دو گلاس دھرے پڑے تھے۔ ایک مٹی کے بڑے سے آب خورے میں بھنگ گھوٹ کر رکھی ہوئی تھی۔

یہ دونوں شیطان تھوڑی دیر پہلے ہی ایک ایک گلاس بھنگ اور شراب کا چڑھا چکے تھے اور کچھ دیر تک خاموش رہتے ہوئے سرور کے عالم میں اپنا سر بھی دھنتے رہے تھے۔

پھر مہا پجاری بدری ناتھ نے اپنے چیلے پرس رام سے کہا۔ ''اساڑھ کا مہینا لگنے تک ہمیں اس فرنگن حسینہ ریتا کو مندر کے تہ خانے میں لانا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں شیطانیت کی چمک عود کر آئی تھی۔ پرس رام نے مکاری سے جواب میں کہا۔

''گروجی! اب چنتا کس بات کی ہے بھلا؟ ریتا کو ہم راج محل سے نکالنے میں کامیاب تو ہو ہی چکے ہیں، وہ اب اپنے اکھا (سارے) ساتھیوں کے ساتھ ادھر ہی کہیں جنگلوں کی خاک چھان رہی ہوگی۔ جب آپ کا حکم ہوگا، ہم اس فرنگن کو دبوچ لیں گے۔''

''پرنتو، ایک بات کی سمجھ نہ آئی پرس رام!'' بدری ناتھ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آخر یہ سسری یہاں جنگلوں میں آئی کس مقصد کے لیے ہے؟''

''یہ انگریز لوگ بڑے کھوجی فطرت کے ہوتے ہیں گروجی!'' پرس رام نے جواب میں کہا۔ ''مجھے تو شروع سے ہی اس انگریز پروفیسر پر اس بات کا شبہ تھا کہ وہ یہاں کسی

خزانے کی تلاش میں آیا ہوگا۔ اب اس کی بیٹی اور اس کے ساتھی اس کام کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاہا...... ہاہا......" اس کی بات پر مہا پجاری بدری ناتھ نے ایک بدمست سا قہقہہ اپنے حلق سے خارج کیا اور اسی لہجے میں بولا۔ "خزانے تو سارے ہمارے قبضے میں ہیں۔ یہ کیول اپنی جانیں گنوانے کے اور کچھ نہیں کرسکتے۔ پرنتو اب تم اپنا کام کر ہی گزرو...... پرس رام! ایسا نہ ہو وہ فرنگن کہیں دور نکل جائے اور ہماری پہنچ میں نہ آسکے۔"

"گروجی! میں کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے تھوڑا ہی بیٹھا ہوں۔" پرس رام نے مکاری سے مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔ "میں نے تو اسی دن دو آدمی ان کے پیچھے لگا دیے تھے جب انہیں راج محل سے نکالا جا رہا تھا۔ پھر جب انہوں نے اپنے خیمے گاڑ لیے تو انہوں نے آکر مجھے اس کی اطلاع دی۔ مجھے تسلی ہوگئی کہ وہ اب کہیں نہیں گئے۔"

"ٹھیک ہے پرس رام!" بدری ناتھ بولا۔ "اب دیر نہیں ہونی چاہیے، اس فرنگن کو اٹھا لاؤ یہاں لیکن یہ کام بہت رازداری اور اس سے زیادہ احتیاط سے کرنا ہوگا۔ ورنہ اس بار پھنسے تو سمجھو گئے، کیونکہ مہاراجا چندر گپتا کے دیہانت ہوجانے کے بعد اب شاید حالات ہمارے حق میں بدل جائیں۔ مہارانی بھی اب نجو بائی کی حیثیت اختیار کرگئی ہے، وہ اب ہمارے کام کی نہیں رہی۔"

"کہا نا گروجی! آپ اس کی بالکل چنتا نہ کریں۔ میں کل ہی اپنے آدمیوں کے ساتھ خود وہاں جاؤں گا اور یہ کام میں ہی انجام دوں گا۔" پرس رام نے کہا پھر کچھ تفکر کے اظہار میں اپنی بھویں اچکا کر دوبارہ بدری ناتھ سے بولا۔ "گروجی! ایک بات کی مجھے چنتا کھائے جاتی ہے۔"

"کون سی بات؟"

"کہیں مہارانی، میرا مطلب ہے یہ نجو بائی ہمارے لیے خطرناک تو ثابت نہیں ہوجائے گی؟ کیونکہ وہ ہمارے رازوں سے واقف ہے۔"

"ایسا کرے گی تو وہ خود بھی پھنسے گی۔" بدری ناتھ مکاری سے اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔ "وہ ایسا کبھی نہیں کرسکتی۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ اس کے سر سے ابھی تک اپنے بیٹے ایش کمار کو ریاست کی گدی پر جمانے کا بھوت نہیں اترا ہوگا۔ ہم بھی چالاکی سے اسے اسی میں مصروف رکھیں گے۔ اس کی مدد کرنے میں ہمارا اپنا بھی تو فائدہ ہے۔"

"یہ تو ٹھیک کہا آپ نے گروجی! کیونکہ راجا پرتاب کمار کے گدی نشین ہونے سے ہمارے اپنے مفادات بھی خطرے کی زد میں آسکتے ہیں۔" پرس رام نے کہا۔

"ہوں......" مہا پجاری بدری ناتھ نے حلق سے ایک گہری ہمکاری خارج کی اور شراب کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا لیا۔

یہاں یہ دونوں شیطان آپس میں اسی طرح کی گفتگو میں مصروف تھے اور مندر کے نیچے سنگی تہ خانے میں اس وقت درد بھری سسکیاں گونج رہی تھیں۔

وہ دس بارہ جوان اور حسین لڑکیاں تھیں۔ اپنی پُرکشش جسمانی بناوٹ، جلد کی شفافیت، کم عمری اور چہرے کے دلکش نقوش کے باعث کسی نہ کسی حوالے سے حسن کے زمرے میں آتی تھیں۔

انہوں نے شکر کیا تھا کہ پورن ماشی کی اس منحوس رات میں ان کی مکتی رہی تھی لیکن انہیں اس بات کا دکھ بھی تھا کہ ...... ان کی باقی ساتھی قیدی لڑکیاں بڑی سفاکی سے کالی دیوی کے چرنوں میں قربان کردی گئی تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو سب کنواری تھیں۔ اگرچہ موجودہ لڑکیوں میں بھی ایسی تھیں مگر کچھ شیطان پجاریوں کی ہوس ناکیوں کا شکار ہوکر اپنی عصمتیں گنوا بیٹھی تھیں۔ انہیں قربان تو نہیں کیا جاتا تھا صرف کنیز ہی بنا کر رکھا جاتا تھا۔

پہلے ان کی تعداد زیادہ تھی۔ دراصل وہ سب ایک ہی قید خانے میں ایک ساتھ صعوبتیں برداشت کرنے اور ساتھ رہنے کے سبب ایک دوسرے کی غم خوار ساتھی بن گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک دوسرے سے کافی مانوس ہوچکی تھیں۔ ان کے ہمیشہ کے لیے جدا ہوجانے کا اسی لیے انہیں دکھ ہو رہا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی تھیں اور کیا خبر اگلے پورن ماشی میں ان کی بھی باری آجائے۔

ہاں البتہ جن کی عصمتیں لوٹ لی گئی تھیں، وہ جان کے بلیدان سے محفوظ تھیں۔ کچھ نے مایوس ہوکر حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ چند ایک نے اس منحوس قید خانے سے فرار کی کوشش بھی کی تھی لیکن ...... وہ ناکام رہی تھیں اور سزا کے طور پر ظالم اور بدمعاش پجاریوں نے بدری ناتھ کے کہنے پر انہیں اذیتیں دے کر ہلاک کردیا تھا۔

جو حکم ماننے پر مجبور تھیں، وہ زندہ تھیں۔ جو مزاحمت کرتیں، انہیں شراب یا تاڑی میں خاص قسم کا زہر ملا کر نشے کا عادی بنا دیا جاتا تھا اور پھر وہ وہی کرتی تھیں جو یہ شیطان پجاری ان سے کرواتے تھے۔ کچھ ایسی بھی تھیں جو جان کے خوف سے اور کالی کے چرنوں کی بھیانک قربانی سے بچنے کے لیے خود بھی چاہتی تھیں کہ شیطان پجاری ان کے ساتھ ہوس

ناکیوں کا کھیل کھیلتے رہیں۔ یوں وہ بہ رضا و رغبت خود کو ان کے سامنے پیش کردیا کرتی تھیں۔

ان میں ایک بڑی بددلی اور بے دلی طاری ہوگئی تھی۔ وہ اب آپس میں بھی کم ہی گھلتی ملتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک دوسرے سے مانوس ہونے کا کیا فائدہ، جب انہیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو ہی جانا ہے۔

ان میں ایک سانولی رنگت کی لڑکی تھی جو ان میں سب سے زیادہ سرکش اور جرأت مند کہلائی جاتی تھی، لیکن اس بار کی منحوس پورن ماشی میں اس نے زندگی اور موت کا جو بربریت انگیز اور سفاک کھیل دیکھا تھا، اس نے اس کی ساری جرأت مندی اور ہمت توڑ ڈالی تھی۔ اس خوفناک رات کے بعد وہ بری طرح دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ اس پر ایسی سراسیمگی طاری ہوگئی تھی کہ اس نے کسی سے بات کرنا تک چھوڑ دیا تھا۔

اس لڑکی کا نام بالی تھا۔ وہ ابھی کنواری تھی۔ پھر بھی اس قربانی سے بچ گئی تھی جو کالی دیوی کے چرنوں میں زندہ اور کنواری لڑکیوں کی دی جا رہی تھی۔

دراصل اسے قیدی بنے دو تین ماہ ہی ہوئے تھے اور یہ خوفناک کھیل اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے اپنا دکھ تو تھا ہی مگر زیادہ دکھ اسے اس انگریز لڑکی ماریا کا تھا جسے پورن ماشی کی اس منحوس رات میں بیدردی سے خنجر مار کر قربانی کے نام پر ان سفاک پجاریوں نے ہلاک کردیا تھا۔ وہ اس کی بہت اچھی اور جرأت مند بہادر دوست تھی۔

بالی ایک قریبی گاؤں کی رہنے والی تھی اور بھیڑیں چراتی ہوئی وہ اس طرف جانکلی تھی جہاں ماریا کا شکاری کیمپ نصب تھا۔ وہیں اس کی ماریا سے ملاقات ہوئی اور پھر دونوں میں راہ و رسم چل نکلی۔

بالی کی اس دن بری گھڑی آئی ہوئی تھی کہ اس روز رات کو طوفانی بارش کے باعث اسے ماریا کے شکاری کیمپ میں ٹھہرنا پڑ گیا اور انہی دنوں بدری ناتھ نے پرس رام کو کسی فرنگن حسینہ کو تلاش کر کے اسے اغوا کر کے مندر کا قیدی بنانے کا حکم دے رکھا تھا۔

پرس رام کو ماریا کا یہ کیمپ نظر آگیا تھا۔ دوسرے روز رات کو اس نے اپنے پالتو... زہریلے سانپوں کے ساتھ وہی پرانا موت کا کھیل کھیلا جو بچ کر بھاگنے لگے، انہیں پرس رام کے بدمعاش ساتھیوں نے جا دبوچا تھا اور اپنے ہاتھوں مار ڈالا تھا۔

ماریا کے ساتھ وہ غریب ہندوستانی لڑکی بالی بھی ان کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

بالی کو ماریا نے ایک نشانی دے رکھی تھی۔ وہ ایک خنجر تھا، چھوٹا سا ہیرے موتی جڑا ہوا خنجر جو اس کے باپ کرنل اینڈرسن نے تحفے کے طور پر اپنی بیٹی ماریا کو دے رکھا تھا۔ اپنی زندگی سے مایوس ہونے کے بعد ماریا نے جانے کیا سوچ کر وہ خنجر بالی کو دے دیا تھا جسے بالی نے اندر ہی اس سنگی قید خانے کے کسی خفیہ گوشے میں چھپا دیا تھا۔ کیونکہ اسے اپنی زندگی کا بھی بھروسا نہ تھا، لیکن جانے کیسی عجیب بات تھی کہ ماریا اس سے اکثر کہتی تھی کہ اس کا دل کہتا ہے وہ یعنی بالی بچ جائے گی۔ ایسا ہوا بھی تھا مگر وہ ابھی تک اس منحوس قید خانے سے آزاد نہ ہوسکی تھی۔

اس وقت بھی وہ اسی خنجر کو ہاتھ میں لیے افسردہ نگاہوں سے.... دیکھ رہی تھی جو اس کی دوست ماریا کی نشانی تھی، پھر وہ ماریا کو یاد کر کے آبدیدہ ہوگئی۔

خنجر زیادہ بڑا نہیں تھا، بس ایک ہاتھ بھر تھا، یعنی ہتھیلی میں سما جاتا تھا لیکن اپنی انفرادیت اور خوبصورتی میں وہ کسی بیش قیمت نوادراتی نمونے سے کم نہیں تھا۔ اس کا دستہ سنہری تھا اور اس پر نگینے اور ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے، جو چمکتے نظر آتے تھے۔ چمکتا پھل قدرے خم کھایا ہوا تھا۔

اچانک کسی نے اس کے ہاتھ سے وہ خنجر جھپٹ لیا۔ بالی ڈر گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے پچھی کو مسکراتے دیکھا۔ وہ خنجر اسی کی قیدی ساتھی لڑکی نے جھپٹا تھا۔ وہ ایک سانولی سی مگر طرح دار اور خوبصورت پُرکشش نقوش والی لڑکی تھی۔ وہ بھی ان کی طرح قیدی تھی، مگر اس نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنی عزت ان ہوس کار پجاریوں کے پاس گروی رکھ دی تھی۔ جو ہر دوسرے تیسرے روز شراب کے نشے میں دھت، قید خانے میں آتے اور پچھی جیسی لڑکیوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ اوپر کمرے میں لے جاتے تھے۔

"ہے بھگوان! اتنا خوبصورت اور قیمتی خنجر تجھے یہاں قید خانے میں کہاں مل گیا؟" پچھی نے خنجر کو گھورتے ہوئے بالی سے پوچھا۔

"یہ میرا ہے، اسے واپس کرو مجھے۔" بالی نے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اس خنجر کی طرف بڑھایا، مگر پچھی نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ بالی رو پڑی اور روہانسے لہجے میں اس کی منت سماجت کرتے ہوئے بولی۔

"پچھی! نہ تنگ کر مجھے، یہ دے مجھ کو، میرا ہے یہ......"

اسے روتے دیکھ کر پچھی کو ترس آگیا۔ اس نے خنجر اس کی طرف بڑھا دیا اور بولی۔

"روتی کیوں ہے پگلی! یہ لے، اب بتا مجھے، یہ کہاں سے آیا تیرے پاس؟ کس نے دیا تھا تجھے......؟"

بالی نے خنجر لے کر اپنے میلے کچیلے لباس میں چھپالیا اور چھمی کی طرف دیکھتے ہوئے جھوٹ بولا۔

"یہ مجھے ادھر ہی تہ خانے سے ملا ہے اور کس نے دینا ہے مجھ ابھاگن کو اتنا قیمتی خنجر۔" وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس خنجر کی حقیقت کے بارے میں کسی کو بتائے۔

"تجھے موت سے ڈر لگتا ہے؟" چھمی اس کی طرف دیکھ کر اچانک عجیب سے لہجے میں بولی۔ جیسے کسی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ خنجر کے قصے کو بھول گئی۔

"ہاں!" بالی نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میری طرح تو بھی اپنا جسم ان بدمعاش پجاریوں کے پاس گروی رکھ دے۔ تیری قربانی اگلی پورن ماشی کو تو کیا کبھی بھی نہ ہوگی۔ جیسے میں نے کیا ہے۔" چھمی نے اسے مشورہ دیا۔

"ہرگز نہیں، میں مرجانا پسند کروں گی مگر ان شیطانوں کو اپنی عزت کی طرف ہاتھ بھی بڑھانے نہیں دوں گی۔" بالی نے ایک دم عجیب سے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ چھمی اس کی طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ ہنسی ہنسنے لگی۔

اچانک اس سیلن زدہ تنگ تہ خانے میں ایک آواز ابھری۔ یہ سب دہشت زدہ سی ہو کر دیواروں سے جا چپکیں۔ تہ خانے میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ قریب ہی ایک زینہ اوپر کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہاں دروازہ تھا۔ یہ اسی کے کھلنے کی مخصوص آواز تھی جو ان قیدی لڑکیوں کو ہمیشہ سے ہی بڑی کریہہ لگتی تھی۔

یہ سب وحشت زدہ بلّیوں کے مانند اسی جانب سہمی ہوئی نگاہوں سے تکے جا رہی تھیں۔ وہاں زینے کی دیوار پر تین سائے ابھرے۔ پھر کسی کے زینے اترنے کے قدموں کی بھاری آواز گونجی۔

وہ تین مشٹنڈے پجاری تھے۔ ان میں ایک بڑا پروہت پرس رام تھا۔ یہ تینوں ہی شراب کے نشے میں دھت تھے۔ پجاری بدری ناتھ نے انہیں نیچے تہ خانے سے چار عدد...... جوان لڑکیاں لانے کا کہا حکم دے رکھا تھا اور اپنے مقرب خاص کار پرداز چیلے...... پرس رام کو تاکید کی تھی کہ ان لڑکیوں میں ایک کنواری لڑکی بھی ضرور شامل ہونی چاہیے۔

انہیں دیکھتے ہی یہ سب بدنصیب قیدی لڑکیاں وحشت زدہ بلّیوں کی طرح چیخنے چلانے لگیں مگر ان پجاریوں پر ان کی چیخوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ چھمی اور دوسری لڑکیوں نے تو بہ رضا و رغبت خود کو ان شیطانوں کے حوالے کر دیا۔ پرس رام کی نظر بالی پر پڑی اور اس کی آنکھوں میں خاص چمک ابھری۔ بالی بھی سہم گئی۔ پرس رام کسی شکرے کی طرح اس پر جھپٹا۔

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ اپنی اپنی پسند کی لڑکیاں کاندھوں پر اٹھائے زینے طے کر رہے تھے جبکہ پرس رام کے کاندھے پر بدری ناتھ کی پسند کی لڑکی بالی لدی ہوئی تھی۔

اوپر پہنچ کر یہ لوگ اپنی اپنی پسند کی لڑکیاں لیے کمروں میں چلے گئے جبکہ پرس رام نے بالی کو لے جا کر مہا پجاری بدری ناتھ کے کمرے میں اس کے قدموں کے قریب ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ واپس لوٹ گیا۔

کمرے کی فضا بڑی خوف ناک اور آسیب زدہ سی ہو رہی تھی۔ پجاری بدری ناتھ ننگ دھڑنگ فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت نظر آ رہا تھا۔

اس کے گنجے سر پر خوب تیل چمک رہا تھا۔ بالوں کی اکلوتی چوٹی بھی چمک رہی تھی اور وہ پیچھے موٹی سی گدی پر جھول رہی تھی۔ کمرے میں مٹی کے چراغوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک سیاہ کوڑیالا سانپ بدری ناتھ کی موٹی گردن کے گرد لپٹا ہوا خوف ناک پھنکاریں مار رہا تھا۔ بالی اس منظر سے دہشت زدہ ہو گئی۔ وہ چیخنے لگی تو بدری ناتھ نے اسے دبوچ لیا اور اپنے ایک ہاتھ سے سانپ کا پھن پکڑا اور بالی کی گردن پر اسے ڈسوا دیا۔ وہاں سے خون کی لکیر بہنے لگی۔ بالی کے حلق سے لرزا دینے والی چیخ خارج ہوئی اور پھر وہ نڈھال سی ہو کر اس شیطان پجاری بدری ناتھ کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تھی، یوں جیسے کسی نشے کے زیر اثر آ گئی ہو۔

بدری ناتھ ہوس ناک نظروں سے بالی کے بے ترتیب پڑے شریر کو گھورنے لگا۔ تب ہی اچانک بالی کے مسلے ہوئے لباس سے وہ سنہری دستے والا خنجر گر پڑا۔

بدری ناتھ اسے دیکھ کر چونک پڑا، اس نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر وہ اٹھالیا اور اسے بڑے غور غور سے دیکھنے لگا۔ پھر خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔

"ہوں...... خاصا قیمتی اور خوب صورت خنجر ہے۔ میں اسے اپنے پاس رکھوں گا۔"

وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ خنجر اس کے لیے کتنی بڑی مصیبت لانے والا تھا۔

(جاری ہے)

زر، زن کی ہوس میں مبتلا رشتوں کا لالچ اور استحصال

رشتوں کا گورکھ دھندا کبھی کبھی انسانیت کے منہ پر طمانچہ بن جاتا ہے مگر طمانچہ کھانے اور مارنے والوں کا تسلسل ہر دور میں جاری رہا۔ وہ بھی ان کے لیے ایک ایسا ہی ترپ کا پتا تھی جس کا وجود ان چالبازوں کے جینے کا سبب تھا مگر ان کے چال چلن نے اسے ایسی چال چلنے پر مجبور کر دیا جس کے بعد وہ گھرانا دو قدم بھی چلنے کے قابل نہ رہا۔

ٹرمپ کارڈ

آصفہ ضیا احمد



ادھیڑ عمر کی شیاما دیوی نے بھرپور اور ستائشی نگاہوں سے اپنے آپ کو دیکھا اور ساڑی کا آنچل ٹھیک کرتے ہوئے پرس اٹھانے کے لیے جھکی تو بے ساختہ نظریں پھر آئینے سے ٹکرائیں۔ اس بار آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر چہرہ سرسوں کا پھول بن گیا۔ کیونکہ سیاہ بکھری ہوئی زلفوں کے ساتھ سفید چاندی جیسے بال اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ دھڑکتے دل نے آواز دی، خزاں کی آمد آمد ہے۔ زمانہ بہار رخصت ہو چکا۔ اس کا باہر جانے کا سارا موڈ غارت ہو گیا۔ بیزار کن انداز میں پرس ایک طرف پھینکا اور بیڈ پر پیر پھیلا کر لیٹ گئی۔ اسی لمحے دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری تو وہ تکیے کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی اور دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔ آگے پیچھے چلتی ہوئی شیاما کی ماں کانتا دیوی اور شیاما کی بیٹی جھرنا داخل ہوئیں۔ کانتا کی کمر کا خم اور چہرے کی جھریاں چھپائے نہیں چھپ رہی تھیں لیکن پھر بھی اپنے آپ

کو سلیقے سے رکھنے کے لیے میک اپ کی دبیز تہ چہرے پر تھوپ رکھی تھی۔ جدید اسٹائلش ساڑی زیب تن کر رکھی تھی۔ جھرنا نے فل آستین کی ٹی شرٹ اور نیوی بلو ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ چہرے سے ہی کمسنی اور الھڑپن جھلک رہا تھا۔ اپنے بے پناہ حسن کا بھی احساس تھا۔ اس لیے گردن غرور اور تکبر سے تنی ہوئی تھی۔ کانتا نے بیٹی کو بیڈ پر نیم دراز دیکھا تو قدرے تحیر سے پوچھا۔ ''تم شاپنگ کے لیے جا رہی تھیں۔ پھر اچانک یہ بستر کیوں سنبھال لیا۔'' شیاما نے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ سجائی اور مدھم لہجے میں بولی۔

''آج کا پروگرام کینسل کر دیا۔ طبیعت کچھ بوجھل سی ہے۔'' لمحاتی توقف کے بعد ماں کو استفسارانہ نظروں سے دیکھا اور بھویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ دونوں کہاں جا رہی ہیں؟'' کانتا دیوی نے ٹشو پیپر سے اپنے چہرے کا پسینا صاف کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''ارے جانا کہاں ہے؟ وہ میری دوست ہے نا مسز پاٹھک انہوں نے ایک وید کا پتا بتایا ہے جس کے پاس بڑھاپا روکنے کے نایاب اور قیمتی نسخے ہیں۔ میں اکیلی کہاں بھٹکتی پھرتی۔ اس لیے تمہاری بیٹی کو ساتھ لے جا رہی ہوں۔ ضدی، ہٹیلی لڑکی تیار نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے رام کیا ہے۔'' کانتا نے نواسی کی جانب دیکھا، جو آئینے کے سامنے کھڑی اپنی لپ اسٹک ٹھیک کر رہی تھی۔ دونوں ہاتھ ہلاتی نکل گئیں۔

شیاما گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خود کلامی کے انداز میں آہستہ سے بڑبڑائی۔ ''ماں......! ساتھ چلنے کے لیے اگلی بار آپ کو جھرنا کی خوشامد نہیں کرنا پڑے گی کیونکہ اس وید کی ضرورت اب مجھے بھی ہے۔''

کانتا دیوی ایک میوزک اسکول چلاتی تھی۔ جہاں سر سنگیت اور رقص کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بذات خود بھی سازوں کی اور سروں کی جانکاری رکھتی تھی کیونکہ وہ خود ایک مشہور طبلچی کی بیٹی تھی۔ کانتا نے بہت چاہا کہ اس کی بیٹی شیاما بھی ان فنون میں دسترس حاصل کرے اور اسکول چلانے میں اس کی معاونت کرے لیکن شیاما لاابالی طبیعت کی آرام طلب، غیر مستقل مزاج اور دوسروں کے پیسے پر عیش کرنے والی عورت تھی۔ میوزک اسکول بھی کامیابی سے صرف اس لیے چل رہا تھا کہ اس میں کانتا کی انتھک محنت شامل تھی۔ بوڑھی نانی کی محنت کو ثمر بار کرنے میں جھرنا کا بھی ہاتھ تھا۔ اپنی تعلیم کے دوران ہی وہ اسکول جا کر میوزک اور رقص کی تربیت حاصل کرتی رہی۔ اس کے جذبۂ شوق کو دیکھتے ہوئے کانتا نے گریجویشن کرنے کے فوراً بعد اسے اپنے اسکول کے لیے ہی ہائر کر لیا۔ جھرنا کے سنِ بلوغت میں قدم رکھتے ہی شیاما کے من کی کلی کھل اٹھی۔ دولت کا حصول اس کا مقصدِ حیات تھا اور اس کے لیے وہ ہمیشہ شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتی تھی۔ بیٹی کے ناز و انداز روپ سنگھار کو دیکھتے ہوئے اس نے نجانے کتنے دھنک رنگ سپنے دیکھ ڈالے۔ دل ہی دل میں اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بہت جلد اپنی اپسرا بیٹی کو لے کر ممبئی کی فلم نگری کی جانب پیش قدمی کرے گی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بیٹی فلم انڈسٹری میں دھوم مچا دے گی لیکن سارے میٹھے اور سنہری سپنے ایک چھناکے کے ساتھ اس روز ٹوٹے جب جھرنا نے اس کے اور کانتا دیوی کے سامنے یہ دھماکا کیا کہ چند ماہ پیشتر اسکول میں آنے والا ایک ٹیچر اس کے من میں سما گیا ہے۔ دونوں ماں بیٹی سرتاپا لرز کر رہ گئیں۔ سونے کی چڑیا اڑنے کے لیے پر تول رہی ہے۔ اس تصور سے ہی دونوں کے دل کی دھڑکنیں زیر و زبر ہو گئیں۔ شیاما شدید اشتعال کے عالم میں جھرنا کی طرف بڑھی اور اس کے پھول سے رخسار پر بھرپور طمانچہ مارا۔ جھرنا بلبلا اٹھی۔ ہاتھ کے ساتھ شیاما کی زبان بھی چل رہی تھی۔ ''سنکی، پاگل، خبطی لڑکی۔ اس ٹٹ پونجیے کے علاوہ اور کوئی نہیں ملا تجھے۔'' جھرنا بھی ماں کو ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔ واشگاف لفظوں میں وہ انیل گپتا سے شادی کا اعلان کر رہی تھی۔ شیاما نے دانت پیستے ہوئے پیر کی جوتی ہاتھ میں اٹھائی اور پھر جھرنا کی طرف بڑھی لیکن اس بار کانتا نے سختی کے ساتھ شیاما کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیا اور درشت لہجے میں بولی۔

''جھکی اور پاگل تو مجھے تم لگ رہی ہو۔ ارے بے وقوف عورت، لڑکی عاقل اور بالغ ہے۔ اگر وہ... اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی ہے تو کرنے دو۔ تم کیوں مزاحمت کر رہی ہو۔'' کانتا نے جیسے ہی کینچلی بدلی۔ شیاما نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ کانتا نے معنی خیز نظروں سے بیٹی کو گھورا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ سمجھا دیا۔ شیاما کا غصہ جھاگ کے مانند بیٹھ گیا۔ اس نے گہری سانس خارج کی اور پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔ کانتا نے روتی بلکتی جھرنا کو اپنی بانہوں میں لے کر سینے سے چمٹا لیا۔ اب وہ باقاعدہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ شیاما کے چہرے پر خشونت اور فکرمندی کی پرچھائیاں تھیں۔

☆☆☆

انیل گپتا طویل القامت، خوبرو اور اسمارٹ نوجوان

تھا۔ آنکھوں سے ہی ذہانت ٹپکتی تھی۔ کلکتہ کی کسی نامور اکیڈمی سے موسیقی کا ڈپلوما ہولڈر تھا۔ جھرنا سے پہلی ہی ملاقات میں دل گھائل کر بیٹھا۔ ادھر جھرنا بھی پریم دیوانی بن کر ماں اور نانی سے ٹکر لے بیٹھی۔ شیاما کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جھرنا کو کچا چبا جائے لیکن تجربہ کار اور جہاں دیدہ کانتا اسے جلد بازی اور بے صبری سے روک رہی تھی۔ اس کی دور رس نگاہیں بہت آگے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ دماغ کی چکی پورے زور و شور کے ساتھ گھر گھر چل رہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی محفوظ رہے۔ جھرنا پر کسی قسم کی بندش یا پابندی لگانے کے لیے بھی اس نے شیاما کو سختی سے منع کر دیا تھا۔ ''دھیرج سے کام لو، جذبات میں آکر کوئی احمقانہ قدم مت اٹھا بیٹھنا۔'' کانتا کی نصیحتوں پر عمل کرتے ہوئے شیاما نے بہ دقت تمام صبر کا گھونٹ پی لیا لیکن جھرنا سے بول چال قطعاً بند تھی۔ جھرنا کی البتہ آج کل نانی سے گاڑھی چھن رہی تھی۔ بوڑھی کانتا اس کی ہمراز اور ہم نوا تھی۔ جنریشن گیپ تو ختم ہی ہو گیا تھا۔ انیل کے ساتھ کہاں گئی تھی۔ انیل کے مستقبل کے کیا پلان ہیں۔ انیل کب اپنے ماتا پتا سے ملوائے گا۔ ہر ہر بات وہ کانتا سے شیئر کرنے لگی تھی۔ ماں کو جلانے کے لیے انیل کی ہر بات زور سے کرتی۔ شیاما پیر پٹختی ہوئی وہاں سے اٹھ جاتی۔ کانتا اس کی پیشانی چوم کر ڈھیروں سارا آشیرواد دے کر اس کا دل خوش کر دیتی۔ آج کل جھرنا کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ کانتا بھی آنے والے وقت کی آہٹوں کو سن رہی تھی۔ اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے کے بعد اس کی سن گن اس نے شیاما کو بھی نہیں لگنے دی۔

☆☆☆

وہ جون کی ایک گرم دوپہر تھی۔ سمر وکیشن کا آغاز ہو چکا تھا لیکن میڈم کانتا نے اپنے اسکول کی ترقی کے لیے کچھ اہم تجاویز اپنے اسٹاف سے ڈسکس کرنا تھیں۔ اس سلسلے میں سب کو بلایا تھا۔ سارا اسٹاف مقررہ وقت پر پہنچ چکا تھا لیکن انیل اور جھرنا کا ابھی دور دور تک پتا نہیں تھا۔ کانتا کی نظر بچا کر سب چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ موضوع انیل اور جھرنا ہی تھے۔ معاً دونوں ساتھ ساتھ آفس میں داخل ہوئے۔ ان دونوں کے آتے ہی مکھیوں والی بھنبھناہٹ ختم ہو گئی اور کانتا کی سربراہی میں میٹنگ کا آغاز ہوا۔ اس نے نپے تلے الفاظ میں تمام اسٹاف کو مخاطب کرتے ہوئے چھوٹی سی تقریر کی اور ایجنڈا پیش کر کے اسٹاف سے ان کی اپنی رائے مانگی۔ ابھی کوئی جواب دینے بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک آفس سے باہر شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو افراد آپس میں جھگڑ رہے ہوں۔ اچانک آفس کا دروازہ کھول کر واچ مین اندر آیا اور کانتا کو مخاطب کر کے بولا۔

''میڈم ایک عورت ہے کسی طور نہیں مان رہی ہے۔ لاکھ کہہ رہا ہوں کہ اندر ایک اہم میٹنگ جاری ہے لیکن اس کی بس ایک ہی رٹ ہے کہ مجھے میڈم کانتا سے ملنا ہے۔''

میڈم نے واچ مین کو ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کے لیے کہا اور پھر تحکمانہ انداز میں بولی۔ ''جو بھی ہے، اسے اندر بھیج دو۔''

واچ مین کے جاتے ہی ایک نوجوان، تیکھے نقوش والی خوش شکل عورت اندر داخل ہوئی۔ گود میں ایک ننھا سا بچہ بھی تھا۔ جسمانی طور پر بچہ نہایت کمزور اور لاغر لگ رہا تھا۔ عورت کا حلیہ اور کپڑے بھی اس کی کسمپرسی اور تنگدستی کی کہانی سنا رہے تھے۔ سب کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ میڈم بھی حیران نظروں سے آنے والی کو گھور رہی تھیں۔ اس عورت نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے میڈم کانتا دیوی سے بات کرنی ہے۔''

میڈم نے حاکمانہ انداز میں جواباً کہا۔ ''میں ہی کانتا ہوں۔ بولو کیا بولنا ہے۔ میں سن رہی ہوں۔''

عورت نے ہچکچاتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''میڈم جی! میں اکیلے میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

میڈم نے تیقن آمیز انداز میں کہا۔ ''میرا اسٹاف قابلِ اعتبار اور میرا خیر خواہ ہے۔ تمہیں جو کہنا ہے، بلا جھجک کہو۔ اس چار دیواری سے باہر کوئی بات نہیں جائے گی۔''

میڈم کی یقین دہانی پر اس عورت نے اپنے بچے کو بھینچتے ہوئے ایک چھلکتی ہوئی نظر سب پر ڈالی اور رقت آمیز آواز میں بولی۔ ''میڈم! آپ میری بزرگ ہیں، میری ماں سمان ہیں۔ آپ کے اسکول کے ایک کرمچاری نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ مجھ سے بیاہ کیا، مجھے ایک بچے کی ماں بنایا اور اب صاف مکر گیا کہ یہ بچہ میرا نہیں۔ باپ کے ہوتے ہوئے میرا بچہ اناتھ ہو گیا۔ مجھے نیائے چاہیے۔ میں آپ کے پاس بڑی امید اور آشا لے کر آئی ہوں۔ مجھے اپنی اتنی چنتا نہیں لیکن صرف اور صرف اس بچے کی خاطر انصاف چاہیے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں میڈم میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔''

وہ عورت حسرت و یاس کی تصویر بنی میڈم سے رحم

وکرم کی خواہاں تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی کے سائے تھے اور چہرے پر بلا کی مظلومیت اور معصومیت تھی۔ چند لمحے بالکل خاموشی اور سناٹا طاری رہا۔ اس اعصاب شکن خاموشی کو کانتا کی ٹھہری ہوئی آواز نے توڑا۔ وہ غصے اور طیش سے کپکپا رہی تھی۔ غصہ قابو کرتے ہوئے اس نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بتا میرے اسکول کا کون شخص ہے جس نے تجھ سے شادی کی اور پھر یوں بے سہارا چھوڑ دیا۔ کون ہے وہ ہوس کا بھیڑیا؟ میں تجھے اور تیرے بچے کو پورا پورا انصاف دلواؤں گی۔''

عورت زہریلی ناگن کی طرح پھنکاری اور انیل گپتا کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میڈم! یہ ہے وہ شکاری جس نے مجھے اپنے جال میں پھانسا اور مجھے تڑپتا ہوا دیکھ کر بھی اس پر کوئی اثر نہیں۔ بالکل معصوم بنا بیٹھا ہے۔'' انیل گپتا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پہاڑ جیسی بلندی سے اسے عمیق گہرائیوں میں دھکا دے دیا ہو۔ اسے ایسا زبردست ذہنی شاک لگا تھا کہ چند لمحوں کے لیے وہ بالکل پتھر کا بت بن گیا۔ منہ کھول کر کچھ بولنا چاہ رہا تھا لیکن نہ الفاظ ترتیب دے پا رہا تھا اور نہ ہی زبان ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے تمام کولیگز اسے افسوس ناک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک لیڈی ٹیچر نے تو آہستہ سے کہہ بھی دیا۔ ''شکل دیکھو اور کرتوت دیکھو۔'' اس کا یہ جملہ سب کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

انیل اپنی ہمت و حوصلے کو مجتمع کر کے بہ دقت تمام کرسی کا سہارا لے کر کھڑا ہوا اور اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ بے ساختہ اس کی نگاہ جھرنا پر جا کر ٹک گئی۔ جھرنا کی خوب صورت آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ جیسے ہی دونوں کی نظریں ٹکرائیں، آنسو بے قابو ہو کر اس کے رخسار تر کرنے لگے اور پھر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور .... ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھی اور باہر کی طرف بھاگی۔ میڈم نے بھی آج کی میٹنگ ملتوی کر کے سب کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ جن لوگوں کو انیل سے ہمدردی تھی، وہ تو اس کے پاس ٹھہر گئے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو دل ہی دل میں اس سے خار کھانے لگے تھے کیونکہ وہ جھرنا جیسی پری پیکر کو لے اڑا تھا اور اس کے سامنے جھرنا کسی کو بھی گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ انیل کا جگری دوست مہیش اب بھی اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا پانی کا جگ اٹھایا اور ایک گلاس میں پانی انڈیل کر انیل کی جانب بڑھایا۔ انیل نے اپنا حلق تر کیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مہیش نے تفکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''چلو گے نہیں...... تقریباً سب جا چکے ہیں۔''

انیل نے ایک سرد آہ بھری اور مغموم نظروں سے مہیش کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کہاں جاؤں، کدھر جاؤں؟ میرے لیے تو سارے راستے ہی بند ہو چکے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میرے دوست اس عورت نے مجھ پر اتنا بڑا الزام کیوں لگایا ہے۔ میں تو اسے جانتا تک نہیں۔ بچہ بھی پتا نہیں کس کا اٹھا لائی اور مجھے اس کا باپ بنا دیا۔ آخر کیا چکر ہے مہیش...... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ......'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

دوست کی حالتِ زار دیکھ کر مہیش کا بھی دل بھر آیا۔ اس نے اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''انیل! ہے تو صورت حال انتہائی سنگین لیکن مجھے اس سارے واقعے میں کسی سازش کی بو آ رہی ہے، کوئی تمہارا قریبی دشمن۔ ذرا سوچو اس سارے ڈرامے میں کس کا مفاد پوشیدہ ہے۔''

انیل نے دماغ پر زور ڈالا تو اس کے اعصاب چٹخنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی اور بیچارگی تھی۔ نفی میں سر کو جنبش دی اور بولا۔ ''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے کیوں اس سارے معاملے میں پھنسایا جا رہا ہے۔''

مہیش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھایا اور کہا۔ ''اس وقت سوچنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے، سکون اور اطمینان کے ساتھ سارے معاملے پر نظر ثانی کرو گے تو خود بخود تانے بانے ملتے چلے جائیں گے اور رزلٹ سامنے آ جائے گا۔''

انیل نے استہزائیہ انداز میں ایک مایوس کن ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''سکون اور اطمینان اب میری زندگی میں کہاں۔'' وہ بہت زیادہ دل برداشتہ ہو رہا تھا۔

مہیش کافی دیر تک اسے تسلی تشفی دیتا رہا پھر دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ انیل نے اس ادارے سے نکلتے ہوئے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اب دوبارہ لوٹ کر یہاں نہیں آئے گا بلکہ بہت جلد اس شہر کو خیر باد کہہ دے گا لیکن اپنے اس خیال کا اظہار اس نے مہیش سے نہیں کیا۔ مہیش اس رات انیل کے فلیٹ پر ہی رہا۔ اس رات مہیش نے اپنی نیند کی قربانی دی اور مکمل طور پر انیل کو دیکھتا رہا، اس کی نگرانی کرتا رہا۔ دوسری صبح اپنے ہاتھوں سے ناشتا تیار کر کے اسے کھلا پلا کر اور دلاسا دے کر اپنے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر بھی اس سے ٹیلی فونک رابطہ قائم رکھا اور اس کی خیریت دریافت کرتا

رہا۔ اب بھی وہ پُرخیال انداز میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ سارا گورکھ دھندا کیا ہے اور اس کے پیچھے کون ہے کہ اچانک اس کا موبائل گنگنایا۔ اسکرین پر انیل کا نام چمک رہا تھا۔ وہ اسے بلاوا دے رہا تھا۔ مہیش فوراً تیار ہو کر اپنی بائیک پر بیٹھ کر انیل کے فلیٹ کی طرف لپکا۔ انیل بے تابی کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ اس کے داخل ہوتے ہی انیل اس سے لپٹ گیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم صحیح کہہ رہے تھے مہیش...... میرے خلاف سازش رچی گئی ہے۔''

مہیش نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا اور استعجاب انگیز لہجے میں بولا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

انیل نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھایا اور پھر دونوں کافی دیر تک محوِ گفتگو رہے۔ جب باتیں ختم ہوئیں تو دونوں کے چہروں پر سکون اور طمانیت کی پرچھائیاں تھیں۔ مہیش نے چلتے چلتے نصیحت کی۔ ''ابھی آواز بند رکھنا کیونکہ دشمن کا کوئی اعتبار نہیں۔''

انیل نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔'' پھر دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

کانتا اور شیاما انتہائی راز دارانہ انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔ ملازم کے قدموں کی چاپ سن کر یکدم سناٹا چھا گیا اور دونوں استفسارانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ ملازم نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''میڈم جی! بے بی کی فرینڈ ورشا آئی ہیں۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر آ رہا ہوں۔ وہ آپ دونوں سے ملنا چاہتی ہیں۔''

کانتا نے خشمگیں نظروں سے بیٹی کو گھورا اور تیز لہجے میں بولی۔ ''رامو! کون ہے...... اسے یہاں بلا لاؤ۔''

آنے والی لڑکی جس کا نام ورشا تھا، متناسب جسم اور دلکش چہرے کی مالک تھی لیکن اس وقت چہرے پر تفکرات کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔ جدید تراش کے اسکرٹ بلاؤز زیب تن کیے ہوئے اور قیمتی پرس ہاتھ میں جھلاتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ دونوں ماں بیٹی کے لیے وہ قطعاً اجنبی تو نہیں تھی۔ بس ایک یا دو بار ہی اس لڑکی کو انہوں نے جھرنا کے ساتھ دیکھا تھا۔ بہت زیادہ کلوز فرینڈز میں اس کا شمار نہیں تھا۔ شیاما...... تو منہ پھیر کر بیٹھ گئی لیکن کانتا نے بڑے پیار سے اسے اپنے پاس بٹھایا اور بولی۔ ''تم یقیناً جھرنا کی دوست ہو گی اور اس سے ملاقات کرنے......'' کانتا کی بات مکمل ہونے سے پہلے شیاما حسبِ عادت پھر درمیان میں ٹپک پڑی اور رسانیت بھرے لہجے میں بولی۔

''دراصل جھرنا ایک کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئی ہوئی ہے۔ اس لیے ملاقات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

ورشا کے لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسم بکھر گیا اور وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ''آنٹی! وہ شہر سے باہر نہیں ہے بلکہ آج کا سارا دن اس نے میرے ساتھ میرے گھر پر گزارا ہے۔ انیل نے اسے بہت زیادہ ڈس ہارٹ کیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے سنبھالا ہے۔'' ورشا کی بات سنتے ہی دونوں ماں بیٹی چوکنا ہو کر بیٹھ گئیں۔

شیاما نے کچھ پوچھنے کے لیے پھر منہ کھولنا چاہا تو کانتا پھر غرائی۔ ''شیاما! تم فضول سوالات کر کے اپنا بھی وقت ضائع کرتی ہو اور دوسروں کا بھی، برائے مہربانی مجھے بات کرنے دو۔'' ماں کے توہین آمیز لہجے پر شیاما کا خون کھول اٹھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے نو دو گیارہ ہو جاتی لیکن معاملہ اپنی لاڈو کا تھا۔ اس لیے صبر کا کڑوا گھونٹ لے کر ماں اور ورشا کے درمیان ہونے والی گفتگو پر کان لگا دیے۔

ورشا کانتا سے مخاطب تھی۔ ''نانو! جھرنا کی جو کیفیت آج میں نے دیکھی ہے، اسے الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ دن تو جیسے تیسے گزر گیا لیکن اندھکار ہوتے ہی وہ میرے گھر سے نکل کر اس سنسان اور ویران پارک میں جا بیٹھی جہاں وہ اور انیل خفیہ ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ میرے گھر چلو لیکن اس کی ضد اور ہٹ دھرمی ختم ہی نہیں ہو رہی ہے۔ چاروناچار مجھے یہاں آنا پڑا۔''

کانتا نے تشکر آمیز لہجے میں جواباً کہا۔ ''ورشا! ہم لوگ جیون بھر تمہارا یہ اپکار نہیں بھول سکتے۔ یقین کرو مجھے اور شیاما کو یہ دھڑکا لگا تھا کہ کہیں اس بے وقوف لڑکی نے آتما ہتھیا نہ کر لی ہو لیکن تمہاری زبان سے یہ سن کر دل کو ڈھارس ملی کہ صحیح سلامت ہے۔ تم دیکھنا وقت کے ساتھ ساتھ سب بھول جائے گی۔ نہ انیل یاد رہے گا اور نہ اس کا پریم۔ میں اور شیاما تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔'' پھر اس نے شیاما کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''چل شیاما! جلدی سے اٹھ جا۔ ڈرائیور سے کہہ کہ گاڑی نکالے۔ ہم ابھی اسی وقت جا کر اسے سمجھا بجھا کر لے کر آتے ہیں۔''

گاڑی میں بیٹھتے ہی شیاما کی زبان میں پھر خارش ہوئی اور وہ تحکمانہ لہجے میں ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔ ''سنو گاڑی ہائی اسپیڈ میں چلانا۔''

کانتانے اسے پھر ٹوکا۔ ''تم اپنے آپ کو بھی سنبھالو اور اپنے دل کو بھی لگام دو۔ ہر وقت بے تکا بولتی ہو۔'' پھر ڈرائیور کی جانب منہ پھیر کر کہا۔ ''او ینٹاش! جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اطمینان سے ڈرائیو کرو۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ کا راستہ ہے۔''

ڈرائیور نے ہولے سے جواباً کہا۔ ''اوکے میڈم!''

بہر حال جب وہ پارک کے گیٹ پر پہنچے تو اچھا خاصا اندھیرا اتر آیا تھا لیکن پارک کا گیٹ پھر بھی کھلا ہوا تھا۔ ورشا دونوں کو بائے کہتے ہوئے باہر سے ہی کھسک گئی۔ وہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھ کر یہ ثابت کرنا چاہ رہی تھی کہ کانتا اور شیاما خود ہی تلاش کرتی ہوئی وہاں تک پہنچی ہیں۔ دونوں متلاشی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ بالآخر روتی بلکتی جھرنا انہیں سفیدے کے پیڑ سے لپٹی نظر آ گئی۔ کانتا دونوں بانہیں پھیلا کر بڑھی اور جھرنا کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ معاً شیاما کی نظر درخت کے تنے پر پڑی۔ اس پر انیل اور جھرنا کا نام کھدا ہوا تھا۔ شاید دونوں نے فرصت کے لمحات میں یہ کام کیا تھا۔ اس لیے ملگجی روشنی میں بھی دونوں کے نام صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ اپنی بیٹی کے نام کے ساتھ انیل کا نام دیکھ کر شیاما کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ حلق میں بھی کڑواہٹ اتر گئی۔ جارحانہ انداز میں آگے بڑھی اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کانتا نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے شیاما نے چپ سادھ لی۔ جھرنا کو اپنی ہی سدھ بدھ نہیں تھی کہ وہ ماں اور نانی کے درمیان ہونے والی اشارے بازی کو دیکھتی۔ ماں اور نانی نے لپٹا چمٹا کر پیار دلار کرکے اسے اپنے ساتھ گھر واپس چلنے کے لیے راضی کر لیا۔ گھر پہنچ کر وہ تیر کی طرح اپنے کمرے میں جا گھسی۔ دونوں کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کی تنہائی میں مخل ہوتیں لیکن رات بھر دونوں نگراں بنی بیٹھی رہیں۔ رات کے آخری پہر میں جب جھرنا کی آنکھ لگی، تب کانتا اور شیاما نے بھی سکون کی سانس لی اور اپنے اپنے بیڈ پر ایسے گریں کہ صبح گیارہ بجے دونوں نیند سے بیدار ہوئیں۔ جھرنا بھی نہا دھو کر فریش ہو گئی تھی۔ یاسیت، اداسی اور حزن و ملال نے اس کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ شیاما اپنے ہاتھ سے بریڈ کو مکھن لگا کر بیٹی کو کھلا رہی تھی۔ کانتا بھی میٹھی میٹھی پیار بھری نگاہوں سے بیٹی اور نواسی کو دیکھے جا رہی تھی۔ بریڈ ختم ہوتے ہی جھرنا نے مزید نہ کھانے کا اشارہ کیا۔ شیاما نے فوراً چائے بنا کر پیش کر دی۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ اپنی مترنم آواز میں گویا ہوئی۔ روئے سخن دونوں کی جانب تھا۔ ''آپ دونوں کا دل دکھانے اور نافرمانی کی ہی سزا مجھے ملی ہے۔ کاش میں آپ دونوں کی نصیحتوں پر عمل کرتی تو شاید یہ سب نہیں ہوتا۔ مجھے علم ہوتا تو میں اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ اچھا ہوا وہ عورت صحیح وقت پر سامنے آ گئی۔ اگر شادی ہو جاتی تو......''

اتنا کہہ کر اس کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی اور آنکھیں پھر نمناک ہو گئیں۔

وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ کانتا نے ملازم سے کہہ کر جھرنا کے لیے دوبارہ چائے تیار کروائی اور خود ہی ٹرے اٹھا کر جھرنا کے سر پر پہنچ گئی۔ جھرنا منہ اوندھائے سرکشن پر رکھ کر سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا اور فوراً کانتا کی گود میں منہ چھپا لیا۔ کانتا نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن بہلا پھسلا کر چائے پلانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کا روتا بسورتا چہرہ دیکھ کر کانتا نے تحکمانہ انداز میں اسے اپنا حلیہ درست کرنے کا آرڈر دیا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر کچھ دیر بعد ملازمہ کو ساتھ لے کر پارلر روانہ ہو گئی۔

جھرنا کے جانے کے بعد کانتا کافی دیر شیاما کو... اپنے مفید مشوروں سے نوازتی رہی۔ شیاما کا غصہ بھی بہت حد تک کم ہو گیا تھا۔ ماں کا لیکچر سننے کے بعد اس نے نہایت سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ''مما! اب سب باتوں پر خاک ڈالیں اور مجھے یہ بتائیں کہ آگے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آج ہم نے انیل سے اس کی جان چھڑائی۔ کل انیل جیسا پھر اس سے ٹکرایا تو کیا کریں گے؟''

کانتا نے پرسوچ انداز میں گردن کو جنبش دی اور گمبھیر لہجے میں بولی۔ ''تو چنتا نہ کر...... اس کا حل بھی میں نے سوچ رکھا ہے۔''

شیاما بیٹھے بیٹھے اچھل پڑی اور پرمسرت آواز میں بولی۔ ''جلدی بتاؤ مما! کیا چل رہا ہے تمہارے من میں۔ تمہارا پھینکا ہوا تیر ہمیشہ نشانے پر لگتا ہے۔''

کانتا نے بیٹی کو دلاسا سا دیتے ہوئے اس کی پشت تھپتھپائی اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ ''نوعمری اور نادانی کا زمانہ ہے۔ اس سے پیار محبت سے بات کرو اور ممبئی جانے کے لیے آمادہ کرو۔ ممبئی کی رنگینیوں میں لے جا کر اسے غرق کر دو۔ وہاں کی چکا چوند دیکھ کر انیل جیسے نوجوانوں کو پیر کی جوتی پر رکھے گی۔''

ماں کی بات سن کر شیاما نے گول گول دیدے گھمائے اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے آہستہ سے گنگنائی۔ ''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ آج ہی بات کرکے اس کی ناک میں نکیل ڈالتی ہوں۔''

''ہوں......'' کانتا کی ''ہوں......'' کافی معنی خیز تھی۔ ایک بار پھر اس نے بیٹی کو یاد دہانی کروائی کہ جھرنا کے سامنے زبان پر قابو رکھنا۔ ایسا نہ ہو وہ سرکش ہرنی پھر بدک جائے۔

شیاما نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''فکر ہی نہیں کرو میں سب سنبھال لوں گی اور آج رات ہم تینوں ڈنر گھر میں نہیں بلکہ باہر کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کانتا وہاں سے اٹھ گئی۔ شیاما کے چہرے سے کافی حد تک تفکرات کی لکیریں سمٹ گئی تھیں۔ آنکھوں میں طمانیت اور سکون تھا۔

ہوٹل شراج میں اپنے من پسند ڈنر کے بعد تینوں ڈرنکس سپ کر رہی تھیں کہ کانتا نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے اس طرح کہا جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ ''اوہ شیاما...... میری یادداشت پر دیکھ کیسے پتھر پڑ گئے۔''

شیاما اور جھرنا نے اسے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے یک زبان ہو کر استفسار کیا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟'' کانتا نے ایک گہری سانس لی اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

''دراصل پرسوں مسز دیکشتھ کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں چند مہینوں کے لیے وہ لوگ امریکا جا رہے ہیں۔ ان کا فلیٹ خالی رہے گا۔ آپ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اگر رہائش کا مسئلہ ہے تو میرا فلیٹ حاضر ہے۔ ہوٹلوں کا کرایہ تو آج کل بہت بڑھ گیا ہے۔ محض ہم لوگوں کی وجہ سے وہ فلیٹ کی چابی اپنی بہن کے پاس چھوڑ گئی ہیں۔ واقعی ایسے دوست بھی نصیب سے ہی ملتے ہیں۔ کتنا خیال ہے اسے میرا۔''

ماں کی بات سن کر شیاما خوشی سے نہال ہو گئی۔ اپنے سرخ سرخ ہونٹوں کو سکیڑتے ہوئے شگفتہ لہجے میں بولی۔ ''مما! یہ گڈ نیوز اب سنا رہی ہیں۔ پھر بھی ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ کا اسکول تو آپ کے لیے کمبل بنا ہوا ہے۔ وہ آپ کو نہیں چھوڑتا اور آپ اسے نہیں چھوڑتیں لیکن میں اور میری بیٹی ایک طویل عرصے سے کہیں آئے گئے نہیں اس لیے میں اور جھرنا اسی ہفتے ممبئی کے لیے نکلتے ہیں۔ کچھ موج مستی کریں گے۔ گھومیں گے پھریں گے۔ دل بھر کر انجوائے کریں گے۔'' جھرنا بیگانی بنی ماں اور نانی کی مکالمہ بازی سن رہی تھی۔

شیاما منتظر تھی کہ جھرنا کچھ بولے گی لیکن جھرنا پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ سپاٹ چہرہ اور خالی خالی نظروں سے دونوں کو تک رہی تھی۔ بالآخر کانتا نے خاموشی کو توڑا اور جھرنا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شہد بھرے لہجے میں بولی۔ ''شیاما! پہلے اپنی بیٹی کی مرضی تو معلوم کرو کہ وہ جانا چاہتی ہے یا نہیں۔ پھر پروگرام ترتیب دو۔ تم تو فوراً ہی چھلانگ لگا لیتی ہو۔''

کانتا کی بات پر جھرنا نے اپنی اداس نیلگوں آنکھوں کی گھنیری پلکیں اٹھائیں۔ باری باری دونوں کو دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گی بلکہ چھٹیوں کے بعد اسکول جوائن کروں گی۔ اپنی محنت اور ریاضت سے اسکول کا نام روشن کروں گی۔'' شیاما کو پھر پتنگے لگ گئے لیکن منہ کھولنے سے پہلے ماں کی نصیحت یاد آ گئی، دل مسوس کر بیٹھ گئی اور اس طرح یہ موضوع ختم ہو گیا۔

جھرنا یہ سمجھی رات گئی بات گئی لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی کیونکہ وقفے وقفے سے کبھی کانتا کبھی شیاما اسے ممبئی چلنے کے لیے اصرار کرتی رہتیں۔ بالآخر دونوں اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔ دونوں نے مل کر جب مکمل طور پر اسے شیشے میں اتار لیا تو شیاما نے زور و شور سے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ دونوں ماں بیٹی اسی ہفتے ممبئی کے لیے عازم سفر ہوئیں۔ ان دونوں کے جاتے ہی کانتا نے ایک سکھ بھری سانس لی۔

☆☆☆

ممبئی شہر شیاما کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ اور کانتا یہاں کے چپے چپے سے واقف تھیں۔ شفٹ ہونے سے پہلے ان کا قیام اسی شہر میں تھا لیکن اب عرصہ دراز سے ان کی مستقل رہائش بنگلور میں تھی اور وہاں کانتا کا میوزک اسکول بھی بہت اچھا چل نکلا تھا۔ اس لیے اسی شہر کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ اگر جھرنا کی لو اسٹوری سامنے نہ آتی تو ادھر آنے کا شیاما سوچتی بھی نہیں کیونکہ اس شہر سے چند ایک خوشگوار یادیں وابستہ تھیں تو کچھ تلخ حقائق بھی ایسے تھے جو آج تک اس کے دل پر نقش تھے۔ جھرنا وقتاً فوقتاً کانتا اور شیاما کے ساتھ آتی تو رہی تھی لیکن ہر بار قیام انتہائی مختصر رہا۔ اس بار شیاما اسے اس وعدے پر لائی تھی کہ وہ اپنی دیرینہ سہیلیوں، ہم جولیوں اور دوستوں سے اس کی ملاقات کروائے گی۔ جھرنا اس وقت تو ماں کے جھانسے میں آ گئی لیکن ممبئی شہر میں قدم رکھتے

ہی اس نے بھانپ لیا کہ ماں کے ارادے کچھ اور ہیں۔ چند دن تو لگژری فلیٹ میں سکون اور اطمینان سے گزرے، اس کے بعد شیاما نے اسے اپنے حلقۂ احباب سے متعارف کروانا شروع کیا۔ کئی انجان پہلوؤں سے اسے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ اپنے ایک واقف کار کے ذریعے فلم نگری پر کمند ڈالنے کی کوشش بھی کی لیکن جھرنا ماں کے سامنے چٹان بن گئی۔ فون پر نانی سے بھی ببانگ دہل کہہ دیا کہ میں فلموں میں اپنا فن اپنی کلا نہیں بیچوں گی۔ اتنی ریاضت اور محنت کے بعد جو فنون میں نے حاصل کیے ہیں، اسے محض پیسے کی خاطر فلم انڈسٹری کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گی۔

پہلے ہی مرحلے پر دونوں ماں بیٹی کو شکست ہوئی۔ برہمی اور مایوسی کے عالم میں شیاما نے پھر ماں سے رابطہ کیا۔ کانتا نے شیاما کو پھر یہی مشورہ دیا کہ روٹی کو ٹھنڈا کرکے کھاؤ۔ صبر اور دھیرج سے کام لو اور اسے امیرزادیوں والے رنگ ڈھنگ سکھا کر کسی موٹی مرغی پر ہاتھ ڈالو اور اس کے ہاتھ پیلے کردو۔ ورنہ ایسا نہ ہو لڑکی مچھلی کی طرح پھسل جائے۔ کانتا کی زبان سے نکلی ہوئی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے فوراً اسٹوڈیوز کے چکر لگانا بند کرکے ہائی سوسائٹی میں جگہ بنانا شروع کی۔ جھرنا خود بھی بنتی سنورتی اور جھرنا کو بھی اپنے ساتھ اس سج دھج سے لے جاتی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ اس وقت بھی دونوں ماں بیٹی شہر کے مشہور نائٹ کلب میں موجود تھیں۔ ماحول حد درجہ خوابناک اور رومانٹک تھا۔ حسین اور بے باک لڑکیاں اپنے ہوش ربا حسن سے مہمانوں کو محظوظ کررہی تھیں لیکن جیسے ہی جھرنا ہال میں داخل ہوئی تقریباً سب ہی لڑکیوں کے چہرے پھیکے پڑگئے۔ جھرنا اس وقت گہری قرمزی رنگ کی اطلسی میکسی میں ملبوس تھی۔ میکسی کی آستینیں جالی کی تھیں۔ ہال میں قدم رکھتے ہی وہ سب کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ اس کا حسنِ کمال آنکھوں کے راستے دلوں میں اتر رہا تھا۔ بیٹی کے ہوشربا حسن کو دیکھ کر شیاما بھی مسرور اور شاداں تھی۔ ہال میں موجود لوگوں کی آنکھوں کی زبان بھلے ہی جھرنا نہیں پڑھ سکی ہو لیکن شیاما نے ایک جھٹکے میں سمجھ لیا کہ اس کے پاس ایسا نایاب ہیرا ہے جسے سب للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ احساسِ تفاخر سے اس کی گردن اکڑ گئی۔

دفعتاً دونوں ماں بیٹی کی نظریں ایک شخص پر منجمد ہوگئیں۔ اس کی شخصیت صنفِ نازک کے لیے انتہائی پرکشش تھی اس لیے کئی لڑکیاں اس کے آس پاس تھرک رہی تھیں۔ شیاما اور جھرنا کی نگاہوں کا مفہوم وہ بھی سمجھ گیا تھا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم ان دونوں کے قریب آکر تھم گئے۔ جھرنا نے قریب سے دیکھا تو اس کا لانبا قد، تیکھے نین نقش، سرخ وسفید رنگت اور کسرتی جسم اسے ایسا بھایا کہ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ”تمام کرسیاں بھر چکی ہیں۔ اتفاقاً ہماری میز پر ایک ہی کرسی خالی ہے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو......“ لیکن اس کی آفر کو بیچ میں ہی بریک لگ گیا۔ اس شخص نے تعظیماً جھک کر شیاما سے ہیلو کی اور پھر جھرنا سے مخاطب ہوکر بولا۔

”میں یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا مس......“

جھرنا نے فوراً اپنا نام بتایا۔ ”جی مجھے جھرنا کہتے ہیں۔“

نوجوان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ جھرنا کے کانوں میں آہستگی سے بولا۔ ”آپ کا نام بھی آپ ہی کی طرح حسین ہے۔ شفاف، ٹھنڈا، بہتا جھرنا بھی آپ ہی کی طرح گنگناتا ہے۔“

جھرنا اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی مترنم ہنسی سن کر آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے کئی لوگ چونک پڑے۔ سب رشک بھری نظروں سے اس شخص کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے جھرنا کی طرف اپنا مضبوط ہاتھ بڑھایا اور جھرنا نے بھی فوراً اپنا نرم ونازک ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔ نہ اس نے ماں کی طرف دیکھا اور نہ اس کی خفگی کی پروا کی۔ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خراماں خراماں ڈانس فلور کی طرف بڑھ گئے۔ شیاما کا دل زور سے دھڑکا، کیونکہ اس نوجوان میں اسے انیل کی شبیہ نظر آرہی تھی۔ تاریخ اپنے آپ کو پھر نہ دہرائے۔ یہ سوچ کر ہی اس کے پسینے چھوٹ گئے لیکن اپنے اطراف بیٹھے ہوئے لوگوں سے اس نے اس نوجوان کی انکوائری کی تو بیٹی کے انتخاب پر اش اش کرنے لگی۔ وہ لڑکا کروڑ پتی صنعت کار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ شہر کی بے شمار امیرزادیاں اس سے شادی کی خواہش مند تھیں۔ لڑکے کا نام دیپک تھا اور ہال میں موجود اس وقت ساری لڑکیاں رقابت کی آگ میں جل رہی تھیں۔ اَن گنت نگاہیں ان پر لگی ہوئی تھیں لیکن وہ دونوں سب سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں مگن، ہاتھوں میں ہاتھ دیے اس وقت تک ناچتے رہے جب تک آرکسٹرا نے دھن نہیں بدلی۔ ایک چھناکے کے ساتھ آرکسٹرا تھما اور فلور پر نئے جوڑے آگئے۔ دیپک اور جھرنا بھی آکر اپنی میز پر بیٹھ گئے۔

شیاما بھی اپنے ایج گروپ کے لوگوں میں بیٹھ کر پینے

پلانے میں مصروف تھی۔ بیٹی کو دیپک کے ساتھ آتا دیکھ کر وہ لہراتی ہوئی آئی اور جھرنا کا بازو تھام کر بولی۔ ”بس سوئٹ ہارٹ! آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے، کل ہم پھر آئیں گے۔“

دیپک فوراً بولا۔ ”اوکے مام! میں منتظر رہوں گا۔“

شیاما نے ترنت استفسار کیا۔ ”کس کے منتظر رہوگے، میرے۔“ دیپک اور جھرنا ہنسنے لگے۔

جھرنا نے دیپک کے کانوں میں سرگوشی کی۔ ”مائی مما از اولڈ لیڈی بٹ شی از ویری ناٹی۔“

دیپک نے غائر نظروں سے شیاما کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”عمارت پرانی ضرور ہے لیکن بری اب بھی نہیں۔ جوانی میں یقیناً قیامت رہی ہوگی۔“ اس نے شیاما سے الوداعی مصافحہ کیا اور ”بائے“ کہتا ہوا چلا گیا۔

جھرنا نے شیاما کے بہکتے وجود کو سنبھالا اور اسے سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور پھر گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ دونوں ماں بیٹی کے چہروں سے کامیابی اور فتح یابی عیاں تھی۔

اس ملاقات کے بعد دیپک اور جھرنا کی اکثر وبیشتر شامیں ساتھ گزرنے لگیں...... شیاما نے کانتا کو فون پر بتایا کہ ماں تمہاری دعاؤں سے جھرنا نے بہت زبردست شکار پھانسا ہے۔ لڑکا کروڑوں میں کھیل رہا ہے۔ صرف ملک میں ہی نہیں بلکہ ملک سے باہر بھی اس کے بے شمار بزنس بکھرے پڑے ہیں۔ کانتا کا سیروں خون بڑھ گیا۔ اس نے دونوں کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے بیٹی کو خاص ہدایت کی کہ ہوشیاری سے کام کرتے ہوئے چوکنا اور چوکس رہنا، کہیں دیپک ہاتھ نہ دکھا جائے۔ شیاما نے اسے کلی طور پر اطمینان دلاتے ہوئے فون بند کردیا۔ وہ بہت زیادہ مطمئن اور خوش تھی۔ وہ جھرنا کو بذاتِ خود مواقع فراہم کرتی تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دیپک کی سنگت میں رہ کر اس کی قربت حاصل کرے اور اسے شادی کے لیے شیشے میں اتار سکے۔ جھرنا روزانہ ماں کو تسلی تشفی دے کر مطمئن کرتی اور ہمت وحوصلہ بھی دیتی۔ ”مما! بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ دیپک میرے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔“

یہ سن کر شیاما کی خوشیوں میں اضافہ ہوجاتا اور آنکھوں کے سامنے دولت کی دیوی رقص کرنے لگتی لیکن اس دیوی کے گھنگھرو ایک روز ٹوٹ کر ایسے بکھرے کہ شیاما کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ ہوا یوں کہ جھرنا نک سک درست کرنے کے بعد اپنے آپ کو خوشبوؤں میں بسا کر

اقوالِ زریں

☆ بہادر کا امتحان میدانِ جنگ میں، دوست کا امتحان مصیبت کے وقت اور عقلمند کا امتحان غیظ وغضب کی حالت میں ہوتا ہے۔

☆ بچے وہ پھول ہیں جو عدم توجہ سے مرجھا جاتے ہیں۔

☆ منافق کی تین نشانیاں ہیں۔

(1) جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

(2) جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔

(3) جب امانت دی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

☆ لوگ بیماری کے خوف سے غذا چھوڑ دیتے ہیں لیکن صد افسوس کہ عذاب الٰہی کے خوف سے گناہ نہیں چھوڑتے۔

☆ آمدنی کے مطابق روپیہ خرچ کرو تو کبھی محتاج نہ ہوگے۔

☆ آج کو کل پر مت ٹالو۔ کل کبھی نہیں آتی۔

☆ چار چیزوں کو تھوڑا نہ سمجھو۔ فرض، قرض، دشمن اور آگ۔

☆ اچھا دوست سو بار بھی روٹھے تو منالو کیونکہ موتیوں کی مالا ٹوٹنے پر بھی دوبارہ بنائی جاسکتی ہے۔

☆ جو شخص اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہے وہ اس شخص کی نسبت زیادہ کامیاب رہتا ہے، جو دوسروں کی امداد کے بھروسے پر اپنا کام کرنے سے پہلو تہی کرتا ہے۔

☆ بدگمانی ایسا زہر ہے جو ہرے بھرے درخت کو راکھ کردیتا ہے۔

☆ کچلے ہوئے آدمی کو غصہ مت دلاؤ۔ کانچ کا ٹکڑا تیز دھار خنجر کا کام کرسکتا ہے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

دیپک سے ملنے کے لیے نکلی تو شیاما نے پیچھے سے آواز دی۔ ''بے بی! آج اس دیپک سے فائنل بات کرنا۔ وہ روزانہ تمہیں لارے لپّے دے رہا ہے۔ اس سے کہہ دینا کہ اگر اسی مہینے شادی کا مہورت نہیں نکلوایا تو میں کسی اور کے ساتھ لگن منڈپ میں نظر آؤں گی اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔''

جھرنا چلی گئی اور اس کی واپسی کا انتظار شیاما کے لیے کٹھن ہو گیا مگر جب وہ واپس آئی اور اس پر شیاما کی نظر پڑی تو وہ اپنی نشست سے کھڑی ہو گئی لیکن اس کا چہرہ دیکھتے ہی اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ جھرنا کا چہرہ انتہائی پژمردہ اور مرجھایا ہوا تھا۔ اڑی اڑی سی رنگت کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔

شیاما نے لپک کر اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے اس کی پیشانی چومی اور ممتا بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''میری جان کیا ہوا ہے تجھے؟ یہ صورت کیوں اتری ہوئی ہے؟''

جھرنا نے ماں کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔ ''مما! آج ہماری ساری محنت پر پانی پھر گیا۔''

شیاما نے گھبرا کر تجسس آمیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیوں؟ کیا ہوا؟ اس نے کوئی بدتمیزی کی ہے تیرے ساتھ۔ تو مجھے کھل کر بتا۔ جلتا ہوا دیپک پھونک مار کر بجھا دوں گی۔ تیری ماں کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔''

جھرنا نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو ماں کی گرفت سے آزاد کیا اور تیوری چڑھا کر بولی۔ ''مما! آپ تو بات سنتی ہو اور نہ سمجھتی ہو۔ دیپک ایسا ویسا لڑکا نہیں ہے۔ اس نے تو آج خود ہی شادی کی پیشکش کی لیکن......''

''لیکن کیا......'' شیاما نے حسب عادت اضطراری لہجے میں قطع کلامی کی۔

جھرنا نے ایک گہری سانس خارج کی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ ساتھ ہی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھایا اور افسردہ لہجے میں بولی۔ ''دراصل دیپک سیٹھ گردھاری لال کا لے پالک بیٹا ہے۔ اس کی ساری دولت کا وارث اس کا اپنا بیٹا ونود ہے۔ جہاں ونود کروڑوں کا مالک ہے وہیں دیپک کو سیٹھ کے مرنے کے بعد چند ہزار روپے ماہوار ملیں گے۔ یعنی یہ سمجھ لو کہ وہ سر سے پیر تک قلاش ہے۔ اس لیے جیسے ہی اس نے شادی کی آفر کی۔ میں نے اس سے کہا کہ ہنی مون کے لیے ہم کسی ایشیائی ملک نہیں بلکہ یورپین کنٹریز جائیں گے اور دل بھر کر انجوائے کریں گے تو اسے...... شاک لگا اور اس نے فوراً حقیقت حال میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے بھی ترنت پینترا بدلا اور کہہ دیا کہ میں کیا میری مرضی کیا، میری شادی بیاہ کا فیصلہ تو میری ماں اور نانی کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کہہ کر میں نے اسے ٹال دیا۔''

شیاما جھرنا کی باتیں سن کر اس پر سے واری صدقے ہو رہی تھی۔ آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ کانتا کی اور اس کی تربیت رائیگاں نہیں گئی۔ بیٹی کی پشت تھپتھپاتے ہوئے وہ ستائشی لہجے میں بولی۔ ''ماں کی ٹریننگ اب اپنا اثر دکھا رہی ہے میری راج دلاری دیپک پر تو تو نے مٹی ڈال کر اچھا کیا بلکہ بہت اچھا کیا لیکن ونود جیسی موٹی اسامی قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔ اس لیے اس کے اردگرد ایسا مضبوط اور منظم جال بچھا کہ وہ ساری زندگی اس میں سے نہ نکل سکے۔''

ماں کی زبان سے یہ بات سن کر جھرنا بھڑک اٹھی اور غضب ناک لہجے میں بولی۔ ''مما! آپ میری ماں ہیں یا دشمن۔ ارے وہ بونگا سا عقل سے پیدل شخص میرے لیے رہ گیا ہے کیا۔ چاہے آپ اور نانی مجھے سولی چڑھا دیں لیکن میں اس سے کبھی بھی شادی نہیں کروں گی۔'' یہ کہہ کر وہ تنتناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ شیاما نے جب دیکھا کہ بیٹی ہتھے سے اکھڑ گئی ہے تو وہ فوراً چاپلوسی پر اتر آئی کیونکہ نئی شکارگاہ میں نئے انداز سے انٹری کرنی ہوگی۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ کل سو کام پس پشت ڈال کر بے بی کو شاپنگ کروانی ہے اور دوبارہ ہاتھ پیر مار کر از سر نو کام کا آغاز کرنا ہے۔

☆☆☆

نیو ایئر نائٹ تھی۔ شیاما اور جھرنا پورے جوش و جذبے کے ساتھ یہ حسین رات سیون اسکائے کلب میں سیلیبریٹ کر رہی تھیں۔ شہر کا امیر کبیر طبقہ اور با اثر بارسوخ لوگ ہی اس کلب کا رخ کرتے تھے۔ شیاما بھی اپنی ایک دولت مند دوست کے توسط سے ہی یہاں تک پہنچی تھی۔ جہاں تمام بے ہودگی اور خرافات موجود تھیں۔ مختلف کھیل، ڈانس، میوزک اور بے حیائی عام تھی، دونوں ماں بیٹی چونکہ پوکر (تاش کا کھیل) کی شوقین تھیں اس لیے پورے انہماک اور دلچسپی سے کھیل اور کھلاڑیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ہر ایک اپنے آپ کو ماہر کھلاڑی ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ جھرنا کی نگاہیں ایک گیمبلر پر ٹکی ہوئی تھیں جس کا جنون فزوں تر ہوتا جا رہا تھا۔

اس نوجوان کا نام وشال تھا اور وہ پوری چابکدستی اور مہارت سے کھیل رہا تھا۔ بیٹی کی بہکی بہکی نگاہیں دیکھ کر شیاما کو اپنی منزل قریب نظر آئی۔

وشال کے پاس اچھی تعلیم اچھی صحت تھی۔ صورت

شکل بھلے ہی واجبی سی تھی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وشال ونود سے زیادہ دولت مند تھا۔ یہ بھی سنا تھا کہ ....

.... نہ صرف وہ اپنے باپ کی جائیداد کا تنہا وارث تھا بلکہ وشال کی ماں بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی سنتان تھی۔ اس لیے نانا نانی کی طرف سے ملنے والے دھن دولت پر بھی صرف اور صرف اسی کا حق تھا۔ شیاما کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ یہ پنچھی اڑنے نہ پائے اس لیے اس نے بیٹی کو راہ راست پر لا کر وشال سے ملنے جلنے کی کھلی چھٹی دے دی۔ جھرنا نے بذات خود دوستی میں پہل کی۔ وہ ایک قدم بڑھی اور وشال سو قدم چل کر اس کے پاس اس طرح آیا کہ واپسی کی ساری راہیں بھول گیا۔ حالات کا مکمل طور پر جائزہ لینے کے بعد شیاما نے فوراً ماں سے رابطہ کیا اور تمام حالات اس کے گوش گزار کر دیے۔ کانتا نے فوراً اپنا فیصلہ اسے سنا دیا کہ یہی وقت ہے کہ دونوں کی فوراً شادی کر دی جائے۔ ورنہ آج کل کے امیرزادوں پر پریم کا بھوت جتنی تیزی سے چڑھتا ہے، اتنی ہی تیزی سے اتر بھی جاتا ہے۔ اس لیے دانش مندی اسی میں ہے کہ اس قیمتی وقت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ماں کی بات فوراً شیاما کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے جھرنا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا جبکہ جھرنا عجلت میں کوئی غلط قدم اٹھانا نہ چاہتی تھی۔ کئی دن تک وہ ماں کو ٹالتی اسے سو فیصد یقین تھا کہ اگر شادی کا پروپوزل وہ وشال کے سامنے رکھتی ہے تو وہ انکار تو نہیں کرے گا لیکن پہل کرنے میں وہ ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں سے گر جائے گی۔ وہ منتظر تھی کہ وشال اپنی زبان کھولے اور اس کا ہاتھ مانگے اور پھر وہ شبھ دن آ پہنچا جب وشال نے اس سے کہا کہ اس کے ممی ڈیڈی اس سے اور اس کی ماں سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس روز جھرنا کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ جب اس نے یہ گڈ نیوز شیاما کو سنائی تو شیاما کی بھی باچھیں کھل اٹھیں۔ اتنی جلدی مراد بر آئے گی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

سیٹھ دیال داس کی کوٹھی اپنے منہ سے مکینوں کی امارت کا حال بتا رہی تھی۔ جدید انداز کی کوٹھی کا طرز تعمیر اور سیکیورٹی انتظام دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں ماں بیٹی وشال کے ہمراہ ڈریسنگ روم میں پہنچیں تو وہاں کی شان و شوکت دیکھ کر دونوں بت بن گئیں۔ وشال نے انہیں نرم گداز صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہاں سے نکل گیا۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وشال کے عقب میں چلتے ہوئے سیٹھ اور سیٹھانی آگے پیچھے داخل ہوئے۔ سیٹھ دیال داس کو دیکھ کر شیاما کو برقی جھٹکا لگا۔ دیال داس کی پیشانی بھی پسینے سے تر ہو گئی۔ شیاما کو دیکھ کر آنکھوں میں شناسائی کی لہریں موجیں مار رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں وشال کی ماں ارملا آگے بڑھی اور شیاما سے بغلگیر ہوئی اور اسے ویلکم کیا۔ اس کے بعد جھرنا کو اپنی بانہوں میں بھر کر ستائشی لہجے میں بولیں۔ ''وشال مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ممی آپ کی ہونے والی بہو چاند کا ٹکڑا ہے...... لیکن وہ غلط کہہ رہا تھا۔''

اس کی بات پر جھرنا اور شیاما کے چہروں کے رنگ اڑ گئے۔ دونوں استفہامیہ اور حیران کن نگاہوں سے ارملا کو دیکھنے لگیں۔ وشال بھی سٹپٹا گیا۔

ارملا نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں...... وشال نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ارے یہ سندری چاند کا ٹکڑا نہیں بلکہ یہ تو پورن ماشی کا پورا چندرما ہے۔''

اس کی اس بات پر کمرے میں موجود سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ دیال داس نے بھی مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے اپنا دست شفقت جھرنا کے سر پر رکھا اور پھر سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

رسمی گفتگو کے بعد کھانے پینے کا دور چلا اور پھر سیٹھانی نے شیاما کو مخاطب کر کے کہا۔ ''بہن جی! اب جلدی سے شبھ گھڑی دیکھ کر ہم شادی کا مہورت نکلوا لیتے ہیں۔ جتنی جلدی یہ کام انجام پا جائے اچھا ہے۔''

''بالکل بالکل...... میں آپ سے متفق ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گہری کاٹ دار نظروں سے دیال داس کو دیکھا۔ اس کے لہجے کی تلخی کو اس نے فوراً محسوس کیا اور گڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

ارملا نے استعجاب انگیز نظروں سے شوہر کو دیکھا اور مستفسر ہوئی۔ ''ارے، یہ اچانک کیوں کھڑے ہو گئے؟ آج تو آپ کہہ رہے تھے کہ میں بالکل فری ہوں، پھر یہ کیا سودا سمایا؟''

دیال داس نے خشونت بھری آواز میں کہا۔ ''ایک ضروری اور اہم کام یاد آ گیا، شام تک آ جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے تیزی سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی سب خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔

واپسی میں جھرنا پر تجسس نظروں سے ماں کو بغور دیکھ

رہی تھی کیونکہ شیاما کی قینچی کی طرح چلنے والی زبان کو یکا یک بریک لگ گیا تھا اور وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ نہ وہ وشال کی کوٹھی کی شان میں کوئی قصیدہ پڑھ رہی تھی اور نہ اس کے لائف اسٹائل پر کوئی تبصرہ کر رہی تھی۔ مکمل طور پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس نے خود بھی مناسب نہیں سمجھا لیکن ٹوہ میں لگی رہی کہ آخر اس تغیر کی وجہ کیا ہے؟ رات کے کھانے پر شیاما نے دو لقمے لے کر فوراً کھانے پر سے ہاتھ کھینچ لیا اور خرابیٔ طبیعت کا کہہ کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

جھرنا نے بھی ماں کو دیکھ کر اپنے سامنے کی پلیٹ سرکا دی اور صرف ایک گلاس دودھ پر اکتفا کیا۔ ماں کے بیڈروم میں جھانک کر دیکھا تو وہ اپنے بیڈ پر نیم دراز لیٹی نظر آئی۔ اس نے فوراً کچھ سکون آور ٹیبلٹس لیں اور شیاما کے سر پر پہنچ گئی۔ شیاما انکار کرتی رہی لیکن اس نے جگ میں سے پانی انڈیل کا گلاس بھرا اور ماں کو اپنے ہاتھوں سے دوا کھلائی اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''میں دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔ آپ کے چہرے پر نقاہت برس رہی ہے۔''

شیاما مسلسل انکار کرتی رہی لیکن جھرنا نہیں مانی۔ وہ چھلاوے کی طرح بیڈروم سے نکلی اور جب دودھ سے بھرا گلاس لے کر داخل ہوئی تو شیاما باتھ روم میں تھی۔ پانی گرنے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس نے گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے زوردار آواز لگائی۔ ''مما! دودھ ضرور پی لینا۔ میں بھی سونے کے لیے جا رہی ہوں۔ گڈ نائٹ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی لیکن دفعتاً ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں تفکر عود کر آیا تھا۔ پیشانی پر سلوٹیں تھیں۔ پُرخیال نگاہوں سے باتھ روم کے دروازے کی جانب دیکھا اور پھر گربہ قدمی سے چلتے ہوئے اسٹور روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور آہستہ سے دروازہ بھیڑ دیا۔

وشال کے گھر سے واپسی کے بعد شیاما کا رویّہ اس کے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ اس کی چھٹی حس بار بار اسے خبردار کر رہی تھی کہ ضرور اس کی ماں کسی راز پر پردہ ڈال رہی ہے۔ وشال کے گھر سے لوٹنے کے بعد وہ دو تین بار اپنی دیرینہ دوست سلوچنا کا نمبر ملا چکی تھی لیکن نمبر ہر بار بند جا رہا تھا۔ جھرنا کو سو فیصد یقین تھا کہ اس کی ماں آج رات سلوچنا سے ضرور کوئی اہم گفتگو کرے گی۔ اس لیے وہ چوروں کی طرح اسٹور روم میں گھسی ہوئی تھی۔ ماں کی آہٹ پر چوکنا ہو کر سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ شیاما سر پر تولیا لپیٹے ہوئے باتھ روم سے برآمد ہوئی۔ ہیئر ڈرائیر سے اپنے بال خشک کیے۔ دودھ کے دو گھونٹ لینے کے بعد گلاس ایک جانب رکھا اور پھر موبائل سے کھیلنے لگی۔ پُرتفکر انداز میں پھر وہ کسی کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ اس بار کال مل گئی تھی کیونکہ شیاما کے چہرے پر قدرے اطمینان کے آثار تھے۔ اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ اب وہ سلوچنا سے محوِ گفتگو تھی۔ جھرنا ہمہ تن گوش بنی ہوئی تھی۔ شیاما نے پہلے تو اس سے رسمی گفتگو کی، اس کے بعد فوراً اپنے مطلب پر آ گئی۔ اب وہ سلوچنا سے دیال داس کا سیل فون نمبر طلب کر رہی تھی۔ سلوچنا نے بغیر کسی حیل و حجت کے اسے نمبر ایس ایم ایس کر دیا۔ نمبر حاصل کرنے کے بعد جھرنا نے ماں کی آنکھوں میں عجیب سی چمک محسوس کی۔ سلوچنا سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد اس نے بلا کسی تاخیر کے دیال داس کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری جانب کال ریسیو کی گئی۔

جھرنا نے سرعت کے ساتھ اپنے کان دروازے کی جھری سے لگا دیے۔ ادھر سے دیال داس کیا کہہ رہا تھا، وہ تو جھرنا نہیں سن سکتی تھی لیکن ماں کی زبان سے نکلا ہوا جملہ سن کر وہ اچھل پڑی۔ وہ انکشاف اس کے لیے تھا ہی انتہائی سنسنی خیز اور تحیر انگیز۔

شیاما دیال داس سے کہہ رہی تھی۔ ''دیال داس! اندر سبھا کی جس اپسرا پر تمہارا بیٹا فدا ہوا ہے، اسے پہچانا تم نے۔ ہے نا ٹریجک، حقیقت میں دونوں بھائی بہن ہیں مگر اس راز کی دونوں کو ہی خبر نہیں لیکن ہم دونوں تو باخبر ہیں۔'' اس کے بعد شیاما خاموش ہو گئی۔ اب وہ سامع تھی۔ مختصر سے وقفے کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ ٹھیٹ کاروباری تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''سیٹھ! ماضی میں تم نے مجھے بے وقوف بنا لیا لیکن اب اس کی توقع مت رکھنا۔ جب اس ننھی سی جان کو لے کر میں تمہارے پاس آئی تھی۔ اس وقت تم نے چند نوٹوں کے عوض مجھ سے سودا کیا تھا کہ میں اسے کہیں دور لے کر چلی جاؤں۔ میں نے یہی کیا لیکن وائے نصیب برسوں بعد تم اور تمہارا خاندان ٹکرایا بھی تو اس طرح کہ تمہاری بولتی ہی بند ہو گئی۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ تم سانس بھی لینا بھول گئے ہو۔ تمہاری بیوی بھی تمہارے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھنا سیکھو دیال داس...... ورنہ اگر تمہاری بیوی اور بیٹا مشکوک ہو گئے تو تمہاری خیر نہیں۔ بہرحال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جھرنا کو سمجھا

بجھا کر دنیا کے کسی بھی کونے میں لے کر چلی جاؤں گی جہاں تمہاری اور تمہارے پریوار کی پرچھائیاں بھی نظر نہیں آئیں گی لیکن اس بار پھر تمہیں سودا کرنا ہوگا لیکن اس بار یہ سودا ہوگا میری مرضی سے۔ جھرنا کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ ہے تو آخر تمہاری بیٹی اور تمہاری اس تمام جائداد میں اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارے بیٹے وشال کا۔ اس لیے اس کا بٹوارا میری مرضی سے ہوگا۔'' پھر مختصر سے وقفے کے لیے شیاما کا منہ بند ہو گیا۔

اب وہ پورے انہماک سے دیال داس کی بات سن رہی تھی۔ مکمل بات سننے کے بعد اس نے مسکرا کر شگفتہ لہجے میں کہا۔ ''چلو منظور ہے تمہاری یہ شرط بھی۔ سب کچھ جھرنا کے نام پر ہوگا۔ وہ پوری طرح اس روپے پیسے کی حقدار ہوگی۔ مجھے تمہارا پائی پیسا نہیں چاہیے۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ وہ بھی تو عیش و عشرت اور موج مستی کی زندگی گزارے۔ آخر کب تک روکھا سوکھا کھا کر گزارہ کرے گی۔''

دیال داس کچھ بول رہا تھا، اس لیے شیاما نے پھر اپنے ہونٹوں کو تالا لگا لیا۔ طویل توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''او کے ٹھیک ہے۔ تمہاری بتائی ہوئی جگہ کل میں پہنچ جاؤں گی۔ سارے معاملات وہیں نمٹ جائیں گے۔''

یہ کہہ کر اس نے موبائل آف کیا۔ ایک بھرپور انگڑائی لی اور اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی اور چہرہ گلاب ہو رہا تھا۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا دودھ کا گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ پی گئی۔ منہ صاف کرنے کے لیے پھر باتھ روم میں جا گھسی۔

جھرنا نے موقع غنیمت جانا اور چپکے سے کھسک گئی۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی وہ اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی اور دھڑام سے اپنے بیڈ پر گر گئی۔ تھوڑی دیر ساکت لیٹی چھت کو گھورتی رہی جو تلخ حقیقت اس نے ماں کی زبان سے سنی تھی، اسے اس کی عقل قبول نہیں کر رہی تھی۔ وہ اس وقت شدید جذباتی کشمکش کا شکار تھی۔ معاً اس کا موبائل گنگنایا اور اس نے لپک کر اسے اٹھایا اور کان سے لگا لیا۔ ہائے ہیلو کے بعد اس نے ایک طمانیت بھری سانس لی اور بولی۔ ''تھینک گاڈ! بالکل مناسب وقت پر فون کیا ہے۔ اس وقت ایک سچے اور کھرے دوست کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔''

جواب میں مردانہ بھاری ہنسی کی گونج سنائی دی اور بولنے والے نے استفسار کیا۔ ''کیوں اب کیا ہوا؟ کیا تمہاری ماں اور نانی نے پھر کوئی قلابازی کھائی ہے یا کوئی نئی نوٹنکی ترتیب دے رہی ہیں؟''

جھرنا نے منہ بسورتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔ ''آج تو جو میری سماعتوں سے ٹکرایا ہے، اسے سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی گہرے سمندر میں گر گئی ہوں۔ پوری قوت سے ہاتھ پیر مار رہی ہوں لیکن تیراکی کے فن سے ناواقف ہوں اور ڈوبتی جا رہی ہوں اور ......اور......'' اچانک اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ بات بھی مکمل نہیں کر پائی۔

''نہ نہ روتے نہیں۔ رونا مسئلے کا حل نہیں۔ ذرا وضاحت تو کرو سارے معاملے کی پھر سوچیں گے کہ ہمیں کیا اسٹیپ لینا چاہیے۔''

دوسری جانب سے دی گئی تسلی تشفی بھی کام نہ آئی بلکہ آنکھیں مزید ساون بھادوں بن گئیں۔ روتے سسکتے ہوئے اس نے سارا واقعہ من و عن اپنے دوست کے گوش گزار کر دیا۔

جواباً ایک طویل ''اوہ'' اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ لہجہ بھی متحیرانہ اور تعجب خیز تھا۔ اپنے لہجے کو نارمل بناتے ہوئے اس نے مزید بات آگے بڑھائی۔ ''ہمت، حوصلے اور عقل سے کام لو۔ اپنی ماں سے کوئی بہانہ بنا کر کسی طرح چند دن کے لیے میرے پاس آؤ۔ بیٹھ کر طے کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

''او کے...... میں رابطہ منقطع کر رہی ہوں، مجھے دروازے پر ماں کے قدموں کی آہٹ محسوس ہو رہی ہے۔''

دوسری صبح دونوں ماں بیٹی کی ملاقات ناشتے کی میز پر ہوئی۔ شیاما کے ہشاش بشاش چہرے پر خوش گوار مسکراہٹ تھی۔ ایک دن پہلے کی بیزار کن کیفیت کا نام و نشان نہیں تھا جبکہ جھرنا کے چہرے پر بدمزگی اور ناپسندیدگی کا تاثر تھا۔

شیاما نے چہکتے ہوئے بیٹی کو مخاطب کیا اور بولی۔ ''آج میرے ساتھ تمہیں ایک اہم کام کے سلسلے میں ایک جگہ چلنا ہے۔''

جھرنا نے آملیٹ اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے سر جھٹکا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کونسا اہم کام ہے اور کہاں چلنا ہے؟''

شیاما نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے فوراً موضوع بدل دیا۔ جھرنا نے بے دلی سے ناشتا ختم کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات میں اپنے فرینڈ سے بات کرنے کے

بعد اس کا ڈپریشن کافی حد تک کم تو ہوگیا تھا لیکن دل بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ بدقت تمام اپنے آپ کو سنبھال پا رہی تھی۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے پھر موبائل پر اپنے ہمدرد ساتھی سے بات کی اور شیاما کا پروگرام بتا کر اس سے رائے طلب کی کہ اسے ماں کے ساتھ جانا چاہیے یا نہیں۔ دوسری جانب سے جواب اثبات میں تھا بلکہ کچھ خصوصی ہدایات بھی تھیں جو اس نے فوراً ذہن نشین کرلیں اور تیار ہو کر اپنے آپ کو تنقیدی نظروں سے دیکھا اور شیاما کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شیاما بھی نک سک سے لیس اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ بیٹھی ہوئی ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا رہی تھی۔ ڈرائیور نے مثبت انداز میں سر کو جنبش دی اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ اب گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

شہر کا یہ علاقہ جھرنا کے لیے اَن دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے گزرتے ہوئے مناظر میں گم تھی۔ اچانک اس کے دل میں شک کا سانپ سرسرایا۔ کہیں سیٹھ دیال داس اس کے اور اس کی ماں کے ساتھ کوئی چال تو نہیں چل رہا ہے کیونکہ حقیقت اس پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ اس کی ماں دیال داس کی غیر قانونی بیوی ہے اور وہ بذاتِ خود سیٹھ کی ناجائز اولاد۔ ان دونوں ماں بیٹی کا وجود سیٹھ کے لیے یقیناً خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لیے اس کا یہ خوف قرین قیاس تھا۔ اضطرابی انداز میں اس نے پہلو بدلا اور جھرجھری سی لی۔

شیاما نے سوچ بھری نظروں سے بیٹی کی جانب دیکھا۔ اسی اثنا میں گاڑی ایک عمارت کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ گیٹ پر یا عمارت کے داخلی دروازے پر انہیں کوئی اپنا منتظر نہیں ملا۔ دونوں ماں بیٹی گردونواح کا جائزہ لیتی ہوئی آگے بڑھیں۔ اس دور افتادہ علاقے میں آکر شیاما کے حواسوں پر بھی خوف اور ڈر مسلط ہونے لگا تھا لیکن ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے دروازے پر لگی کال بیل دبائی۔ فوراً دروازہ کھل گیا۔ گول چہرہ اور پستہ قد شخص جو کہ حلیے سے ہی ملازم نظر آرہا تھا، اس نے ان دونوں کو اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں ماں بیٹی قدرے ہچکچاتے ہوئے اس کے پیچھے ہولیں۔ عمارت باہر سے ضرور خستہ حال تھی لیکن اندر سے عمارت کے در و دیوار بالکل ٹھیک ٹھاک اور تازہ رنگ و روغن کی غمازی کر رہے تھے۔ دونوں ماں بیٹی اس ملازم کی معیت میں ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہاں دو اشخاص نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ دونوں کے چہروں پر شرافت، سنجیدگی اور متانت تھی۔ ان دونوں پر نظر پڑتے ہی شیاما پُرسکون نظر آئی اور جب دونوں نے اپنا تعارف کروایا تو وہ دل ہی دل میں دیال داس کی ذہانت و فراست کی قائل ہوگئی۔ کیونکہ ان میں سے ایک دیال داس کا وکیل تھا اور دوسرا اس کا منیجر۔ دیال داس نے زیادہ بھیڑ بھاڑ اکٹھی نہیں کی تھی۔

منیجر نے گمبھیر لہجے میں شیاما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کارروائی شروع کرنے سے پہلے اگر آپ کچھ چائے کافی لینا چاہیں تو......“

شیاما نے قطع کلامی کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ کھنکھار کر اپنا گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”ہم لوگ جس کام کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں، اگر وہ جلد انجام پا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔“

جھرنا بھی یہاں آکر کافی مطمئن ہوگئی تھی لیکن پھر بھی اپنی تر پیشانی کو ٹشو سے بار بار صاف کر رہی تھی۔ خود فراموشی کے عالم میں کبھی ماں کی طرف دیکھ رہی تھی اور کبھی وکیل اور منیجر کی صورتوں کو تکنے لگتی۔ وہ چونکی اس وقت جب وکیل نے اس سے دستخط کرنے کے لیے کہا۔ اس نے اجازت طلب نگاہوں سے ماں کی جانب دیکھا۔ شیاما نے کاغذات اپنی طرف سرکائے اور ریڈنگ کرنے لگی۔ اس کے چہرے سے اطمینان اور مسرت جھلک رہی تھی بلکہ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی کیونکہ دیال داس نے یا تو پدرانہ محبت سے مغلوب ہوکر یا پھر زمانے کے خوف سے کافی کچھ جھرنا کے نام لکھ دیا تھا۔ جھرنا کے اکاؤنٹ میں کروڑوں کی رقم کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے اشارے پر جھرنا اپنے سائن کرتی رہی اور وفورِ مسرت سے شیاما کا رُواں رُواں جھوم رہا تھا۔ ساری کارروائی مکمل ہونے کے بعد دونوں نے نہایت خوش اخلاقی سے رخصتی مصافحہ کیا اور مالکانہ حقوق کے تمام کاغذات بریف کیس میں رکھ کر باہر کی راہ لی۔ واپسی میں وہی ملازم گیٹ تک انہیں چھوڑنے آیا اور پھر فوراً ہی الٹے قدموں واپس بھی چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی شیاما نے معنی خیز انداز میں بیٹی کی طرف دیکھا اور ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ مستفسر ہوئی۔ ”مائی سوئٹ ہارٹ! تم کچھ سمجھیں؟“ اس وقت اس کے لہجے میں اپنائیت اور یگانگت کا رنگ تھا۔

قدرے توقف کے بعد جھرنا نے برجستہ کہا۔ ”ہوں...... بہت کچھ سمجھ گئی ہوں کہ میرے باپ دیال داس نے اپنی دولت کا بڑا حصہ میرے نام لکھ دیا ہے۔“ پھر ایک بے باکانہ ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ ”لیکن آپ کے نام ایک دمڑی نہیں کی، کیونکہ میں ان کی ناجائز اولاد ہوں۔“

شیاما کے چہرے پر تناؤ نمایاں ہوگیا، لیکن وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ خاموش ہوگئی کیونکہ ڈرائیور کار کا دروازہ کھول کر ان کے بیٹھنے کا منتظر تھا۔

اپنی سیٹ پر براجمان ہوتے ہی وہ سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ ”سب میری کوششوں سے ہوا ہے، ورنہ دیال داس تجھے گھاس بھی نہیں ڈالتا۔ تو بجائے میرا احسان ماننے کے بھاؤ کھا رہی ہے۔“ جھرنا ماں کی بات سن کر استہزائیہ انداز میں مسکرائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

جھرنا کو یقین تھا کہ گھر پہنچ کر شیاما دیال داس سے ضرور بات کرے گی۔ اس لیے بہانے بہانے سے ماں کے پاس تھرکتی رہی اور کچھ دیر بعد دیال داس کی کال آگئی۔ بیٹی نے جو طعنہ دیا تھا اس کا سارا غبار شیاما نے دیال داس پر نکال دیا۔ وہ تلخ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”ارے میرے لیے تو کچھ نہیں تھا تمہارے پاس...... جو کچھ دیا ہے اپنی بیٹی کو دیا ہے تاکہ میں ہمیشہ بھک منگوں کی طرح اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتی رہوں اور وہ ترسا ترسا کر میری جھولی میں ڈالتی رہے۔“ یہ کہہ کر شدید تنتنا کر اس نے کال کاٹ دی۔

جھرنا خاموشی سے وہاں سے سرک گئی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ماں کے تلوؤں سے لگی ہوئی ہے اور اب سارا عتاب اس پر نازل ہوگا۔

دوسرے دن جھرنا خوشامدی انداز میں ماں کی منتیں کرکے اسے اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں کھانا کھلانے لے گئی۔ جہاں اس نے پینترا بدلا اور بیٹی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تیرے باپ نے تجھے اتنا کچھ دیا ہے کہ ساری زندگی اسی طرح کھاتی کھلاتی رہے گی پھر بھی کمی نہیں آئے گی۔“

جھرنا ماں کی باتوں کو بخوبی سمجھ رہی تھی لیکن چاہتے ہوئے بھی اس نے کوئی سخت جواب نہیں دیا بلکہ روہانسی آواز میں بولی۔

”مما! کاش میرا باپ مجھے کچھ نہ دیتا لیکن بیٹی کہہ کر مجھے گلے لگا لیتا۔ جس طرح وشال اسے ڈیڈی کہہ کر پکارتا ہے کاش یہ حق مجھے بھی ملا ہوتا اور میں ساری دنیا کے سامنے اسے ڈیڈی کہتی۔“ کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہوگئی۔

شیاما نے اپنا من پسند مشروب گلاس میں ڈالا اور اس سے شغل کرنے لگی۔ انداز بے نیازی سے بیٹی کی بات سنی اَن سنی کردی۔ جھرنا نے آنکھوں کے نم گوشے صاف کیے اور اپنی بات مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”خاک ڈالتی ہوں میں ایسے باپ پر۔ اب تو آپ ہی میری ماں اور آپ ہی میرا باپ ہیں۔“

جھرنا کی زبان سے یہ الفاظ سن کر شیاما کے دل میں پھول کھل گئے۔ فرطِ مسرت سے مغلوب ہوکر اس نے بیٹی کا ہاتھ چوم لیا۔ جھرنا نے بھی پیار کا اظہار کرتے ہوئے اپنی بانہیں ماں کی گردن میں حمائل کردیں اور خوشامدانہ انداز میں بولی۔ ”مما! میری دو تین دوستوں کا گروپ تین دن کے لیے کھنڈالا جا رہا ہے۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہہ رہی ہیں اگر آپ کی پرمیشن......“

شیاما نے فوراً بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ارے میری جان! میری پرمیشن کی کیا ضرورت۔ جاؤ گھومو پھرو اور عیش کرو۔ آخر تمہارے باپ نے تمہیں اتنا روپیا پیسا کس لیے دیا ہے۔“ شیاما پر دولت کا خمار ایسا چڑھا تھا کہ اس نے یہ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا کہ اس کے دوستوں کے نام کیا ہیں اور پتے کیا ہیں۔ بیٹی پر اسے اندھا اعتماد تھا۔ ماں کو اپنی دامِ محبت میں گرفتار کرکے اس نے اس سے بریف کیس کی چابی بھی ہتھیالی۔ جب دونوں اپنی رہائش گاہ پر پہنچیں تو جھرنا خوشی کے جھولے میں ہلکورے لے رہی تھی۔ دوسری صبح شیاما کے جاگنے سے پہلے وہ گھر سے اڑن چھو ہو چکی تھی۔

خوبصورت بات

☆ اس شخص کا دل کبھی مت توڑو جو آپ کو پسند کرتا ہے۔ اس شخص کو خدا حافظ مت کہو جس کو آپ کی ضرورت ہو۔ اس شخص کو شرمندہ نہ کرو جو آپ پر مکمل بھروسا کرتا ہو۔ اس شخص کو کبھی مت بھلاؤ جو آپ کو ہمیشہ یاد کرتا ہے۔

☆ میں بچپن کا وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتا، جب گھڑی کسی کسی کے پاس اور وقت سب کے پاس ہوتا تھا۔

دعا

کاش اس کا نام (دعا) ہوتا۔
کبھی کبھی اس کی امی مجھے ملتیں تو پوچھتیں بیٹا کیسے ہو...... میں کہتا، آنٹی بس آپ کی (دعا) چاہیے۔

مرسلہ۔ راحیلہ شفیق، سندھی ہوٹل، نیو کراچی

شیاما نے اس سے رابطہ کرنا چاہا تو موبائل بند جارہا تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں بیٹی پر واری صدقے ہوتے ہوئے ممتا بھرے لہجے میں بولی۔ ”بہت عرصے بعد تو گھومنے پھرنے نکلی ہے باہر۔ دوستوں کے جھرمٹ میں چاند بن کر چمک رہی ہوگی۔ میری لاڈو اتنی بڑی ہوگئی ہے مگر اس کا بھولپن تو دیکھو میری اجازت کے بغیر گھر سے قدم نہیں نکالتی ہے۔ ہے بڑی فرماں بردار۔ اس کی نادانیاں تو دیکھو، ایک بار بھی بریف کیس کھول کر نہیں دیکھا۔ نہ بینک جاکر اپنا اکاؤنٹ چیک کیا۔ اب تو راج کماریوں کی طرح جیون بتا سکتی ہے مگر اس کی سادگی تو دیکھو کل سے آج تک ایک پیسے کی شاپنگ نہیں کی میری بٹو نے۔ سیر کے لیے بجائے یورپ جانے کے کھنڈالا گئی ہے۔“ زبانی کلامی وہ اپنے آپ سے بولے جارہی تھی۔

جھرنا کو گھر سے گئے ہوئے تین دن ہوچکے تھے۔ شیاما بے تابی کے ساتھ بیٹی کی منتظر تھی لیکن چوتھے روز بھی دوپہر ہونے کو آرہی تھی۔ ابھی تک جھرنا کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ شیاما اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔ اپنی کوتاہی پر پشیمان تھی کہ اس نے جھرنا کی سہیلیوں کے سیل فون نمبرز کیوں نہیں لیے۔ طرح طرح کے وسوسے اس کے دل و دماغ میں ابھر رہے تھے۔ کبھی اس کا ذہن انیل کی طرف جاتا کیونکہ وہ بھی جھرنا کا ناکام عاشق تھا۔ اس کے بعد دیپک اور وشال تھے۔ کہیں انہوں نے کوئی انتقامی کارروائی کرکے جھرنا کو اغوا تو نہیں کرلیا۔ کہیں لے جاکر اسے...... اس سے آگے اس میں سوچنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے پولیس سے رابطہ کرنے کی ٹھانی۔ جیسے ہی موبائل اٹھانے کے لیے آگے بڑھی، موبائل نے رنگ ٹون دینا شروع کردی۔ اس کی نظریں اسکرین پر جم گئیں۔ آہستہ سے اس نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”اوہ ممّا ہے۔ بہت دنوں بعد کال کی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار ہیلو کی لیکن جواب میں اسے کانتا دیوی کی آنسوؤں میں بھیگی آواز سنائی دی۔

شیاما کا دل کٹی پتنگ کی طرح ڈولنے لگا۔ شکستہ لہجے میں وہ مستفسر ہوئی۔ ”ممّا! کیوں رو رہی ہو۔“

بیٹی کی آواز سنتے ہی کانتا کی آہ وزاری میں مزید اضافہ ہوگیا۔ شیاما حیران پریشان جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر زور سے چیخی۔ ”ممّا رونا دھونا بند کرو اور مجھے بتاؤ کہ کیا افتاد آن پڑی ہے۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔“

کانتا نے اپنی سسکیوں کو بریک لگایا اور بولی۔ ”تیری پریشانی میں جانتی ہوں۔ وہ جھرنا ہے نا جس کے لیے ہم نے اپنے دن کا سکھ اور رات کا چین غارت کیا۔ اس ناگن کو دودھ پلا کر پالا پوسا، وہ ہم دونوں کو چونا لگا گئی۔“

کانتا کی بات سنتے ہی شیاما کے کان کھڑے ہوئے۔ چہرے پر سراسیمگی اور زردی لرزاں تھی۔ لکنت زدہ آواز میں بولی۔ ”مجھے تو کھنڈالا کا کہہ کر گئی تھی اور کرم جلی بنگلور پہنچ گئی اور وہاں پہنچ کر کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ممّا! ذرا واضح الفاظ میں بتایئے، آخر ہوا کیا ہے۔“ کانتا کا بھوں بھوں رونا رفتہ رفتہ کم ہوا اور اس نے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کیا۔ ایک ذرا توقف سے کہا۔

”ارے اچانک آکر مجھ سے لپٹ گئی کہ نانو آپ کی یاد میں میں جل بن مچھلی بنی ہوئی تھی۔ آپ کو سرپرائز دینا مقصد تھا۔ اس لیے ممّا کو چکما دے کر آئی ہوں۔ آپ انہیں بالکل آگاہ نہیں کرنا کہ میں بنگلور میں ہوں۔ ارے شیاما میرا دل خوش ہوگیا کہ کمبخت مجھ سے کتنا لاڈ دلار کرتی ہے کہ مجھ سے ملنے اتنی دور بھاگی بھاگی چلی آئی لیکن اچانک......“ اتنا بولنے کے بعد کانتا یوں سہم کر خاموش ہوگئی جیسے کوئی اس کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہے۔

شیاما جھنجلا کر بولی۔ ”ممّا! آگے بھی تو کہو، ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔“ اس کی آواز بھی رندھی ہوئی تھی۔

کانتا دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ ”اپنے لگتے بلگتوں کو بھی ساتھ لے کر آئی تھی اور پتا ہے میرے ساتھ کیا کیا؟“

”کیا......؟“ شیاما کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

کانتا نے ایک جھرجھری لی اور تھرتھراتی آواز میں بولی۔ ”انیل اور مہیش نے گن پوائنٹ پر مجھ سے وہ راز بھی اگلوالیا جو ابھی تک اس منحوس سے ہم دونوں نے چھپا رکھا تھا۔“ کانتا کی بات سنتے ہی شیاما کو یوں محسوس ہوا جیسے بجلی کے ننگے تار کو اس نے چھولیا ہو۔ اب زاروقطار رونے کی باری شیاما کی تھی۔ ساڑی کے آنچل سے آنسو پونچھے اور سڑسڑ کرکے ناک کھینچی اور بولی۔

”ہائے میّا! حالات کی کیسی مار پڑی ہم پر۔ ارے قلاش کرگئی ہم کو۔“

کانتا نے بوکھلا کر سوال کیا۔ ”اری کھل کر تو بتا کچھ مجھے کیا چونا لگا کرگئی ہے۔“ شیاما نے من وعن وہ ساری داستان سنا دی کہ کس طرح دیال داس کی دولت کا بڑا حصہ اس نے جھرنا کے نام کیا اور جھرنا نے کس طرح شراب کے نشے میں بریف کیس کی چابی اڑائی اور دوسری صبح خود بھی اڑ گئی۔

کانتا نے ایک لمبی ہائے کی اور دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اب دونوں کے پاس کہنے سننے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

دونوں اپنی اپنی جگہ رو رو کر ہلکان ہورہی تھیں۔ بمشکل کانتا نے استفسار کیا۔ ”تم کب آرہی ہو بنگلور...... مجھے تمہاری سخت ضرورت محسوس ہورہی ہے۔“

شیاما نے آنسو پیتے ہوئے جواباً کہا۔ ”ممّا! اب تو اتنے پیسے بھی نہیں کہ پلین کی ٹکٹ کٹا سکوں۔ اتنا لمبا سفر ہوگا اور ٹرین کی چھکڑ چھکڑ ہوگی۔ ہائے...... دھڑن تختہ کردیا بدبخت نے۔“ اور بھی جانے وہ کیا کیا کہتی رہی لیکن دوسری طرف سے کانتا نے موبائل آف کردیا کیونکہ اس کی حالت غیر ہورہی تھی۔ مسلسل ہچکیاں اور سسکیاں لے رہی تھی اور سر پیٹتے ہوئے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

”ہاتھ میں آئی دولت کتنی آسانی سے نکل گئی۔ ارے اتنا دھن کمانے میں عمریں بیت جاتی ہیں، پھر بھی ہم جیسے لوگ نہیں کما سکتے۔ سارے پاپڑ میری بیٹی نے بیلے اور وہ پل میں ہمیں کنگال کرگئی۔“

دوسری جانب شیاما کی حالت انتہائی غیر ہورہی تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں جھرنا کو رنگ برنگی گالیوں سے نواز رہی تھی لیکن اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ہاں البتہ سناٹے میں ڈوبے در و دیوار ضرور اس کے دمساز اور غمگسار تھے۔ وہ رات بھی اس نے نہایت اذیت میں گزاری۔ دوسری صبح حسب معمول روشن اور چمکیلی تھی۔ سکوت اور سوگ کے عالم میں بیٹھی اپنے خیالوں میں مستغرق رہی۔ معاً کال بیل کی آواز سن کر ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ دروازے پر پہنچی اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ وہاں ایک طویل القامت نوعمر لڑکا کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ شیاما اس سے کوئی سوال کرتی اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولا۔ ”میم! ائرپورٹ پر کینیڈا جانے والے ایک نوبیاہتا جوڑے سے میری ملاقات ہوئی۔ میں دراصل اپنی بہن کو سی آف کرنے گیا تھا۔ وہاں چند لمحوں کی ملاقات کے دوران ہی ہماری دوستی ہوگئی اور انہوں نے مجھے ایڈریس سمجھا کر یہ خط آپ تک پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ اس لیے حاضر ہوا ہوں۔“

شیاما نے جھپٹ کر عجلت کے ساتھ لفافہ اس کے ہاتھ سے لیا اور دیکھنے لگی، تحریر جھرنا کی تھی۔ دل اچھل کر حلق میں آگیا اور آنکھوں میں پھر برسات اتر آئی۔ لڑکا فوراً مڑا اور اپنی راہ لی۔ شیاما اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر ایک سرد آہ کھینچی اور ایک زوردار آواز کے ساتھ دھڑام سے دروازہ بند کردیا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جلدی سے لفافہ چاک کرکے خط پر نظریں دوڑانے لگی۔

”ممّا! مجھے آپ کو ممّا تو نہیں لکھنا چاہیے کیونکہ آپ میری ماں ہیں ہی نہیں۔ نہ کانتا دیوی میری نانی ہیں۔ میں تو پالکڑی ہوں اور اتنے دنوں آپ نے اور آپ کی ماں نے مجھے اتنے ناز و نعم سے صرف اس لیے پالا کہ میری جوانی اور حسن آپ دونوں کے بڑھاپے کا سہارا بن سکیں۔ اور وقت آنے پر آپ اسے کیش کرواسکیں۔ بات یہیں تک ہوتی تو ٹھیک تھی لیکن آپ دونوں کی حرص و ہوس اور لالچ کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ جونہی انیل میرے قریب آیا۔ آپ دونوں نے اس کے خلاف محاذ قائم کرلیا۔ اتنا زبردست ناٹک کیا کہ وہ اپنی صفائی میں دو لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔ ساری دنیا کے سامنے آپ دونوں نے اسے ذلیل کردیا لیکن جس عورت کو اس ڈرامے میں انیل کی بیوی کا کردار دیا گیا تھا‘ وہ اداکارہ تو بہت اچھی تھی لیکن انتہائی لالچی، بزدل اور ڈرپوک تھی۔ انیل نے جیسے ہی چند نوٹوں کی جھلک دکھلائی، اس نے بہت آسانی سے سارا بھانڈا پھوڑ دیا اور آپ کی اور نانی کی مکاری کی ساری داستان فرفر سنادی۔ انیل اور مہیش نے سیڑھی کے طور پر نانی کے ڈرائیور کو استعمال کیا۔ عقل سے پیدل نانی جو اپنے آپ کو بہت ہوشیار اور عقل مند سمجھتی ہیں۔ انہوں نے اس عورت سے پیسوں کا لین دین ڈرائیور کے سامنے ہی کیا تھا۔ اس نے جو دیکھا جو سنا تھا وہ اسی روز انیل کے گوش گزار کردیا۔ مجھے اسی روز پتا چل گیا تھا کہ پس پردہ اس سارے کھیل میں نانی کا اور آپ کا ہاتھ ہے۔ میں

بے بسی

ایک آدمی کو ساگ بہت پسند تھا۔ وہ روزانہ گھر میں ساگ پکواتا۔ جب کھانے بیٹھتے تو ہمیشہ اپنے بیٹے سے کہتا کھانا بسم اللہ سے شروع کیا کرو ورنہ شیطان کھانے میں شامل ہوجاتا ہے لیکن بیٹا ہر بار بسم اللہ پڑھنا بھول جاتا۔ ایک دن وہ بسم اللہ پڑھے بغیر ساگ کھانے ہی والا تھا کہ شیطان خود آگیا اور روتے ہوئے بولا۔ ”مریں کدی تے بسم اللہ کہہ لیا کر...... ساگ کھا کھا کے میں مرن والا ہوگیا واں۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

احتیاط

ڈاکٹر صاحب کو ٹیلی فون آیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میرے بیٹے نے ریت کھالی ہے۔ میں نے اسے پانی پلادیا ہے۔ بتائیں میں اور کیا کروں؟“

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ ”اب صرف یہ احتیاط کیجیے کہ وہ سیمنٹ ہرگز نہ کھانے پائے۔“

آپ کے ہاتھوں روبوٹ محض اس لیے بنی رہی کہ صرف اور صرف مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ میں اور انیل ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ شادی تو مجھے انیل سے ہی کرنا تھی۔ اس لیے آپ کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی رہی اور آپ کے اشاروں پر ناچتی رہی۔ پھر مجھ سے دیپک ٹکرایا۔ دیپک کی دھن دولت دیکھ کر آپ کی رال ٹپک پڑی۔ آپ کے کہنے پر میں نے اس کے ساتھ عشق عاشقی کا کھیل شروع کیا لیکن اوپر والے کو شاید مجھ پر رحم آگیا اور جیسے ہی میں نے ”سلے پالک“ والی من گھڑت کہانی سنائی، آپ کا تعمیر کردہ سنہرا سنسار زمین بوس ہوگیا لیکن آپ بھی اس میدان کی پرانی کھلاڑی تھیں۔ آپ نے دماغ کے گھوڑے دوڑائے اور فوراً ہی وشال کو ٹارگٹ بنایا۔ وشال کا بیک گراؤنڈ کیا ہے جب تک آپ کو نہیں معلوم تھا۔ بس اس کی دولت سے آپ کی آنکھیں چکاچوند ہو رہی تھیں لیکن سیٹھ دیال داس کا سامنا ہوتے ہی آپ کے خیالات نے فوراً پلٹا کھایا۔ آپ نے سوچا سانپ بھی مر رہا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ میں کنواری ناری رہوں گی اور چھپر پھاڑ کر دولت کی برسات بھی ہوجائے گی۔ آپ نے مجھے پل ہی پل میں دیال داس کی بیٹی بنا دیا۔

”دیال داس پہلے ہی چور بنا ہوا تھا کیونکہ حقیقت یہی تھی کہ آپ اس کی بیٹی کی ماں تھیں۔ اس نے آپ کی زبان پر تالا لگانے کی بھاری قیمت ادا کی تھی لیکن اس لڑکی پر نہ آپ نے کوئی توجہ دی اور نہ نانی نے۔ حالانکہ وہ آپ کا خون تھی۔ آپ اس کی ماں تھیں لیکن وہ ہمیشہ عدم توجہی کا شکار رہی اور اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ انتہائی معمولی صورت شکل کی تھی۔ آپ نے اور نانی نے اندازہ لگالیا تھا کہ جوانی میں قدم رکھنے کے بعد اس کی شادی، اس کا جہیز اور اس کے لیے بر تلاش کرنا ایک مسئلہ ہے۔ دیال داس کی وہ بیٹی آپ کے لیے مسائل کا انبار بن جاتی۔ اس لیے اس بچی کی موت پر آپ نے اور نانی نے دو اشک بہانا بھی گوارا نہ کیا۔ بلکہ اس کی چتا جلا کر چین کی سانس لی۔ اسی اثنا میں ممبئی سے اگت پوری جاتے ہوئے ریلوے اسٹیشن پر متعدد کپڑوں کی پرتوں میں لپٹی ہوئی آپ کو ایک نوزائیدہ بچی ملی۔ دور دور تک آپ کو اور نانی کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ہاں البتہ چار پانچ کتے اس بچی کے گرد منڈلا رہے تھے۔ نرم گوشت اور ملائم ہڈیوں کی بو پر وہ آوارہ کتے پاگل ہو رہے تھے۔ آپ کے اور نانی کے جذبۂ ترحم نے جوش مارا اور آپ نے مجھے ان کتوں کے منہ کا نوالہ نہیں بننے دیا۔ آپ کا اور نانی کا یہ اپکار میں جیون بھر یاد رکھوں گی۔ آپ دونوں نے مجھے چھاتی سے لگا کر ممتا دی، پیار دیا، میرے ناز اٹھائے لیکن میرا حسن اور میری جوانی دونوں میرے لیے عذاب بن گئے۔ بھوکے کتوں کا کردار آپ دونوں نے اپنالیا۔ ممتا، پیار کا لس اور احساس ہوا میں تحلیل ہوگیا اور آپ اور نانی بکاؤ مال سمجھ کر میرا مول تول کرنے لگیں۔ انیل اور مہیش نے مجھے اس لالچی عورت سے بھی ملوادیا تھا جو چند ہزار روپیوں کی خاطر ایسے ناٹک روز ہی کرتی ہے۔ بہرحال میں اور انیل ہمیشہ کے لیے کینیڈا جا رہے ہیں۔ ہمارے لینڈنگ پیپرز تیار ہوچکے ہیں۔ ہم اپنے ساتھ نانی کے ڈرائیور کو بھی لے جا رہے ہیں۔ اس نے مشکل وقت میں ہم دونوں کا ساتھ نبھایا۔ دراصل اس کی وجہ سے ہی انیل، مہیش اور میں حقیقت کی تہ تک پہنچ سکے۔ ورنہ شاید میں ساری زندگی انیل کو مجرم سمجھتی رہتی اور یقیناً ہمیشہ بدگمانیوں اور غلط فہمی کا شکار رہتی۔ مہیش نے بھی قدم قدم پر ہم دونوں کا حوصلہ بڑھایا۔ اس ہی کے مشورے پر میں اور انیل نانی تک پہنچے اور پھر ایک ہی جھٹکے میں وہ سارے راز اگلوا لیے جواب تک آپ سینے میں دبائے بیٹھی تھیں۔ تب مجھے پتا چلا کہ دیال داس سے میرا دور دور تک کوئی رشتہ نہیں۔ نہ وہ میرا باپ ہے نہ میں اس کی بیٹی...... لیکن وہ احمق شخص محض اس لیے قربانی کا بکرا بنا کہ اس کے دل میں چور تھا۔ اگر وہ دل و دماغ کو حاضر رکھ کر ہوش وحواس سے کام لیتا اور میرا ڈی این اے کروالیتا تو آپ کو اور نانی کو منہ کی کھانی پڑتی۔ اس ساری صورت حال کا فائدہ مجھے اور صرف مجھے پہنچا۔ دیال داس نے آپ کو پھوٹی کوڑی بھی نہ دی لیکن پھر تصور میں وہ منظر گھوم گیا جب کتوں کی شکل میں میرے سر پر موت منڈلا رہی تھی اور آپ نے اور نانی نے مجھے ان کے خونخوار پنجوں سے چھڑایا ہوگا۔ اس لیے میں آپ کے اور نانی کے اکاؤنٹ میں اتنا کچھ چھوڑ کر جا رہی ہوں جو اگر کفایت شعاری اور سمجھ داری سے خرچ کیا گیا تو آپ دونوں کے لیے کافی ہے۔ آپ سے اور نانی سے ملنے ملانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ میں اب مسز انیل گپتا بن چکی ہوں اور اس روپ میں یقیناً آپ دونوں ہی مجھے برداشت نہیں کرسکیں گی۔ اس لیے واپسی کے تمام راستے میں خود ہی بند کر رہی ہوں۔“

آخر میں جھرنا کے دستخط تھے۔ خط پڑھ کر شیاما کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔ مدد کے لیے کسی کو پکارنا چاہا لیکن آواز ہی نہ نکلی۔ دل میں درد کی لہر اٹھی اور پھر وہ دل پکڑ کر دھڑام سے بیڈ پر گر گئی۔ کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔

جادوئی چراغ

تنویر ریاض

یہ کائنات بذاتِ خود حیرتوں کا طویل سلسلہ ہے اور اس میں رونما ہونے والے واقعات... گویا حیرتوں کے پہاڑ... اگر ان کا تعلق بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھ لیں تو حقائق جان کر ذہن ششدر رہ جاتا ہے کہ بچپن کی محبت اور بڑھاپے میں ملن... دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔

بے خبری میں چاہنے کے مرض میں مبتلا ایک عاشق کا قصہ

میں نے کتاب پڑھتے پڑھتے انگڑائی لی۔ کچھ پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔ میرے دو مرتبہ تالی بجانے پر رنگو نے آنکھیں کھولیں۔ ایک زوردار جماہی لی اور چاروں ہاتھ پیروں سے اچھلتا کودتا باورچی خانے کے فریج تک گیا۔ رنگو میرا پالتو بندر ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے کسی ملازم، سیکریٹری یا محافظ کی ضرورت نہیں۔ اس نے فریج سے بیئر کی بوتل نکالی۔ اس کا ڈھکنا کوڑے دان میں پھینکا اور بوتل لے کر میرے پاس آگیا۔

”تم کافی ہوشیار ہوتے جا رہے ہو۔“ میں نے ستائشی انداز میں کہا تو اس نے فرمانبرداری سے سر جھکا لیا۔ گرم ہوا کا جھونکا کشتی سے ٹکرایا تو میں نے اپنا ہیٹ اتار دیا تاکہ سورج کی شعاعیں براہِ راست میرے چہرے پر پڑیں۔



اردگرد کا منظر بڑا دلفریب تھا۔ پانی کی منہ زور لہریں کشتی کو جھولا جھلا رہی تھیں پھر میں نے مرغابیوں کے ڈکرانے کی آواز سنی۔ میں نے اس ماحول سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ قریب تھا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہوجاتی، تبھی میں نے ساحل پر ایک کار کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سنی۔

میں نے اپنی جگہ پر کھڑے ہوکر دیکھا کہ آسمانی رنگ کی ایک کار میری جیپ کے برابر میں کھڑی تھی۔ اس میں سے ایک عورت اتری جو آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کشتی کی طرف آرہی تھی۔ اس کی عمر ستر اسّی کے لگ بھگ تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور سر پر ایک بڑا سا سفید ہیٹ تھا جسے اس نے ایک ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں بید کی ٹوکری تھی۔

میں نے اپنی لکڑی کی ٹانگ کو مضبوطی سے باندھا اور اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔

''ہیلو......'' اس نے گھاٹ پر سے ہی آواز لگائی۔

''بلی! تم موجود ہو؟''

اس نے اپنا ہیٹ اتار دیا۔ اب میں ریشمی رومال سے بندھے ہوئے اس کے سفید بال اور بڑے سائز کا چشمہ دیکھ سکتا تھا۔

''بلی! یہ تم ہو؟'' اس نے گویا تصدیق کرنے کے انداز میں کہا۔

''اور تم کلارا ابیل ہونا؟'' میں دور سے ہی چلّایا۔

''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اوپر آجاؤں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے عرشے کی سیڑھیاں چڑھنے میں مدد دی اور پوچھا۔ ''تم کچھ پینا چاہوگی...... پانی یا کچھ اور؟''

کلارا ابیل ایک پرانے لائٹ ہاؤس میں نگراں کے طور پر رہتی تھی۔ وہ مغربی ٹیکساس سے تعلق رکھنے والی ایک مضبوط اور عملی عورت تھی۔ میری اس سے اتوار کے دن چرچ میں ملاقات ہوجاتی تھی۔

''مشروب؟'' اس نے فرمائش کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہارے پاس موجود ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹوکری پیروں کے پاس رکھی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے اس کے لیے مشروب کا ایک گلاس بنایا اور تین دفعہ تالی بجائی۔ رنگو چھلانگیں لگاتا ہوا کیبنٹ تک گیا۔ اس میں سے مونگ پھلی نکال کر ایک چھوٹے پیالے میں ڈالی اور کلارا ابیل کے سامنے میز پر رکھ دی۔

''اوہ ڈیئر۔'' اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو واقعی بہت ہوشیار ہے۔''

''شکریہ!'' میں نے کہا اور رنگو کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھا۔ وہ منہ چلاتا ہوا واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔ ''میں نے بیونس آئرس میں ایسا ہی ایک بندر دیکھا تھا جو بالکل ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔ تب سے ہی میں اس کی تربیت کررہا ہوں۔''

''ڈیوڈز ففتھ مارگریٹا۔'' اس نے میری کشتی کا نام پڑھتے ہوئے کہا۔ ''بہت دلچسپ نام ہے۔ یہ ڈیوڈ کون ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے گلاس کے گرد نیپکن لپیٹا اور اس پر ربر بینڈ چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کشتی میں نے ہوسٹن میں خریدی تھی لیکن اس کا نام تبدیل نہیں کیا کیونکہ یہ بدشگونی سمجھی جاتی ہے۔''

''ہاں۔ حقیقت تو یہ ہے بلی کہ میں بھی تم سے قسمت کے بارے میں ہی بات کرنے آئی ہوں۔''

''ہاں کہو۔ میں سن رہا ہوں۔'' میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

اس نے مشروب کا ایک بڑا گھونٹ لیا اور بولی۔ ''کیا تم نے کبھی کوئی خواہش کی ہے؟''

''ہاں، میرا خیال ہے کہ ہم سب کسی نہ کسی انداز میں خواہش کرتے ہیں۔ کوئی سالگرہ پارٹی میں، کوئی فوارے میں سکہ پھینک کر اور کوئی کسی اور طرح۔''

''بالکل...... میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔'' وہ چشمے کے پیچھے سے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ ''چند روز قبل لائٹ ہاؤس کے اسٹور میں کسی جگہ سے پانی لیک ہورہا تھا۔ میں وہ دیکھنے گئی تو مجھے وہاں یہ چیز ملی۔'' اس نے ٹوکری میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ٹوکری کھولی۔ اس میں ایک اورنج کلر کی پرانی ٹی کوزی رکھی ہوئی تھی۔

''بہت خوب صورت ہے۔'' میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

کلارا مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں یقین ہے کہ تم واقعی ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہو؟''

''ہاں گو کہ میرے پاس لائسنس نہیں ہے لیکن تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''یہ دیکھو۔'' اس نے ٹی کوزی کھولتے ہوئے کہا۔ ''علی بابا اور چالیس چور'' وہ ایک چراغ تھا۔

''واؤ......'' میں نے اپنا ہیٹ اتارا اور جھک کر اسے

قریب سے دیکھنے لگا۔ وہ کسی جادوئی چراغ کے مانند لگ رہا تھا۔ لمبا چپٹا اور بیضوی۔ اس کا دستہ اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا اور آگے کی طرف گولائی میں ٹونٹی بنی ہوئی تھی۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''لائٹ ہاؤس کے اسٹور کی اوپری منزل سے۔'' کلارا نے کہا۔ ''چند روز قبل جب بارش ہوئی تو مجھے لگا کہ کہیں سے پانی لیک ہورہا ہے۔ اسٹور روم روشنی کے مینار سے ایک منزل نیچے ہے جہاں میں کلینزر، کپڑے کے ٹکڑے، تیل میں ملانے والے مادے اور دوسری چیزیں رکھتی ہوں۔ میں وہ جگہ تلاش کررہی تھی جہاں سے پانی گر رہا تھا، تبھی میری نظر اس پر گئی۔ یہ ایک ٹوٹے ہوئے آلے کے اوپر رکھا ہوا تھا۔''

یہ کہہ کر اس نے وہ چراغ دوبارہ ٹی کوزی میں لپیٹا اور ٹوکری میں رکھ لیا۔

''اس سے پہلے تم نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی؟'' میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ''بقول تمہارے اچانک ہی اس پر نظر چلی گئی؟''

''بلی! مجھے اس لائٹ ہاؤس میں رہتے ہوئے چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوچکا ہے، جب میں مڈلینڈ سے یہاں آئی تھی۔ اگر وہاں کوئی جادوئی چراغ ہوتا تو کیا مجھے پتا نہ چلتا؟''

''جادوئی چراغ......!'' میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں جادوئی چراغ۔'' کلارا ابیل نے دہراتے ہوئے کہا اور ٹوکری کا ڈھکنا بند کردیا۔ ''بلی! یہ واقعی خواہشیں پوری کرنے والا جادوئی چراغ ہے۔ خدا کے واسطے میری مدد کرو۔'' میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مذاق میں اسے جادوئی چراغ کہہ رہی ہے لیکن وہ واقعی سنجیدہ تھی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں کیونکہ میں نے اسے چیلنج کرنے کی جرأت کی تھی۔

میری مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ آگے کیا کہوں۔ میں نے مشروب کے دو گلاس اور بنائے۔ اب میں دماغ پر زور دے رہا تھا کہ کس طرح اس گفتگو کو خوشگوار انداز میں ختم کیا جائے۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ پاگل پن لگتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں۔'' میں نے اپنی گردن کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں پاگل پن والی کوئی بات نہیں ہے۔ یقیناً یہ ایک خوب صورت اور نادر چیز ہے۔''

کلارا ابیل نے مشروب کا... ایک اور گھونٹ لیا۔ باسکٹ دوبارہ کھولی اور اس میں سے ایک چار تہوں میں مڑا ہوا بڑا اور موٹا کاغذ نکالا اور بولی۔ ''یہ لیمپ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔''

میں نے اس سے وہ کاغذ لے لیا اور اسے کھول کر میز پر پھیلا دیا۔ پرانا ہونے کی وجہ سے وہ زرد اور بوسیدہ ہوچکا تھا لیکن کسی دعوتی کارڈ کی طرح مضبوط اور دبیز تھا۔ اس پر بڑے بڑے حروف میں یہ تحریر درج تھی۔

''جب لائٹ ہاؤس بند ہو تو اس چراغ کو روشن کرو۔ اپنا چہرہ قطبی ستارے کی طرف کرو اور آنکھیں بند کرکے اونچی آواز میں اپنی تین خواہشیں بیان کرو۔''

''واہ۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تو واقعی ایک مذاق ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے کاغذ کو دوبارہ تہ کرکے اسے واپس کردیا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس مجھے گھورتی رہی پھر اس نے مجھ سے وہ کاغذ لے کر ٹوکری میں رکھ لیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے واپس چل دی۔ رنگو اپنی قیام گاہ سے باہر نکلا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

''مسز کلارا!'' میں نے اس کا تعاقب کرتے ہوئے آواز دی لیکن وہ اپنی کار کی طرف بڑھتی رہی۔ میں نے دوبارہ اسے آواز دی اور کہا۔ ''کیا میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی جسے سن کر تم پریشان ہوگئیں؟''

اس نے وہ ٹوکری کار کی پچھلی نشست پر رکھی پھر اس نے اپنے پرس سے چابیوں کا گچھا نکالا اور چہرے کے سامنے لاکر مطلوبہ چابی تلاش کرنے لگی اور گہری سانس لینے کے بعد کار کی ڈکی کھول دی۔ وہ نظارہ دیکھ کر میری آنکھیں چکاچوند ہوگئیں۔ ڈکی میں سو ڈالر کے نوٹوں کی گڈیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ ہر گڈی دس ہزار ڈالرز مالیت کی تھی اور گڈیوں نے پوری ڈکی کی جگہ گھیر رکھی تھی۔ میں نے انہیں گننا چاہا لیکن میرا ذہن ساتھ نہ دے سکا۔

''تم کیا سمجھتے ہو؟'' کلارا نے کہا۔ ''کیا یہ جادو نہیں ہے؟''

میں نے ساحل کا جائزہ لیا۔ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا...... سوائے پرندوں اور مرغابیوں کے۔

''میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ تم یہ جادو اپنی کار سے نکالو اور اسے بینک میں رکھوا دو۔''

میں اس کے ساتھ کارپوس کرسٹی کے وسط میں واقع بینک آف ٹیکساس کی شاخ میں گیا جہاں میں نے یہ رقم جمع کرانے میں اس کی مدد کی۔ میں نے منیجر سے درخواست کی کہ وہ اپنے سیکیورٹی گارڈ کے ذریعے اس رقم کو اتارنے اور بینک تک لانے میں ہماری مدد کرے لیکن اس نے کوئی توجہ

نہیں دی البتہ اس کی گردن کی رگیں تن گئیں جب کلارا نے کار کی ڈکی کھول کر رقم اسے دکھائی۔ وہ چار بڑے ڈبوں میں رکھی گئی تھی اور اس کی کُل مالیت دس لاکھ ڈالرز تھی۔

''میں نے ناشتا کرنے کے لیے اس میں سے سو ڈالر کا ایک نوٹ لیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''اس میں سے بچے ہوئے ستانوے ڈالر اب بھی میرے پرس میں ہیں۔''

جب وہ رقم بینک میں جمع ہو گئی تو ہم باہر آ کر لکڑی کی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ رنگو اس کے نیچے گھس کر سائے میں لیٹ گیا۔

ایک منٹ تک ہم دونوں میں سے کوئی نہ بولا۔ پھر میں نے پہل کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ رقم کہاں سے ملی؟''

''میں تمہیں پہلے ہی دو مرتبہ بتا چکی ہوں۔ میں نے اس کی خواہش کی تھی۔ جیسا کہ اس کاغذ پر لکھا ہے، میں نے لائٹ ہاؤس کے مینار کی روشنیاں گُل کر دیں۔ چراغ روشن کیا اور اسے اپنے سامنے رکھ کر چہرہ قطبی ستارے کی طرف کر لیا پھر تین دفعہ اونچی آواز میں اپنی خواہش بیان کی اور اس طرح یہ رقم مجھے مل گئی۔''

''مگر کیسے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ رقم آسمان سے ٹپکی، دھوئیں کے مرغولے سے برآمد ہوئی یا ایسا ہی کوئی اور معجزہ ہوا؟''

''نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہ رقم فوراً ہی مجھے نہیں ملی۔ میں دعا مانگنے کے بعد ایک منٹ تک بیٹھی رہی۔ میری بلی بینز آئی اور وہ بھی میرے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی پھر میں نے کندھے اچکائے اور سونے چلی گئی۔''

''پھر یہ رقم تمہیں کیسے ملی؟''

''یہ صبح میرے دروازے پر ڈبوں میں رکھی ہوئی ملی۔''

''اچھا۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ یہ آسمان سے نہیں گری، اس لیے یقیناً کوئی تمہارے دروازے پر چھوڑ گیا ہوگا اور تم نہیں جانتیں کہ وہ کون تھا؟''

''مجھے اس کی پروا نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے ایک جادوئی چراغ ملا اور اس نے میری خواہش پوری کر دی۔ یہ رقم کہاں سے اور کیسے آئی؟ یہ سوچنا میرا کام نہیں۔ تمہارے پاس اس لیے آئی کہ میں ایک تنہا بوڑھی عورت ہوں اور اتنی بڑی رقم اپنے پاس نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس تنہائی اور بڑھاپے کی وجہ سے میں بعض اوقات خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ تم پر مجھے اعتماد تھا کیونکہ تم امیر آدمی ہو اور میری رقم نہیں چراؤ گے۔''

وہ غلط سمجھ رہی تھی۔ میں خوش حال ضرور تھا لیکن امیر نہیں۔ بہرحال اس نے مجھ پر بھروسا کیا جس کی مجھے خوشی تھی۔ میں نے اظہارِ ممنونیت کے طور پر اپنا ہیٹ اتارا اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ رقم کہاں سے آئی؟ میرا مطلب ہے کہ اگر کوئی اسے واپس لینا چاہے تو؟''

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ یہ رقم مجھے اس چراغ نے دی ہے۔ آخر تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کر لیتے؟ بھلا کوئی مجھے اتنی بڑی رقم کیوں دے گا؟'' اس نے کچھ غصے سے کہا۔ ''اور اس چراغ نے صرف یہ رقم ہی نہیں اور بھی کچھ دیا ہے۔''

''اوہ۔'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''وہ کیا؟''

''ہاں۔ یہ رقم مجھے دو دن پہلے ملی تھی۔ گزشتہ شب میں نے اس کاغذ پر لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق اپنی دوسری خواہش بیان کی کہ میں اپنی بہن کو آخری بار دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کا انتقال برسوں پہلے ہوا تھا...... پھیپھڑوں کے سرطان سے۔''

میں نے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے اسے دوبارہ دیکھا؟''

''آؤ میرے ساتھ...... خود چل کر دیکھ لو۔''

میں نے اپنی جیپ نکالی اور اس کی کار کے پیچھے چل پڑا۔ گو کہ ٹیکساس کا رقبہ جرمنی کے برابر ہے لیکن جہازوں کے لیے اس کے ساحل تک پہنچنا نسبتاً آسان ہے۔ اس لیے یہاں مشی گن، الاسکا اور نارتھ ایسٹ کی طرح بہت زیادہ لائٹ ہاؤس نظر نہیں آتے اور گزشتہ سو سالوں سے ان کی تعداد صرف سات ہی ہے۔

ارن ساس پاس کا لائٹ ہاؤس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا شمار ٹیکساس کے قدیم ترین میناروں میں ہوتا ہے۔ عملاً اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا اور اسے محض ایک میراث کے طور پر روشن رکھا جاتا ہے۔ سرخ اینٹوں سے بنا ہوا یہ لائٹ ہاؤس ہشت پہلو ہے۔ مینار کے اوپری حصے کے چاروں طرف شیشہ لگا ہوا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے ریلنگ لگائی گئی ہے۔ 1860ء میں اتحادی فوجیوں نے اسے بارود سے تباہ کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ امریکی سپاہی اسے استعمال نہ کر سکیں لیکن وہ ناکام رہے اور 1867ء میں اسے دوبارہ روشن کر دیا گیا۔ ٹاور کے برابر میں ہی ایک بڑا بیچ ہاؤس بھی ہے۔

''یہ اصلی گھر نہیں ہے۔'' کلارا نے پورچ میں کھڑے ہو کر کہا۔ ''وہ تو طوفانوں کی نذر ہو گیا۔''

اس نے بیرونی دروازہ کھولا اور ہماری نظر ایک سفید اور زرد دھاریوں والی بلی پر پڑی۔ یہ کلارا کی پالتو بلی بینز تھی۔

اس نے رنگو کو دیکھ کر سسکاری بھری اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ اس کے بعد وہ ہمارے سامنے نہیں آئی۔

کلارا مجھے ایک چھوٹے کمرے میں لے گئی جو ناشتا کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں قدِ آدم کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کیتلی میں پانی ڈال کر اسے گرم کرنے کے لیے رکھ دیا۔ رنگو نے میز پر چڑھ کر پھلوں کی ٹوکری سے ایک خوبانی اٹھائی اور اپنے منہ میں دبالی۔

''معاف کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''اسے ذرا بھی تمیز نہیں۔ اس کی وجہ سے یہ خوبانی مجھ پر ادھار رہی۔''

اس نے میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا گتے کا ڈبا تھا۔ وہ اس نے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ رات میں تقریباً چار یا پانچ بجے کے قریب سوئی۔ جب آنکھ کھلی تو یہ ڈبا دروازے کی دہلیز پر پڑا ہوا تھا۔''

میں نے وہ ڈبا کھول کر اس میں سے ایک سیاہ و سفید تصویر نکالی جو لکڑی کے فریم میں لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک لڑکی کی تصویر تھی جس کی عمر تقریباً بیس سال ہوگی۔ اس کا چہرہ نازک اور صاف تھا۔ پس منظر میں لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا جنہوں نے کاؤبوائے ہیٹ اور پرانے فیشن کی ٹائیاں لگا رکھی تھیں اور وہ کوئی تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس لڑکی کے برابر میں اسکول کے لڑکے لڑکیاں نظر آ رہے تھے جن کے یونیفارم پر مڈلینڈ ہائی اسکول کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔

''میں نے اپنی بہن کی یہ تصویر پہلے کبھی نہیں دیکھی۔'' کلارا نے کہا۔ ''لیکن یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ میری بہن ہی ہے۔ میں اس سے ہائی اسکول کے بعد نہیں ملی۔ اسی لیے میں نے اسے ایک دفعہ اور دیکھنے کی خواہش کی تھی اور اس چراغ نے وہ پوری کر دی۔ اس تصویر کے ساتھ جو چیزیں ڈبے میں ہیں، وہ اسی کی ہیں۔ آج یہ تصویر غیر متوقع طور پر مجھے مل گئی۔ اب تو تمہیں یقین آ جانا چاہیے کہ یہ واقعی جادوئی چراغ ہے۔''

رنگو نے ڈبے پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے وہاں سے ہٹا دیا۔ کلارا نے چائے کے دو کپ بنائے اور ایک مجھے پکڑا دیا پھر وہ میرے ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔

''واؤ......'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا اور چائے کا کپ منہ سے لگا لیا۔

''تمہاری حیرت بجا ہے لیکن اس چراغ نے میری زندگی بدل دی ہے۔ مجھے ایک ہی رات میں اتنی دولت مل گئی جس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اب میں جو چاہوں کر سکتی ہوں۔ میری ہر خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے دوستوں سے ملنے چلی جاؤں۔''

میں نے کلارا کو کبھی دوستوں کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہمیشہ اپنی دکان اور چرچ پر ہی رہی اور اب شاید اسے جن بھوتوں پر بھی یقین آ گیا ہو لیکن یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ کوئی شخص کسی مقصد کے تحت اس سے کھیل رہا ہے جس کی خاطر اس نے دس لاکھ ڈالرز کی رقم بھی داؤ پر لگا دی۔

کلارا نے میرا کپ دوبارہ بھر دیا۔ ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ وہ اپنی بہن کی تصویر پر نظریں جمائے ہوئے تھی اور میں دیوار پر لگے ہوئے پرانے کلاک کی ٹک ٹک سن رہا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے اس بارے میں سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس معاملے میں کسی جن بھوت کا کوئی کردار نہیں ہے لیکن وہ کون ہے جو اس بوڑھی عورت کو ایک خطیر رقم اور تحفے دے رہا ہے؟

''تمہیں معلوم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرے والد کہا کرتے تھے کہ فری لنچ کوئی چیز نہیں ہوتی، یہ محض ایک اصطلاح ہے۔ آپ اسی کو کھانا کھلاتے ہیں جس سے کوئی مطلب ہوتا ہے۔ وہ وکیل تھے اور ان کا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑتا رہتا تھا جو اپنا مطلب نکالنے کے لیے انہیں کھانے پر بلاتے تھے۔''

کلارا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ یہ فری لنچ قسم کی کوئی چیز ہے۔ بھلا مجھ بوڑھی عورت سے کسی کو کیا کام ہو سکتا ہے اور کوئی مجھے دس لاکھ ڈالرز کیوں دے گا؟''

''تم اسے اس انداز سے سوچو۔'' میں نے دوبارہ کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''فرض کرو یہ جن نہیں تو پھر کوئی ایسا شخص ہے جسے تم جانتی ہو۔ وہ کون ہو سکتا ہے، کیا تمہیں کوئی اندازہ ہے؟''

اس نے تصویر نیچے رکھی اور بولی۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے بلی۔ میں کسی کو نہیں جانتی۔ ہم چالیس سال پہلے یہاں آئے تھے اور الگ تھلگ زندگی گزارتے رہے۔ پال کو پندرہ سال پہلے دل کا دورہ پڑا اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میرا نہیں خیال کہ تم کبھی اس سے ملے ہو گے۔ وہ ٹیکساس پیٹرولیم میں انجینئر تھا۔ پال اور اپنی بہن کے بعد میں تنہا ہو گئی۔ ممکن ہے کہ خاندان کے کچھ لوگ مغربی ٹیکساس میں

ہوں لیکن میں چالیس برس سے مڈلینڈ نہیں گئی اور میرا کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔‘‘

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے چشمہ اتار کر رومال سے صاف کیا اور بولی۔ ’’میں ایک تنہا عورت ہوں جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔‘‘

’’کیا میں لائٹ ہاؤس دیکھ سکتا ہوں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے رنگو سے کہا۔ ’’تم یہیں ٹھہرو۔‘‘

ہم عقبی سیڑھیوں سے اترے اور ایک فلیگ پوسٹ سے گزرے جہاں چھ جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ان میں امریکی جھنڈا سب سے اوپر تھا اور مختصر فاصلہ طے کرکے روشنی کے مینار تک پہنچے۔ وہاں ایک اسٹور اور چھوٹا سا گیسٹ ہاؤس تھا۔ روشنی کے مینار اور گیسٹ ہاؤس کو ملانے کے لیے ایک راستہ بنا ہوا تھا جس کا اختتام ایک تنگ اور اونچے دروازے پر ہو رہا تھا۔

ہم اس دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے۔ وہاں چکردار زینہ بنا ہوا تھا جسے دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ میرا خیال تھا کہ کلارا کو ان لوہے کی سیڑھیوں پر چڑھنے میں مشکل پیش آئے گی لیکن وہ دو سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچ گئی اور مجھے پیچھے چھوڑ دیا حالانکہ لکڑی کی ٹانگ سے مجھے چلنے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں ہوئی لیکن سیڑھیاں چڑھنا ہمیشہ ایک مسئلہ رہا ہے۔ اسی لیے مجھے کئی بار رکنا پڑا۔ بہرحال جیسے تیسے یہ مرحلہ بھی سر ہو گیا۔

سیڑھیوں کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا کھٹکے دار دروازہ تھا جس میں سے ہمیں گھٹنوں کے بل رینگ کر گزرنا پڑا۔ یہاں بھی کلارا مجھ سے آگے نکل گئی۔ جب تک میں سیدھا کھڑا ہوتا، وہ شیلف کے نیچے لگے ہوئے ایک اسکرو کو کسنے لگی۔ یہاں بھی اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور اس نے اسکرو ڈرائیور شیلف پر رکھ دیا جہاں پہلے سے ایک ٹارچ، دوربین اور تھرماس رکھا ہوا تھا۔

’’یہی وہ جگہ ہے جہاں تم نے اپنی خواہش بیان کی تھی؟‘‘

’’ہاں، میں اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’میں نے بہ آوازِ بلند تین مرتبہ اپنی خواہش بیان کی تھی۔‘‘

اس کمرے کا فرش پتھر کا بنا ہوا تھا اور لکڑی پر نیا رنگ کیا گیا تھا۔ وہاں بجلی نہیں تھی اور نہ ہی ایسی جگہ جہاں کوئی شخص چھپ سکتا۔ میں نے شیلف کے نیچے دیکھا۔ وہاں دو بھونرے رینگ رہے تھے۔

میں اس چھوٹے کمرے سے باہر آیا اور بیرونی پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر سگریٹ پینے لگا۔ کلارا بھی میرے پیچھے چلی آئی۔ اس نے اپنے سر کے گرد لپٹے ہوئے اسکارف کو مضبوطی سے باندھا اور ہم دونوں ساحل کا نظارہ کرنے لگے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر تھپکی دی اور بولی۔ ’’تم کتنے اچھے ہو کہ میرے ساتھ آج کا دن گزارا۔ تمہاری رفاقت میں مجھے تبدیلی کا احساس ہوا لیکن اس دولت کے بغیر میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتی تھی اور تمہیں میرے ساتھ نہ آنا پڑتا۔‘‘

’’لیکن کیا تمہیں تجسس نہیں ہے؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’میرا مطلب ہے کہ تمہیں اچانک اتنی بڑی رقم مل گئی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ یہ کہاں سے آئی۔ کیا تمہیں ڈر نہیں لگ رہا؟‘‘

’’میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ اس چراغ کا کمال ہے۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ آج رات تم ایک اور خواہش بیان کرو گی؟‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو میں نے پوچھا۔ ’’اور اس بار تم کس چیز کی خواہش کرو گی؟‘‘

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’نہیں پھر یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ میں نے پچھلی دو خواہشوں کے بارے میں بھی کسی کو نہیں بتایا تھا۔‘‘

’’ٹھیک ہے، میں اصرار نہیں کروں گا لیکن کیا تم میری ایک فرمائش پوری کر سکتی ہو؟‘‘

’’وہ کیا؟‘‘

’’کیا میں اس وقت وہاں آ سکتا ہوں جب تم اپنی فرمائش کرو گی؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں نصف شب کے فوراً بعد چلا جاؤں گا۔‘‘

اس نے اپنا چشمہ اتار کر صاف کیا اور بولی۔ ’’میں جانتی ہوں کہ یہ احمقانہ بات ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ کوئی گڑبڑ ہو۔‘‘

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی پھر کچھ دیر بعد سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ’’اگر تم اس وقت تک نیچے رک جاؤ، جب میں لائٹ ہاؤس میں اپنی خواہش بیان کر رہی ہوں تو تمہارے لیے گیسٹ ہاؤس میں ہی رات گزارنے کا انتظام کر دوں گی اور تمہیں اتنی رات گئے گھر نہیں جانا پڑے گا۔‘‘

’’مجھے منظور ہے۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا اور ہم لائٹ ہاؤس کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔

جب رات کو میں اور رنگو دوبارہ وہاں گئے تو مینار کی روشنی دور سے ہی دکھائی دے رہی تھی۔ کلارا نے سنہرے

ٹ کا لباس پہن رکھا تھا اور دونوں کانوں میں سرخ پھول رکھے تھے۔ اس نے ہمیں ڈائننگ روم میں بٹھایا اور ڑی تواضع مچھلی اور مکئی کی روٹی سے کی۔ ہم کچھ دیر باتیں رتے رہے پھر میں نے مشروب کی بوتل کھولی جو اپنے اتھ لے کر گیا تھا۔ ہمارے درمیان مختلف موضوعات پر فتگو ہوئی۔ اس کے مرحوم شوہر کا تذکرہ بھی آیا پھر وہ مجھ ے سابقہ زندگی کے بارے میں پوچھتی رہی جو میں نے یثیت پولیس آفیسر گزاری تھی۔ اسے سیاست سے بھی چپی تھی اور وہ صدر کی بڑی مداح تھی پھر اس نے میری نگ کے بارے میں پوچھا۔ اس دوران رنگو کی نظریں سلسل کلارا کی بلی کو تلاش کرتی رہیں لیکن وہ نظر نہیں آئی۔

نصف شب کے قریب کلارا معذرت کرکے میز سے ٹی اور اس نے ایک لیمپ لا کر ہمارے درمیان رکھ دیا۔ رہم باہر نکلے اور پورے چاند کا نظارہ کرنے لگے۔ میں نے اس سے گیسٹ ہاؤس کی چابیاں مانگیں تاکہ کمرے کا ائزہ لے سکوں۔ یہ طریقہ میں نے پولیس اکیڈمی میں سیکھا ا۔ وہ اپنی بات پر سختی سے قائم تھی کہ جب وہ لائٹ ہاؤس ں اپنی خواہش بیان کر رہی ہو تو میں نیچے ہی ٹھہروں۔

جب وہ اوپر چلی گئی تو میں نے ایک سگریٹ سلگایا ور بیچ ہاؤس کی طرف چل دیا پھر میں نے دوربین نکال کر ئٹ ہاؤس اور اس کے آس پاس ساحل کا جائزہ لیا۔ لارا نے لائٹ ہاؤس کی روشنی بجھا دی تھی اور روشن مینار شمالی حصے کی طرف چلی گئی تھی۔ میں بھی ساحل کی طرف ں دیا تاکہ اسے شمال کا رخ کرتے دیکھ سکوں۔ چراغ ی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور لب حرکت ر رہے تھے۔

فاصلے پر واقع تمام گھروں کی کھڑکیاں بند تھیں اور وہ مل طور پر تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے البتہ پورے ند کی روشنی میں آبی راستہ نظر... آ رہا تھا جس کی ب دور سے ہی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ی۔ بارہ بج کر ایک منٹ ہو چکا تھا۔ میری نظریں بے ار لائٹ ہاؤس کی طرف اٹھ گئیں۔ کھڑکی سے چراغ کی اتی ہوئی روشنی نظر آ رہی تھی اور کلارا کا منہ اس کی طرف ر میں نے وہاں کسی شے کو حرکت کرتے دیکھا۔

وہ ایک جھینگے پکڑنے والی کشتی تھی۔ میں نے دوربین ۔ چاند کی روشنی میں کشتی میں دو آنکھیں مجھے دیکھ رہی ں۔ میں نے غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ ان آنکھوں ی دوربین چڑھی ہوئی تھی۔ گویا وہ کوئی عام کشتی نہیں تھی بلکہ کوئی قصداً اس جانب آ رہا تھا۔

میں اس جانب دوڑ پڑا۔ گوکہ یہ میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔ گیلی ریت پر لکڑی کی ٹانگ سے دوڑنے میں دقت ہو رہی تھی لیکن میں نے اپنی طرف سے بہترین کوشش کی اور دونوں بازو پھیلا کر زور زور سے سانس لینے لگا۔ سو گز چلنے کے بعد اب مجھے کشتی کی کھڑکی میں سے جھانکتی ہوئی دوربین نظر نہیں آ رہی تھی۔ جب میں قریب پہنچا تو دیکھا کہ کشتی کے کیبن میں سے ایک سایہ نکلا اور سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگا۔

’’رک جاؤ۔‘‘ میں نے زور سے چلاتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا لیکن اس نے میری آواز پر کوئی توجہ نہیں دی اور ساحل کی طرف بڑھتا رہا۔ اس کی رفتار بھی میرے مقابلے میں زیادہ نہیں تھی شاید اسے بھی میری طرح چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

چاند کی مدھم روشنی میں وہ کافی بڑا لگ رہا تھا اور فلموں میں نظر آنے والے بھوتوں کی طرح مبالغہ آمیز انداز میں چھلانگیں مارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے بازو بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور سر گنجا تھا۔

’’رک جاؤ۔‘‘ میں نے پھر کہا لیکن اس مرتبہ بھی اس نے مجھے نظرانداز کر دیا۔ ’’میں نہیں سمجھتا کہ ہم میں سے کوئی بھی تیز دوڑ سکتا ہے۔‘‘ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اب وہ سرکنڈوں تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے اپنے آپ کو آگے کی جانب دھکیلا تو سارا زور میری اس ٹانگ پر آ گیا جو صحیح حالت میں تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا اور وہی ہوا۔ سرکنڈوں تک پہنچتے ہی میرا توازن بگڑ گیا۔ میں اس کے اوپر گرا اور اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔

ہم دونوں ایک زوردار آواز کے ساتھ ریت سے ٹکرائے۔ میرے نتھنوں سے آفٹر شیو لوشن اور تمباکو کی بو ٹکرائی۔ ایک بھاری ہاتھ میرے چہرے سے لپٹا ہوا مجھے دور دھکیل رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک زوردار گھونسا رسید کیا اور میرا سر جھنجھنا اٹھا پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو کلارا کے فرنٹ روم میں پایا۔ میرا سر پھوڑے کے مانند دکھ رہا تھا۔

میں ایک دیوان پر لیٹا ہوا تھا اور رنگو میرے برابر میں رونی صورت بنائے بیٹھا ہوا تھا۔ کلارا مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر تیزی سے باہر گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ ’’میں نے اس میں تھوڑی سی بوربون

ڈال دی ہے۔" اس نے کہا۔ "تاکہ تمہاری تکلیف کم ہوجائے۔"

میں نے دیوارگیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ کھڑکی سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی جس سے میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ میری بائیں آنکھ پر سوجن آگئی تھی۔

"رات تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے اس آدمی کے بارے میں بتایا جو کشتی میں آیا تھا اور میں نے اس کا مختصر تعاقب کیا۔

"رات تم نے اپنی تیسری خواہش بیان کی تھی۔ کیا وہ پوری ہوگئی؟" میں نے پوچھا۔ "آج صبح تمہیں اپنی دہلیز پر کوئی چیز ملی؟"

"ہاں اور وہ تم تھے۔" اس نے کہا۔ "میں نے اپنی خواہش بیان کی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور تمہیں ڈھونڈنے گئی۔ تقریباً بیس منٹ بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازے پر جا کر دیکھا تو تم وہاں پڑے ہوئے تھے۔"

"اوہ...... تو میں اس طرح یہاں پہنچا؟ تم نے کیا خواہش کی تھی؟"

اس کے چہرے پر سرخی آگئی اور وہ شرماتے ہوئے بولی۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں تمہاری آنکھ پر لگانے کے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں پھر میرے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے وہ فریج میں کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی دروازے پر زوردار دستک سنائی دی۔ اس کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑلیا۔ پتا نہیں یہ مشروب کا اثر تھا یا اس شخص کا گھونسا اتنا زوردار تھا کہ اس کی دھمک ابھی تک میرے سر میں ہو رہی تھی۔

میں دیوان سے اترا اور ڈگمگاتا ہوا دروازے تک گیا۔ وہاں ایک لمبا چوڑا شخص ایک ہاتھ میں گلدستہ اور دوسرے میں مشروب کی بوتل لیے ہوئے کھڑا تھا اور اس نے گرے کاؤبوائے ہیٹ سے اپنا سر ڈھانپ رکھا تھا۔

اس نے مشروب کی بوتل مجھے پکڑائی پھر اپنی مٹھی سینے پر رکھی اور دائرے کی شکل میں دل کے گرد گھمانے لگا۔ اس نے قیمتی گرے رنگ کا سوٹ اور سلور کلر کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کا قد چھ فٹ پانچ انچ اور عمر اسّی برس کے قریب تھی۔ سیاہ جلد پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور دونوں کانوں میں آلۂ سماعت لگا ہوا تھا۔

"میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے گلدستہ لکڑی کی میز پر رکھا۔ اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے نوٹ پیڈ اور پین نکالا اور اس پر لکھا۔ "جوان۔ مجھے تمہاری آنکھ زخمی ہونے کا افسوس ہے۔" پھر نوٹ پیڈ مجھے دکھا دیا۔

گویا میں نے ایک بوڑھے شخص سے مار کھائی تھی تاہم وہ قدوقامت میں مجھ سے بہت زیادہ تھا۔ "آہ......" میں نے مسکراتے ہوئے اپنی ہتھیلی غیر ارادی طور پر اپنی آنکھ پر رکھ لی۔ اس کے کانوں میں آلۂ سماعت دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ رات کو وہ میری آواز پر جواب کیوں نہیں دے رہا تھا لیکن اس نے ہماری جاسوسی کیوں کی یا مجھے اتنی زور سے گھونسا کیوں مارا؟

میں نے اس کے ہاتھ سے پیڈ لے کر لکھا۔ "تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

اس نے پیڈ مجھ سے واپس لے لیا اور اس پر کچھ لکھنے ہی والا تھا کہ کلارا ابیل ہاتھ میں آئس بیگ لے کر آئی۔

"اسے تم اپنی آنکھ پر رکھ کر دیکھو۔"

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کلارا کے ہاتھ سے تھیلی گر پڑی۔ مرد نے بھی پین اور قلم نیچے گرا دیا۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے۔

"کلارا ابیل!" اس نے بلند آواز میں کہا پھر اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر گلدستہ اٹھایا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔ پھر اپنا ہیٹ اتار کر اسے گلدستہ دیتے ہوئے بولا۔

"اس بات کو کافی عرصہ ہوگیا ہے۔" اس کا لہجہ پُراعتماد تھا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

کلارا نے اس سے پھول لے لیے اور ایک ہاتھ منہ پر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

"تم ایک دوسرے کو جانتے ہو؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

کلارا نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا پھر اپنا چشمہ اتار کر اسے صاف کرتے ہوئے بولی۔ "یہ میری تیسری خواہش تھی۔"

اس کا نام جیٹ وارتھنگٹن تھا۔ وہ مڈلینڈ میں کلارا کے ساتھ ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ کبھی ڈیٹ پر نہیں گئے لیکن ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے تاہم وقت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اس نے نوٹ پیڈ پر لکھ کر بتایا کہ کس طرح ایک حادثے میں بلندی سے گرنے پر اس کی سماعت اور

...کت متاثر ہوئی۔

ہم تینوں عقبی پورچ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ...شخص نے شمال کی طرف اشارہ کرکے اپنے پیڈ پر لکھا۔ ...میں نے تمہارے گھر سے قریب ترین مکان خریدا۔ میں ...یں چاہتا تھا کہ تم اکیلی رہو۔"

"لیکن تم نے یہ سب کیوں کیا؟" کلارا نے پوچھا۔

اس آدمی نے بھویں اوپر اٹھائیں اور نوٹ پیڈ کا ...ہ پلٹ کر لکھا۔ "تم جانتی ہو ڈارلنگ کہ میں نے ایسا ...یوں کیا، میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہا۔"

کلارا اسے حیرت سے دیکھنے لگی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں نے تمہیں ان چالیس سالوں میں کبھی نہیں دیکھا۔"

اس شخص نے محض کندھے اچکا دیے اور چائے پیتا رہا۔

"تم نے ہی کلارا کو وہ رقم دی تھی؟" میں نے اس ...کے نوٹ پیڈ پر لکھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر نوٹ پیڈ کا اگلا صفحہ ...لٹ کر اس نے لکھا۔ "میں نے لائٹ ہاؤس میں کام کرنے ...لے رنگ ساز سمیٹی لیڈل کو ایک معقول رقم دے کر کہا کہ وہ ...وقع دیکھ کر یہ چراغ وہاں رکھ دے۔"

یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور ایک اور صفحہ ...لٹ کر لکھا۔ "میں روزانہ نصف شب کے قریب اس پرانی ...شتی پر آیا کرتا تھا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ کلارا کی اس ...نظر پڑی یا نہیں۔"

میرا خیال تھا کہ کلارا ابھی یہ سن کر قہقہہ لگائے گی لیکن ...نہیں ہوا بلکہ وہ کچھ مایوس دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ...ے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو یہ جادوئی چراغ نہیں ہے؟"

جیٹ نے نفی میں سر ہلایا اور پیڈ کے اگلے صفحے پر ...ھا۔ "یہ میں نے دبئی میں ایک پرانی چیزوں کی دکان سے ...یدا تھا۔"

"لیکن کیوں؟" کلارا بولی۔ "میرا مطلب ہے کہ تم ...ن کے بغیر بھی مجھ تک پہنچ سکتے تھے پھر یہ سب کرنے کی کیا ...رورت تھی؟"

اس نے لمحہ بھر کے لیے دور خلا میں دیکھا پھر اگلے ...پر لکھا۔ "شاید یہ ممکن نہ ہوتا اسی لیے میں نے تم تک پہنچنے ...کے لیے یہ راستہ اختیار کیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ تمہارے ...ں میں کیا ہے۔"

"تم نے اتنی بڑی رقم کہاں سے حاصل کی؟" میرا ...ں اپنی جگہ برقرار تھا۔

اس نے اپنے سوٹ کی جیب سے ایک بزنس کارڈ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ وہ وارتھنگٹن گلوبل پیٹرولیم کا تھا۔ میں نے بہ آوازِ بلند پڑھا۔ "جیٹ وارتھنگٹن۔ بانی اور چیف ایگزیکٹو آفیسر!" میں نے ہلکی سی سیٹی بجائی اور کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اس بوڑھے نے پیڈ کا صفحہ ایک بار پھر پلٹا اور اس پر لکھنے لگا۔ "ہر شخص کی پہلی خواہش ہوتی ہے کہ اسے دس لاکھ ڈالر مل جائیں۔ چنانچہ میں نے بھی کلارا تک پہنچنے کے لیے اس رقم کا انتظام کیا اور جب مجھے اطلاع ملی کہ سمیٹی نے وہ چراغ لائٹ ہاؤس میں رکھ دیا ہے تو میں اپنے بینک گیا اور یہ رقم نکال لی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اس وقت بینک منیجر کا کیا حال ہوا ہوگا؟"

"اس کی بہن کا سامان اور تصویر تمہیں کہاں سے ملی؟"

"اوہ...... اس سوال کا جواب میں دے سکتی ہوں۔" کلارا بولی۔ "اور مجھے یقین ہے کہ وہ درست ہوگا۔ جیٹ کے ڈیڈی کی مڈلینڈ میں ایک اسٹوریج کمپنی تھی۔ جب میری بہن کا انتقال ہوا تو میں نے اس کا سامان وہاں رکھوا دیا اور منتظمین کو اجازت دے دی کہ وہ یہ اشیا نیلام کے ذریعے فروخت کردیں۔ میرا اندازہ ہے کہ سب سے اونچی بولی تم نے ہی لگائی ہوگی۔"

جیٹ نے تعظیماً اپنا سر جھکایا اور دونوں بازو پھیلا دیے جیسے وہ حاضرین سے داد وصول کر رہا ہو۔

اب سب کچھ واضح ہوچکا تھا اس لیے میں نے دو محبت کرنے والوں کے درمیان رکنا مناسب نہ سمجھا۔ "اب مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ان دونوں میں سے کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

میں لنگڑاتا ہوا اپنی جیپ کی طرف چل دیا۔ رنگو پیچھے رہ گیا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لیے پلٹا۔ کلارا اور جیٹ ابھی تک ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ اور لب خاموش تھے۔ میں نے جیپ کا انجن اسٹارٹ کیا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ ایک خوشگوار دن تھا لیکن میں اسے یادگار کہوں گا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ خوشیاں یوں بھی اچانک اور غیر متوقع طور پر ملتی ہیں اور خواہشوں کے پورا ہونے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ وہ جادوئی چراغ نہیں تھا لیکن کلارا نے اس کے سامنے اپنے دل میں چھپی برسوں کی خواہش بیان کردی اور اس طرح جیٹ اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور ایک بار پھر یہ ثابت ہوگیا کہ محبت کبھی نہیں مرتی۔



نافرمان

مرزا امجد بیگ

یہ بات تو طے ہے کہ انسان اپنے مرکز، اپنی پناہ گاہ سے دغا کرکے خوش نہیں رہ پاتا... اس نے بھی یہی غلطی کی اور اپنے ہی گھر کو جہنم اور اپنے رشتوں کو بوجھ سمجھ کر جب اس نے سرکشی کی تو باہر دنیا کی گرم ہواؤں نے اسے بری طرح جھلسا کر رکھ دیا اور کہیں اسے عارضی چھاؤں تک نصیب نہ ہوسکی اور تب اس نے جانا کہ والدین اور اولاد کے درمیان اللہ نے کیسا مضبوط اور عجیب رشتہ قائم کیا ہوا ہے جو اپنی اولاد کو دنیا کے جہنم زار سے بچا کر ٹھنڈک کا احساس دیتے ہیں۔ اس نے بھی یہ اعتراف تو کیا مگر ایک ایسے قتل کے بعد جس کا خون ناحق اس کی گردن پر تھا اور یہی وہ مقام تھا... جہاں اسے اپنے پرائے کا احساس ہوا... یہ اور بات کہ یہ احساس دلانے کے لیے مرزا امجد کو عدالتی کارروائیوں کا سہارا لینا پڑا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ویسا نہ ہوتا، جیسا ہونا چاہیے تھا۔

ایک نافرمان بیٹے کی پشیمانی اور پریشانیوں کا

دلچسپ احوال

عورت کی آواز میں حد درجہ گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔ میرے ''ہیلو'' کے جواب میں اس نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔

''آپ امجد بیگ صاحب بات کررہے ہیں نا؟''

''جی۔ میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔'' میں نے بڑی رسان سے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''آپ کون اور...... میرا نمبر آپ کو کس نے دیا ہے؟''

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور یہ فون میرے گھر کے نمبر پر آیا تھا اس لیے میرا دریافت کرنا عین فطری اور منطقی تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آواز سے میں اس عورت کو پہچان نہیں سکا تھا۔ مذکورہ عورت نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''میرا نام صدف ہے اور میں آپ کے ایک دوست کی بیٹی ہوں۔ میں نے ابو سے آپ کا نمبر لیا ہے اور انہی کے کہنے پر آپ کو فون کررہی ہوں۔''

بات اب بھی کلیئر نہیں ہوئی تھی۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''آپ کے ابو کا نام کیا ہے؟''

''مظفر علی۔'' اس نے بتایا۔ ''ابو ایک سرکاری محکمے میں تھے۔ اب ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں اور...... مفلوج بھی ہیں۔''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز میں نمی اتر آئی تھی۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ صدف میرے کس دوست کا ذکر کررہی تھی۔ میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ انکوائری آفس کے علاقے میں رہتے ہیں نا؟''

''جی بالکل۔'' صدف نے تصدیقی انداز میں کہا۔

''اور دس بارہ سال پہلے آپ کی امی اور بڑے بھائی کا ایک کار حادثے میں انتقال ہوگیا تھا...... کراچی سے حیدرآباد جاتے ہوئے۔ وہ حادثہ اتنا خطرناک تھا کہ ان دونوں کی باڈیز کو باہر نکالنے کے لیے کار کے مختلف حصوں کو باقاعدہ کاٹنا پڑا تھا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ ''ہائی وے پر ایک تیز رفتار ٹرک نے ان کی کار کو

کچل کرر کھ دیا تھا۔‘‘

میں نے اس کی افسردگی کو کم کرنے کی غرض سے پوچھا۔ ’’مظفر صاحب کا کیا حال ہے؟‘‘

’’ابو تو بس جیسے ہیں، سو ہیں۔‘‘ وہ سرسری انداز میں بولی۔ ’’اس وقت میں نے آپ کو کسی اور مقصد کے لیے فون کیا ہے۔ ہم بیٹھے بٹھائے ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں......‘‘

’’کیا ہو گیا بھئی؟‘‘ میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’کاشف کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔‘‘ وہ روہانسی ہوگئی۔

میری معلومات کے مطابق کار ایکسیڈنٹ میں صدف کا بڑا بھائی اشعر اور اس کی والدہ ساجدہ جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس فیملی میں دو افراد باقی بچے تھے یعنی مظفر علی اور صدف۔ صدف نے کسی کاشف کی گرفتاری کا ذکر کیا تو میں نے چونکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

’’یہ کاشف صاحب کون ہیں؟‘‘

’’کاشف میرے شوہر ہیں بیگ صاحب۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’دو سال پہلے میری شادی کاشف سے ہوئی تھی۔ ہمارا ایک سال کا بیٹا بھی ہے جس کا نام میں نے اپنے مرحوم بھائی کے نام پر اشعر رکھا ہے اور جو ’’ببلو‘‘ کے نام سے مشہور ہے۔‘‘

میں نے کام کی بات کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ’’پولیس نے آپ کے شوہر کو کس چکر میں گرفتار کیا ہے؟‘‘

’’کاشف پر قتل کا الزام ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’کس کے قتل کا؟‘‘

’’اپنے باس اعجاز حسین کے قتل کا الزام۔‘‘

’’اوہ......‘‘ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’یہ کب کی بات ہے؟‘‘

’’کاشف کو گزشتہ رات دس بجے گھر سے گرفتار کیا گیا ہے۔‘‘ صدف نے بتایا۔ ’’یعنی لگ بھگ چوبیس گھنٹے پہلے۔‘‘

’’ہوں......‘‘ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ’’اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج صبح پولیس نے کاشف کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کرلیا ہوگا۔‘‘

’’آپ کا اندازہ بالکل درست ہے بیگ صاحب۔‘‘ وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ’’اس وقت کاشف پولیس کسٹڈی میں ہے۔‘‘

’’اور آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں کاشف کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لوں۔‘‘ میں نے صدف کے دل کی خواہش کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ’’تاکہ آپ کا شوہر اس جھمیلے سے نکل کر باعزت بری ہو جائے؟‘‘

’’جی۔ میں بالکل ایسا ہی چاہتی ہوں۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

آیندہ دس پندرہ منٹ میں، میں نے گھما پھرا کر صدف سے ایک درجن سوالات کیے جس کے نتیجے میں اس کیس کی ابتدائی معلومات مجھ تک پہنچ گئیں۔ بات کے اختتام پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’کاشف عرصہ سات یوم کے ریمانڈ پر ہے۔ اس ہفتے کے دوران میں کوئی عدالتی کارروائی تو ہو نہیں سکتی۔ البتہ مجھے کیس کی اسٹڈی اور تیاری کا اچھا خاصا موقع مل جائے گا۔ میں کل کسی وقت متعلقہ تھانے جا کر کاشف سے ایک ملاقات بھی کرلوں گا۔ وکالت نامہ اور درخواستِ ضمانت پر اس کے دستخط لینا ہوں گے۔ چند اہم قانونی کاغذات پر مجھے آپ کے دستخط کی ضرورت پیش آئے گی۔‘‘

’’آپ جب بھی کہیں گے، میں آپ کے آفس آکر دستخط کر دوں گی۔‘‘ صدف نے کہا۔ ’’اور آپ کی فیس بھی ادا کر دوں گی۔‘‘

’’فی الحال آپ کو میرے آفس آنے کی ضرورت نہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں کل آفس سے اٹھنے کے بعد مظفر صاحب کی مزاج پرسی کے لیے آپ کے گھر آ جاؤں گا۔ ان سے ملاقات کیے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ ویسے بھی انکوائری آفس کا علاقہ میرے گھر کے راستے میں پڑتا ہے۔‘‘

’’یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔‘‘ وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولی پھر پوچھا۔ ’’کاشف باعزت رہا ہو جائے گا نا؟‘‘

’’انشاءاللہ!‘‘ میں نے پورے تیقن سے کہا۔ ’’اگر آپ کا شوہر قتل کے کسی معاملے میں ملوث نہیں تو پھر اس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔‘‘

’’اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔‘‘ وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔ ’’مجھے تو یقین ہے کہ کاشف کا اعجاز حسین کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت اس معاملے میں پھنسایا گیا ہے۔‘‘

’’اس نوعیت کی سازش بننے والوں کو گھیرنا مجھے آتا ہے۔‘‘ میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ’’آپ کو پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔‘‘

اس نے تہِ دل سے میرا شکریہ ادا کیا۔

میں نے تسلی دے کر رابطہ موقوف کر دیا۔

آگے بڑھنے سے پیشتر میں اس کیس کا ہلکا پھلکا پس منظر آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

کاشف کا تعلق صحافت کی دنیا سے تھا۔ وہ شام کے

ایک معروف اخبار کے لیے رپورٹنگ کرتا تھا۔ مذکورہ اخبار کا نام آپ ’’کھوجی‘‘ فرض کرلیں۔ کھوجی کے مالک اور پبلشر اعجاز حسین کی رہائش گلشن اقبال کے علاقے میں تھی۔ کاشف کو ’’کھوجی‘‘ کے لیے رپورٹنگ کرتے کافی عرصہ ہو گیا تھا اور آج وہ اپنے باس اعجاز حسین کے قتل کے الزام میں ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں تھا۔ اس نے ٹاپ آف دی لائن واقعات کی رپورٹنگ کی تھی اور اب مختلف اخبارات اسی رپورٹر کی گرفتاری کی خبریں چھاپ رہے تھے۔ حریف اخبارات نے تو اس ایشو کو منفی انداز میں اسے بارہ مسالوں کی چاٹ بنا دیا تھا۔ بہرحال، اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں۔

اعجاز حسین کو اس کی رہائش گاہ پر قتل کیا گیا تھا اور یہ افسوس ناک واقعہ چودہ اکتوبر کی رات کے ابتدائی حصے میں پیش آیا تھا اور کاشف کے خلاف سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ انہی اوقات میں وہ اپنے باس سے ملنے اس کے بنگلے پر گیا تھا۔ کاشف جب گلشن اقبال سے واپس اپنے گھر واقع انکوائری آفس پہنچا تو تھوڑی دیر کے بعد پولیس وہاں آدھمکی تھی چنانچہ کم و بیش دس بجے رات کاشف کو ’’کھوجی‘‘ کے مالک اعجاز حسین کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ صدف سے شادی کے بعد کاشف نے انہی کے پاس رہنا شروع کر دیا تھا۔ گویا ایک لحاظ سے وہ گھر داماد تھا۔

صدف نے مجھے بتایا تھا کہ اس واقعے سے قبل کاشف خاصا پریشان تھا کیونکہ اعجاز حسین نے اسے نوکری سے نکالنے اور جیل بھجوانے کی دھمکی دے رکھی تھی اور کاشف اسی سلسلے میں اپنے باس کی منت سماجت کرنے اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اعجاز حسین اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا لہٰذا وہ مایوس و نامراد وہاں سے واپس لوٹ آیا تھا اور اپنے گھر میں داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد اسے گرفتار کرلیا گیا تھا۔

واقعات کے مطابق کاشف پر پیداگیری کا الزام تھا اور یہ شکایت کراچی کے ایک بہت بڑے کاروباری شخص نے کی تھی۔ اس کاروباری شخص کا نام رفیق الدین تھا۔ رفیق الدین مختلف قسم کے فوڈ آئٹمز تیار کرتا تھا۔ اس کی فوڈ پروڈکٹس ملک کے تمام حصوں میں فروخت ہوتی تھیں۔ رفیق الدین ان فوڈ آئٹمز کو بیرونِ ملک ایکسپورٹ بھی کرتا تھا۔

کاشف نے رفیق الدین کی تیار کردہ فوڈ پروڈکٹس کے حوالے سے ایک باتصویر رپورٹ تیار کی تھی جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ ان پروڈکٹس کی تیاری میں کون کون سی ممنوعہ چیزیں اور خطرناک کیمیکلز استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد ذہن میں یہی تاثر ابھرتا تھا کہ رفیق الدین کی کمپنی مضرِ صحت فوڈ پروڈکٹس مارکیٹ میں پھیلا کر دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اس رپورٹ کے ذریعے رفیق الدین کی کمپنی کی ساکھ کو تباہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور مزے کی بات یہ کہ مذکورہ سنسنی خیز رپورٹ ’’کھوجی‘‘ میں شائع بھی ہو گئی تھی۔

رپورٹ کی اشاعت کے اگلے روز رفیق الدین نے کھوجی کے آفس فون کیا اور اخبار کے مالک سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ جلد ہی اعجاز حسین سے اس کی بات کروا دی گئی۔

’’میں رفیق الدین بات کر رہا ہوں...... اسٹار فوڈ پروڈکٹس کا مالک۔‘‘ اس نے خفگی آمیز لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔

رفیق الدین کی کمپنی کا نام ’’اسٹار‘‘ میں نے فرض کیا ہے کیونکہ کمپنی کے اصل نام کو ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

اعجاز حسین نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

’’جی فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔‘‘

’’خدمت تو میں آپ کی اور آپ کے اخبار کی کروں گا۔‘‘ رفیق الدین نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ’’اگر آپ نے میری شکایت کا معقول جواب نہیں دیا تو......‘‘

رفیق الدین کے انداز میں ایک خاص نوعیت کی دھمکی بڑی واضح محسوس کی جاسکتی تھی۔ اعجاز حسین سمجھ تو گیا کہ ماجرا کیا ہے تاہم اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

’’جی رفیق صاحب! آپ حکم کریں۔ میں آپ کی شکایت دور کرنے کی کوشش کروں گا۔‘‘

’’آپ کے اخبار میں گزشتہ روز میری کمپنی کے خلاف ایک رپورٹ شائع کی گئی ہے۔‘‘ رفیق الدین نے برہمی سے بتایا۔ ’’اس رپورٹ میں جو کچھ بھی بتایا گیا ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سراسر میری کمپنی کو برباد کرنے کی ایک گھناؤنی سازش ہے اور اس سازش میں آپ کا اخبار شامل ہے۔ میں آپ کے اخبار کے خلاف عدالت میں جاؤں گا۔‘‘

’’ہم نے کھوجی میں جو کچھ شائع کیا وہ مبنی بر دروغ نہیں ہے۔‘‘ اعجاز حسین نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ’’ہمارے رپورٹر نے اس پروجیکٹ پر کافی محنت کی ہے۔ اس کے پاس ٹھوس ثبوت ہیں۔‘‘

’’ان ٹھوس ثبوتوں کو تو آپ اپنے پاس سنبھال کر رکھیں۔ یہ عدالت میں آپ کے کام آئیں گے اور جہاں تک آپ کے رپورٹر کی بات ہے تو......‘‘ اس نے لمحاتی

توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
''میری نظر میں یہ رپورٹر اول درجے کا بلیک میلر ہے۔ اس نے میری کمپنی کی پروڈکٹس کے بارے میں جو رپورٹ تیار کی، اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔''
''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے جو رپورٹ شائع کی وہ ایک دم بوگس ہے۔'' اعجاز حسین نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کاشف نے اس سلسلے میں جھک ماری ہے......؟''
''جی بالکل۔ میرے کہنے کا یہی مطلب ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ کے رپورٹر نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ ''جھک'' ماری ہے اور جھک مارنے کے بعد وہ مجھ سے ملنے آیا تھا......''
''کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں؟'' اعجاز حسین نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔
''میں آپ کے محنتی اور قابلِ فخر رپورٹر کاشف کی بات کررہا ہوں۔'' رفیق الدین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ اپنی تیار کردہ رپورٹ کے ساتھ میرے پاس آیا تھا اور مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔''
''ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے۔'' اعجاز حسین نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کس قسم کی بلیک میلنگ کا ذکر کررہے ہیں؟''
''کیا آپ واقعی اتنے بے خبر پبلشر ہیں؟'' رفیق نے عجیب سے لہجے میں دریافت کیا۔
''میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔''
''اگر آپ ایسے ہی لاعلم ہیں تو پھر کوئی اور کام کرلیں۔'' رفیق الدین نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''صحافت آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔''
''میں اپنے اسٹاف پر بھروسا کرتا ہوں۔'' اعجاز حسین نے کہا۔ ''کاشف میرے لیے ایک قابلِ اعتماد رپورٹر ہے۔''
''دھوکا اور اعتماد کا چولی دامن کا ساتھ ہے اعجاز صاحب!'' رفیق الدین نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جہاں بہت زیادہ اعتماد ہوتا ہے وہیں سے دھوکے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے رپورٹر کے ٹیلنٹ سے بالکل واقف نہیں ہیں یا پھر سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ بھی اس سازش میں برابر کے شریک ہیں۔''
''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اعجاز حسین نے بیزاری سے کہا۔ ''میں کاشف کو بلا کر کڑی تفتیش کروں گا۔ فی الحال، آپ مجھے بتائیں کہ کاشف نے آپ کو کس طرح بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی؟''
''چند روز قبل آپ کے رپورٹر نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔'' رفیق الدین نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اپنی تیار کردہ مبنی بر دروغ رپورٹ مجھے دکھانے کے بعد اس نے کہا۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ رپورٹ کھوجی میں شائع نہ ہو تو آپ کو اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ میں نے کہا۔ اس رپورٹ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے تاہم میں جاننا چاہوں گا کہ آپ کا منہ بند کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ اس نے جواب دیا، اس کی قیمت ہے بیس ہزار روپے۔ میں نے دوٹوک انداز میں آپ کے رپورٹر سے کہہ دیا، میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میرا دامن صاف ہے لہٰذا میں تمہارے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہوں گا۔ ہاں، اگر تمہیں کچھ خرچہ وغیرہ چاہیے ہو تو میں دو تین سو دینے کو تیار ہوں۔ کاشف نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا، بیس ہزار سے ایک پیسا کم نہیں اور سوچنے کے لیے میں آپ کو صرف ایک دن کی مہلت دے سکتا ہوں۔ اگر آپ نے میرا مطالبہ پورا نہیں کیا تو یہ رپورٹ کھوجی میں شائع ہوجائے گی......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''میں نے آپ کے بدعنوان رپورٹر کا ناجائز مطالبہ پورا نہیں کیا۔ لہٰذا آپ کے اخبار نے میری کمپنی کو نقصان پہنچانے کے لیے وہ جھوٹی رپورٹ شائع کردی۔''
رفیق الدین جتنے اعتماد اور وثوق سے بات کررہا تھا اس نے اعجاز حسین کو الجھا کر رکھ دیا۔ کاشف کے حوالے سے پہلے اس قسم کی کبھی کوئی شکایت سننے کو نہیں ملی تھی۔ دوسری جانب وہ سرِدست رفیق الدین کے دعوے کو جھٹلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا لہٰذا اس نے بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
''رفیق صاحب! آپ مجھے ایک دن کی مہلت دیں۔ میں اپنے طور پر اس سلسلے میں کاشف سے ضروری پوچھ تاچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں کل آپ کی شکایت کا تسلی بخش جواب دوں گا۔''
''آپ ایک دن کی مہلت لیں یا دس دن کی اُس سے میرا موقف تبدیل نہیں ہوگا۔'' رفیق الدین نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''آپ کے اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹ سے میری کمپنی کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا ہے، میں

کسی بھی قیمت پر اسے فراموش نہیں کرسکتا۔''
ایک فوری خیال کے تحت اعجاز حسین نے پوچھ لیا۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''
''اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اس معاملے کو عدالت میں نہ لے جاؤں تو آپ کو دو میں سے میری ایک بات ماننا ہوگی۔''
''کون سی دو باتیں؟'' اعجاز حسین نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''آپ کے رپورٹر نے اس رپورٹ کو شائع نہ کرنے کے لیے مجھ سے بیس ہزار روپے کا مطالبہ کیا تھا۔'' رفیق الدین نے کسی ماہر کھلاڑی کے انداز میں کہا۔ ''اور میں اس رپورٹ کو شائع کرنے کا جرمانہ آپ سے دوگنا وصول کرنا چاہتا ہوں...... یعنی چالیس ہزار روپے!''
''اوہ......'' اعجاز حسین نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر استفسار کیا۔ ''اور دوسری بات؟''
''دوسری بات یہ کہ اگر آپ اپنے رپورٹر کو نوکری سے نکال دیں تو میں اپنے مطالبے میں ففٹی پرسنٹ کمی کرنے کو تیار ہوں۔'' رفیق الدین نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''یعنی کاشف کو برخاست کرنے کی صورت میں، میں آپ سے بیس ہزار لے کر معاملہ رفع دفع کرنے کو تیار ہوں۔''
''کیا یہ بلیک میلنگ نہیں ہے؟'' اعجاز حسین نے ترش لہجے میں سوال کیا۔
''آپ میری پیشکش کو بلیک میلنگ سمجھیں یا وہائٹ میلنگ، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' رفیق الدین نے روکھے پھیکے انداز میں کہا۔ ''اگر میری بات آپ کی سمجھ میں آتی ہے تو ٹھیک ورنہ عدالت کا دروازہ تو ہر خاص و عام کے لیے کھلا ہے۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ آپ کی جان سستے میں چھوٹ جائے۔ عدالت کے ذریعے میں جو ہرجانہ وصول کروں گا وہ ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہوگا۔''
''ٹھیک ہے، ہم اس موضوع پر کل بات کریں گے۔'' اعجاز حسین نے یہ کہہ کر ایک دن کی مہلت لے لی۔
اس مہلت کے دوران میں اعجاز حسین نے کاشف سے کڑی پوچھ گچھ کی لیکن کاشف کے جوابات نے اعجاز حسین کی تسلی نہیں کی۔ کاشف شائع شدہ اپنی رپورٹ کے حوالے سے کوئی ایسا ٹھوس ثبوت پیش نہیں کرسکا جسے عدالت میں رفیق الدین کے دعوے کے خلاف استعمال کیا جاسکتا۔ کاشف نے خود کو اور اپنی رپورٹ کو سچا ثابت کرنے کے لیے باس کے سامنے جتنے بھی دلائل دیے ان کی زبانی کلامی تو اہمیت نظر آتی تھی مگر عدالت کی نظر میں وہ سب بے بنیاد اور بے کار کی باتیں تھیں۔ اعجاز حسین بخوبی سمجھ رہا تھا کہ اگر رفیق الدین نے اپنی کمپنی کے حوالے سے ''ہتک عزت'' ٹائپ کا کوئی مقدمہ دائر کردیا تو جان چھڑانا مشکل ہوجائے گی۔ وکیلِ استغاثہ کاشف کی باتوں کو بڑی آسانی سے ''من گھڑت قصے'' ثابت کردے گا اور عدالت ان کے خلاف فیصلہ دے گی۔
''اب میرے پاس صرف دو ہی راستے ہیں۔'' اعجاز حسین نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کاشف سے کہا۔ ''یہ تو طے ہے کہ میں رفیق الدین کو عدالت کا دروازہ نہیں...... کھٹکھٹانے دوں گا۔ یہ معاملہ عدالت سے باہر ہی سیٹل کرنا ہوگا......''
کاشف نے سوالیہ نظر سے اپنے باس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کن دو راستوں کا ذکر کررہے ہیں؟''
''میں اپنی جیب سے بیس ہزار روپے رفیق الدین کو ادا کردوں اور تمہیں نوکری سے نکال دوں۔ اس طرح یہ معاملہ رفع دفع ہوجائے گا۔'' اعجاز حسین نے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ ''دوسری صورت یہ ہے کہ تمہیں اپنی نوکری برقرار رکھنے کے لیے فوری طور پر بیس ہزار روپے کا بندوبست کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس حالت میں مجھے رفیق الدین کو چالیس ہزار دینا ہوں گے۔ بیس تم دو گے اور بیس میں ملا دوں گا۔ میں اس سے زیادہ تمہیں فیور نہیں دے سکتا۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے کاشف......!''
''سر! میں اتنی بڑی رقم ارینج نہیں کرسکتا۔'' کاشف نے منت ریز انداز میں کہا۔ ''آپ جانتے ہیں، یہ تو میری سال بھر کی سیلری کے برابر ہے......''
''تو یہ سب ایسا کام کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا نا!'' اعجاز حسین نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''میں نے ہمیشہ صاف ستھری صحافت کی ہے۔ مجھے تم سے ایسی گھٹیا حرکت کی امید نہیں تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ رفیق الدین نے عدالت سے رجوع کرنے سے پہلے براہِ راست مجھ سے رابطہ کرلیا ورنہ بدنامی الگ ہوتی اور اس کے دعوے کے مطابق ہرجانہ بھی ادا کرنا پڑتا جو یقیناً لاکھوں میں ہوتا۔''
''سر! آپ میری بات کا یقین کریں۔'' کاشف اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''میری رپورٹ غلط نہیں ہے لیکن......''
''بس، بس......'' اعجاز حسین نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ''مجھے تمہاری اور بکواس نہیں

سننا۔ اگر تمہاری رپورٹ درست بھی ہے تو میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ جب ہم اپنے موقف کو عدالت میں سچا ثابت نہیں کرسکتے تو پھر ہمیں یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ اسے اپنے اخبار کا سہارا لے کر اچھالتے پھریں۔ یہ صحافت کے نام پر دھبا ہے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے بہت کچھ ہو رہا ہوتا ہے لیکن بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے کسی بھی معاملے میں ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اب بھگتو بھی۔ اگر نوکری سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتے تو جلد از جلد بیس ہزار روپے کا انتظام کرلو۔ بصورت دیگر میں تمہیں فائر کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔ میرے لیے کھوجی کی نیک نامی ہر شے پر مقدم ہے۔“

اعجاز حسین کے حتمی انداز نے کاشف کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے ”اسٹار فوڈ پروڈکٹس“ کے بارے میں جو رپورٹ شائع کی تھی اس کے اندر حقیقت چھپی ہوئی تھی۔ یہ چونکہ ایک پوشیدہ حقیقت تھی جو کاشف کی کاوش سے منظرِ عام پر آگئی تھی لیکن عدم ثبوت کے باعث وہ ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اس حوالے سے اعجاز حسین کا کہنا درست تھا کہ دنیا میں ایسے بہت سے حقائق ہیں جن کا بے نقاب ہونا ضروری ہے لیکن بغیر ثبوت کے ان پر محض ڈسکس ہی کیا جاسکتا تھا۔ اب کاشف کو یا تو بیس ہزار روپے کا بندوبست کرنا تھا اور یا پھر کھوجی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا تھا۔

آج کل جس قسم کی صحافت ہورہی ہے اس کے تناظر میں تو اعجاز حسین کا کردار افسانوی اور دیومالائی سا نظر آتا ہے لیکن بہرحال ہر دور میں اور زندگی کے ہر شعبے میں ایماندار اور اصول پرست لوگ موجود ہوتے ہیں، چاہے آٹے میں نمک کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔

کاشف بیس ہزار روپے کے لیے پریشان تھا لیکن آپ یہ سوچ کر اپنے ذہن کو نہ الجھائیں کہ وہ بے وقوف اتنی تھوڑی سی رقم کے لیے اس درجہ پریشان کیوں تھا؟ یقیناً آج کل بیس ہزار روپے ایک معمولی رقم نظر آتی ہے مگر یہ واقعہ کم و بیش پینتیس سال پہلے کا ہے اور اس زمانے میں یہ رقم خاصی اہمیت کی حامل ہوا کرتی تھی۔ آپ اپنی الجھن کو دور کرنے کے لیے اس میں کم از کم ایک صفر کا اضافہ کرلیں۔ یہ آج کے دو لاکھ ہوجائیں گے اور مزے کی بات یہ کہ آج کل دو لاکھ روپے ارینج کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا دشوار آج سے پینتیس سال پہلے بیس ہزار روپے کا بندوبست کرنا ہوا کرتا تھا۔

اعجاز حسین درحقیقت کاشف کو اب اپنے اخبار میں نہیں رکھنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے احساسِ ذمے داری میں ڈینٹ پڑچکا تھا۔ یہ کوئی اتنی بڑی غلطی نہیں تھی کہ جسے معاف نہ کیا جاسکتا ہو لیکن جو لوگ اصول پرست اور قواعد و ضوابط کے پابند ہوتے ہیں، ان کے فیصلے بعض اوقات ظالمانہ نظر آتے ہیں۔ کاشف کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

چند روز تک اعجاز حسین نے کاشف کو پریشر میں رکھا پھر اسے صاف الفاظ میں بتادیا کہ کھوجی کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی نے کاشف کو مشورہ دیا کہ وہ اعجاز حسین کے گھر جاکر اس کی منت سماجت کرے اور بیس ہزار کے لیے باس کو یقین دہانی کرائے کہ وہ تھوڑے تھوڑے کرکے اپنی تنخواہ سے کٹوا دے گا۔ یہ ایک مناسب مشورہ تھا اور وقوعہ کے روز کاشف نے اس مشورے پر عمل بھی کیا مگر اعجاز حسین نے اس کی ایک نہیں سنی تھی چنانچہ کاشف کو اپنے باس کے گھر سے ناکام و نامراد لوٹنا پڑا تھا اور اب...... وہ اسی باس کے قتل کے الزام میں عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں تھا۔

کاشف ایک محنتی اور قابل رپورٹر تھا لیکن دوسری طرف جو شخص تھا اسے اپنے اصول عزیز تھے۔ کون غلط تھا اور کون صحیح، یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا اور یہ فیصلہ آنے والے وقت کو کرنا تھا۔ سرِدست حالات یہ بتاتے تھے کہ اصول پرست اپنے اصولوں کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کرگیا تھا اور خطاکار اس کے قاتل کی حیثیت سے قانون کے قبضے میں تھا اور مجھے اس خطاکار کو اس جرم کے الزام سے نکالنا تھا جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ اسٹار فوڈ پروڈکٹس کے حوالے سے سچی یا جھوٹی رپورٹ شائع کرنا اتنی سنگین خطا نہیں تھی کہ خطاکار کو ایک قاتل کی حیثیت سے پھانسی کی سزا سنادی جاتی......

☆☆☆

آئندہ روز میں اپنے آفس میں بیٹھا اپنے کلائنٹس کے ساتھ مصروف تھا کہ درمیانی عمر کی ایک عورت مجھ سے ملنے آئی۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ جب وہ میری میز کے سامنے ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ چکی تو میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”جی فرمائیے...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

”وکیل صاحب! میں اپنے شوہر کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔“ وہ غم زدہ آواز میں بولی۔ ”اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔“

میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر اس پریشان حال عورت کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ

اپنے شوہر کی وجہ سے کیوں پریشان ہیں؟“

”کاشف کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کاشف“ کے ذکر پر میں نے چونک کر اس عورت کی طرف دیکھا۔ گویا، صدف اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ نے میرے آفس آنے کی زحمت کیوں کی......؟“

”وکیل صاحب!“ اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ کاشف کی پریشانی مجھے کھینچ کر یہاں لے آئی ہے......“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن رات میں نے آپ سے کہہ تو دیا تھا کہ آپ کو میرے آفس آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود مظفر صاحب سے ملاقات کرنے آپ کے گھر آؤں گا۔“

وہ عورت مجھے ایسی نظر سے دیکھنے لگی جیسے اسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو۔ میں پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس نے فکرمند لہجے میں استفسار کیا۔

”وکیل صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

”وکیل صاحب! آج میں پہلی بار آپ کے آفس آئی ہوں۔“ وہ بہ دستور شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور آپ ایسا ظاہر کررہے ہیں جیسے ہماری دیرینہ شناسائی ہو۔ میں کسی مظفر صاحب کو نہیں جانتی اور...... یہ کہ پچھلی رات آپ کی مجھ سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔“

اب میرے لیے مقامِ حیرت تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مظفر علی کی بیٹی صدف تھی جس کا شوہر کاشف اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں تھا لیکن یہ عورت میرے اندازے کی نفی کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ اس خیال کے تحت کہ ہوسکتا ہے، اتفاق سے اس کے شوہر کا نام بھی کاشف ہو، میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”کیا آپ کے شوہر پر قتل کا الزام ہے؟“

”جی...... جی ہاں۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ”لیکن آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے استفسار کیا۔ ”آپ کے شوہر کاشف کا تعلق صحافت کے شعبے سے ہے۔ وہ کھوجی نامی شام کے ایک اخبار کے لیے رپورٹنگ کرتا ہے...... مطلب کرتا تھا۔ اس وقت تو وہ اپنے باس کے قتل کے الزام میں پولیس کی تحویل میں ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”آپ کی ساری باتیں درست ہیں اور میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ نے اخبارات میں کاشف کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا ہے۔ پچھلے چند روز سے کاشف کے حوالے سے بہت کچھ شائع ہورہا ہے۔ آپ ایک باخبر وکیل ہیں لیکن......“ لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”لیکن میں کسی مظفر صاحب کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی پچھلی رات میری آپ سے بات ہوئی ہے۔“

اس عورت کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صدف نہیں ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک شک نے سر ابھارا اور اپنے اس شک کو رفع کرنے کی غرض سے میں نے اپنے سامنے بیٹھی اس عورت سے کہا۔

”آپ مظفر صاحب کو فی الحال بھول جائیں اور یہ بھی نہ سوچیں کہ گزشتہ رات ہماری بات ہوئی تھی یا نہیں۔ آپ صرف اس بات پر فوکس کریں کہ آپ کا شوہر کاشف اس وقت ایک مصیبت میں گرفتار ہے اور آپ میری مدد سے کاشف کی مشکل آسان کرنا چاہتی ہیں۔“

”یہی حقیقت ہے وکیل صاحب!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اور مجھے لگتا ہے، میں بالکل ٹھیک جگہ پر آگئی ہوں۔ آپ میری مدد کریں گے نا......؟“

آخری جملہ اس نے بڑے امید بھرے انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”بالکل، میں آپ کی مدد کروں گا لیکن اس کے لیے آپ کو مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔“

”میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں وکیل صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”آپ کی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کو برداشت کرنے کی طاقت ہے مجھ میں۔“

”یہ سب تو انتہائی ضروری ہے اور آپ ہی کو افورڈ کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ایک اور کام ہے۔“

”کون سا کام؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اب وہ کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

’’میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کا معاملہ تو بعد میں آئے گا۔ پہلے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ میں آپ کے شوہر کا کیس لے رہا ہوں یا نہیں۔‘‘

’’اور یہ کس طرح طے ہوگا؟‘‘ اس کے استفسار سے فکرمندی جھلکتی تھی۔

’’بہت آسانی سے۔‘‘ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ’’ایک بات میں واضح کردوں کہ میں مجرموں کے کیس نہیں لیا کرتا۔ آپ مجھے کاشف کو پیش آنے والے واقعے کی تفصیل سے آگاہ کریں۔ اس بات کا میں خود فیصلہ کروں گا کہ آپ کا شوہر بے گناہ ہے یا نہیں۔ اگر وہ مجھے بے قصور نظر آیا تو پھر میں اس کا کیس لینے کے لیے تیار ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے، میں آپ کو پوری اسٹوری سناتی ہوں۔‘‘ وہ بڑے عزم سے بولی۔ ’’مجھے صد فیصد یقین ہے کہ کاشف نے اپنے باس کو قتل نہیں کیا۔‘‘

ایسا ہی کامل یقین صدف کو بھی تھا لیکن میرے سامنے بیٹھی وہ عورت صدف نہیں تھی۔ تھوڑی دیر پہلے میرے ذہن میں جس اندیشے نے سر اٹھایا تھا اس کی تصدیق کے لیے اس عورت کی کہانی سننا بہت ضروری تھا۔

آیندہ پندرہ منٹ میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں اس کے مطابق میرے سامنے بیٹھی ہوئی عورت کا نام شازیہ تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس اور پچاس کے درمیان قائم کیا۔ بعدازاں پتا چلا کہ وہ اپنی زندگی کی اڑتالیس بہاریں دیکھ چکی ہے۔ شازیہ مائل بہ فربہی بدن کی مالک ایک پستہ قامت عورت تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی پراسراریت پائی جاتی تھی جیسا کہ جاسوسی ذہن رکھنے والے افراد کے چہرے کے تاثرات ہوتے ہیں۔ ہر شے کو کھوجتی اور ٹٹولتی ہوئی متحرک آنکھیں اور تجسس آمیز اندازِ گفتگو..... سامنے والے کو شک کی نظر سے دیکھنا..... وغیرہ۔

شازیہ کا تعلق محکمۂ تعلیم سے تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے ٹیچنگ کر رہی تھی۔ اس کی رہائش گلشن ظہور میں تھی۔ یہ گلشن ظہور کا ایک تکونا مکان تھا جو شازیہ کی ذاتی ملکیت تھا۔ محکمۂ تعلیم میں رہتے ہوئے اس نے سب سے اچھا کام یہی کیا تھا کہ اپنے لیے ذاتی رہائش کا بندوبست کرلیا تھا۔ کاشف سے اس کی شادی کو پانچ سال ہوگئے تھے مگر ابھی تک وہ اولاد ایسی نعمت سے محروم تھے۔ یہ دو افراد کی ایک خوش باش فیملی تھی اور ایک فرد کی گرفتاری سے دوسرا فرد پریشانی میں آگیا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے شازیہ کے پس منظر کا ذکر بھی ضروری ہے۔

شازیہ کے والد کا انتقال ہوچکا تھا اور والدہ دل کی مریضہ تھیں۔ شازیہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس سے چھوٹا بھائی پینتالیس سال کا تھا۔ اس کا نام شکیل احمد تھا۔ شکیل ٹیکسی چلاتا تھا۔ وہ شادی شدہ تھا۔ اس کی شادی کو دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ اپنی بیوی جویریہ اور تین بچوں کے ساتھ پی آئی بی کے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ والدہ صاحبہ اپنے بیٹے کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ شازیہ اسکول سے چھٹی کرکے پہلے پی آئی بی کالونی جایا کرتی تھی۔ وہ تھوڑا وقت اپنی ماں کے ساتھ گزارتی پھر اپنے گھر گلشن ظہور آجایا کرتی تھی۔ شکیل کی بیوی جویریہ ایک گھریلو عورت تھی، ٹیکنیکل زبان میں جسے ہاؤس وائف کہا جاتا ہے۔

شازیہ کی چھوٹی بہن کا نام نازیہ تھا۔ نازیہ بھی شادی شدہ تھی۔ نازیہ کی عمر پینتیس سال تھی۔ نازیہ کا شوہر عارف پچھلے پانچ سال سے بحرین میں تھا۔ وہ وہاں کسی آئل کمپنی میں کام کرتا تھا اس کی شادی کو آٹھ سال ہوگئے تھے اور شازیہ کی طرح ابھی تک وہ بھی بے اولاد تھی۔ نازیہ اپنی سسرال واقع کورنگی میں رہتی تھی۔

بہن بھائیوں میں سب سے آخر میں شازیہ نے شادی کی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ سب سے بڑی تھی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد گھر کے معاشی بوجھ کی گٹھڑی اس کے کاندھوں پر آگئی تھی۔ گھر کا سربراہ سر پر موجود نہ رہے تو سب سے بڑی اولاد کی ذمے داریوں میں اچانک بے پناہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ شازیہ کے ساتھ بھی یہی سب ہوا تھا مگر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتی تھی۔ والد سے محرومی، والدہ کی بیماری اور دو چھوٹے بھائی بہن کی پرورش..... یہ کوئی معمولی ذمے داریاں نہیں تھیں۔ اللہ کا شکر کہ اس کے پاس گورنمنٹ جاب تھی لہٰذا ایک لگی بندھی آمدنی کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ شازیہ نے مردانہ وار ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی والدہ کا خیال رکھا۔ شکیل اور نازیہ کی پرورش کی اور انہیں کسی قابل بنانے کے بعد ان کی شادیاں کرائیں۔ ان فرائض کو نمٹانے کے بعد جب اسے اپنا خیال آیا تو اس نے خود کو ادھیڑ عمری کی منزل پر پایا۔ بہرحال پانچ سال پہلے اس نے اخباری رپورٹر کاشف سے شادی کرلی تھی۔

کاشف بھی عجیب و غریب پس منظر کا مالک تھا۔ اپنے گھر والوں سے اس کی بالکل نہیں بنتی تھی اور شادی کے بعد وہ شازیہ کے تکونے مکان ہی میں شفٹ ہوگیا تھا۔ پچھلے

5 سال سے کاشف اپنی بیوی شازیہ کے ساتھ اسی تکونے مکان میں رہائش پذیر تھا اور اس وقت..... وہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی خاطر داری کے ’’مزے لوٹ‘‘ رہا تھا۔ اس پر اپنے باس اعجاز حسین کے قتل کا الزام تھا۔

کاشف کی جاب اور گرفتاری کے حوالے سے شازیہ نے مجھے جو کچھ بتایا وہ مجھے پہلے سے معلوم تھا کیونکہ یہ ساری تفصیل گزشتہ رات صدف مجھے بتا چکی تھی۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ ملزم کاشف نے دو شادیاں کر رکھی تھیں اور صدف اس کی سیکنڈ وائف تھی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ شازیہ، کاشف کی دوسری شادی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ صدف، کاشف کی پہلی شادی کے بارے میں کچھ جانتی تھی یا نہیں، اس کا ابھی تک مجھے اندازہ نہیں تھا۔ آج رات والی ملاقات میں شاید کوئی بات نکل کر سامنے آجاتی۔

میں نے شازیہ کی بپتا سننے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’ٹھیک ہے، میں آپ کے شوہر کا کیس لینے کے لیے تیار ہوں۔ آج یا کل کسی وقت میں متعلقہ تھانے جاکر کاشف سے ملاقات بھی کرلوں گا۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔‘‘

اس نے مجھ سے میری فیس کے بارے میں دریافت کیا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بعد یہ اضافہ بھی کردیا۔ ’’شازیہ صاحبہ! میرا یہ اصول ہے کہ میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔‘‘

اس نے اپنے پرس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’جی ضرور۔ میں آپ کی فیس ابھی ادا کردیتی ہوں۔‘‘

پھر اس نے میری فیس کے برابر رقم گن کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے نوٹ لے لیے اور بغیر گنے انہیں اپنی میز کی دراز میں رکھ لیے۔

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’آپ میرے دیے ہوئے پیسوں کو گن تو لیتے۔‘‘

’’میں نے اچھی طرح گن لیے ہیں۔‘‘ میں نے اس کی حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

’’کب؟‘‘ وہ بے ساختہ بولی۔

اس کی حیرانی میں پریشانی بھی شامل ہوگئی تھی۔ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ’’اسی وقت جب آپ رقم کو شمار کر رہی تھیں۔ آپ کی انگلیوں اور میری آنکھوں نے یہ کام بیک وقت کیا ہے۔‘‘

’’وکیل صاحب! آپ کی نظر تو بہت تیز ہے۔‘‘ وہ توصیفی انداز میں بولی۔

’’نگاہ کو ہشاش بشاش اور تیز رکھنا پڑتا ہے۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’عدالتی معاملات میں ایک لمحے کی غفلت تخت کو تختے میں بدل دیتی ہے۔‘‘

’’یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کا کام واقعی بیدار مغزی کا ہے۔‘‘ وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ میرے شوہر کو اس بکھیڑے سے نکال کر باعزت بری کروالیں گے۔‘‘

’’انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔‘‘ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ میرا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے ذہن کا میک اپ کرلیا۔ مجھے اس کیس کو بڑی احتیاط کے ساتھ ہینڈل کرنا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے میں نے ایک لائحۂ عمل بھی ترتیب دے لیا تھا جس کا اندازہ آپ کو عدالتی کارروائی کے دوران میں بخوبی ہوجائے گا۔

اس روز آفس سے اٹھنے کے بعد میں نے اس تھانے کا رخ کیا جہاں کاشف عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں تھا۔ جب کوئی ملزم ریمانڈ پر ہوتا ہے تو اس سے ملاقات کرنا خاصا دشوار ہوتا ہے تاہم آپ جانتے ہیں، ہمارے ملک میں سکہ رائج الوقت کا جادو بڑے بڑے مضبوط تالوں کو بھی پلک جھپکتے میں کھول دیتا ہے۔

کاشف ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کی عمر اڑتیس سال تھی۔ وہ اپنی پہلی بیوی شازیہ سے دس سال چھوٹا اور دوسری بیوی صدف سے آٹھ سال بڑا تھا۔ دو کشتیوں کا مسافر کاشف اس وقت بیچ منجدھار میں پھنسا ہوا تھا۔ جب میں اپنے مخصوص فارمولے آزمانے کے بعد اس کے پاس پہنچا تو وہ حوالات کے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے حوالات کے باہر کھڑے ہوکر بہ آوازِ بلند اسے سلام کیا۔

’’السلام علیکم!‘‘

’’وعلیکم السلام.....‘‘ اس نے میرے سلام کا جواب دیا پھر کھڑے ہوکر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

’’میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔‘‘ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ’’تمہاری بیوی نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں تمہیں اس جھمیلے سے نکال کر آزادی دلواؤں گا۔‘‘

’’وہ دن میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔‘‘ وہ اداس بھرے لہجے میں بولا اور آگے بڑھ کر حوالات کی آہنی سلاخوں کے نزدیک آگیا۔ ’’کہہ رہی تھی، میرے لیے کسی

وکیل کا بندوبست کرے گی۔"

"کون آئی تھی؟" میں نے سب کچھ جاننے کے باوجود بھی انجان بنتے ہوئے سوال کیا۔

"میری بیوی اور کون؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ "جس نے آپ کو میرا وکیل مقرر کیا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ "لیکن کیا وکیل صاحب؟"

"مطلب یہ کہ میں آپ کی بیوی کا نام جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "بعض لوگوں کی ایک سے زیادہ بیویاں بھی تو ہوتی ہیں۔"

میرے آخری جملے پر کاشف نے بے چینی سے مجھے دیکھا پھر کوئی وضاحت کیے بغیر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ "میری بیوی کا نام شازیہ ہے۔"

میں نے بھی سردست دو بیویوں کے حوالے سے زیادہ کرید مناسب نہ سمجھی اور کہا۔ "بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ شازیہ صاحبہ ہی نے مجھے آپ کی وکالت کی ذمے داری سونپی ہے۔"

وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور تذبذب کے ملے جلے تاثرات تھے۔ میری "ایک سے زیادہ بیویوں" والی بات نے کاشف کو ذہنی طور پر الجھا دیا تھا۔ میں نے اس کی الجھن کا مداوا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور وکالت نامے، درخواست ضمانت اور دیگر ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لینے کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔

"اب آپ نہایت ہی مختصر الفاظ میں مجھے بتائیں کہ وقوعہ کے روز مقتول اعجاز حسین کے بنگلے پر کیا واقعات پیش آئے تھے؟ میرا اشارہ چودہ اکتوبر کی شام آٹھ اور نو بجے کے درمیانی وقت کی جانب ہے۔"

وہ ایک منجھا ہوا رپورٹر تھا۔ اس نے ٹو دی پوائنٹ مجھے میری مطلوبہ معلومات فراہم کردیں۔ میں نے اس سے "اسٹار فوڈز" کے خلاف شائع ہونے والی "کھوجی" کی رپورٹ اور رفیق الدین کے بارے میں بھی نہایت ہی اہم سوالات کیے جن کے اس نے تسلی بخش جواب دیے۔ مجھے اس کی بے گناہی کا یقین ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق کسی گہری سازش کے تحت کاشف کو اپنے باس اعجاز حسین کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حوالات میں ہونے والی اس ملاقات میں کاشف سے مجھے جو گرانقدر معلومات حاصل ہوئیں ان کا ذکر آگے ہے بلکہ ہے عدالتی کارروائی کے بیچ کیا جائے گا۔

میں نے کاشف کو تسلی دی کہ اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر پولیس والے اقبالِ جرم کروانے کے لیے تشدد کی راہ اپنانے کی کوشش کریں تو وہ اپنی حفاظت اور سلامتی کے پیشِ نظر ان کی مرضی کا بیان دے سکتا ہے۔ میں عدالت میں سب سنبھال لوں گا۔ وہ صحافت کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا اسے اہم پوائنٹس ذہن نشین کرانے میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ وہ بہت سارے قانون قاعدے اچھی طرح جانتا تھا۔

میں تھانے سے نکلا اور مظفر علی کے گھر واقع انکوائری آفس پہنچ گیا۔

مظفر صاحب سے میری اچھی یاد اللہ تھی۔ میں انہیں پیش آنے والے حادثے سے آگاہ تھا لیکن زندگی کی پیشہ ورانہ مصروفیات کے سبب کافی عرصے سے میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کاشف کی گرفتاری اس ملاقات کا وسیلہ بن گئی تھی۔ تھوڑی دیر تک میں ان کی مزاج پرسی کرتا رہا پھر ہمارے بیچ حالاتِ حاضرہ پر گفتگو ہونے لگی۔ اس وقت صدف بھی ہمارے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ میری زیادہ بات چیت صدف ہی سے ہو رہی تھی کیونکہ زبان کے فالج کی وجہ سے مظفر علی ٹھیک طرح سے بول نہیں پاتا تھا۔ میں نے ان باپ بیٹی کو کاشف سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں تفصیلاً بتایا اور آخر میں کہا۔

"میں آپ لوگوں سے کاشف کی ذات کے حوالے سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

ان دونوں باپ بیٹی نے سوالیہ نظر سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہوگئے۔ صدف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"انکل! ہم آپ سے ہر نوعیت کا تعاون کریں گے۔ آپ کو جو بھی پوچھنا ہے، بلا جھجک سوال کرسکتے ہیں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ اپنے شوہر کاشف کے پس منظر کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟"

صدف کی عمر تیس کے قریب تھی۔ وہ ایک دبلی پتلی، دراز قامت اور گوری چٹی عورت تھی۔ اگر حسن و جمال کے ترازو پر صدف اور شازیہ کا موازنہ کیا جاتا تو بلاشبہ صدف کا پلڑا جھک جاتا۔ وہ ہر لحاظ سے شازیہ پر سبقت رکھتی تھی اور

اس میں ایک اہم لحاظ صدف کا صاحب اولاد ہونا بھی تھا۔ علاوہ ازیں صدف کے چہرے سے معصومیت جھلکتی تھی جبکہ شازیہ کے چہرے اور آنکھوں میں موجود تاثرات ایک خرانٹ تفتیشی افسر جیسے تھے۔

"کاشف کا بیک گراؤنڈ کوئی عالیشان اور قابلِ ذکر نہیں ہے۔" صدف نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ "ہر طرف قدم قدم پر ٹریجڈی ہی ٹریجڈی ہے۔ اس کے لڑکپن میں ماں نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ یعنی کاشف کی ماں عالیہ اپنے شوہر شفیق الرحمٰن اور بچوں کو چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی تھی۔ کاشف کا باپ ایک سخت گیر انسان تھا۔ بیوی کی بے وفائی نے اسے حد سے زیادہ چڑچڑا اور بدمزاج بنا دیا تھا۔ وہ اپنا سارا غصہ اولاد پر نکالتا تھا۔ کاشف تو باقاعدہ چمڑے کی بیلٹ سے بھی پٹتا رہا ہے۔ پھر ایک روز اس نے گھر چھوڑ دیا اور اپنی مدد آپ کے تحت زندگی کو آگے بڑھانے لگا۔ ایک بار وہ گھر سے نکلا تو پھر اس نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کا باپ اور دیگر بھائی بہن کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اس کے باپ شفیق الرحمٰن کی رہائش کسی زمانے میں لیاقت آباد المعروف لالوکھیت میں ہوا کرتی تھی۔ کاشف نے جب صحافت کی دنیا میں قدم جما لیے تو ان دنوں وہ ڈرگ روڈ کے کینٹ بازار میں کسی کوارٹر میں رہائش پذیر تھا......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "بس یہی ہے کاشف کا خاندانی پس منظر۔"

"ہوں......" میں نے پُرمعنی انداز میں ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ "کاشف نے لگ بھگ آٹھ سال صحافت کے کوچے کی خاک چھانی ہے اور اس نگری کی گلیاں ناپی ہیں۔ آپ نے ڈرگ روڈ کے کینٹ بازار والے جس کرایے کے کوارٹر کا ذکر کیا ہے وہ ایک ہوٹل کے بالائی حصے پر بنا ہوا تھا بلکہ وہ کل چھ کوارٹر تھے جو ہوٹل والوں نے چھڑے چھانٹ افراد کو کرایے پر دے رکھے تھے لیکن کم وبیش پانچ سال پہلے کاشف نے وہ کوارٹر چھوڑ دیا تھا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ ...... "آپ نے گزشتہ رات فون پر بتایا تھا کہ دو سال پہلے کاشف سے آپ کی شادی ہوئی تھی۔" میں نے دھیرے دھیرے اسے اپنے مقصد کی طرف لاتے ہوئے ٹھوس انداز میں پوچھا۔ "ڈرگ روڈ، کینٹ بازار والا ہوٹل چھوڑنے کے بعد سے آپ کے ساتھ شادی کرنے تک کا درمیانی عرصہ یعنی لگ بھگ تین سال کاشف نے کہاں گزارے تھے؟"

"گلشن ظہور میں۔" وہ بے حد سادہ لہجے میں بولی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اضطراری انداز میں دریافت کیا۔ "گلشنِ ظہور میں وہ کس کے پاس ٹھہرا ہوا تھا؟"

"اپنی بیوی شازیہ کے پاس۔" اس نے بے لاگ جواب دیا۔

"اوہ......" میں ایک بوجھل سانس خارج کرکے رہ گیا۔ "تو یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ کاشف پہلے سے شادی شدہ تھا؟"

"جی ہاں۔" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "کاشف نے مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ ہماری پہلی ملاقات ساحلِ سمندر پر منعقد پھولوں کی ایک نمائش میں ہوئی تھی۔ کاشف ایونٹ کی کوریج کے لیے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ بس پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا۔ آئندہ دو تین ملاقاتوں میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ابو کتنے صاف گو اور اصول پسند ہیں۔ میں نے کاشف کو ابو سے ملوایا تو کاشف ابو کو بھی بہت پسند آیا۔ ابو کھرے اور بے لاگ لوگوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ بس پھر دو سال پہلے ہماری شادی ہوگئی۔"

"آپ کاشف کی پہلی بیوی شازیہ کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔" اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ "لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ شازیہ آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی حتیٰ کہ اسے تو یہ بھی نہیں پتا کہ کاشف نے دوسری شادی کررکھی ہے۔"

"جی...... مجھے یہ بات معلوم ہے۔" وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولی۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں صدف کو شازیہ سے ہونے والی اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا۔ وہ توجہ سے میری بات سنتی رہی۔ میں نے آخر میں اس سے ایک اہم سوال کیا۔

"ان دو سالوں میں آپ نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ کاشف کو دوسری شادی کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟"

"مجھے ازخود یہ جاننے کی کوشش نہیں کرنا پڑی تھی۔" وہ پُراعتماد انداز میں بولی۔ "شادی سے پہلے جب ہماری

باقاعدہ ملاقاتیں ہونے لگی تھیں اور ہم ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کررہے تھے تو کاشف نے صاف الفاظ میں مجھے بتادیا تھا کہ اس کا دوسری شادی کرنے کا مقصد کیا تھا۔''

''میں بھی جاننا چاہتا ہوں، وہ کیا مقصد تھا۔'' میں نے صدف کی زندگی کی کہانی میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

''کاشف نے مجھے بتایا تھا کہ اسے شازیہ سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''بس، ستم کی بات یہ تھی کہ شازیہ، کاشف کی دلی آرزو پوری نہیں کرسکتی تھی...... اولاد کی آرزو۔''

''اوہ......!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''شازیہ میں ایسی کیا کمی تھی کہ وہ کاشف کے لیے اولاد پیدا نہیں کرسکتی تھی؟''

''شازیہ ایک بانجھ عورت ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''کاشف نے تین سال تک شہر کے مہنگے ترین ڈاکٹروں سے اس کا علاج کروایا۔ علاج معالجہ تو اب بھی چل رہا ہے لیکن دو سال پہلے متعدد لیڈی ڈاکٹرز کی متفقہ رائے کے بعد دوسری شادی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ معروف اور قابل لیڈی ڈاکٹرز نے شازیہ کے بارے میں یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ دنیا کا کوئی بھی علاج اسے فطری انداز میں ماں نہیں بناسکتا۔''

میں نے صدف کی بات تحمل سے سنی لیکن اس سے یہ سوال نہیں کیا کہ اگر بالفرض وہ بھی کاشف کے لیے اولاد پیدا نہ کرپاتی تو کیا کاشف اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے تیسری شادی کرتا؟

ہمارے بیچ میں موجودہ حالات پر مزید گفتگو ہوتی رہی۔ ایک مرحلے پر میں... پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''آپ کو تو خیر پتا ہے کہ آپ کے شوہر کی ایک اور بیوی بھی ہے مگر شازیہ، کاشف کی دوسری شادی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ دونوں بیویوں کو مناسب وقت کیسے دے پاتا ہے؟''

''اس سلسلے میں کاشف کی نوکری سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کاشف کا کسی بھی کام کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے۔ کبھی وہ علی الصباح گھر سے نکل جاتا ہے اور کبھی بھری دوپہر میں۔ یہی حال اس کی واپسی کا بھی ہے۔ بعض اوقات گھر لوٹتے ہوئے اسے رات کے دو بھی بج جاتے ہیں۔ شازیہ اس کے ان معمولات کی عادی ہے اور کاشف نے ہمیشہ یہ احتیاط کی ہے کہ چاہے کتنی بھی تاخیر ہوجائے وہ رات کو شازیہ کے پاس ہی جاتا ہے۔ وہ دن میں اچھا خاصا وقت ہمارے ساتھ گزارتا ہے اور بعض اوقات پورا دن بھی مگر رات وہ شازیہ کے پاس ہی گزارتا ہے۔ اس طرح کاشف نے دونوں گھروں کے معاملات کو نبھا رکھا ہے۔ ویسے پچھلے کچھ عرصے سے وہ کئی بار ایک بات کہہ چکا ہے......''

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکی تو میں نے فوراً سوال داغ دیا۔ ''کون سی بات؟''

''وہ خود اس روٹین سے فیڈ اپ ہوچکا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہم ماں بیٹے کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر پارہا۔ کہہ رہا تھا کہ بہت جلد وہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر ہم دونوں کی ملاقات کروادے گا اور شازیہ کو سب کچھ سچ سچ بتا دے گا لیکن قدرت نے اسے یہ موقع نہیں دیا اور وہ بیٹھے بٹھائے ایک ناکردہ جرم کی لپیٹ میں آگیا ہے۔''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں اداسی اتر آئی تھی۔ میں نے اس کے مجروح جذبات کی مرہم پٹی کرتے ہوئے کہا۔

''قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی۔ کاشف نے ایک صحت مند اور مثبت قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ قدرت اسے یہ موقع ضرور فراہم کرے گی مگر اپنے پروگرام کے مطابق۔ میں سمجھتا ہوں، جب تک کاشف اس بن بلائی مصیبت سے چھٹکارا حاصل نہیں کرلیتا، آپ کو بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔''

''مثلاً کس قسم کی احتیاط؟'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ اسے قدرت کی کرشمہ کاری سمجھیں یا اسے حسنِ اتفاق کا نام دیں کہ گزشتہ رات آپ نے مجھے فون کیا اور آج سہ پہر میں شازیہ مجھ سے ملنے میرے دفتر آگئی اور آپ دونوں کا مقصد ایک ہی تھا۔'' میں نے رسان بھرے انداز میں اسے سمجھانے کی سعی کی۔ ''اب آپ کے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ بی ہائنڈ دسین چلی جائیں اور شازیہ کو فرنٹ پر رہنے دیں۔ کم از کم جب تک یہ کیس اپنے منطقی انجام کو نہیں پہنچ جاتا، آپ اسی پالیسی پر کاربند رہیں۔ کیس کے حوالے سے جو بھی اپ ڈیٹس ہوں گی ان سے میں آپ کو باخبر کرتا رہوں گا۔ آپ درپردہ رہ کر کاشف کی بریت کے لیے دعا کریں۔ میں کاشف کے وکیل کی حیثیت سے عدالتی معاملات کو دیکھتا رہوں گا...... وہ وکیل جو کاشف کی بیوی

شازیہ نے مقرر کیا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ کی تجویز مجھے پسند آئی ہے۔ اس نازک اور سنگین موقع پر جبکہ کاشف ایک پریشانی میں پھنسا ہوا ہے، اس کی دو بیویوں کا بیک وقت منظرِعام پر سرگرم نظر آنا کاشف کے کیس کو الجھا سکتا ہے۔'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

''میرے کاشف سے ملنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے نا؟''

''حرج تو کوئی نہیں لیکن آپ کاشف سے اس طرح ملاقات کا پروگرام بنائیں کہ شازیہ کو کانوں کان خبر نہ ہو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بہت ضروری ہے۔''

''آپ بے فکر ہوجائیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''میں مینیج کرلوں گی۔''

''اس سلسلے میں سب سے اہم ایک اور معاملہ بھی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ ہے ضابطۂ اخلاق کا طے کرنا۔''

''ضابطۂ اخلاق......'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''میں سمجھی نہیں جناب؟''

''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کیس پر اٹھنے والے تمام چھوٹے بڑے اخراجات کو باقاعدہ نوٹ کیا جائے گا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ فی الحال پردے کے پیچھے رہیں گی اور آپ کی جیب سے ایک روپیہ خرچ نہیں ہوگا۔ ہر عدالتی معاملے میں شازیہ پیش پیش رہے گی اور چھوٹا بڑا ہر خرچہ وہی کرے گی۔ جب ہم یہ کیس جیت جائیں گے تو کل اخراجات کو دو پر تقسیم کردیا جائے گا یعنی نصف خرچہ آپ دیں گی اور نصف خرچہ شازیہ کے ذمے ہوگا۔ اس فارمولے کے تحت کیس کے اختتام پر میں کچھ اضافی رقم شازیہ کو واپس کردوں گا اور اگر آپ کو اور کاشف کو کوئی اعتراض نہ ہوا تو دوسری شادی کو منظرِعام پر لانے کا اس سے مناسب موقع اور کوئی نہیں ہوگا۔''

''کیس کے اخراجات کی منصفانہ تقسیم کا آئیڈیا مجھے بے حد پسند آیا اور میں اس کے لیے تیار ہوں۔'' وہ بڑے عزم سے بولی۔ ''باقی جہاں تک دوسری شادی کو ڈیکلیئر کرنے کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں کاشف سے صلاح کیے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔''

''کاشف سے صلاح مشورے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم کاشف کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کریں گے۔''

''تب تو ٹھیک ہے۔'' وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''اس دوران میں آپ نے ایک اہم کام کرنا ہے۔'' میں نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کسی طرح کاشف کے والد شفیق الرحمٰن کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کریں۔ اگر ان کا سراغ مل جائے تو انہیں کاشف کے حالات سے آگاہ کرنے کے بعد اس کے حق میں دعا کرنے کو کہیں۔ باپ کی دعا میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر شفیق الرحمٰن نے کاشف کے لیے دعا کردی تو اس کی مشکل آسان ہوجائے گی۔''

''جی ضرور......'' وہ فرماں برداری سے بولی۔ ''میں کاشف کے والد صاحب کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

مظفر علی کی صحت اس امر کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ مجھے رخصت کرنے کے لیے داخلی دروازے تک آتے۔ یہ فریضہ صدف نے ادا کیا۔ بوقتِ رخصت میں نے سرسری انداز میں اس سے پوچھ لیا۔

''کیا شازیہ کو اس حقیقت کا علم ہے کہ وہ ایک بانجھ عورت ہے اور وہ زندگی بھر اولاد پیدا نہیں کرسکتی؟''

''نہیں......'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔

''کاشف نے دانستہ یہ راز شازیہ سے چھپایا ہوا ہے۔ وہ شازیہ کو کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا اسی لیے وہ اس کی تسلی اور اطمینان کی غرض سے علاج معالجے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔''

''ویل ڈن!'' میں نے ستائشی نظر سے شازیہ کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا شوہر کافی سمجھدار انسان ہے۔''

اس کے چہرے پر مجھے فخر کے تاثرات کی جھلک دکھائی دی تاہم اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے زیرِلب مسکرانے پر اکتفا کیا۔ گویا اس نے خود کو کاشف کی دانش مند اہلیہ ہونے کا ثبوت فراہم کردیا تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ استغاثہ کے مطابق مقتول اعجاز حسین نے ملزم کاشف کی بدعنوانی کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا جس کے نتیجے میں مقتول نے ملزم کو نوکری سے برخاست کردیا تھا۔ ملزم نے خود کو بحال کرانے کی پوری کوشش کی لیکن جب اس مقصد میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی تو وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مقتول کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ اس نے اندر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے

یہی ظاہر کیا کہ وہ مقتول کی منت سماجت کرکے اسے منانے آیا ہے لیکن اس کے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ اسے اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہوچکا تھا کہ باس اسے ہرگز ہرگز معاف نہیں کرے گا لہٰذا اس نے اپنے باس سے انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس ملاقات پر وہی سب ہوا جیسا اس کا اندازہ تھا لہٰذا اس نے بھی وہی سب کیا جو وہ سوچ کر وہاں پہنچا تھا۔ ملزم نے اپنے باس کو موت کی نیند سلایا اور بنگلے سے رخصت ہوگیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول اعجاز حسین کی موت چودہ اکتوبر کی شام آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اس کی موت کا سبب وہ زہریلا انجیکشن تھا جو ملزم نے مقتول کی گردن میں گھسایا تھا۔ یہ سریع الاثر زہر فوراً سے پیشتر مقتول کے پورے بدن میں پھیل گیا تھا چنانچہ آن واحد میں اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔ زہریلے انجیکشن والی سرنج پولیس کو اسی صوفے پر پڑی مل گئی تھی جہاں مقتول اعجاز حسین کی لاش پائی گئی تھی۔ کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ نے اس امر کی تصدیق کردی تھی کہ مقتول کی موت کا سبب بننے والا زہر وہی تھا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے اپنے موکل کی ضمانت کرانے کی بھرپور کوشش کی لیکن اس سعی میں مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت یعنی فوری ضمانت لگ بھگ ایک ناممکن کام ہے لہٰذا اس مرحلے پر میں قطعاً مایوس نہیں ہوا تھا۔

آیندہ دو تین پیشیاں تکنیکی نوعیت کے امور نمٹانے میں گزر گئیں جن کی سست اور غیر دلچسپ کارروائی کو بیان کرکے میں آپ کو بور نہیں کروں گا لہٰذا ہم چند قدم آگے بڑھتے ہیں۔

کم و بیش دو ماہ کے بعد عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس دوران میں مجھے ہوم اینڈ فیلڈ ورک کرنے کے لیے اچھا خاصا وقت مل گیا تھا۔ اسی مدت میں صدف نے وہ کام بھی کر ڈالا تھا جو میں نے اس کے ذمے لگایا تھا۔

عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِجرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صحتِ جرم سے صاف انکار کردیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف انہی گواہوں کے بیانات کا تذکرہ کروں گا جو کسی بھی حوالے سے اس کیس میں اہمیت کے حامل ہوں گے۔ اس سے قبل کہ استغاثہ کی طرف سے پہلا گواہ پیش کیا جاتا، میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر یا تفتیشی افسر یا ''آئی او'' کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے۔ وہ ایک لحاظ سے استغاثہ کا وارث ہوتا ہے لہٰذا اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ میں نے جج سے کوئی انوکھی یا ناممکن فرمائش نہیں کی تھی چنانچہ انکوائری آفیسر وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں پہنچ گیا۔

اس کیس کا تفتیشی افسر ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر خادم حسین تھا۔ خادم حسین متناسب قد کاٹھ کا مالک ایک روایتی پولیس والا تھا۔ میں کٹہرے کے نزدیک چلا گیا اور آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''آئی او صاحب! اس ناخوشگوار واقعے کی اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟''

''مقتول کی بیوی شہلا نے۔'' اس نے جواب دیا۔

''شہلا صاحبہ نے کتنے بجے آپ کو بتایا کہ ان کے شوہر کو قتل کردیا گیا ہے؟'' میں نے استفسار کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پولیس کے روزنامچے کے مطابق مقتول کی بیوی نے چودہ اکتوبر کی شام ساڑھے آٹھ بجے تھانے فون کرکے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''مقتول کی بیوی کے اطلاعی الفاظ کیا تھے؟''

''اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں ڈیوٹی افسر کو بتایا تھا کہ اخبار کے ایک رپورٹر کاشف نے اس کے شوہر کو قتل کردیا ہے۔''

''آپ جائے واردات پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''لگ بھگ نو بجے۔'' ایک لمحے سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

''جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو کیا اس وقت ملزم وہاں موجود تھا؟''

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی نہیں۔ چوکیدار کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ ملزم تھوڑی دیر پہلے بنگلے سے نکلا تھا اور اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہوکر وہاں سے روانہ ہوگیا تھا۔''

''استغاثہ کے مطابق پولیس نے ملزم کو وقوعہ کی رات دس بجے انکوائری آفس کے ایک گھر سے گرفتار کیا تھا۔'' میں نے بہ دستور آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"
"نہیں۔ آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "حقیقت یہی ہے۔"
"انکوائری آفیسر صاحب! کیا آپ کو یہ بات معلوم تھی کہ استغاثہ کے مطابق مقتول کے بنگلے سے فرار ہونے کے بعد ملزم انکوائری آفس کے علاقے میں واقع ایک گھر کا رخ کرے گا؟"
"جی نہیں۔ مجھے یہ پتا نہیں تھا۔" وہ سادگی سے بولا۔
"پھر آپ نے ملزم کی گرفتاری کے لیے ادھر کا رخ کیوں کیا؟" میں نے قدرے ترش لہجے میں دریافت کیا۔
"اس لیے کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ ملزم اس وقت کہاں مل سکتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔
"آپ کو اتنی اہم اطلاع کس نے دی تھی؟"
"سلیم صاحب نے۔"
"کون سلیم صاحب؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔
"مقتول کے منیجر۔" اس نے بتایا۔
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو یہ منیجر سلیم صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے؟"
"جی نہیں۔ وہ بعد میں وہاں پہنچے تھے۔"
"جب مقتول کی بیوی شہلا کی اطلاع پر آپ نے اس کے گھر کا رخ کیا تو اس وقت جائے وقوعہ یعنی اس بنگلے میں کتنے افراد موجود تھے؟" میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے سوال کیا۔
"بنگلے کے اندر یا باہر......!" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔
میں نے جواب دیا۔ "دونوں جگہ کا احوال بیان کردیں۔"
"بنگلے کے باہر گیٹ پر چوکیدار اکرام اللہ موجود تھا۔" اس نے بتایا۔ "اور بنگلے کے اندر صرف مقتول کی بیوی یعنی شہلا موجود تھی یا پھر......" اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کردی۔
"یا پھر صوفے پر مقتول کی لاش پڑی تھی۔"
"مقتول کی لاش گھر کے کس حصے میں پائی گئی تھی؟"
"ڈرائنگ روم میں، ایک صوفے پر۔" اس نے جواب دیا۔
"اسی صوفے پر مقتول کی لاش کے قریب آپ کو ایک اور چیز بھی، پڑی ملی تھی۔" میں یہ کہتے ہوئے اس میز کی سمت بڑھ گیا جہاں ایک مہر شدہ سیلوفین بیگ میں آلۂ قتل رکھا ہوا تھا۔ میں نے مذکورہ بیگ کو اٹھالیا پھر انکوائری آفیسر کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں اس کی بات کررہا ہوں۔"
"جی بالکل!" وہ خاصے توانا لہجے میں بولا۔ "یہ سرنج مقتول کی لاش کے نزدیک صوفے پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس محفوظ کرلیا تھا۔"
"صرف محفوظ کرلیا تھا یا موقع کی ضروری کارروائی بھی کی تھی......؟"
"میں سمجھا نہیں۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔
"یہ فائیو سی سی کی ڈسپوزیبل سرنج اس کیس میں آلۂ قتل کی حیثیت رکھتی ہے۔" میں نے سیلوفین بیگ کو آئی او کی نگاہ کے سامنے جھلاتے ہوئے استفسار کیا۔ "کیا آپ نے اس سرنج پر سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات اٹھانے کی کوشش کی تھی؟ اس سوال کی ضرورت اس لیے پیش آرہی ہے کہ اس کیس کے استغاثہ کی فائل میں قاتل کے فنگر پرنٹس کی رپورٹ کہیں نظر نہیں آرہی......!"
"وہ جی......" آئی او تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "میں نے آلۂ قتل پر سے فنگر پرنٹس اٹھانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی لہٰذا اس سلسلے میں کوئی رپورٹ بھی تیار نہیں کی گئی۔"
"آلۂ قتل پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات موجود نہیں تھے......" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانے کی کوشش کررہے ہیں کہ قاتل کی انگلیوں کے نشانات بھاپ کے بنے ہوئے تھے جو آپ کی آمد سے قبل ہی بخارات کی صورت ہوا میں تحلیل ہوگئے تھے؟"
"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔
"پھر آپ کی بات کا کیا مطلب تھا؟" میں نے پوچھا۔
"میرے کہنے کا سیدھا سادہ مطلب یہ تھا کہ اس ڈسپوزیبل سرنج پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات موجود نہیں تھے۔" وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ "جس کا ایک ہی سبب ہے کہ چالاک ملزم نے آلۂ قتل پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات کو صاف کردیا ہوگا۔"
"بہت خوب آئی او صاحب۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "گویا آپ کی تھیوری کے مطابق، میرا موکل ایک شاطر انسان ہے؟"
"اس میں کیا شک ہے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

میں نے اس کے طنز پر چوٹ لگائی۔ "یعنی آپ کی نظر میں میرا موکل اتنا زیادہ عیار اور چالاک ہے کہ جائے وقوعہ سے فرار ہوتے وقت وہ آلۂ قتل کو بھی لاش کے قریب ہی چھینک گیا تھا؟"
"ذہین سے ذہین اور تجربہ کار سے تجربہ کار مجرم بھی غلطی ضرور کرتا ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "اور اسی غلطی کی وجہ سے وہ قانون کی گرفت میں آجاتا ہے۔ ملزم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔"
"آپ کی بات میں وزن ہے آئی او صاحب......" میں نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
وہ قدرے چوڑا ہوگیا اور یہی سمجھا کہ میں نے اس کی تعریف کی ہے۔ میں نے جرح کے سلسلے کو منطقی اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔
"آئی او صاحب! کیا آپ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اتفاق کرتے ہیں؟"
اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔
"مکمل یا جزوی؟" میں نے کہا۔
"مکمل......" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "صد فیصد۔"
"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق وقوعہ کے روز آٹھ اور نو بجے شام کے بیچ مقتول اعجاز حسین کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔" میں نے تفتیشی افسر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اس رپورٹ میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قاتل نے زہر سے بھری ہوئی سرنج کی سوئی کو مقتول کے بائیں کان کے نیچے گردن کے وسطی حصے میں گھونپا اور پھر سرنج کا پسٹن دبا کر چیمبر میں موجود زہریلے محلول کو... مقتول کے بدن میں اتار دیا۔ یہ زہر اتنا سریع الاثر تھا کہ ...ک جھپکتے میں مقتول کی موت واقع ہوگئی۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟"
اس نے کہا۔ "میرے خیال میں بھی یہ سب ویسے ہی ...آیا ہوگا جیسا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا ہوا ہے۔"
"یہ بات تو آپ کو معلوم ہی ہوگی کہ ملزم اپنی کسی غلطی کی ...فی اور معافی کے لیے مقتول کے بنگلے پر حاضر ہوا تھا لیکن ...ول نے اس کی کوئی بات نہیں مانی تھی۔" میں نے کہا۔ "...قتول، ملزم کو اپنے اخبار میں رکھنے پر تیار نہیں ہوا تھا......؟"
"اور اسی وجہ سے ملزم نے طیش میں آکر اپنے باس کا ...تمام کردیا۔" وہ خاصے جوشیلے انداز میں بولا۔
میں نے پوچھا۔ "کیا اس موقع پر آپ اس ڈرائنگ روم ...موجود تھے جہاں مقتول اعجاز حسین کو فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟"
"یہ آپ کس قسم کی بات کررہے ہیں......" وہ خفگی بھرے انداز میں بولا۔ "جائے وقوعہ پر بھلا میرا کیا کام۔ میں تو مقتول کی بیوی کی اطلاع پر اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔ اس وقت تک قاتل اپنا کام کرکے جائے واردات سے فرار ہوچکا تھا۔"
"میں نے آپ کے الفاظ کی روشنی میں یہ استفسار کیا تھا۔" میں نے اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ نے فرمایا کہ ملزم نے طیش میں آکر اپنے باس کا قصہ تمام کردیا تو...... آپ کی بات سے میں یہی سمجھا کہ آپ بھی بہ نفسِ نفیس جائے وقوعہ پر موجود تھے اس لیے آنکھوں دیکھا حال بیان کررہے ہیں۔"
"یہ میرا اندازہ تھا......" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "گویا آپ استغاثہ کے موقف سے منحرف ہورہے ہیں؟"
"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ ٹپٹاتے ہوئے انداز میں بولا۔
"استغاثہ کی رپورٹ میں اس بات کا ذکر بڑے واضح الفاظ میں کیا گیا ہے کہ ملزم ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وقوعہ کی شام مقتول کے بنگلے پر پہنچا تھا۔" میں نے اس کے سوال کے جواب میں اپنے مطلب کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ منت خوشامد سے پہلے مقتول کو منانے کی کوشش کرے گا۔ اگر مقتول نے اسے معاف کردیا تو ٹھیک، بصورتِ دیگر وہ اپنے باس کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ اسی مقصد کی خاطر ملزم اپنے ساتھ ایک زوداثر زہر سے بھری ہوئی سرنج بھی لے کر گیا تھا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ......" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے انصاف کی کرسی پر براجمان جج کی سمت دیکھا پھر دوبارہ آئی او کی جانب متوجہ ہوکر اپنی بات مکمل کردی۔
"ملزم نے طیش میں آکر اپنے باس کا قصہ تمام کردیا جبکہ استغاثہ کے مطابق ملزم پوری منصوبہ بندی کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔ اگر یہ وقتی طیش کا معاملہ ہوتا تو ملزم غصے میں کوئی چیز اٹھا کر مقتول کو دے مارتا یا پھر آگے بڑھ کر اس کا گلا دبانے کی کوشش کرتا...... آپ کا موجودہ بیان تو استغاثہ کی رپورٹ سے کھلا انحراف ہے۔"
"آپ تو میرے الفاظ پکڑ رہے ہیں وکیل صاحب۔" وہ ناراض نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔
"اسے کہتے ہیں بال کی کھال نکالنا......"

''حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے حسبِ ضرورت میں کھال کے بال بھی نکال سکتا ہوں۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''ہم پروفیشنل ہیں اور یہی تو ہماری خاصیت ہے...... ہے یا نہیں؟''

اس نے ''ہاں'' میں جواب دیا اور نہ ہی ''نہ'' میں۔ بس، ناپسندیدہ انداز میں مجھے تکتا چلا گیا۔ میں نے اس کی خفگی کی پروا کیے بغیر اپنی جرح جاری رکھی۔

''یہ بات تو طے ہے کہ مقتول کی موت سے قبل ملزم اور مقتول کے درمیان چند مکالمے ہوئے ہوں گے یعنی وہ ڈرائنگ روم میں روبرو بیٹھے ہوئے تھے؟''

اس نے مختصر جواب دیا۔ ''جی بالکل۔''

''اگر ان دونوں کے بیچ مکالمہ ہوا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان لمحات میں مقتول بہ قائمی ہوش و حواس اپنے ڈرائنگ روم میں ملزم کے سامنے موجود تھا؟''

''اس میں کیا شک ہے......'' وہ حیرت بھرے انداز میں بولا۔

''اس میں یہ شک ہے کہ......'' میں نے اپنی جرح کو فائنل ٹچ لگاتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کی رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وقوعہ کے وقت مقتول بھنگ پیے مدہوش ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھا تھا جبھی جب ملزم خطرناک سرنج بدست اس پر حملہ آور ہوا تو مقتول نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی اور چپ چاپ موت کو گلے لگا لیا......؟''

''آپ ایک بہت ہی اہم نکتے کو نظر انداز کر رہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی چوٹ کے جواب میں خوش دلی سے کہا۔ ''مائی گڈنیس...... آپ بتائیے پلیز۔ میں کون سا نکتہ نظر انداز کر رہا ہوں؟''

''کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ملزم نے سامنے سے مقتول پر حملہ کیا تھا؟'' وہ حقارت سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی خوش فہمی کو بامِ عروج تک پہنچانے کی غرض سے معصومیت بھرے انداز میں کہا۔ ''جی...... میں ایسا ہی سمجھ رہا ہوں۔''

''آپ سراسر غلط سمجھ رہے ہیں۔'' وہ فاتحانہ انداز میں بولا۔ ''مقتول پر ملزم نے اس کے عقب سے، اس کی بے خبری میں حملہ کیا تھا۔ مقتول یہی سمجھا تھا کہ ملزم اس کے عقب سے نکل کر ڈرائنگ روم کے دروازے کی سمت بڑھے گا لیکن ملزم کے ارادے تو انتہائی خطرناک تھے۔ وہ جیسے ہی مقتول کے عقب میں پہنچا، اس نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ زہریلے محلول سے بھرے ہوئے انجکشن کی نیڈل کو مقتول کی گردن میں گھونپ دیا...... اب بات آئی سمجھ میں؟''

''جی، آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے آپ کی سمجھائی اور سکھائی ہوئی اہم باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہے۔'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آیندہ عدالتی کارروائی میں آپ کی دی ہوئی تعلیم میرے بہت کام آئے گی۔ اگین تھینک یو۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نوعیت کی باتوں سے میرا مقصد کیا تھا۔ میں اسے الجھا ہوا چھوڑ کر جج کی جانب متوجہ ہو گیا اور نہایت ہی احترام بھرے لہجے میں کہا۔

''جنابِ عالی! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈجارنڈ......!''

☆☆☆

آیندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے چار گواہ پیش کیے گئے جن میں ایک مقتول کے بنگلے کا چوکیدار اکرام اللہ، ایک مقتول کی بیوی شہلا اور دو دیگر افراد تھے۔ ان دو دیگر افراد کے بیانات میں کوئی بھی قابلِ ذکر بات نہیں لہٰذا میں ان کے تذکرے کو گول کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

چوکیدار پر بھی میں نے نہایت ہی مختصر جرح کی جو کچھ اس طرح تھی۔

اکرام اللہ کی عمر پچاس کے اریب قریب تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کو مقتول کے بنگلے کی رکھوالی کرتے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''میں دس سال سے ان کا ملازم ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ...... دس سال اچھی خاصی مدت ہوتی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ''پھر تو آپ اپنے علاقے کے تمام رہائشیوں کو اچھی طرح جانتے ہوں گے؟''

''سب کو تو نہیں......'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''لیکن تمام پڑوسیوں کے بارے میں تفصیلاً جانتا ہوں۔''

''مقتول کے بنگلے کے عقب میں ایک بنگلا ہے۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''اس بنگلے کا مین گیٹ سیاہ رنگ کا ہے اور پورے بنگلے پر انگوری رنگ کیا گیا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''وکیل صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک بتایا۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا بنگلا موجود ہے۔''

''اس موجود مذکور بنگلے میں کون رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سیٹھ نجم الدین۔'' چوکیدار نے رسانیت بھرے انداز میں جواب دیا۔

''سیٹھ نجم الدین کا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

''وہ کپڑے کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔''

''کیا آپ کی سیٹھ نجم الدین سے علیک سلیک ہے؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیلِ استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ ''میرے فاضل دوست غیر متعلقہ کردار کو زیرِ بحث لا کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے حربوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''بیگ صاحب! کیا سیٹھ نجم الدین کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق واسطہ ہے؟''

''جی...... براہِ راست نہیں مگر ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اگر استغاثہ کے گواہ پر مجھے جرح کا موقع فراہم کیا جائے تو میرے موقف کی وضاحت ہو جائے گی۔''

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔'' جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

میں دوبارہ چوکیدار اکرام اللہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور اپنے سوال کو دہرایا۔ ''کیا آپ کی سیٹھ نجم الدین سے علیک سلیک ہے؟''

''بس سلام دعا کی حد تک ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''البتہ......''

استغاثہ کے گواہ نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ ''البتہ کیا......؟''

''البتہ سیٹھ صاحب کے چوکیدار دلدار خان سے میری گہری دوستی ہے۔'' اس نے اپنی نامکمل بات کو مکمل کر دیا۔

''دلدار خان سے آپ کی دوستی کتنی پرانی ہے؟''

''ہماری دوستی کو دس سال ہو گئے ہیں۔''

''ان دس سالوں میں آپ نے دلدار خان کو کیسا پایا ہے؟''

''دلدار خان ایک بہترین انسان ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ایمان دار، سچا اور جاں نثار دوست۔''

''ابھی آپ نے دلدار خان کی تعریف میں جو کچھ کہا یہ آپ کے دس سالہ تجربے کا نچوڑ ہے۔'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اکرام اللہ کی طرف دیکھا۔ ''ہیں نا......؟''

''جی بالکل!'' وہ پورے تیقن سے بولا۔

''دی پوائنٹ از ٹو بی نوٹیڈ!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''استغاثہ کے ایک معزز گواہ اور مقتول کے چوکیدار اکرام اللہ کا دعویٰ ہے کہ سیٹھ نجم الدین کا چوکیدار ایک سچا اور ایمان دار انسان ہے۔''

یہ وکیل استغاثہ کے لیے بلبلا اٹھنے کا موقع تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ ''آبجیکشن یور آنر'' کا نعرۂ مستانہ بلند کرتا، میں نے استغاثہ کے گواہ سے اگلا سوال کر دیا۔

''وقوعہ کے روز بنگلے کے اندر کتنے افراد موجود تھے؟''

''دو......'' اس نے جواب دیا۔ ''اعجاز حسین صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ۔''

''ان کے علاوہ اور کوئی؟''

''بالکل نہیں!'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

''ملزم کتنے بجے مقتول سے ملنے آیا تھا؟''

''آٹھ بجے کے قریب...... یا پانچ دس منٹ اوپر نیچے۔''

''ملزم کتنی دیر تک بنگلے کے اندر رہا تھا؟''

''یہی کوئی پندرہ بیس منٹ۔''

''آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ملزم لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے شام بنگلے سے روانہ ہو گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی بالکل!'' اس نے جواب دیا۔

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''ملزم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد بیگم صاحبہ نے مجھے بتایا کہ ملزم نے صاحب کو قتل کر دیا ہے۔'' اکرام اللہ نے بتایا۔ ''پھر سلیم صاحب وہاں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی صورتِ حال کو سنبھال لیا تھا۔''

''سلیم صاحب......'' میں نے سوالیہ نظر سے استغاثہ کے گواہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے، مقتول کے منیجر سلیم شاہ؟''

''جی وہی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''منیجر صاحب پیدل ہی ٹہلتے ہوئے وہاں پہنچے تھے یا......؟''

''نہیں جناب، وہ اپنی گاڑی میں آئے تھے۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''یہ وہی وقت تھا جب بیگم صاحبہ مجھے اعجاز صاحب کی موت کے بارے میں بتا رہی تھیں۔''

''منیجر صاحب کے استعمال میں کون سی گاڑی ہے؟''

''نیلی مزدا۔'' چوکیدار نے جواب دیا۔

میں نے استغاثہ کے گواہ پر جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد مقتول کی بیوی بلکہ بیوہ شہلا گواہی کے لیے پیش ہوئی۔ شہلا کی عمر تیس سے متجاوز نہیں تھی۔ میرے ریکارڈ کے مطابق موت کے وقت مقتول اعجاز حسین کی عمر پینسٹھ سال تھی۔ گویا یہ جوڑی بھرپور جوانی اور بڑھاپے کا

سنگم تھا۔ شہلا بھرے بھرے بدن کی مالک ایک دلکش اور جاذبِ نظر عورت تھی۔ جنسِ مخالف کے لیے اس کے اندر بے پناہ کشش پائی جاتی تھی۔ اس کا جوبن اور اٹھان کسی بھی مرد کو دیوانہ بنا سکتے تھے۔ شہلا کا شمار فاتح خواتین میں ہوتا تھا۔

شہلا نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروادیا تو وکیلِ استغاثہ اس کی جانب بڑھا۔ وکیلِ استغاثہ نے چند سوالات کے بعد اسے فارغ کردیا تو میں جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا۔

شہلا کے پہناوے، اسٹائل اور چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر بالکل یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ تازہ تازہ بیوہ ہوئی ہے تاہم میں نے اپنے الفاظ میں ہمدردی کا رنگ بھرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''شہلا صاحبہ! مجھے آپ کے شوہر کی موت کا دکھ ہے اور اس بات کا افسوس بھی کہ آپ کو عدالتی کارروائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بہرحال یہ سب زندگی کا حصہ ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ آپ کو جلدی فارغ کردوں۔''

''اس کوشش کے لیے میں آپ کی شکرگزار ہوں۔'' وہ نیم طنزیہ انداز میں بولی۔ ''لیکن آپ کی زبان سے میرے لیے ہمدردی، دکھ، افسوس جیسے الفاظ اچھے نہیں لگتے۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''آپ تو وکیلِ صفائی ہیں۔'' وہ گہری چوٹ کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے ملزم کو باعزت بری کروانے کے لیے زور لگانا ہے جو میرے شوہر کا قاتل ہے۔ آپ میرے شوہر کے قاتل کے حمایتی ہیں پھر مجھ سے ہمدردی جتانے کی کیا ضرورت ہے...... آپ یہ ناٹک نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔''

''میں جو کچھ بھی کرتا ہوں اس کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔'' میں نے اس کی نشیلی مقناطیسی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ مقصد ہے، انصاف کا پرچم سربلند رکھنا۔ میں اس وقت بھی یہی کر رہا ہوں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ مجھے اپنا دوست سمجھتی ہیں یا دشمن۔''

وہ اضطراری انداز میں، دانتوں کی مدد سے لبِ زیریں کا کباڑا کرنے لگی۔

''شہلا صاحبہ!'' میں نے پیشہ ورانہ انداز میں اپنے کام کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''مقتول سے آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا تھا؟''

''ایک سال۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا آپ مقتول کی سیکنڈ وائف تھیں؟''

''جی۔ آپ کی معلومات درست ہیں۔''

''مقتول کی پہلی بیوی سے اس کی کتنی اولادیں ہیں؟''

''ایک بھی نہیں۔'' اس نے دوٹوک انداز میں بتایا۔ ''اعجاز صاحب کی پہلی شادی بیس سال تک قائم رہی لیکن سلمٰی ان کے لیے اولاد پیدا نہ کرسکی۔ پھر طویل بیماری کے بعد سلمٰی کا انتقال ہوگیا۔ کئی سال تک اعجاز صاحب نے تنہا زندگی گزاری پھر ایک سال پہلے انہوں نے مجھ سے شادی کرلی تھی۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت مقتول کے کاروبار، مال و دولت اور جائداد کی اکلوتی وارث آپ ہی ہیں؟''

''جی بالکل۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولی۔ ''قانوناً، اخلاقاً اور شرعاً ایسا ہی ہے۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ......'' میں نے جرح کے سلسلے کو ایک خاص زاویے پر موڑتے ہوئے استفسار کیا۔ ''آپ کی مقتول سے شادی، مقتول کے ایک معتمدِ خاص کے توسط سے ہوئی تھی؟''

''یہ درست ہے کہ میری شادی میں شاہ جی کا ایک اہم کردار رہا ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اعجاز صاحب شاہ جی پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔''

''شاہ جی سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''میرا مطلب ہے، سلیم شاہ صاحب۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''شاہ جی طویل عرصے سے اعجاز صاحب کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ پرنٹنگ، سرکولیشن اور کیش ڈیلنگ کے تمام معاملات کو شاہ جی نے سنبھال رکھا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں اعجاز صاحب کے منیجر تھے۔''

''بہت خوب......!'' میں نے ستائشی انداز میں کہا پھر ٹٹولنے والے لہجے میں پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز بھی تو شاہ جی آپ کے بنگلے پر موجود تھے......؟''

''وہ بنگلے پر موجود نہیں تھے۔'' وہ بڑی سرعت سے تصحیح کرتے ہوئے بولی۔ ''بلکہ اس واقعے کے بعد وہ وہاں پہنچے تھے۔ اس نازک اور کٹھن موقع پر شاہ جی نے مجھے بہت سہارا دیا تھا ورنہ اعجاز صاحب کی موت نے تو مجھے حواس باختہ کردیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ شاہ جی کے اخلاقی تعاون سے میں صورتِ حال کو سنبھال پائی تھی۔''

''بہرحال...... آپ کی بڑی ہمت ہے کہ آپ نے بروقت پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی۔'' میں نے توصیفی

انداز میں کہا۔ ''آپ کی جگہ اگر اور کوئی خاتون ہوتی تو اس کے ہاتھ پاؤں ہی پھول جاتے۔''

''تعریف کا شکریہ۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولی۔

''آپ کے چوکیدار اکرام اللہ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ نے اسے یہ اطلاع دی تھی کہ صاحب کو ملزم نے قتل کردیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سب سے پہلے آپ ہی نے مقتول کی لاش کو دیکھا تھا؟''

''جی...... اس کا یہی مطلب ہے۔''

''کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے یہ واردات ہوتے دیکھی تھی؟''

''جی نہیں!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''پھر آپ نے کس بنا پر چوکیدار کو یہ بتایا کہ ملزم نے صاحب کو قتل کردیا ہے؟''

''اس وقت بنگلے میں صرف تین افراد موجود تھے یعنی میں، اعجاز صاحب اور کاشف۔'' وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اعجاز صاحب اور کاشف ڈرائنگ روم میں میٹنگ کر رہے تھے اور میں ایک اندرونی کمرے میں تھی۔ جب ملزم اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہوکر رخصت ہوگیا اور کافی دیر تک اعجاز صاحب اندر نہیں آئے تو مجھے تشویش ہوئی اور میں انہیں دیکھنے ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ اب آپ یہ نہیں پوچھیے گا کہ مجھے کیسے معلوم ہوا کہ ملزم بنگلے سے روانہ ہوچکا ہے۔''

آخری جملہ شہلا نے بڑے معنی خیز اور چیلنج کرنے والے انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں پوچھوں گا کیونکہ میری نظر میں آپ ایک ذہین اور بیدار سماعت خاتون ہیں۔ آپ نے ملزم کے بائیک اسٹارٹ کرنے کی آواز سن لی ہوگی اور پھر بائیک کے رخصت ہونے کی مخصوص صدا بھی بتدریج آپ کی سماعت سے دور ہوتی چلی گئی ہوگی جس سے آپ نے بخوبی اندازہ قائم کرلیا کہ ملزم وہاں سے روانہ ہوگیا ہے۔''

''میں تو سمجھی تھی کہ آپ صرف وکالت ہی کرتے ہیں۔'' وہ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بڑی ادا سے بولی۔

میں نے حیرت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میں نے اور کیا کیا کردیا ہے بھئی......؟''

''آپ مائنڈ ریڈنگ بھی اچھی کرلیتے ہیں۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''ابھی آپ نے میری سماعت کے حوالے سے جو تجزیہ پیش کیا ہے، میں بالکل ویسا ہی سوچ رہی تھی اور میں ایسا اس لیے سوچ رہی تھی کہ وقوعہ کے روز یہی سب پیش آیا تھا۔''

میں نے اپنی ذات کے حوالے سے اس کے توصیفی کلمات کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''وقوعہ کے روز جب آپ بنگلے کے کسی اندرونی کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں پہنچیں تو وہاں آپ نے کیا دیکھا تھا؟''

''میں نے اعجاز صاحب کو ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بےسدھ ڈھیر پڑے دیکھا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اور ان کے قریب ہی صوفے پر ایک خالی ڈسپوزیبل سرنج بھی پڑی تھی۔''

''مقتول کو بےسدھ پڑے دیکھ کر آپ نے طے کرلیا کہ ملزم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور آپ نے فوراً پولیس کو فون گھما کر قتل کی اس واردات کی اطلاع دی۔ بعدازاں آپ نے چوکیدار اکرام اللہ کو بتایا کہ ملزم نے صاحب کو قتل کردیا ہے......'' میں نے لحاتی توقف کرکے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر تصدیق طلب انداز میں دریافت کیا۔

''میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا شہلا صاحبہ؟''

''نہیں۔ آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''آپ کیا سمجھتی ہیں، اس سچویشن میں آپ کا ردِعمل صحیح تھا؟''

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا تو وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی پھر استفسار کیا۔

''کیوں...... میرے ردِعمل میں کیا خرابی تھی؟''

''بات خرابی یا خوبی کی نہیں شہلا صاحبہ۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ کا وہ عمل غیر فطری تھا۔''

''اچھا......!'' اس نے آنکھیں پھیلا کر مجھے گھورا پھر تلخی بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''آپ کے خیال میں اس موقع پر مجھے کس قسم کے طرزِعمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا؟''

میں نے اس کے زہر بھرے طنز کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور کہا۔

''اس قسم کی صورتِ حال میں اہلِ خانہ کے ذہن میں سب سے پہلے کسی ڈاکٹر یا کسی اسپتال کا خیال آتا ہے۔''

میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''وہ متاثرہ شخص کو پہلی فرصت میں کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانے یا کسی اسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اسے فوری طبی امداد مل سکے اور آپ نے تو......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے شک زدہ نظر سے شہلا کو دیکھا پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے تو اپنے شوہر کو صوفے پر بے سدھ پڑا دیکھ کر پلک جھپکتے میں یہ اندازہ قائم کرلیا کہ وہ اللہ کا بندہ، اللہ کو پیارا ہوچکا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے تو فوراً سے پیشتر یہ فتویٰ بھی صادر کردیا کہ میرے موکل نے آپ کے شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔''

''اس وقت میں بے حد پریشان تھی۔'' وہ بے چینی کے عالم میں ایک پاؤں کا بوجھ دوسرے پاؤں پر منتقل کرتے ہوئے بولی۔ ''میرے منتشر ذہن میں جو بھی آیا، میں نے اسی کے مطابق عمل کیا۔ اب میرا یہ عمل فطری تھا یا غیر فطری، اس کا حساب آپ خود ہی لگاتے رہیں......''

''بعض اوقات فوری طور پر ذہن میں آنے والی بات پر عمل کرنے سے انسان مصیبت میں بھی گھر جاتا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''جائے وقوعہ پر آپ نے جس فوری اور پھرتیلی بھری کارکردگی کا مظاہرہ کیا اس سے تو یہی تاثر ابھرتا ہے کہ آپ کو پہلے سے اس بات کی خبر تھی کہ میرا موکل ایک زہریلی سرنج کی مدد سے آپ کے شوہر کو ہلاک کرنے آرہا ہے لہٰذا جب آپ نے مقتول کو صوفے پر بے سدھ پڑے دیکھا تو آپ کو یقین ہوگیا کہ ملزم نے مقتول کو موت کی نیند سلا دیا ہے۔''

''اگر مجھے پہلے سے ملزم کے ناپاک عزائم کا علم ہوتا تو میں اسے بنگلے کے اندر آنے کی اجازت ہی کیوں دیتی؟'' وہ برہمی سے بولی۔ ''بے حد معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ آپ نے میرے طرزِعمل کے بارے میں بالکل غلط اندازہ لگایا ہے......''

''انسان کا لگایا ہوا اندازہ بے شک غلط ہوسکتا ہے۔'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''لیکن انسانی فطرت کے اصول اٹل ہیں۔ ان میں کوئی ردوبدل ممکن نہیں۔ خیر......'' میں نے ذرا دیر کو رک کر ایک گہری سانس لی پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جب پولیس جائے وقوعہ پر پہنچی تو ملزم کی گرفتاری کے لیے مقتول کے منیجر سلیم شاہ نے ان کی راہنمائی کی تھی۔ کیا آپ بتاسکتی ہیں کہ شاہ جی کو یہ بات کیسے معلوم تھی کہ ملزم انکوائری آفس کے علاقے میں ایک گھر کے اندر موجود ہوگا؟''

''یہ سوال تو آپ کو سلیم شاہ سے کرنا چاہیے......'' شہلا نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

''اوکے۔ آپ ناراض نہ ہوں۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''جب مقتول کا منیجر گواہی کے لیے یہاں آئے گا تو میں اس سے ضرور یہ سوال پوچھوں گا۔ فی الحال ہم آپ کے بنگلے کی بات کرتے ہیں، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......''

اس نے ''ہاں'' کہا اور نہ ہی ''نہ''۔ بس، الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ میں نے جرح کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے پوچھا۔

''شہلا جی! آپ کے بنگلے میں آمدورفت کے لیے کتنے راستے ہیں؟''

''صرف ایک'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''وہی مین گیٹ جہاں ہمارا چوکیدار اکرام اللہ موجود رہتا ہے۔''

''اس گیٹ کے علاوہ......؟''

''کوئی نہیں۔'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔

''اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دیں۔'' میں نے کہا۔

میرے اصراری انداز پر اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے گھورا۔ ایک لمحے تک وہ گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہی پھر سرسری لہجے میں بولی۔

''ایک دروازہ اور بھی ہے لیکن عموماً وہ استعمال نہیں ہوتا۔''

''مذکورہ دروازے کی لوکیشن بتائیں۔'' میں نے اپنے انداز میں قدرے سختی بھرتے ہوئے کہا۔ ''معزز عدالت یہ بھی جاننا چاہتی ہے کہ اگر عموماً وہ دروازہ استعمال نہیں ہوتا تو پھر خصوصاً وہ کب استعمال کیا جاتا ہے؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیلِ استغاثہ نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''اس وقت عدالت میں اعجاز حسین مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست پتا نہیں، کہاں کہاں کی کہانیاں سنانے میں لگے ہوئے ہیں۔''

جج نے استفساریہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے دبنگ انداز میں کہا۔

''یور آنر! میں نے ابھی تک معزز عدالت کے روبرو ایک کہانی بھی نہیں سنائی البتہ میں اعجاز حسین مرڈر کیس کی مسٹری کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور بنگلے میں آمدورفت کا دوسرا راستہ میری اس کوشش کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے لہٰذا اگر وکیلِ استغاثہ میری جرح کے راستے

میں اپنے اعتراضات کے روڑے نہ اٹکائیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ میں آیندہ دس منٹ کے اندر استغاثہ کی گواہ کو فارغ کردوں گا۔''

جج نے وکیلِ استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔''

میں نے شہلا کی جانب مڑتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ اس نے جواب دیا۔

''بنگلے کی عقبی دیوار میں لوہے کا ایک دروازہ موجود ہے جو عموماً بند رہتا ہے۔ کبھی کبھار ہمارا مالی اپنی ضرورت کے تحت اسے استعمال کرلیتا ہے۔ بنگلے کے عقبی حصے میں ہم نے ایک خوبصورت لان بنا رکھا ہے۔ مالی کو جب بھی پودوں کے لیے مٹی کھاد یا گملے وغیرہ لانا ہوتے ہیں تو وہ ہتھ گاڑی کا استعمال کرتا ہے اور مذکورہ ہتھ گاڑی کی آمدورفت اسی آہنی دروازے سے ہوتی ہے۔''

''آپ جس عقبی آہنی دروازے کا ذکر کررہی ہیں، وہ تین فٹ بائی سات فٹ سائز کا ہے اور اس پر گہرا بھورا رنگ کیا گیا ہے۔'' میں نے تیز نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب! آپ کا مشاہدہ بڑا گہرا ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''ایسا محسوس ہوتا ہے، آپ کا بچپن ہمارے بنگلے کی عقبی گلی میں گزرا ہے۔''

''کاش ایسا ہوتا......!'' میں نے اس کی چوٹ کو مذاق میں اڑاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا اس لیے آپ سے میرا آخری سوال یہ ہے کہ اچھی طرح گن کر بتائیں، میرے ہاتھ میں کل کتنی انگلیاں ہیں؟''

بات کے اختتام پر میں نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے کردیا۔ میرے اس عجیب وغریب سوال پر وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گئی مگر اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گئی اور بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''آپ کے ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہیں، یعنی چار انگلیاں اور ایک انگوٹھا۔''

''کیا آپ یہ لکھ کردے سکتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ اس میں کیا مشکل ہے؟''

''اگر کوئی مشکل نہیں تو پھر بسم اللہ کریں۔'' میں نے ایک سادہ کاغذ اور قلم اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے کاغذ پر لکھا۔ ''وکیلِ صفائی کے ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہیں۔ یعنی چار انگلیاں اور ایک انگوٹھا۔'' پھر وہ مذکورہ کاغذ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ لیں۔ لکھ دیا۔''

''میڈم! یہ پکی تحریر ہے۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ اس کاغذ پر اپنے دستخط بھی کردیں تو کام پکا ہوجائے گا۔''

اس نے بلاتردد دستخط بھی کردیے۔

میں نے اس پکی تحریر کو اپنی فائل میں محفوظ کرلیا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' وکیلِ استغاثہ کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

وہ چونکہ اس وقت میری جانب دیکھ رہا تھا اور مجھ ہی سے مخاطب تھا لہٰذا میں نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''آیندہ پیشی پر بتاؤں گا پھر آپ کو پتا چل جائے گا کہ یہ سب کیا ہے اور وہ سب کیا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

میں ہر پیشی کے بعد اپنے موکل کی دوسری بیوی صدف کو عدالتی کارروائی کے اہم نکات سے آگاہ کردیا کرتا تھا۔ وہ میری ہدایت کے مطابق کبھی عدالت نہیں آتی تھی البتہ کاشف کی پہلی بیوی ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتی تھی۔ اس روز رات میں جب صدف سے میری بات ہوئی تو اس نے کہا۔

''وکیل صاحب! میں نے شفیق انکل کا سراغ لگالیا ہے۔ وہ آپ سے ملنے کو بے تاب ہیں۔''

شفیق الرحمٰن میرے موکل اور صدف کے شوہر کاشف کا باپ تھا اور کافی عرصہ پہلے کاشف نے اپنے والد کو چھوڑ دیا تھا۔ صدف کی بات سن کر میں چونکا اور پوچھا۔

''آپ کی باتوں سے تو لگتا ہے کہ آپ شفیق الرحمٰن سے ملاقات کرچکی ہیں؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''شفیق انکل کاشف سے سخت ناراض ہیں۔ وہ کاشف کو بہت برا بھلا کہہ رہے تھے۔ میں نے انہیں کاشف کی موجودہ مصیبت کے بارے میں تفصیلاً بتایا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ (کاشف) نالائق تو مجھ سے دور بھاگتا ہے۔ آپ اس نافرمان کے وکیل کو میرے پاس لے کر آؤ۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''شفیق الرحمٰن اس وقت کہاں رہ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''لیاقت آباد میں نیرنگ کے قریب۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ نے شفیق الرحمٰن کا ٹھکانا دیکھ لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں آپ کے ساتھ ہی وہاں جاسکتا ہوں۔''

''آپ جب بھی کہیں، میں آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے، دو دن کے بعد چھٹی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ شفیق الرحمٰن سے ملاقات کا مناسب موقع ہے۔''

ہمارے بیچ تھوڑی دیر تک کاشف کے کیس کے بارے میں بات ہوتی رہی پھر صدف نے پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں کب تک اس کیس کا فیصلہ ہوجائے گا؟''

''ایک پیشی یا زیادہ سے زیادہ دو پیشیوں میں اس کیس کی کشتی کنارے لگ جائے گی۔'' میں نے پُروثوق انداز میں کہا۔ ''اور ہاں...... آیندہ پیشی پر آپ نے لازمی عدالت میں آنا ہے۔''

''میں نے......'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''مگر آپ نے تو خود مجھے وہاں جانے سے منع کر رکھا ہے؟''

''ہاں...... مگر اگلی پیشی پر آپ کا عدالت میں موجود ہونا ضروری ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا اس پیشی پر شازیہ نہیں ہوگی؟''

''ہوگی!'' میں نے کہا۔ ''وہ ہر پیشی پر حاضر ہوتی ہے۔''

''کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے......''

''گڑبڑ پیدا کرنے کے لیے ہی تو آپ کو بلا رہا ہوں۔'' میں نے گول مول انداز میں کہا۔

''میں سمجھی نہیں......؟'' اس کی الجھن میں حیرت در آئی۔

''میں آیندہ پیشی پر عدالت میں ایک خوفناک بم پھوڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' میں نے بدستور معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یہ بم استغاثہ کے پرخچے اڑا دے گا اور اس کے ساتھ ہی آپ کے سر پر لٹکی ہوئی تلوار بھی ہٹ جائے گی۔''

وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ ''کون سی تلوار؟''

''دوسری بیوی ہونے کی تلوار۔'' میں نے اس کی الجھن رفع کرتے ہوئے کہا۔ ''اس پیشی پر کاشف کی دوسری شادی بھی منظرِ عام پر آجائے گی مگر انتہائی معقول اور منطقی انداز میں۔''

''آپ اگر ایسا چاہ رہے ہیں تو یقیناً آپ نے اس کے مابعد اثرات کے بارے میں بھی سوچ رکھا ہوگا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں آپ کے ساتھ ہوں۔ بتائیں، آیندہ پیشی کب ہے؟''

''ٹھیک پندرہ دن کے بعد۔'' میں نے بتایا۔

''او کے...... ڈن!'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

اختتامی کلمات کے بعد میں نے ٹیلی فونک رابطہ موقوف کر دیا۔

صدف ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال اور سمجھ دار عورت تھی۔ اس نے میرے منصوبے کی تفصیل جاننے کے لیے مجھ سے متعدد سوالات نہیں کیے تھے اور مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے سرِتسلیم خم کر دیا تھا۔ فرماں برداری اور اطاعت گزاری میں ان گنت سکھ پوشیدہ ہیں۔ بعض اوقات زیادہ چھاننے سے بھی چیز کنکر ملی ہوجاتی ہے۔ تجربے میں یہی بات آئی ہے کہ زیادہ سوالات کرنے والوں کے ہاتھ اور دامن خالی رہ جاتے ہیں۔

اگلی پیشی سے پیشتر میں نے صدف کی ہمراہی میں لیاقت آباد المعروف لالوکھیت جا کر شفیق الرحمٰن سے ایک بھرپور ملاقات بھی کر لی تھی۔ یہ ملاقات کافی دلچسپ اور سودمند ثابت ہوئی تھی۔ شفیق الرحمٰن ایک غصہ ور اور بدمزاج شخص ضرور تھا تاہم کاشف کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ موجود تھا۔ میں نے شفیق الرحمٰن کو یقین دلایا کہ بہت جلد میں باپ بیٹے کے ملاپ کی کوئی سبیل نکال لوں گا، میری تسلی نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور وٹنس باکس کے اندر مقتول کا منیجر سلیم شاہ کھڑا تھا۔ سلیم شاہ کی عمر پینتالیس کے قریب تھی۔ وہ ایک دراز قامت اور ہینڈسم شخص تھا۔ سلیم شاہ کی آنکھوں میں تیزی اور طراری کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ آج کی عدالتی کارروائی کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ پہلی مرتبہ ملزم کی دوسری بیوی صدف بھی وہاں موجود تھی۔

کارروائی کے آغاز پر سلیم شاہ نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا پھر استغاثہ نے چند رسمی سوالات کے بعد اسے فارغ کر دیا۔ اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور اس انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

''شاہ جی! کیا آپ کی دور کی نظر ٹھیک ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''الحمدللہ......!'' وہ کراری آواز میں بولا۔ ''دور اور نزدیک دونوں نگاہیں بالکل ٹھیک ہیں۔ ٹیکنیکل زبان میں جسے سکس بائی سکس کہا جاتا ہے۔''

''ٹیکنیکل زبان میں یقیناً اسے ''سکس بائی سکس'' کہا جاتا ہوگا۔'' میں نے سنجیدہ الفاظ میں کہا۔ ''لیکن عدالت میں ثبوت کی زبان چلتی ہے۔ کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ آپ کی دور کی نگاہ درست ہے؟''

''آپ چاہیں تو میرا ٹیسٹ لے لیں۔'' وہ فراخ دلی سے بولا۔

''یہ کیسا مذاق ہے۔'' وکیل استغاثہ نے برہمی سے کہا۔ ''یہ عدالت کا کمرا ہے، کوئی آئی ٹیسٹنگ کلینک نہیں۔''

''جب آپ کے معزز گواہ کو ٹیسٹ دینے پر کوئی اعتراض نہیں تو آپ کیوں خفگی کا اظہار کر رہے ہیں؟'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

وہ چند لمحات تک معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔ ''جنابِ عالی! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میرے فاضل دوست کس قسم کی جرح کر رہے ہیں۔''

''اگر آپ چند منٹ تک صبر کا مظاہرہ کرنے کے لیے راضی ہوجائیں تو ہر بات آپ کی سمجھ میں بہ آسانی سرایت کر جائے گی۔'' میں نے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''آپ جو کچھ کرنے جا رہے ہیں کیا اس کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟''

''بہت ہی گہرا تعلق ہے جنابِ عالی۔'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''میں ابھی اپنی بات کو ثابت بھی کر دوں گا۔''

جج سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ آپ اپنی جرح جاری رکھیں مگر غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرتے ہوئے ٹو دی پوائنٹ!''

''شیور یور آنر۔'' میں نے نہایت ہی فرماں برداری سے کہا پھر استغاثہ کے گواہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''شاہ جی! آپ آئی سائٹ ٹیسٹ کے لیے تیار ہیں؟''

''جی۔ میں تیار ہوں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے اپنی فائل میں سے ایک سادہ کاغذ اور قلم نکال کر سلیم شاہ کو تھمایا پھر اپنے ہاتھ کو اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

''شاہ جی! اچھی طرح گن کر بتائیں، میرے ہاتھ میں کل کتنی انگلیاں ہیں؟''

اس نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر جواب دیا۔ ''آپ کے ہاتھ میں کل چار انگلیاں ہیں اور اگر انگوٹھے کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کی تعداد پانچ ہوجائے گی۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''شاہ جی! مبارک ہو۔ آپ ٹیسٹ میں کامیاب ہوگئے۔ آپ کا جواب بالکل درست ہے۔ اب آپ مجھے اس کی رسید بھی دے دیں تاکہ سند رہے اور بہ وقتِ ضرورت کام آئے۔''

''میں سمجھا نہیں وکیل صاحب۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھ سے کس قسم کی رسید مانگ رہے ہیں؟''

''ابھی آپ نے میرے ہاتھ کو دیکھ کر جو کچھ کہا وہ وائیوا (زبانی امتحان) تھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ اپنے انہی الفاظ کو کاغذ پر لکھ دیں گے تو یہ میرے لیے آپ کی جانب سے تحریری رسید ہوگی۔ آپ نے اس تحریر پر اپنے دستخط بھی کرنا ہیں......''

''یہ کون سا مشکل کام ہے۔'' وہ جوش بھرے انداز میں بولا۔ ''میں ابھی کر دیتا ہوں۔''

ایک پیغام

اسپین کے مشہور شہر میڈرڈ کے ایک باغ میں درخت پر یہ الفاظ کندہ ہیں۔

☆ مجھے گزند مت پہنچایئے کیونکہ میں جاڑے کی برفانی راتوں میں آپ کے چولہے کی حرارت ہوں۔

☆ میں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں آپ کو بچانے والا سایہ ہوں۔

☆ اپنے پھلوں سے اور ان سے بنے مشروبات کے ذریعے دورانِ سفر آپ کی پیاس میں ہی بجھاتا ہوں۔

☆ میں وہ شہتیر ہوں جس کے سہارے آپ کے گھر کی چھت قائم ہے۔

☆ آپ کے گھر کا دروازہ بھی ہوں۔

☆ میرے جسم ہی کو تراش کر آپ کشتی بناتے ہیں۔

☆ آپ کی کشتی کا چپو بھی میں ہوں۔

☆ میں آپ کی کدال کا دستہ ہوں۔

☆ میں آپ کا پہلا دوست ہوں۔

☆ میں ہی آپ کا سب سے آخری ساتھی بھی ہوں۔

☆ کیونکہ میں ہی آپ کے تابوت کا خول ہوں۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

آیندہ ایک منٹ کے اندر استغاثہ کے گواہ سلیم شاہ نے میرے حسبِ منشا دستخط شدہ تحریر لکھ کر وہ کاغذ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ''شکریے'' کے الفاظ کے ساتھ مذکورہ کاغذ کو اپنی فائل میں رکھ لیا۔ اسی لمحے وکیلِ استغاثہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ایسی ہی ایک تحریر آپ نے مقتول کی وائف سے بھی لکھوائی تھی۔ آخر ایسی حرکت سے آپ کا مقصد کیا ہے؟''

''میں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ حرکت میں برکت ہوتی ہے لہٰذا میں برکت حاصل کرنے کے لیے ہر وقت حرکت میں رہتا ہوں۔'' میں نے وکیلِ استغاثہ کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنے ذہن کو نہ تھکائیں میرے فاضل دوست۔'' میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا پھر اپنی فائل کو تھپتھپاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''شہلا والا پرچہ بھی اس فائل کے اندر محفوظ ہے۔ بہ وقتِ ضرورت ان دونوں کی برمحل رونمائی کی جائے گی۔''

وکیل استغاثہ میری اس کاری ضرب پر جھنجلا کر رہ گیا اور مجھے ایسی نظر سے گھورنے لگا کہ اگر اسے موقع ملے تو وہ مجھے کچا ہی چبا ڈالے گا۔ میں وکیل استغاثہ کو یکسر نظر انداز کر کے استغاثہ کے گواہ سلیم شاہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''شاہ جی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''فیضان علی سے آپ کی دوستی کیسی چل رہی ہے؟''

میں نے جب حوالات میں کاشف سے پہلی ملاقات کی تھی تو اس نے مجھے بہت قیمتی معلومات فراہم کی تھیں۔ بعد ازاں میں نے خود بھی کافی ریسرچ کی تھی۔ اسی تیاری کی روشنی میں اس وقت میں سلیم شاہ کی رگڑائی منجھائی کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں وہ خاصی لاتعلقی سے بولا۔

''کون فیضان علی؟''

''انڈس فوڈز والے فیضان علی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''انڈس فوڈز...... اچھا اچھا...... وہ فیضان علی۔'' اس کی یادداشت نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ''ہماری دوستی ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''اسٹار فوڈز'' کے ساتھ آپ کی دشمنی بھی ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ یہ دونوں کمپنیاں ایک دوسرے کی حریف ہیں......؟''

''مجھے کسی کے حریف یا حلیف ہونے سے کیا لینا دینا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''میری دوستی فیضان علی سے ہے، اس کی کمپنی سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔''

''دوست کا دوست، دوست اور دوست کا دشمن، دشمن ہوتا ہے سلیم صاحب اور یہ فارمولا میں نے نہیں بنایا بلکہ یہ ایک ضرب المثل ہے جو سالہا سال سے عمل پذیر ہے۔'' میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ ''اگر اسٹار فوڈز کمپنی، انڈس فوڈ کمپنی کی دشمن ہے تو اس اصول کے تحت آپ بھی اسٹار فوڈز کمپنی کے دشمن ٹھہرائے جائیں گے کیونکہ آپ فیضان علی (انڈس فوڈز) کے دوست ہیں جو رفیق الدین (اسٹار فوڈز) کا دشمن ہے اور آپ نے اس دشمنی کا عملی ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔''

میرے آخری جملے نے اس کے اندر کھلبلی مچا دی تھی، اس نے خاصے ترش لہجے میں دریافت کیا۔ ''آپ کس ثبوت کی بات کر رہے ہیں؟''

''کھوجی میں شائع ہونے والی وہ جائزہ رپورٹ جس نے اسٹار فوڈز کمپنی کی ساکھ کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''میرا اس رپورٹ سے کوئی تعلق نہیں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''یہ کارنامہ آپ کے موکل نے انجام دیا تھا جس کے نتیجے میں اعجاز صاحب نے اسے نوکری سے نکال دیا تھا۔ آپ کسی دوسرے کا گناہ میرے سر پر ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔''

''لیکن میرے موکل نے مجھے بتایا ہے کہ اس کام کی تحریک آپ نے اسے دی تھی۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''آپ نے اس سے کہا تھا کہ اس بلیک میلنگ میں جو پیدا ہوگی وہ آپ دونوں آپس میں برابر بانٹ لیں گے لیکن جب رفیق الدین دباؤ میں نہیں آیا اور کھیل بگڑتا ہوا دیکھا تو آپ چالاکی سے ایک طرف ہوگئے اور اس معاملے کا سارا ملبا میرے موکل کی گردن پر آ گرا......''

یہ وہ حقائق تھے جو کاشف کی زبانی مجھ تک پہنچے تھے۔ میرے موکل سے اسٹار فوڈز کمپنی کے خلاف شائع ہونے والی رپورٹ کے سلسلے میں ضرور غلطی ہوئی تھی لیکن وہ کسی بھی طور اعجاز حسین کے قتل میں ملوث نہیں تھا اسی لیے میں نے اس کی وکالت کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی۔

''آپ کا موکل بکواس کرتا ہے۔'' سلیم شاہ آگ بگولا ہوتے ہوئے بولا۔ ''وہ حقائق کو مسخ کر کے خود کو بے گناہ و بے قصور ثابت کرنے کی تاک میں ہے اور افسوس...... صد افسوس کہ آپ نے اس کی بات کا یقین بھی کر لیا......''

بات کے اختتام پر وہ حقارت بھری نظر سے مجھے ـنے لگا۔ میں نے اس کی نگاہ کو جوتے کی نوک پر مارتے ـے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھایا اور بدستور کٹیلے انداز ـں کہا۔

''میرے موکل نے تو مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ مقتول ـے بنگلے پر آ کر معافی مانگنے کی تجویز بھی اسے آپ ہی نے ـی تھی......؟''

''آپ کا موکل اول درجے کا مکار اور جھوٹا ہے۔ ـا کیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) میں کھڑے ـاشف کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے نفرت ـرے انداز میں بولا۔ ''اگر دنیا میں دروغ گوئی پر بھی کوئی ـعام مل رہا ہوتا تو آپ کا موکل سب سے بڑا ایوارڈ ونر ـابت ہوتا۔''

''ایک لمحے کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ میرا موکل ـں دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا اور آپ اس دنیا کے سب سے ـچے انسان ہیں۔'' میں نے غیر محسوس انداز میں اسے اپنے ـال میں پھانستے ہوئے کہا۔ ''اب آپ یہ بتا دیں کہ نیلے ـنگ کی مزدا کار آپ ہی کی ملکیت ہے؟''

''اس شہر میں سیکڑوں نہیں تو درجنوں نیلی مزدا کاریں ـموجود ہیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آپ کس کار کی ـات کر رہے ہیں؟''

''میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ اس ـہر میں بہت ساری نیلی مزدا کاریں ہو سکتی ہیں لیکن یہ بھی ـیک حقیقت ہے کہ ان تمام کاروں کا نمبر ایک نہیں ہوگا۔'' ـں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ـبھی جس نیلی مزدا کار کا ذکر کیا ہے اس کا نمبر ہے...... کے ـے ڈی۔ سیون فور۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی۔ یہ ـری ہی کار کا نمبر ہے۔''

''سلیم صاحب!'' میں نے جرح کے سلسلے کو بڑی ـحتیاط کے ساتھ سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''وقوعہ کے روز آپ کی ـاہنمائی پر پولیس نے انکوائری آفس کے علاقے میں ایک ـھر پر چھاپا مار کر ملزم کو گرفتار کیا تھا۔ کیا آپ معزز عدالت ـو یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کو کیسے پتا تھا کہ رات کو دس ـجے ملزم اس گھر میں موجود ہوگا؟''

''ظاہر ہے، ہر انسان رات کو اپنے ہی گھر جاتا ـہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''لیکن ملزم کا اپنا گھر تو گلشن ظہور میں ہے۔'' میں نے مصنوعی لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاں وہ اپنی بیوی شازیہ کے ساتھ رہتا ہے۔''

''آپ کی معلومات درست مگر ادھوری ہیں وکیل صاحب۔'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''شاہ جی! اگر میری معلومات ادھوری ہیں تو آپ انہیں مکمل کر دیں۔''

''مجھے امید نہیں تھی کہ آپ اپنے موکل کے بارے میں اتنے بے خبر ہوں گے۔'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی امید پر پورا نہیں اترا۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ راہنمائی فرمائیں۔''

وہ سمجھا کہ میں اس سے مرعوب ہوگیا ہوں۔ اس نادان کو علم نہیں تھا کہ بے خبری میں، میں اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔ وہ بڑے فخر سے معلومات کے دریا بہانے لگا۔

''آپ کا موکل دو کشتیوں کا مسافر ہے یعنی اس نے دو شادیاں کر رکھی ہیں۔ اس کی پہلی بیوی شازیہ گلشن ظہور والے گھر میں رہتی ہے اور دوسری بیوی صدف انکوائری آفس کے علاقے والے مکان میں۔ شازیہ سے اس کی کوئی اولاد نہیں جبکہ صدف سے اس کا ایک بیٹا ہے اور آپ کی تازہ ترین اطلاع کے لیے یہ بھی بتاتا چلوں کہ آپ کے موکل کی دونوں کشتیاں...... میرا مطلب ہے، ملزم کی دونوں بیویاں اس وقت عدالت میں موجود ہیں......''

''ایں......'' میں نے بے پناہ مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آپ فلمی سین سنا رہے ہیں......''

میں نے بات پوری کرنے کے بعد حاضرینِ عدالت پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ صدف بڑے اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ شازیہ اضطراب کے عالم میں گردن اٹھا کر عدالت کے کمرے میں موجود ہر عورت کو تفتیشی نگاہ سے ٹٹول رہی تھی۔ دوسری جانب استغاثہ کا گواہ سلیم شاہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا جا رہا تھا......

''دو کشتیوں پر سوار شخص ایک روز اپنی ٹانگیں تڑوا بیٹھتا ہے اور ملزم کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک تنخواہ میں دو گھروں کو چلانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ اکثر مجھ سے ادھار پیسے مانگتا رہتا تھا پھر ایک روز میں نے اسے آئیڈیا دیا......''

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگیا اور ایسی چور

نظر سے ادھر ادھر تکنے لگا جیسے وہ کوئی سنگین غلطی کرنے جارہا تھا۔ میں نے اس کی ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آپ نے ملزم کو آئیڈیا دیا کہ پیسے کمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا پڑتے ہیں۔ وہ بھی بلیک میلنگ کا دھندا شروع کردے۔ اس سلسلے کا پہلا پروجیکٹ اسٹار فوڈز کمپنی کے خلاف رپورٹنگ تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا شاہ جی؟“

”آپ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جبکہ میں نے اسے ڈبل نوکری کا مشورہ دیا تھا۔“

”آپ کے مشورے کی برکت کے طفیل ڈبل تو کیا وہ سنگل نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔“ میں نے خشمگیں نظر سے اسے گھورا۔ ”آپ نے بڑی صفائی کے ساتھ ایک تیر سے دو دو شکار کرلیے......“

میرے آخری جملے پر وہ جزبز ہوکر رہ گیا۔

”یور آنر!“ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے دلائل کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول کی گردن کے بائیں جانب زہریلے انجکشن سے وار کرکے اسے نیند کی موت سلایا گیا۔ بائیں کان کے عین نیچے گردن کے وسط میں سرنج کی سوئی کا نشان بھی پایا گیا تھا۔ یہ تمام تر تفصیل پہلی پیشی پر معزز عدالت کے روبرو میں نے اس کیس کے انکوائری آفیسر سے ڈسکس کی تھی۔ ہماری یہ گفتگو جرح کی صورت عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ، انکوائری آفیسر اور میں اس بات پر متفق ہیں کہ قاتل نے مقتول کے عقب سے حملہ کرکے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اگر اجازت ہو تو میں مقتول کی موت کے سین کو عدالت کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“ وکیلِ استغاثہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے استفسار کیا۔

میں نے بھی بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”اس تجربے کے نتیجے میں میرا موکل بے گناہ ثابت ہوجائے گا۔“

جج نے میری بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کراری آواز میں کہا۔ ”آپ کو یہ تجربہ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔“

”آپ آئیں میرے ساتھ۔“ میں نے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں...... کیوں...... کہاں......؟“ وہ چیں بہ جبیں ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ آئیں تو۔“ میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ”اس کیس پر پچھلے کئی ماہ سے ہم دونوں سینگ لڑا رہے ہیں۔ یہ دلچسپ تجربہ بھی ہم دونوں بھائی مل کر ہی کریں گے۔“

وہ جزبز ہوتے ہوئے میرے ساتھ چل پڑا۔ اس روز میں اس کیس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے مکمل تیاری کے ساتھ عدالت پہنچا تھا۔ اس ”تیاری“ کا ایک جز اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر برآمدے میں بیٹھا اپنی باری کا انتظار کررہا تھا۔

میرے اشارے پر وکیل مخالف ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے عقب میں جاکر کھڑا ہوگیا۔ ہم دونوں کا رخ جج کی سمت تھا۔ عدالت کے اندر یکایک سناٹا چھا گیا تھا۔ وہاں پر موجود ہر ذی نفس کی نگاہ منتظر تھی کہ میں اپنے تجربے کے تھیلے میں سے کون سا سانپ نکالنے والا ہوں۔

میں نے کھنکھار کر پن ڈراپ سائیلنس کا دامن تار تار کردیا پھر وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”فرض کریں، آپ مقتول اعجاز حسین ہیں اور میں آپ کے عقب میں کھڑا ایک نامعلوم خطرناک قاتل ہوں......“

میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ بجلی کی سرعت سے بدکا لیکن میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے بدکتے ہی میں نے اسے کندھوں سے دبا کر کرسی پر جمار ہنے دیا اور تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

”گھبرائیں نہیں میرے فاضل دوست۔ اس تجربے کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں...... سولجر! دس از جسٹ اے ڈرل!“

میرے اطمینان دلانے پر وہ قدرے شانت ہوگیا۔ ایک لمحہ پہلے اس کے بدن میں جو تشنج ایسی کیفیت پیدا ہوئی تھی وہ جاتی رہی۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک فائیو سی سی کی ڈسپوزیبل سرنج نکالی اور ڈرامائی انداز میں کہا۔

”اب میں اپنے فاضل دوست پر خطرناک حملے کا ڈیمو دوں گا تاکہ معزز عدالت کے سامنے استغاثہ کی پیش کردہ تھیوری کا پریکٹیکل کیا جاسکے......“

میں نے اس کے کندھے پر ایک ہاتھ کا دباؤ برقرار رکھا ہوا تھا تاکہ وہ کرسی سے اٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ اس نے سراسیمہ انداز میں گردن گھما کر سرنج کی طرف دیکھا۔ میں نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں کہا۔

”آپ تو اس طرح ڈر رہے ہیں جیسے چھوٹے بچے انجکشن لگوانے سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔“ پھر میں نے سرنج کے چیمبر میں پسٹن کو اندر باہر کرتے ہوئے ان الفاظ

میں اضافہ کیا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس سرنج کے اندر زہریلا محلول موجود نہیں اور اپنا ہاتھ ادھر لائیں۔“ اس کے بعد میں نے سرنج کے آگے لگی ہوئی نیڈل کو اتارا اور وکیل استغاثہ کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس سوئی کو اپنی مٹھی میں دبا کر بیٹھ جائیں۔ انجکشن کے تمام تر خطرات معدوم ہوگئے ہیں۔“

اس کی جان میں جان آئی اور گہری سانس خارج کرنے کے بعد وہ بی با بچہ بن کر آرام سے بیٹھ گیا جیسے چھوٹے بچے بال کٹوانے کے لیے کپڑا لپیٹ کر حجام کی کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے قتل کی واردات کا ڈیمو دیا۔

پہلے میں نے سرنج کو دائیں ہاتھ میں پکڑ کر وکیل استغاثہ کی گردن کے دائیں حصے پر انجکشن لگانے کی اداکاری کی۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے پر سرنج کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر وکیل مخالف کی گردن کے بائیں حصے پر انجکشن لگانے کی اداکاری کی۔ اس کام سے نمٹنے کے بعد میں نے روئے سخن جج کی سمت کرتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا۔

”جناب عالی! حقائق و واقعات اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کی روشنی میں مقتول کی گردن کے بائیں حصے پر زہریلا انجکشن لگایا گیا تھا۔ ابھی میرے تجربے نے یہ ثابت کیا ہے کہ قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے یعنی وہ لیفٹ ہینڈر ہے جبھی اس نے مقتول کے عقب میں کھڑے ہوکر بائیں ہاتھ سے مقتول کی گردن کے بائیں حصے میں سرنج کی سوئی کو پیوست کرکے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔“

”بات سمجھ میں نہیں آئی......“ وکیلِ استغاثہ ہونقوں کے مانند منہ کھول کر بولا۔

”آپ اٹھ کر اپنی جگہ پر چلے جائیں۔“ میں نے وکیل سرکار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”استغاثہ کی بیسی پر حقائق کا زوداثر انجکشن لگ چکا ہے۔ اس کیس میں آپ کا رول ختم ہوگیا۔ اب پیک اپ کریں۔“

”یہ تو ثابت ہوگیا کہ قاتل لیفٹ ہینڈر ہے۔“ جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی نظر میں ملزم رائٹ ہینڈر ہے؟“

”صرف میری نظر پر ہی موقوف نہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس امر کے درجنوں بلکہ سینکڑوں گواہ مل جائیں گے کہ میرا موکل ایک سو ایک فیصد دائیں ہاتھ سے کام کرنے والا انسان ہے لہٰذا یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ میرا موکل بے گناہ ہے۔ اس نے اعجاز حسین کو قتل نہیں کیا۔ ملزم کے جائے وقوعہ سے چلے جانے کے بعد مقتول کی موت واقع ہوئی تھی۔“

”وہ لیفٹ ہینڈر شخص کون ہے جس نے اعجاز حسین کو موت کی نیند سلا دیا......؟“ جج نے سرسراتی ہوئی آواز میں ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

”سر! میں اب اجازت چاہوں گا۔“ سلیم شاہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پریس کے بہت سارے کام دیکھنا ہیں......“

”صدقے جاؤں...... آپ کہاں جارہے ہیں۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”آپ کو پریس کے کام دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اب تو پریس آپ کے کام دیکھے گی۔ آپ یہاں سے سیدھے پولیس کی کسٹڈی میں جائیں گے...... اعجاز حسین کے قتل کے جرم میں۔ شہر کے تمام پریس آپ کی چٹ پٹی کہانی شائع کریں گے۔“

”آپ کیا بکواس کررہے ہیں......“ وہ بپھرے ہوئے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کا منہ نوچ لوں گا۔“

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ میں نے بے پروائی سے کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے اپنے دلائل کو منطقی انجام تک پہنچا دیا۔

”جناب عالی! استغاثہ کے مطابق وقوعہ کے روز مقتول کے بنگلے کے اندر تین افراد موجود تھے۔ ملزم، مقتول اور مقتول کی بیوی شہلا۔ مقتول تو جان کی بازی ہار چکا لہٰذا اسے مائنس کردیتے ہیں۔ باقی بچے ملزم اور شہلا اور یہ دونوں افراد رائٹ ہینڈرز ہیں گویا ان میں سے کوئی بھی قاتل نہیں ہوسکتا۔“ لمحاتی توقف کرکے میں نے حاضرین عدالت پر ایک گہری نگاہ ڈالی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن میرے مطابق وقوعہ کے روز ان کے علاوہ ایک اور شخص بھی بنگلے پر موجود تھا جو لیفٹ ہینڈر ہے اور اسی شخص نے زہریلے انجکشن کی مدد سے اعجاز حسین کو موت کی نیند سلایا تھا۔“

”وکیل کے بچے! اگر تم نے مجھے اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی تو میں تمہاری گردن توڑ ڈالوں گا۔“ سلیم شاہ وٹنس باکس سے نکل کر خوں خوار انداز میں میری جانب بڑھا۔

تاہم اس کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ متعلقہ عدالتی

عملے نے اسے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی قابو کر کے حوالۂ پولیس کردیا۔

”جناب عالی! پچھلی پیشی پر میں نے شہلا کا رٹن ٹیسٹ لیا تھا تاکہ یہ جان سکوں کہ وہ لیفٹ ہینڈر ہے یا رائٹ ہینڈر اور یہی ٹیسٹ میں نے اس پیشی پر سلیم شاہ کا بھی لیا ہے۔ ان دونوں کے ٹیسٹ کی کاپیاں میری فائل میں موجود ہیں جن کے مطابق، مقتول کی بیوہ شہلا رائٹ ہینڈر ہے جبکہ سلیم شاہ لیفٹ ہینڈر اور...... اس سلیم شاہ ہی نے اعجاز حسین کا قتل کیا ہے۔ یہ شخص وقوعہ کے روز بنگلے پر پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ملزم کے رخصت ہونے کے بعد اپنے محسن اعجاز حسین کی گردن میں زہریلا انجکشن پیوست کیا پھر بنگلے کے عقبی گیٹ میں سے نکل کر اپنی گاڑی میں پہنچا جو پروگرام کے تحت اس نے عقبی گلی کے نکڑ پر کھڑی کر رکھی تھی۔ یہ گاڑی میں سوار ہوا اور دوسری گلی سے گھوم کر بنگلے کے مین گیٹ پر آگیا اور یہی ظاہر کیا کہ یہ ابھی ابھی وہاں پہنچا ہے۔ اس کے بعد کی ساری کہانی عدالت کے علم میں ہے۔“

”بیگ صاحب!“ پوری بات سننے کے بعد جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت ہے جس سے پتا چلے کہ سلیم شاہ وقوعہ کے روز مقتول کے بنگلے میں موجود تھا؟“

”جو بغیر ثبوت اور دلائل کے بات کرے، میں اسے وکیل نہیں مانتا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس ایک ایسا صادق اور امین چشم دید گواہ موجود ہے جس نے وقوعہ کے روز سلیم شاہ کو بنگلے کے عقبی گہرے بھورے دروازے میں سے نکل کر نیلی مزدا کار کی جانب بڑھتے اور پھر مذکورہ کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوتے دیکھا تھا اور عین وقوعہ کے وقت۔“

”آپ کون سے صادق اور امین گواہ کی بات کررہے ہیں؟“

”دلدار خان کی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”سیٹھ نجم الدین کا چوکیدار...... وہ اس وقت عدالت کے باہر برآمدے میں موجود ہے۔“

جج نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”صفائی کے گواہ کو فوراً پیش کیا جائے۔“

☆☆☆

اگلی پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کو باعزت بری کردیا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دلدار خان کی گواہی کے بعد سلیم شاہ کو باقاعدہ حراست میں لینے کے بعد پولیس کسٹڈی میں دے دیا گیا تھا۔ یہ بھی بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جب اصل مجرم پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو اس کی زبان کھلوانے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ یہ واردات سلیم شاہ اور شہلا کا جوائنٹ وینچر تھا۔ وہ دونوں اندر سے ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے کاشف کو قربانی کا بکرا بنا کر اعجاز حسین کو اپنی راہ سے ہٹایا تھا لیکن وہی بات کہ...... جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔ کاشف آزاد فضا میں سانس لے رہا تھا اور سلیم شاہ اپنے باس کو قتل کرنے کی پاداش میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ پولیس نے شریک جرم ہونے کی حیثیت سے شہلا کو بھی حراست میں لے لیا تھا۔

اس کیس کے ختم ہونے کے چند روز بعد کاشف مجھ سے ملنے میرے آفس آیا۔ اس کے ساتھ شازیہ اور شفیق الرحمٰن بھی تھے۔ ان سب نے میرا شکریہ ادا کیا (صدف قبل ازیں میرا شکریہ ادا کرچکی تھی) شازیہ نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

”میں نے کاتب تقدیر کے لکھے کو قبول کرلیا ہے۔ یہ تو ممکن اور مناسب نہیں لگا کہ میں اور صدف کاشف کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہیں لیکن میں نے انکل شفیق کو اپنے گھر میں شفٹ کرلیا ہے۔ اس طرح میرے والد کی کمی پوری ہوگئی ہے۔ میں انہیں ”ابو“ کہتی ہوں۔ یہ اسم بامسمٰی ہیں۔ ان کی آمد سے ہماری زندگی میں بہار آگئی ہے۔“

میں نے شفیق الرحمٰن سے استفسار کیا۔ ”حضرت! اب تو آپ کی نظر میں کاشف نافرمان نہیں ہے نا؟“

”یہ بہت نالائق ہے۔“ شفیق الرحمٰن نے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے میٹھی خفگی سے کہا۔ ”میری شازیہ بیٹی بہت اچھی ہے۔“

”نالائق چلے گا......“ میں نے کہا۔ ”نافرمانی کے چکر میں آپ کے بیٹے نے کافی مصیبت اٹھالی ہے۔ ویسے......“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ویسے آپ کی دوسری بیٹی صدف بھی اچھی ہے۔“

وہ تینوں مسکرانے لگے۔ شازیہ کی مسکراہٹ میں ایک خاص نوعیت کی شکایت چھپی ہوئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ یہ شازیہ کا فطری ردعمل تھا. صدف اس کی سوتن تھی اسی لیے میرے منہ سے صدف کی تعریف شازیہ کو بھائی نہیں تھی......!

(تحریر: حسام بٹ)

کوتاہی اور عاقبت نااندیشی کے طفیل انسان ہمیشہ آزمائشوں میں مبتلا رہا مگر اس کی فطرت اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اسے سرکشی پر اکساتی رہتی ہے جس کے نتیجے میں دلدل اس کا نصیب ٹھہر جاتی ہے اور ہائے ری بدنصیبی کہ جب پاؤں دلدل کی تہ میں جکڑ لیے جاتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ کہاں ہم سے غلطی ہوئی لیکن اس کے باوجود کوئی بھی الزام اپنے سر لینے کے بجائے وہ بے شمار جواز تراش لیتا ہے... یہ بھی ایسے ہی مرض میں مبتلا لوگ تھے۔

ترقی کے نام پر بے حیائی کا جواز تلاشنے والوں کی روداد

جواز

زویا اعجاز



دوپہر کے سائے تیزی سے سہ پہر کی آغوش میں پناہ ... رہے تھے۔ سڑکوں پر ہر سمت ٹریفک کا ازدحام تھا۔ ...روفیت، عجلت اور بھاگ دوڑ کی کیفیت نے فضا کو اپنی ... میں لے رکھا تھا۔ تیس برس سے متجاوز وہ عورت بھی نہایت عجلت ہی میں ایک بغلی گلی سے برآمد ہوئی۔ اس کے ہمراہ نو سالہ بچی تھی جس کے چہرے پر بیزاری اور جھنجلاہٹ واضح نظر آرہی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی بیرونی سڑک پر آچکی تھیں۔

''ماما! میں آج پھر لیٹ ہوگئی ہوں۔'' بچی نے روہانسی آواز میں ماں کو یاددہانی کروائی۔

''کوئی بات نہیں میرا بچہ! چند منٹ کی تاخیر سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' عطیہ نے حتی الامکان لہجہ بے نیاز رکھا۔

''فرق پڑتا ہے ناماما! ٹیچر بہت سخت ہیں۔ وہ سب کے سامنے ڈانٹ دیتی ہیں۔ مجھے بہت انسلٹ فیل ہوتی ہے۔'' نو سالہ ثنا کے اس معصومانہ انداز پر وہ بے ساختہ مسکرانے لگی۔

''اب آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟'' وہ مزید آزردہ ہوئی۔ ''ایک تو کوئی بھی میری بات کو سیریس لیتا ہی نہیں ہے۔''

عطیہ کو بیٹی کی اس ادا پر بہت پیار آیا۔ ثنا علاقے کے ایک بہترین اسکول میں نہایت ذہین اور چاق و چوبند طالبہ تھی۔ سہ پہر کے وقت وہ ایک کوچنگ سینٹر میں ٹیوشن پڑھنے جاتی تھی۔ اس کی ٹیچر نظم و ضبط کے معاملے میں خاصی سخت مزاج تھی اور چند منٹ کی تاخیر پر بھی بچوں کی کھنچائی کردیا کرتی۔ نازو انداز میں پروردہ ثنا اپنی عزتِ نفس کے معاملے میں بہت زودرنج تھی۔

''میں اپنی بیٹی کی ہر بات سنجیدہ لیتی ہوں...!'' عطیہ نے اسے پچکارا۔

''تو پھر آپ ٹیچر سے کہہ دیں گی نا کہ وہ مجھے مت ڈانٹیں۔''

''بالکل کہہ دوں گی۔ آپ فکر نہ کرو۔ ویسے بھی اس تاخیر میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔'' ماں کی اس بات پر ثنا کے چہرے سے طمانیت جھلکنے لگی۔

''آپ پاپا سے بھی بات کیجیے گا۔ اب ہر روز یونہی ہوا کرے گا کیا؟'' اسے یکدم وجۂ تاخیر یاد آئی تو ماں کی ذہن سازی بھی ضروری خیال کی۔

''او کے مائی چائلڈ! میں پاپا سے بھی ضرور کہوں گی۔''

''تھینک یو مام! یو آر دی ورلڈ بیسٹ مام۔'' وہ چہکی۔

عطیہ کا وجود خوشی و فخر کی لہروں سے شرابور ہوگیا۔ اولاد کی خوشی سے بڑھ کر ماتا کو سکون ملتا ہی کہاں ہے۔ انہی سوچوں میں غلطاں وہ کوچنگ سینٹر پہنچ گئیں۔ وہ متوسط طبقے کا چار مرلے پر مشتمل ایک گھر تھا جس کے بیرونی سمت میں واقع کمرا ٹیوشن کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ علاقے میں اس سینٹر کی شہرت بہت اچھی تھی۔ زاہدہ خاتون کے ساتھ بچوں کو پڑھانے کی ذمے داری ان کی بیٹی نے بھی سنبھال رکھی تھی۔ عطیہ کے شوہر مجاہد اور ان کی دونوں بہنیں بھی زاہدہ کے پاس ہی پڑھتے رہے تھے اس لیے کسی غیرتحریری قانون کے مطابق ثنا کو بھی یہیں داخل کروادیا گیا۔

''السلام علیکم خالہ جی! آج تاخیر کے لیے میں بہت معذرت خواہ ہوں۔ دراصل ماں جی کی طبیعت یکدم بہت بگڑ گئی تھی۔ انہیں سنبھالنے میں الجھ کر میں ثنا کو چھوڑنے نہ آسکی۔'' عطیہ نے پہلے ہی سے سوچا ہوا عذر تراشا۔ ثنا نے یکدم چونک کر ماں کی جانب دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ بھی پُرسکون ہوگئی۔

''اللہ پاک کرم فرمائے! کیا ہوا نفیسہ بہن کو؟'' زاہدہ نے تشویش سے پوچھا۔

''بس خالہ جی! بڑھاپا تو خود سیکڑوں بیماریوں کا جواز ہوتا ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو بیٹا! میری طرف سے نفیسہ کو بہت پوچھنا۔ میں کسی وقت چکر لگاؤں گی۔ بہت عرصہ ہوا نفیسہ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''

''ضرور خالہ جی! آپ کا اپنا گھر ہے۔ جب دل چاہے آئیں۔'' عطیہ نے سنبھل کر کہا اور ثنا کو آمنہ کے پاس چھوڑ کر واپس ہولی۔ اس کا مسئلہ بہ آسانی حل ہوگیا تھا اس لیے وہ اب کافی پرسکون تھی۔

زاہدہ خاتون کے گھر سے واپس سڑک پر آتے ہوئے اب وہ اپنے دیگر مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ انہی خیالات میں غرق اسے پیشانی اور کندھے پر کسی نکیلی اور بھاری بھرکم چیز کی ضرب کا احساس ہوا تو وہ بلبلا کر رہ گئی۔ پتھروں کی ان ضربات سے وہ لڑکھڑا کر سڑک پر ہی گرگئی تھی۔

''اندھی ہوگئی ہے کیا؟ اللہ نے تجھے آنکھیں دی ہیں...... عقل دی ہے...... انہیں استعمال کیوں نہیں کرتی؟'' اس کے سڑک بوس ہوتے ہی وہ عورت افتاد کی طرح اس پر پل پڑی۔ عطیہ کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''ہٹو پیچھے...... کون ہو تم؟ یہ کیا حرکت ہے...... پاگل ہوئی ہو کیا؟'' میلے، الجھے بالوں اور لباس سے اٹھتی بدبو سے عطیہ کا دل متلانے لگا۔

''تُو بتا...... یہ کیا حرکت ہے؟...... تُو یہ سب کیا کررہی ہے؟'' عورت نے ایک بار پھر سابقہ انداز میں کہا۔

عطیہ کے لیے اب سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ اسی پل وہاں چند راہ گیر اکٹھے ہوگئے اور مخبوط الحواس عورت کو جھٹکے سے پیچھے ہٹادیا۔

''بہن جی! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اس کے ایک پڑوسی نے تشویش سے پوچھا۔ اس کی کریانے کی دکان اسی سڑک پر واقع تھی۔ عطیہ نے سنبھل کر اپنی پیشانی ٹٹولی جہاں ہلکا سا

...اور درد محسوس ہونے لگا تھا۔

''کون ہے یہ عورت؟ کیا بے ہودگی ہے یہ؟'' ہاتھ ...نے سے درد میں اضافہ ہوا تو وہ بھنا کر بولی۔

''ارے بہن جی! جانے کون پاگل ہے۔ کچھ ہی روز ...یہاں نظر آنے لگی ہے...... صبح شام بس یہیں گھومتی رہتی ...'' اس کے پڑوسی نے نیم بیزاری سے کہا۔

''اگر اس نے دوبارہ کوئی ایسی حرکت کی تو حشر بگاڑ دیں ...'' دوسری آواز ابھری۔

عطیہ نے اب کافی حد تک خود کو سنبھال لیا تھا۔ کندھا ...پیشانی دھیرے دھیرے سہلاتی ہوئی وہ گھر کی جانب ...نہ ہوگئی۔

''اب بھی وقت ہے...... سنبھل جا...... سنبھل جا......'' ...سمت سے اسی عورت کی آواز سماعت میں پڑی۔

''ہونہہ...... پاگل! جانے کہاں کہاں سے آجاتے ...ں۔'' وہ غصے سے بڑبڑانے لگی۔

☆☆☆

شام ہونے تک عطیہ کے سر کی چوٹ کا درد مزید شدت ...یار کرگیا۔ درد کے ساتھ اسے ہلکی سی حرارت بھی محسوس ہو ...ہی تھی۔ کام نمٹاتے ہوئے اعصابی کھنچاؤ ناقابلِ برداشت ...نے لگا تو لمحاتی سوچ بچار کے بعد اس نے موبائل فون اٹھایا ...ر مجاہد کا نمبر ملایا۔

''کیا بات ہے، تمہاری آواز اس قدر بوجھل کیوں ہو رہی ...؟'' مجاہد نے اس کی طبیعت میں تبدیلی فوراً بھانپ لی۔

''ایک چھوٹا سا حادثہ ہوگیا تھا۔ آپ پلیز ثنا کو ٹیوشن ...ٹر سے لیتے آئیے گا۔ میں زاہدہ خالہ کو میسج کردوں گی کہ اس ...ی چھٹی ہوتے ہی آپ کے فون پر مسڈ کال کردیں۔'' عطیہ ...نے اس واقعے کے متعلق مختصراً بتاتے ہوئے کہا۔ آمنہ اور ...ہدہ خاتون کسی بھی بچے کی چھٹی ہونے پر اہلِ خانہ کے ...بائل پر مسڈ کال کیا کرتی تھیں تاکہ اس کی بحفاظت واپسی ...ی بنائی جاسکے۔

''او کے! فکر نہ کرو۔ میں لے آؤں گا اسے۔'' مجاہد ...نرمی سے کہتے ہوئے فون بند کردیا۔

عطیہ درد کی ٹیسوں پر قابو پاتے ہوئے بستر پر نیم دراز ...ہی۔ ''فکر کیسے نہ کریں اولاد کی...... یہی تو ہمارے جینے کا ...مد اور آسرا ہوتی ہے۔'' اس نے خودکلامی کی۔

وہ دونوں ہی بیٹی کے معاملے میں بہت حساس اور محتاط ...۔ ایک انہی پر کیا موقوف، آئے روز میڈیا میں بچوں ...ہونے والے جنسی تشدد اور زیادتی کے واقعات نے سبھی والدین کو ہراساں کر رکھا تھا۔ ثنا ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ خواہش کے باوجود وہ ہنوز دوسری اولاد سے محروم تھے۔ اسکول کے لیے خصوصی طور پر وین کا بندوبست کیا گیا تھا اور ٹیوشن کی ذمے داری عطیہ نے خود سنبھال رکھی تھی۔ وہ اس معاملے میں رتی بھر بھی بے احتیاطی کی قائل نہ تھی۔

''بعد میں کسی پچھتاوے میں مبتلا ہونے یا ملول رہنے سے بہتر ہے کہ انسان بروقت فیصلے کرے اور وقتی تکالیف برداشت کرلے۔'' وہ اکثر شوہر سے کہا کرتی۔ مجاہد بھی مکمل طور پر اس کا ہم نوا تھا۔

''عطیہ! میرا کھانا لے آؤ۔'' ساس کی آواز نے اسے بستر سے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ نفیسہ اس وقت ہلکے پھلکے کھانے کے بعد دوا لیا کرتی تھیں۔

ساس کو کھانا اور دوا پلانے کے بعد وہ ایک بار پھر فارغ تھی۔ اسے شوہر اور بیٹی کا شدت سے انتظار تھا۔ نصف گھنٹے بعد دروازے پر بائیک کی آواز اور ثنا کی چہکار سن کر اسے ساری تکلیف فراموش ہوگئی۔

''اتنی دیر کیوں کردی بھئی؟ فون بھی نہیں اٹھا رہے تھے۔'' وہ بے تابی سے بولی۔

''پاپا زاہدہ آنٹی سے باتیں کررہے تھے۔ وہ ان کی ٹیچر تھیں نا۔ آج آنٹی نے مجھے پاپا کی بہت سی شرارتیں بتائی ہیں۔ ہائے اللہ! پاپا اتنے شرارتی ہوا کرتے تھے۔'' ثنا کے پُرجوش اور چہکتے انداز پر وہ بھی کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ہاں بھئی! بہت شرارتی ہوا کرتے تھے آپ کے پاپا......'' اس نے لقمہ دیا۔ خالہ زاد ہونے کے ناتے وہ مجاہد کے بچپن سے اچھی طرح واقف تھی۔

مجاہد کے چہرے پر الجھن اور سنجیدگی تھی۔ اسے ان باتوں میں فی الوقت کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ سرد انداز میں کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''ماما! آپ نے میرے لیے نگٹس فرائی کیے؟'' ثنا نے فوری طور پر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

''ماما آپ سے کیا ہوا کوئی وعدہ بھول سکتی ہیں کیا؟'' عطیہ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بیگ اپنی جگہ پر رکھنے کی ہدایات دیتی ہوئی کچن میں چلی آئی۔ ثنا جنک فوڈ کی کافی شوقین تھی اور ٹیوشن سے واپسی کے بعد عطیہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور بنا کر رکھتی تھی۔

نگٹس اور فرائز تھام کر وہ ٹی وی لاؤنج میں چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنے پسندیدہ کارٹونز دیکھنے میں مگن ہوچکی تھی۔ عطیہ کو اب شوہر کی جانب سے تشویش ہونے لگی۔

''اس قدر خاموش اور اکھڑے ہوئے سے کیوں ہیں یہ؟ پہلے تو فون پر اچھے بھلے تھے۔'' وہ الجھتی ہوئی بیڈروم کی طرف چلی آئی جہاں مجاہد کپڑے تبدیل کر کے بستر پر لیٹ چکا تھا۔ وہ ایک میڈیکل اسٹور کا مالک تھا اور بعد از شام ایک گھنٹے کے لیے آرام کی غرض سے گھر آجاتا تھا۔ اس کے بعد اسٹور رات گئے تک کھلا رہتا۔

''نصیبِ دشمناں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' عطیہ نے ملائمت سے پوچھا۔

''ہوں! ٹھیک ہوں۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''کوئی تو بات ہے ایسی جس کی وجہ سے آپ کا موڈ آف ہے۔'' وہ اس کے پاس بیٹھ کر نرمی سے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ شوہر کی رکھائی اور سرد مہری ختم کرنے کے لیے وہ اکثر یہی ہتھیار استعمال کرتی تھی۔

حسبِ سابق مجاہد کے چہرے پر تنے نقوش دھیرے دھیرے نرم ہونے لگے۔ ''تم نے زاہدہ باجی سے جھوٹ کیوں بولا؟ امی کی طبیعت تو بھلی چنگی ہے۔ میں خوامخواہ اتنا شرمندہ ہوا ان کے سامنے۔'' کچھ ہی دیر بعد ناراضگی فراموش کیے وہ اپنے مخصوص نرم انداز میں بولا۔

''میں ایسا کچھ بھی نہیں کہنا چاہتی تھی لیکن اس وقت صورتِ حال ہی ایسی تھی کہ یہ عذر تراشنا پڑا۔''

''ایسی کیا افتاد آن پڑی تھی آخر؟'' وہ جھنجلایا۔

''آپ بھی ان کے پاس پڑھتے رہے ہیں۔ آپ کو بھی یاد ہوگا کہ وہ ڈسپلن کے معاملے میں کس قدر سخت ہیں۔''

''ہاں! مجھے یاد ہے کہ دیر سے جانے پر ہمیں کافی سزا ملتی تھی۔ اس وقت اکثر بچے ٹیوشن جانے سے پہلے کسی نہ کسی ویڈیو گیم کی دکان میں گھس جایا کرتے تھے۔ اسی عادت کو ختم کرنے کے لیے باجی نے سختی کرنی شروع کی تھی۔ بچوں کی لکڑی کے اسکیل یا ایک آدھ تھپڑ سے خوب خاطر داری ہوا کرتی تھی۔'' مجاہد کے ہونٹوں پر بچپن کی یاد نے ہلکی سے مسکراہٹ بکھیر دی۔ ''لیکن اس بات کا تمہارے جھوٹ سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق نہیں...... بنیاد کہہ لیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دراصل خالہ جان آج ٹیوشن جانے سے پہلے ثنا کو کپڑوں کے متعلق ڈانٹنے لگیں۔ آپ کو علم تو ہے کہ وہ اکثر ان معاملات میں روک ٹوک کرتی ہیں۔ بس اسی افراتفری میں ہم لیٹ ہوگئے۔ اب وہاں جا کر میں کیا جواز تراشتی کہ ہمارے گھر میں آئے روز یہی مسائل سر اٹھانے لگے ہیں۔'' شوہر کا مزاج بھانپ کر اس نے تفصیلی وضاحت کی۔ وہ خوش تھی کہ اس بات کا آغاز کرنے کے لیے اسے از خود کوشش نہیں کرنی پڑی۔

''امی کی کہی بات آج زاہدہ باجی نے بھی دبے لفظوں میں مجھے جتائی ہے۔ وہ اس معاملے میں شاید خود ہی تم سے بھی کوئی ذکر ضرور کریں گی۔'' مجاہد کے اس انکشاف پر عطیہ کے چہرے پر دبا دبا غصہ جھلکنے لگا۔

یہ معاملہ اب اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگا تھا۔ حالانکہ بات اتنی بڑی بھی نہ تھی لیکن نفیسہ نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ ثنا کو ٹراؤزرز اور ٹی شرٹس پہننے کا بہت شوق تھا۔ وہ اس لباس میں بہت آرام دہ محسوس کرتی تھی۔ عطیہ بھی اس کی ہم نوا تھی لیکن نفیسہ اسے ہمیشہ شلوار قمیص پہنانے کے لیے اصرار کیا کرتیں اور نوبت اکثر ڈانٹ ڈپٹ یا تلخ کلامی تک بھی جا پہنچتی تھی۔ آج بھی ٹیوشن سینٹر جانے سے قبل وہ اسی وجہ سے تاخیر کا شکار ہوئی تھیں۔ اب زاہدہ کے خیالات اور کوشش کا ذکر سن کر اسے مزید غصہ آنے لگا۔

''کیا بات ہے، خاموش کیوں ہوگئی ہو؟'' مجاہد نے اس کی ناگواری بھانپ لی۔

''ایسا کب تک چلے گا جی؟'' اس نے معاملے کو حتمی صورت دینے کا فیصلہ کرلیا۔

''میں سمجھا نہیں تمہاری بات۔''

''دیکھیں مجاہد! ہمارے گلشن میں ایک ہی تو پھول ہے۔ ہم جو کچھ کماتے ہیں، جو بھی تکالیف سہتے ہیں سب ثنا ہی کے لیے تو ہے۔''

''اس بات سے میں کب انکاری ہوں بھئی؟'' وہ الجھا۔

''آج وقت بہت بدل چکا ہے۔ انسان کی شخصیت اس کے لباس اور ظاہر سے جانچی جاتی ہے۔ اگر ہم اپنی بچی کو آؤٹ آف فیشن لباس پہنا کر معاشرے کے سامنے لائیں گے تو اس کی شخصیت کیسے پروان چڑھے گی؟ وہ تو لوگوں کی باتوں، طنز و تمسخر میں ہی الجھ کر اپنی ذات میں منفی ہوتی چلی جائے گی۔ کیا آپ اپنی بیٹی کو دبی، کچلی اور سہمی ہوئی شخصیت بنا کر پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔''

''ہرگز نہیں! وہ مجاہد آغا کی بیٹی ہے۔ وہ کیوں لوگوں کی وجہ سے ڈری سہمی رہے۔'' اس کا ردعمل حسبِ توقع تھا۔

''یہ تو آپ سمجھتے ہیں...... میں جانتی ہوں...... لیکن خالہ جان تو نہیں سمجھتیں نا! وہ پرانے وقتوں کی سیدھی سادی سی عورت ہیں۔ معاشرتی سوچ میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھلا کیسے واقف ہوسکتی ہیں؟ ہم جدید تقاضوں سے

واقف ہیں۔ اس لیے جانتے بوجھتے بیٹی کے لیے غلط راہیں کیسے منتخب کر سکتے ہیں؟'' عطیہ نے نرمی سے اپنی بات جاری رکھی۔

''بھئی! میں نے تمہاری بات سے کب انکار کیا ہے؟ میں نے تو خود اس معاملے میں تمہیں گرین سگنل دے رکھا ہے۔'' وہ اب اس موضوع کو سمیٹنا چاہتا تھا۔ ''زاہدہ باجی کو بھی میں نے طریقے سے سمجھا دیا تھا کہ ثنا کو آئندہ اس حوالے سے کبھی کچھ نہ کہیں۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک کیا...... لیکن میں کچھ اور بھی سوچ رہی تھی۔'' وہ دانستہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''ڈرتی ہوں کہ آپ کو کہیں میری بات بری نہ لگے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم کھل کر بات کرو۔''

''مجھے زاہدہ باجی اور آمنہ کے طریقہ کار پر بھی تحفظات ہیں۔''

''کیسے تحفظات؟ کیا ہوا ہے وہاں؟'' وہ چونک گیا۔ عطیہ اسی کیفیت کی منتظر تھی۔ یہ لمحات اس کے لیے بے حد اہم تھے۔

''آمنہ بچوں پر ضرورت سے زیادہ سختی کرنے لگی ہے۔ چند منٹ کی تاخیر، کسی ٹیسٹ میں کچھ کم نمبر یا ناگہانی چھٹی پر اس کا رویہ بہت درشت ہوتا ہے۔''

''وہ شروع ہی سے ایسی ہیں۔ ہم تینوں بہن بھائی اس چیز سے اچھی طرح واقف ہیں۔''

''واقف ضرور ہوں گے...... لیکن کیا اس سختی کے عادی ہوسکے تھے آپ؟'' اس نے اطمینان سے چوٹ کی۔ مجاہد بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

''میں ان کے خلوص یا اچھائی پر شک نہیں کر رہی۔ بخدا وہ بہت لگن سے پڑھاتی ہیں۔ میں تو بس یہ کہنا چاہتی ہوں کہ وقت بہت بدل گیا ہے اور کامیاب انسان وہی ہے جو وقت کے ساتھ خود کو ڈھال لے۔ اب بچے ایسی سختی سے باغی ہو جاتے ہیں۔ دوسرے بچوں کے سامنے ایسے رویے سے ان کی خودداری مجروح ہوتی ہے، بے عزتی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے میں پُراعتماد شخصیت کیسے قائم رہ پائے گی؟'' عطیہ کے دلائل پر وہ مزید بے چین ہوگیا۔

مجاہد آغا کی سوچ اور ذہنی سفر بھی ایک عام انسان کی طرح مخصوص مدار میں گردش کرتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے بچپن یا جوانی میں ہزاروں خوشگوار واقعات فراموش کیے چیدہ چیدہ منفی پہلو نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ زندگی بھر انہیں کھینچ کھینچ کر تناور درخت کی صورت دے لیتے ہیں۔ اس کے بچپن میں بھی ایسی اِکّا دُکّا یادیں موجود تھیں جنہیں وہ ہر روز کسی نہ کسی سے دہرایا کرتا تھا۔ آغا بشیر کا سلسلۂ روزگار عدم توازن کا شکار رہتا تھا۔ وہ تینوں بہن بھائی سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ زاہدہ باجی نے انہیں ٹیوشن کی فیس میں بھی خاصی رعایت دے رکھی تھی۔ دیر سویر کے معاملے میں وہ انہیں کبھی کوئی بات نہ جتاتیں۔ مجاہد کو ان کے پاس پڑھتے ہوئے صرف دو ہی مسائل کا سامنا تھا۔ دیگر بچے ان کے قدرے پرانے لباس پر دبے لفظوں میں پھبتیاں کسنے سے باز ہی نہ آتے۔ پڑھائی اور نظم و ضبط کے معاملے میں سختی اس وقت بھی ایسے ہی تھی۔ کسی بھی غلطی پر اچھی خاصی کھنچائی ہوجاتی۔ اسے یاد تھا کہ وہ اکثر منہ بسورتا نفیسہ سے بہت مان بھری ضد کیا کرتا تھا کہ وہ اس ڈانٹ ڈپٹ یا سختی کے خلاف کوئی سفارش کریں۔ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ ماں کے کہنے پر اسے کبھی ایسے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ نفیسہ نے اس مقصد میں اسے کبھی کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ دگنی سختی سے اسے ایک ہی بات دہرایا کرتیں۔

''استاد جو مرضی کہے...... جو مرضی کرے...... اس کا حق ہے۔ وہ تیری کھال بھی اتار دیں تو میں اف نہ کروں گی اور تجھے بھی بولنے نہیں دوں گی۔'' ماں کے یہ تیور دیکھ کر وہ مزید اصرار جاری نہ رکھ پاتا۔ اگر کبھی نفیسہ ان کی فیس وغیرہ کی ادائیگی کے لیے زاہدہ کے پاس جاتیں تو انہیں بھی بہت عاجزی سے کہتیں۔

''زاہدہ بہن! ہڈیاں میری...... کھال آپ کی...... مجھے بس ان کو کسی مقام پر پہنچتے دیکھنا ہے۔'' والدہ کی ان باتوں کے بعد ان تینوں کے لیے ذرا بھی رعایت ممکن نہ تھی۔ نتیجتاً وہ سب پڑھائی میں بہتری کی طرف گامزن رہے اور آج اپنی زندگیوں میں بے حد کامیاب تھے۔ اس کامیابی کے باوجود مجاہد کے دل کے کسی کونے میں ہم عصر بچوں کا وہ طنز و تمسخر نقش تھا۔

ایک لمحے کے لیے اسے پردۂ تصور پر اپنی جگہ ثنا کھڑی نظر آئی۔ خفت سے سر جھکائے، ہم عمر بچوں سے نظریں چراتی، پڑھائی میں بلاشبہ بہترین لیکن کبھی کسی ڈانٹ کے بعد ان کے مذاق کا نشانہ بنتی...... اپنی بیٹی کے تصور سے وہ بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا۔ وہ اسے وہاں بھیجنے کے لیے پہلے ہی رضامند نہیں تھا لیکن نفیسہ اور بہنوں کے اصرار پر خاموش ہوگیا تھا۔

''کیا وہاں میری بیٹی کے ساتھ کوئی مار پیٹ ہوتی ہے؟'' اس کی آواز میں کئی اندیشے تھے۔

"نن...... نہیں...... لیکن وہ اسے سب کے سامنے ڈی گریڈ کرتی ہیں۔ ثنا بہت اپ سیٹ ہوجاتی ہے۔" عطیہ نے لوہا گرم دیکھ کر اعتماد سے ایک اور چوٹ کی۔ "دو ماہ بعد فائنل ٹرم امتحان ہیں۔ ایسے میں کوئی ٹینشن اس کے لیے اچھی ثابت نہیں ہوگی۔"

"میں امی سے بات کرلوں گا۔ وہ آئندہ ثنا کو اس بارے میں کچھ نہیں کہیں گی...... باقی رہی زاہدہ باجی کے ہاں پڑھنے کی بات تو اسے وہاں بھیجنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔" مجاہد کا فیصلہ سنتے ہی اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ شوہر کی یہ نرمی اور تبدیلی اس کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ اپنے ذہن میں پہلے ہی سے موجود منصوبے کا اگلا حصہ بھی اسے کامیابی سے ہمکنار ہوتا نظر آنے لگا۔ وہ آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔

عطیہ اپنی سابقہ تکلیف اور درد نظر انداز کیے ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی جہاں ثنا نہایت ذمے داری سے بیگ کھولے کسی ٹیسٹ کی تیاری میں مصروف تھی۔ عطیہ کے ذہن میں اس کے "بہتر مستقبل" کی بابت بہت سے منصوبے تھے۔ ثنا علاقے کے ایک مشہور اسکول میں زیرِ تعلیم تھی۔ پڑھائی کا معیار بالکل اعلیٰ طبقے کے تعلیمی اداروں جیسا تھا۔ طلبہ کو نہایت نازونعم میں رکھا جاتا۔ ان کی خودداری اور عزتِ نفس کا بھی خصوصی خیال رکھا جاتا تھا۔ بہترین انتظامی صلاحیتوں کے پیشِ نظر انہیں بہت کم مقدار میں کام تفویض کیا جاتا لیکن آمنہ کی جانب سے اسے کوئی رعایت نہ ملتی۔ وہ اسے روزانہ زائد کام کرواتی جس کے باعث ثنا خاصی چیں بہ جبیں رہا کرتی۔

"بیٹا! اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے نا۔ اچھا ہے کہ آپ کی تیاری ساتھ ساتھ ہوجایا کرتی ہے۔" وہ اسے سمجھاتی۔

"مگر ماما! جب اسکول سے وہ کام ملتا ہی نہیں تو میں کیوں یاد کروں بھلا؟" وہ پاؤں پٹخ کر آنسو بہانے لگتی۔

عطیہ اس کی ضد اور آنسوؤں کے سامنے خود کو بہت کمزور تصور کرنے لگتی۔ اس کے آنسو دیکھ کر عطیہ کے سبھی منطقی دلائل اور قوتِ ارادی وہیں دم توڑ دیتے۔ وہ اسے سمجھا ہی نہ پاتی کہ اگر وہ کام فی الوقت اسکول سے نہیں ملا تو امتحانی نقطۂ نظر سے آمنہ کا یہ فیصلہ اور طریقہ نہایت احسن اور دوررس ہے۔

کچھ وقت اور گزرا تو ثنا نے اپنے اسکول میں ہی قائم ہونے والی اس اکیڈمی کا تذکرہ کرنا شروع کردیا جہاں اس کی جماعت کے اور بھی بہت سے بچے پڑھتے تھے۔ وہاں بھی طلبہ کو بہت "لاڈ پیار" سے رکھا جاتا تھا۔ چند ہی ماہ میں اس اکیڈمی نے مضبوط ساکھ بنالی۔ بچے وہاں بہت خوش رہتے تھے اور وہاں زیرِ تعلیم طلبہ کی "ٹاپ تھری" پوزیشن بھی لازماً آتیں۔ یہ صورتِ حال ثنا کے لیے بہت مایوس کن تھی۔ اتنی محنت کے باوجود وہ کوئی پوزیشن حاصل کرنے میں ناکام رہتی اور پھر آمنہ سے ڈانٹ کا سیشن اسے کئی دن ملول رکھتا۔ عطیہ کے لیے بیٹی کی یہ ذہنی کیفیت ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اسکول اور اکیڈمیز کی کاروباری پالیسیوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ "معاشی منافع" کے لیے اپنے طلبہ کو اگلے روز ہونے والا پرچہ من وعن رٹوا دینا بھی ان کے لیے ایک معمول تھا۔ طلبہ کے وسیع تر تعلیمی مفاد کے تحت وہ ان اعمال کو بہت نقصان دہ تصور کرتی تھی لیکن بیٹی کا اترا چہرہ، آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اور مایوسی اس کی ہر دلیل کا پل بھر میں خاتمہ کردیتے۔ اسی دوران میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ثنا کو بہتر مستقبل کی راہ پر ضرور گامزن کرے گی اور آج اسے اپنے مقصد میں جزوی کامیابی نصیب ہو ہی گئی تھی۔

اگلے روز مجاہد سے بات چیت کے بعد اسے قائل کرنا بالکل دشوار ثابت نہ ہوا۔ وہ محض اس اکیڈمی کی مسافت پر کچھ تحفظات کا شکار تھا تاہم عطیہ کے پاس اس مسئلے کا حل بھی موجود تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی نے اپنے رکشا میں پک اینڈ ڈراپ کی پارٹ ٹائم سروس کا آغاز کیا تھا۔ ثنا کی ذمے داری بھی اسے ہی سونپ دی گئی۔ حالات اور ذہن مکمل طور پر پرسکون ہوچکے تھے۔

"زاہدہ باجی سے ایک دفعہ بات کرلینا۔ اتنے پرانے تعلقات کے بعد یکدم رکھائی مناسب نہیں لگتی۔" وہ بیوی کو یاددہانی کرواتا۔

"کسی دن فرصت ملی تو ضرور جاؤں گی۔" عطیہ نے پہلو بچایا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ان کے خلوص اور متوقع سوالات سے ہی گریزاں تھی۔

نفیسہ نے بیٹے کے دونوں فیصلوں پر عدم تحفظ کا اظہار کیا تھا لیکن مجاہد نے ان کی ایک بھی نہ چلنے دی۔

"اب آپ کا وقت نہیں رہا امی! حالات بدل چکے ہیں۔ اب اولاد کے جذبات کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ آپ خوامخواہ ہلکان ہوکر گھر کا ماحول خراب نہ کیا کریں۔" اس کے الفاظ نے نفیسہ کو ساکت کردیا۔

"میں بوڑھی اور موجودہ وقت کی تبدیلیوں سے بے

خبر ہی بیٹا! لیکن اتنا تو جانتی ہوں کہ خمیر اور جبلت ہر دور میں ایک جیسی ہی رہتی ہے۔ چنگاری اور دامن کی قربت کا کبھی بھی کوئی جواز تراشا ہی نہیں جاسکتا۔ وقت کی تبدیلی کا الاپ محض شیطانی فریب ہیں ورنہ انسان ازل سے وہی ہے اور ابد تک ویسا ہی رہے گا۔"

"چھوڑیں ان باتوں کو...... فہمیدہ بہت عرصے سے آپ کو بلوا رہی ہے۔ کچھ عرصے کے لیے اس کی طرف ہو آئیں۔ دل بہل جائے گا۔" مجاہد نے دوسرے شہر میں رہنے والی بہن کا ذکر کیا جو حقیقتاً کئی بار ماں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرچکی تھی لیکن بچوں کی سخت ترین پڑھائی اور شوہر کی ملازمت کے باعث خود آنے سے قاصر تھی۔

نفیسہ بیٹے کی اس طوطا چشمی پر ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہوگئیں۔

☆☆☆

عطیہ بے حد خوش تھی۔

ثنا کی خوشی، جوش اور اطمینان اس کے لیے ہفت اقلیم سے کم نہ تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا۔ فائنل ٹرم کا آغاز بھی ہوچکا تھا۔ اسکول کی روایات کے مطابق امتحان سے پہلے ہی سالانہ تقریب کے انعقاد کا اعلان کردیا گیا۔ دورانِ امتحان والدین سے طلبہ کو دو گھنٹے زائد روکنے کی اجازت بھی حاصل کی جاچکی تھی۔ ثنا بھی ایک ورائٹی شو اور استقبالیہ رقص میں حصہ لے رہی تھی۔ عطیہ اور مجاہد ان غیر نصابی سرگرمیوں کو بچوں کی بہترین ذہنی نشوونما اور پُراعتماد شخصیت کے لیے جزولاینفک سمجھتے تھے لہٰذا اسے بہ آسانی اجازت دے دی گئی۔ وہ اپنی زندگی کی اس نئی تبدیلی اور معمولات سے بے پناہ خوش تھی۔ والدین کی توجہ، اعتماد اور لاڈ پیار نے اس کی شخصی خوبصورتی اور کشش میں ہمیشہ اضافہ کیا تھا۔ وہ ہر جگہ مرکزِ نگاہ بن جایا کرتی تھی۔ راوی اس کے لیے چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ نفیسہ کے ملتان چلے جانے اور آمنہ نامی آسیب سے نجات نے اس کی زندگی ہموار بنادی تھی۔ اس کی خوش مزاجی عطیہ کے لیے براہِ راست مثبت نتائج لے کر آتی۔

ٹیوشن سینٹر کی ذمے داری سے فراغت نے اسے اپنے من پسند کاموں اور ٹی وی کے لیے کافی فرصت فراہم کردی۔ شوہر کا خوش باش استقبال، چہکتی اور مطمئن بیٹی، گھریلو معمولات پر کلی ذاتی اجارہ داری نے زندگی حسین ترین بنادی تھی۔ لیکن پھر ایک روز اس پُرسکون بحر میں خوفناک تلاطم پیدا ہوگیا۔ وہی تلاطم جس کی خبریں وہ آئے روز میڈیا پر سنتے تھے۔ وہی طوفان جس کے تصور ہی کے خوف نے انہیں ہمیشہ محتاط رکھا تھا۔ تمام تر انسانی حکمتِ عملیوں اور احتیاط کے باوجود ہونی تو ہوکر ہی رہتی ہے۔ مجاہد اور عطیہ بھی ایسی ہی ایک انہونی کی زد میں آگئے تھے۔

☆☆☆

وہ سنیچر کا دن تھا اور اس روز عطیہ کی طبیعت بہت کسلمندی کا شکار تھی۔

ثنا اپنے معمول کے مطابق افضل ہی کے ساتھ اکیڈمی روانہ ہوچکی تھی۔ اس کے امتحان ختم ہونے میں دو روز باقی تھے۔ اپنی متوقع فراغت اور پوزیشن کے حصول کے تصور نے اس کی توانائی میں بے حد اضافہ کردیا تھا۔

شام سات بجے کے بعد جانے کیوں عطیہ کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہونے لگا۔ گھر میں اس وقت کوئی بھی نہ تھا۔ وہ کچھ دیر خالی الذہنی کے عالم میں لیٹی رہی۔ گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے آٹھ کے ہندسے کی جانب سفر جاری رکھے ہوئے تھیں۔ وقت کے احساس سے اس کی وحشت و بے قراری میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

"کہاں رہ گئی ہے ثنا...... اتنی تاخیر پہلے تو کبھی نہیں ہوئی۔" وہ پیشانی مسلنے لگی۔ مجاہد بھی ادویات کی خریداری اور چند دیگر ضروری کاموں کے سلسلے میں گھر نہیں آیا تھا۔ آٹھ بجے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ اس نے افضل کو فون کرنے کے لیے موبائل تھاما ہی تھا کہ دوسری جانب اس کی کال کا عندیہ پاکر بے چینی سے سبز بٹن دبادیا۔

"کہاں رہ گئے ہیں بھائی جان؟ اتنی دیر پہلے تو کبھی نہیں ہوئی۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"ثنا گھر نہیں آئی کیا؟" افضل کے الفاظ اس کے لیے کسی بم دھماکے سے کم نہ تھے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ گھر کیسے آئے گی؟ آپ ہی تو لاتے ہیں اسے۔"

"میں کب سے یہاں کھڑا اسی کا انتظار کررہا ہوں۔ سب بچے لوٹ چکے ہیں لیکن ثنا کا کچھ پتا ہی نہیں۔" افضل کے انداز میں بھی وحشت نمایاں تھی۔

"الٰہی! میری بچی......" وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے گھٹنوں کے بل زمین بوس ہوگئی۔ "وہ وہیں اندر ہوگی...... آپ ایک بار دیکھیے تو سہی!"

"واچ مین دوبارہ اندر جاکر چیک کرآیا ہے۔ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔" افضل کی بے بس آواز نے اس کی رہی سہی ہمت بھی ختم کردی۔ وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

"ہمت کرو عطیہ! میں مجاہد کو فون کرتا ہوں۔ ثنا کو کچھ

نہیں ہوگا۔" اس نے عجلت میں فون بند کرتے ہوئے کہا لیکن عطیہ ہمت کرتی بھی تو کیسے؟ اسے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اس کے وجود کو کچوکے لگا رہا ہے۔ دل کی دھڑکنیں نہایت خوفزدگی میں مدھم ہو گئی تھیں، مبادا ان کا شور انہیں مزید کسی آزمائش میں مبتلا کر دے۔ اذیت کی ایک تیز اور ناقابل برداشت لہر اس کے وجود کو پارہ پارہ کر رہی تھی۔

"الٰہی! میری بچی...... میری گڑیا کی حفاظت فرمانا۔" وہ بلکنے لگی۔

وقت گویا ساکت ہو گیا تھا۔ اکیلے گھر میں تنہائی مزید ہولناکی کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ اذیت جب ناقابلِ برداشت ہوئی تو اس نے جائے نماز بچھا لی اور حاجت کے نوافل ادا کرتے تڑپ تڑپ کر بیٹی کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

گیارہ بجے مجاہد کی بائیک کی آواز سن کر وہ دیوانگی کے عالم میں دروازے کی طرف لپکی۔

"آ گئی میری بچی...... مجھے یقین تھا کہ وہ مل جائے گی...... ارے! ایسے ہی شرارت میں کہیں چھپ گئی ہوگی...... مجاہد نے ڈھونڈ لیا ہوگا اسے۔" وہ خود کلامی کرتی ہوئی دروازہ کھول کر بے تابی سے نظریں دوڑانے لگی۔ وہاں مجاہد اور افضل کے ستے ہوئے چہروں اور تھکے ماندہ وجود کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔

"کہاں ہے میری بچی؟ آپ اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟" وہ عالمِ وحشت میں شوہر کا گریبان جھنجوڑنے لگی۔

"خود کو سنبھالو عطیہ! اندر چل کے بات کرتے ہیں۔" افضل نے نرمی سے اسے الگ کیا۔ مجاہد کی آنکھیں بھی شدتِ ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"ہر جگہ ڈھونڈ لیا اسے...... ہر کلاس فیلو سے پوچھ لیا...... وہ کہیں بھی نہیں ہے...... میری بیٹی...... کہیں بھی نہیں ہے۔" وہ ضبط کھو بیٹھا اور اپنے بال مٹھیوں میں جکڑے رونے لگا۔

"آپ نے انتظامیہ سے کیوں نہیں پوچھا؟ انہوں نے اکیلے کیوں جانے دیا اسے؟" وہ حلق کے بل چلائی۔

"سب کچھ کر آئے ہیں عطیہ! سب کچھ......" افضل نے کہا۔ "جونیئر سیکشن کے امتحان ختم ہونے کے باعث ان کی اور ان کی ٹیچر کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ اکیڈمی میں صرف جماعت چہارم سے اگلی کلاسز کے طلبہ آئے تھے۔ پرنسپل کو کسی سیمینار میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ وہ ایک اور ٹیچر کے ساتھ پانچ بجے ہی روانہ ہو گیا تھا۔ چھ بجے دوسری ٹیچر کے موبائل پر اہلِ خانہ نے اطلاع دی کہ اس کے والد کو ہارٹ اٹیک کے سلسلے میں اسپتال لے جایا گیا ہے۔ اس نے پریشانی اور گھبراہٹ میں سب بچوں کو چھٹی دی اور خود اسپتال روانہ ہو گئی۔ بچے اسی علاقے کے رہائشی تھے اس لیے خود ہی بہ آسانی گھر پہنچ گئے۔"

"اور واچ مین...... وہ تو وہیں تھا نا...... اس نے کیسے جانے دیا ثنا کو؟" عطیہ کے ذہن میں بگولے اٹھ رہے تھے۔

"وہ اس ٹیچر کو از راہِ اخلاق کسی سواری تک پہنچانے گیا تھا...... واپس آیا تو سبھی بچے جا چکے تھے۔" افضل نے اپنے ہونٹ کچلے۔

"اسکول میں سی سی ٹی وی کیمرے بھی تو موجود ہیں...... آپ نے ریکارڈنگ کیوں نہیں دیکھی؟ اور وہ سیکیورٹی گارڈز...... وہ بھی تو موجود ہوتا ہے وہاں؟"

"کون سا کیمرا...... کون سے گارڈز؟" مجاہد بھڑک اٹھا۔ "سب ڈھکوسلے تھے...... کیمرے اسکول ٹائمنگز کے بعد آف کر دیے جاتے ہیں اور گارڈز کی ڈیوٹی بھی اسی وقت تک ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انتظامیہ نے اپنا فوکس صرف مارننگ شفٹ پر ہی رکھا ہوا ہے۔ حکومتی دباؤ کے زیرِ اثر یہ 'زائد خرچے' صرف ایک ہی وقت میں برداشت ہو سکتے ہیں۔" مجاہد کے تلخ اور صاف گو الفاظ عطیہ کا وجود بے جان کرنے لگے۔

"اب...... میری بچی...... اللہ......" گویائی اس کا ساتھ چھوڑنے لگی۔

"پولیس میں رپورٹ لکھوا دی ہے۔ خدا جانے قسمت نے مزید کیا گل کھلانے ہیں؟" افضل کے آنسو بھی چھلک اٹھے۔

عطیہ کے دل و دماغ میں آندھیاں برپا تھیں۔ کاروباری فوائد اور حکمت عملیاں کسی کے آشیانے پر ایسی قیامت ڈھایا کرتی ہیں۔ بظاہر فول پروف سیکیورٹی کا ڈھول بجانے والوں کا پول کھلا بھی تو کیسے؟ اس کی اکلوتی بیٹی کے غیاب کی قیمت پر۔ لمحہ بھر میں ہی میڈیا پر چلنے والی خبریں ذہن میں گردش کرنے لگیں تو وہ بے اختیار کانپ اٹھی۔

"الٰہی! میری بچی کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔" اس کے تڑپتے دل سے ایک ہی صدا برآمد ہو رہی تھی۔

مجاہد کی حالت بھی کسی زندہ لاش کی طرح تھی۔ اس پر سکتہ طاری تھا۔ افضل ہنوز ان کے ساتھ موجود تھا لیکن اس کا کوئی حرف' کوئی لفظ یا دلاسا انہیں سکون دے ہی نہ پا رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد مجاہد بے قراری سے اٹھا اور پولیس اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ تقدیر ان سے روٹھی ہوئی ہی محسوس ہوتی تھی۔ ہر تدبیر ناکامی پر منتج ہو رہی تھی۔

وہ رات قیامت خیز تھی۔ عطیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دل کسی بھی لمحے پھٹ جائے گا۔ مؤذن نے فجر کی اذان کے لیے کلماتِ مقدس کی ادائیگی کا آغاز کیا تو مجاہد اپنا ضبط مکمل طور پر کھو بیٹھا۔

"خو کو سنبھالو یار! حوصلہ رکھو...... ثنا ضرور مل جائے گی۔" افضل نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسے دلاسا دیا۔

"نہیں...... میرا دل کہتا ہے کہ......" وہ یکدم خاموش ہوا اور پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم دونوں دعا کرو کہ وہ مر جائے...... وہ زندہ رہی تو زندگی کے قابل نہ رہے گی...... بس دعا کرو کہ وہ مر جائے۔"

شوہر کی بے بسی اور اذیت کی یہ انتہا عطیہ کے اعصاب کے لیے بہت کاری ثابت ہوئی۔ وہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

ثنا کے غیاب کی خبر اگلی صبح محلے بھر میں پھیل گئی۔

خوف' مایوسی' بے بسی اور سابقہ وارداتوں کے تذکرے زبان زدِ عام تھے۔ ہفتہ وار تعطیل کے باعث ہر گھر سے ہی کوئی نہ کوئی انہیں ملنے چلا آیا۔ مشورے' نصائح اور تاسف انگیز فقرات کا ایک بازار گرم ہو چکا تھا۔ رشتے داروں کی آمد اور ہمدردی میں لپٹے پُرسے انہیں مزید بے حال کر رہے تھے۔ پولیس کا کردار البتہ کافی حیران کن اور مثبت تھا۔ وہ علاقے میں موجود ثنا کے سبھی اسکول فیلوز سے فرداً فرداً تفتیش میں جتے تھے۔ اسکول کی تفصیلی تلاشی کے بعد واچ مین کو بھی سخت تفتیشی مراحل سے گزارا گیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ عطیہ کی حالت نہایت مخدوش ہو چکی تھی۔ اسے بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ گھڑی کی سوئیوں کی ہر ایک جنبش ان کے اعصاب کے لیے تازیانہ ثابت ہوتی۔ عزیز از جان اولاد کی دوری ہر پل ایک نئی اور مزید جان لیوا موت سے ہمکنار کر رہی تھی۔

ستم ظریفی تو یہ تھی کہ ان کی تمام تر احتیاطی تدابیر دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ ملک میں بچوں سے زیادتی کے بڑھتے واقعات کے بعد انہوں نے ثنا کی ذہنی تربیت پر بہت دھیان دیا تھا۔ کسی بھی اجنبی سے بات کرنے' کھانے پینے کی اشیا کے لین دین یا غیر معمولی واقعے کے سلسلے میں والدین کو فوری اعتماد میں لینے کی ہدایات تک ذہن نشین کروائی گئی تھیں۔ کرب کی ان گھڑیوں کا احساس انہیں بے دم کیے دے رہا تھا لیکن پھر پولیس اسٹیشن سے آئے ایک فون نے اس جان لیوا کیفیت کا ایک ہی جھٹکے میں خاتمہ کر کے نئی جان کنی میں مبتلا کر دیا۔

"ثنا کا سراغ مل گیا ہے...... میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔" مجاہد کی آواز ہیجان زدہ تھی۔

"مجھے بھی ساتھ لے چلیے...... میں یہاں اکیلی مر جاؤں گی...... خدا کا واسطہ ہے...... مجھے بھی لے چلیں۔" عطیہ کا مطالبہ عام حالات میں تو ہرگز قابلِ قبول نہ تھا لیکن مجاہد کی اپنی ذہنی کیفیت بھی کسی فیصلے یا گہرائی میں سوچنے کے قابل کہاں تھی؟ اس نے خالی الذہنی کے عالم میں افضل اور عطیہ کو ہمراہ لے لیا۔

پولیس اسٹیشن کا ماحول نہایت اعصاب شکن تھا۔ ان کے دل و دماغ میں بھونچال کی سی حالت تھی۔ تفتیشی افسر کے کمرے میں پہنچ کر ان کے کلیجے منہ کو آنے لگے۔ کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال کے احساس نے جسم و جاں میں حشر برپا کر دیا تھا۔

"میں آپ کو ہرگز یہاں بلوانے کی زحمت نہیں دینا چاہتا تھا لیکن ایسے کیسز میں اہلِ خانہ کے قریبی رشتے دار اور پڑوسی اپنے تجسس اور مروت میں بہت مسائل پیدا کرنے لگتے ہیں۔" انسپکٹر نے گلا کھنکھارتے ہوئے رسان سے کہا۔

"میری بیٹی...... کہاں ہے؟" عطیہ کی آواز سرگوشی سے بلند نہ ہو سکی۔

"معاف کیجیے خاتون! میرے پاس آپ لوگوں کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔" اس نے بوجھل سانس لی اور ایک کونے میں بیٹھے تین افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے مجرم گرفتار ہو چکے ہیں۔"

ان تینوں ہی کی گردن ایک جھٹکے سے اس طرف مڑ گئی۔ زخمی چہرے اپنے گھٹنوں میں دے کر بیٹھے ان لوگوں کا نظارہ عطیہ اور مجاہد کے لیے بہت کربناک تھا۔ ان میں سے دو لڑکے قدرے کم عمر تھے جبکہ تیسرے شخص کی دید ان کے بدترین خدشات کی تصدیق تھی۔

"معاف کر دو صاحب! میں بہک گیا تھا۔ ان بچہ لوگوں کی باتوں میں آ گیا تھا...... اللہ قسم! میں اسے اپنی بچی ہی کی طرح سمجھتا تھا۔ مجھے شیطان نے جکڑ لیا تھا۔" کسی چوپائے کی طرح مجاہد کے قدموں میں لوٹتا وہ اسکول کا واچ مین نصیر تھا۔

"معافی کے گھوڑے...... میرا بس چلے تو تیری ہڈیاں تک چیل کوؤں کو کھلا دوں۔ خبیث انسان! تو ہزار دفعہ پھانسی

دیے جانے کے لائق ہے۔" انسپکٹر نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکر رسید کی۔ ان تینوں کے لیے یہ مناظر سست روی سے چلتی کسی فلم کی طرح تھے۔

"ہم پر الزام کیوں دھر رہے ہو؟ تمہارے مکمل تعاون ہی سے ہم نے یہ قدم اٹھایا تھا" ایک لڑکے نے ترخ کر جواب دیا۔ اس کے لمبے بال، چہرے پر مہاسوں کے نشان اور قدرے سیاہ ہونٹ کثرتِ تمباکو نوشی کا واضح عندیہ دیتے تھے۔

انسپکٹر کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے مغلظات کے ساتھ انہیں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس کی باتوں اور طیش سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں لڑکے کسی رشوت یا "مک مکا" کی پیشکش بھی کر چکے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ان کا بھرکس نکال چکا تھا۔ ایک اہلکار کو ان کے پاس تعینات کرکے وہ مجاہد کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"کبھی کبھی شدت سے دل چاہتا ہے کہ ماورائے قانون قتل کردوں۔ ان لڑکوں کی گرفتاری بھی بہرحال آسان نہیں تھی۔ اپنے تعلقات کی بنا پر خاصا اودھم مچایا ہے انہوں نے۔" وہ پانی کے گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

"ثنا کہاں ہے انسپکٹر؟ یہ پکڑے کیسے گئے؟" افضل نے استفسار کیا۔

"نصیر کی بدحواسی نے ہی ہمیں مشکوک کیا تھا۔ وہ اس ٹیچر کے لیے سواری کا بندوبست کرنے تو گیا تھا لیکن واپسی پر ثنا اسکول کمپاؤنڈ میں ہی ایک جھولے پر بیٹھی تھی۔ یہ دونوں لڑکے مڈل اور نہم جماعت میں اسی ادارے کے طلبہ ہیں اور ان میں سے ایک ثنا کے ساتھ کسی ڈانس میں حصہ لے کر پریکٹس بھی کرتا رہا ہے۔ ایسے تنہا وہاں دیکھ کر اسی کے ذہن میں شیطانیت برپا ہوئی تھی۔ اپنے ساتھی سے مل کر وہ اسے پچھلی جانب بنی کلاس روم میں لے جانا چاہتے تھے لیکن نصیر کی آمد پر حواس باختہ ہوگئے۔ تھوڑی سی بحث کے بعد وہ مل بانٹ کر واردات کرنے میں راضی ہوگئے۔ مہاسوں والے اس لڑکے ولید کا گھر قریب ہی واقع ہے اور سوئے اتفاق اس کے سوا سبھی کسی تقریب میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ ثنا کو وہاں لے جایا گیا اور......" اس نے بے چینی سے ہاتھ مسلتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اور میری بب...... بیٹی......" مجاہد نے مٹھیاں بھینچیں۔

"اسپتال میں ایڈمٹ کروادیا ہے اسے۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ بے حد صدمے کی کیفیت میں ہے۔" انسپکٹر کے انکشاف پر افضل اور مجاہد اپنا ضبط کھو کر ان لڑکوں پر پل پڑے۔

"معاف کردیں سر! غلطی ہوگئی ہم سے...... پلیز...... وہ اپنی عمر سے بہت بڑی لگتی تھی۔ ڈانس پریکٹس میں مجھے جانے کیا ہونے لگتا تھا...... معاف کردیں مجھے......" سولہ سالہ اس لڑکے کے چہرے کی معصومیت اور لباس سے وہ کسی معزز گھرانے کا فرد ہی لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید ہراس تھا۔

"سنبھالیے خود کو مجاہد صاحب! پلیز......" انسپکٹر نے قدرے سخت لہجے میں حکم دیا۔ "بشیر خان! انہیں حوالات میں لے جاؤ ورنہ خدا کی قسم میں آج کوئی قتل کر بیٹھوں گا۔" اس نے اہلکار کو جانے کا اشارہ کیا۔

مجاہد کرسی پر ڈھے کر اپنے بال مٹھیوں میں بھینچے رونے لگا۔ "یا اللہ! کہاں کوتاہی ہوگئی مجھ سے...... میری بچی......"

"میں اس دکھ کو کم تو نہیں کرسکتا لیکن ایک وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ جب تک میں اس تھانے میں ہوں، یہ تینوں شیطان رہا نہیں ہو پائیں گے۔" انسپکٹر نے اسے پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ پولیس کی بابت آپ لوگوں کے ذہنوں میں ایک عمومی سوچ ہی راسخ ہوگی لیکن یقین کیجیے، ان بچوں اور بچیوں کے ساتھ ہونے والے یہ حادثات ہمیں بھی یونہی خون کے آنسو رلاتے ہیں۔"

انسپکٹر اب ان سے چند کاغذات پر دستخط لیتا اس لڑکے کی بابت بتانے لگا جس نے روانگی سے قبل نصیر کو واپس آتے اور ثنا کو جھولے پر بیٹھے دیکھا تھا۔ عطیہ کو ان کے ہونٹ ہی جنبش کرتے نظر آرہے تھے۔ ذہن میں اب بھی مجاہد ہی کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"کہاں کوتاہی ہوگئی مجھ سے......"

اسے پولیس اسٹیشن کی ہر ایک چیز میں ماضی کے نقوش دکھائی دے رہے تھے۔ جب احباب ثنا کے جدید اور قدرے چست مغربی لباس پر تعریف و ستائش کے پل باندھتے اکثر اسے اپنی عمر سے بڑی قرار دیا کرتے تھے۔ ان لمحات میں عطیہ کا ذہن فخر و غرور سے ہواؤں میں اڑنے لگتا۔ نفیسہ کی روک ٹوک اور زاہدہ کی دوراندیشی کو بھی اس نے بہ آسانی چٹکیوں میں اڑا کے اپنے تئیں بیٹی کو ایک "بہتر مستقبل" کا مسافر بنا دیا تھا۔

مستقبل...... اس لفظ کا خیال آتے ہی اس پر یکدم لرزہ طاری ہوگیا۔

☆☆☆

مجاہد اور عطیہ کی زندگی مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔

کسی "خیرخواہ" کے ذریعے میڈیا نے اسپتال تک رسائی حاصل کرلی اور پھر اذیت و بدحالی کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ دور دراز سے لوگ انہیں ملنے اور تسلی دینے چلے آتے۔ ان کی آمد سے تمام زخم ازسرنو تازہ ہوجاتے لیکن بے بسی اور خاموشی کے سوا کہیں کوئی جائے امان نہ تھی۔

اسکول انتظامیہ نے تینوں ذمے داران کے خلاف "سخت ایکشن" لینے کا اعلان کرتے ہوئے شام کے اوقات میں بھی کیمرے اور سیکورٹی کا فوری بندوبست کردیا تھا۔ زندگی کے سبھی معمولات اسی طرح جاری و ساری تھے لیکن ثنا کی حالت میں رتی بھر بھی تبدیلی نہ آئی تھی۔ وہ ذہنی عدم توازن کا شکار ہوچکی تھی۔ مجاہد سمیت کسی بھی مرد کو دیکھتے ہی اس کی چیخ و پکار آسمان سے باتیں کرنے لگتی۔ قانون تلازم کے تحت وہ بہت سی دیگر اشیا سے بھی شدید دورے کی سی کیفیت میں مبتلا ہوجاتی۔ گھر میں آنے والے کسی بھی مہمان کے زیراستعمال سگریٹ کا دھواں اس پر تشنجی کیفیت طاری کردیتا۔ چند ہی ہفتوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ اسے سنبھالنے کے ساتھ نفیسہ کی دیکھ بھال نے مشکلات میں مزید اضافہ کردیا۔ لاڈلی پوتی پر ٹوٹنے والی اس قیامت کے بعد انہیں گہری خاموشی نے گھیرلیا تھا۔ وہ سارا دن بستر پر لیٹی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہتیں اور آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگتے خاموشی سے بہتے چلے جاتے۔

اس کیفیت میں وہ حوائج ضروریہ سے بھی بیگانہ ہوچکی تھیں۔ بستر اور کپڑے ناپاکی کی حالت میں رہتے۔ انہیں سنبھالنے کے لیے جزوقتی ملازمہ کا انتخاب ایک نئی اذیت ثابت ہوتا تھا۔ ہر ملازمہ ان کے گھریلو حالات کو بڑھا چڑھا کر علاقے کے دیگر گھروں میں بیان کرتی اور پھر تاسف، ترحم، طنز اور تمسخر کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ ان حالات سے تنگ آکر مجاہد نے رہائش کی تبدیلی کا فیصلہ کرلیا اور مکان کی فروخت کے لیے کئی ایک پراپرٹی ڈیلرز سے رابطہ بھی قائم کرلیا۔ روزگار اور دیگر دنیاوی معاملات سے اس کا دل بھی اچاٹ ہوچکا تھا۔

"مکان کا سودا ہوگیا ہے...... ایک ماہ میں وہ پارٹی ہمیں ادائیگی کردے گی۔" دو ماہ بعد اس نے بجھے ہوئے انداز میں عطیہ کو اطلاع دی۔ اس خبر پر اسے خوشی کے بجائے ایک عجب بے عنوان دکھ نے گھیرلیا۔ کسی بھی عورت کے لیے اس مقام کی اہمیت مسلمہ ہوتی ہے جہاں وہ اپنی شادی شدہ

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

ہم نشینی۔ اگر تم کسی کی ہم نشینی اختیار کرنا چاہتے ہو تو ایسے علماء کی ہم نشینی اختیار کرو جو تمہیں پانچ چیزوں سے پانچ چیزوں کی طرف بلائیں۔

(1) شک سے یقین کی طرف
(2) ریا سے اخلاص کی طرف
(3) رغبت سے خوف کی طرف
(4) تکبر سے انکساری کی طرف
(5) کھوٹ سے خلوصِ نیت کی طرف

☆☆☆

بردبار لوگوں سے ہم نشینی رکھو۔ اس طرح تمہارا علم بڑھے گا۔ علماء کے ساتھ ہم نشینی رکھو کہ سعادت مند بنو گے۔ علماء کی ہم نشینی اختیار کرو کہ اس طرح عقل کامل ہوگی۔ تمہارا نفس شریف بنے گا اور تمہاری جہالت دور ہوگی۔

دنیا داروں کے ساتھ رہن سہن دین کو داغدار بنا دیتا ہے اور یقین کو کمزور کردیتا ہے۔ شریروں سے کنارہ کشی کرو اور شریفوں کے ساتھ ہم نشینی رکھو۔ صاحبانِ تقویٰ و حکمت کے ساتھ ہم نشینی رکھو اور ان سے علمی گفتگو جاری رکھو کیونکہ اگر تم جاہل ہوگے تو وہ تمہیں علم سکھائیں گے اور اگر تم عالم ہوگے تو تمہارے علم میں اضافہ کریں گے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف

اصل دکھ

ایک چڑیا گھر کا ہاتھی مرگیا۔ اس چڑیا گھر کا ملازم رو رہا تھا۔ ایک آدمی نے پوچھا۔

"لگتا ہے۔ بھائی تمہیں ہاتھی سے بہت محبت تھی۔"

ملازم نے کہا۔ "محبت وغیرہ کا تو مجھے پتا نہیں۔ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ مجھے ہاتھی کی قبر کھودنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

بہتر خوراک

ڈاکٹر نے مریض کو غذا کی افادیت بتاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو۔ مچھلی سے بہتر کوئی غذا نہیں۔ اس سے جسم سڈول، دلکش اور موٹا ہوتا ہے۔"

مریض جھٹ بولا۔ "لیکن ڈاکٹر صاحب۔ پھر بگلا اتنا کمزور اور سوکھا ہوا کیوں ہوتا ہے؟"

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ مجاہد کے لیے تو اس گھر سے بچپن کی یادیں بھی وابستہ تھیں۔
"میرے لیے بھی یہاں سے روانگی آسان نہیں ہوگی لیکن ثنا کی خاطر یہ سب ہمیں برداشت کرنا پڑے گا۔" مجاہد کا لہجہ رندھ چکا تھا۔ وہ حسب سابق اس کی سوچ بھانپ گیا تھا۔
"میری طرف سے آپ کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں ہوگا۔ میں ہر فیصلے میں آپ ہی کے ساتھ ہوں۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ بیٹی کے سلسلے میں ہونے والی کوتاہی نے اسے ایک اخلاقی دباؤ میں لے رکھا تھا۔ وہ دونوں ہی احساس جرم کا شکار تھے۔ عطیہ کو اگر اپنے فیصلوں پر ملال تھا تو مجاہد کو بھی یہ احساس بے چین کیے رکھتا کہ بیوی کے ان ارادوں اور فیصلوں کو اس کی رضامندی اور کم اندیشی ہی نے تقویت پہنچائی تھی۔
"یہاں اب کچھ ہی دن کے مہمان ہیں ہم...... کسی ہمسائے کو نئے گھر کے بارے میں بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ روانگی سے قبل زاہدہ باجی سے بھی الوداعی ملاقات کرا آنا۔ اس دکھ اور مصیبت کی گھڑی میں ان کے سوا کسی کو مخلص ہی نہیں پایا میں نے۔" شوہر کے اس مطالبے پر وہ تذبذب میں مبتلا ہوئی لیکن پھر کچھ سوچ کر ہامی بھرلی۔
"ٹھیک ہے...... میں دو ایک روز میں چلی جاؤں گی۔" اس نے بے دلی سے جواب دیا۔
تیسرے روز بعد از سہ پہر اپنا بوجھل وجود بمشکل گھسیٹتی وہ انہی راہوں پر گامزن تھی۔ ہر ایک گوشے سے اسے ثنا کی چہکار اور چھوٹی چھوٹی لیکن زندگی سے بھرپور باتوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ اس کے حلق میں ایک پھندا سا آن پھنسا۔ زاہدہ کے گھر پہنچنے تک وہ یادوں کی اس یلغار سے نڈھال ہو چکی تھی۔ گھر کا دروازہ نیم وا تھا۔ مخدوش ذہنی کیفیت میں وہ دستک کے بنا ہی اندر داخل ہوگئی۔
"سوری آنٹی جی! لیکن میں ایک عرصے سے اسی اصول پر کاربند ہوں۔" اس کی سماعت میں آمنہ کی آواز پڑی۔
"میں مانتی ہوں بیٹا! مگر بڑے مان سے آپ کے پاس آئی تھی میں۔" کسی خاتون نے بڑی لجاجت سے کہا۔
"دیکھیے آنٹی جی! فطرت کے اصولوں سے ٹکراؤ کبھی بھی انسان کے لیے سودمند نہیں ہوتا۔ میں پرائمری کلاسز کے بعد لڑکوں کو نہیں پڑھاتی۔ بہت مسائل پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ والدین اپنی بچیوں کو بہت اعتبار سے یہاں بھیجتے ہیں اور میرے لیے وہ اعتبار زیادہ قیمتی ہے۔ میری ذاتی رائے میں پرائمری کے بعد بچوں کو میل ٹیچرز ہی کے پاس پڑھنا چاہیے۔ یقین مانیے بہت سے بگاڑ ختم ہوجاتے ہیں۔ مجھے آپ سے ایک اور التجا بھی کرنی ہے۔ لائبہ کو اتنے چست لباس مت پہنایا کریں کہ اٹھتے بیٹھتے ہوئے جسم نمایاں ہونے لگے۔ اسے دوپٹا یا اسکارف بھی اوڑھا کر بھیجا کریں۔ بچیاں ہمیشہ ڈھکی چھپی ہی اچھی اور محفوظ رہتی ہیں۔ میری اس بات کا برا نہ منائیے گا۔ استاد روحانی والدین ہی تو ہوتے ہیں۔ وہ بھی ان کے لیے ویسے ہی حساس اور احتیاط پسند ہوتے ہیں۔" آمنہ کے پُرخلوص اور دوٹوک انداز پر اس کے ضبط کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ وہ اپنے آنسو چھپاتی وہیں سے واپس مڑ گئی لیکن اشک تو کسی سمندر کی طرح طغیانی میں آچکے تھے۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا یہ عکس بہت کریہہ و بھیانک تھا۔ اس کے قدم جسم کا بوجھ سہارنے سے انکاری ہونے لگے اور پھر ایک زیر تعمیر گھر کے باہر وہ ڈھے سی گئی۔ وہاں اینٹوں کے ایک چھوٹے سے ڈھیر پر بیٹھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"کیا ہوا؟ اب کیوں روتی ہے؟ جب خزانہ تیرے پاس تھا تو اس وقت تیری آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھی تھی۔ اب کیوں روتی ہے؟" ایک کرخت آواز کے ساتھ بدبو کے احساس نے اسے چونکا دیا۔
اس کے سامنے وہی پتھر بردار عورت کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی دبا دبا سا غصہ تھا۔
"میں نے کچھ نہیں کیا...... خدا کی قسم! میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا۔" عطیہ کے لیے اپنے دل و دماغ کی گھٹن سے نجات کے لیے اعتراف کے سوا اب کوئی چارہ نہ رہا تھا۔
"خاموش رہ بدبخت! اللہ کو اپنی قسموں کا وسیلہ کیوں بناتی ہے؟ تو نے اس رب کی حدود سے نافرمانی کی۔ اب اپنے پچھتاوؤں کے لیے اس کے نام کی قسمیں کیوں کھاتی ہے؟" اس کی آواز تیز سرگوشی کی طرح تھی۔
"میں نے تو ہر لمحہ اس کی حفاظت ہی کی تھی۔ میں نے اس کی بہتری ہی سوچی تھی۔" وہ بلکنے لگی۔
"تو نے خزانے کو لٹیروں کی دعوت کا سامان بنا دیا۔ بول! بنایا کہ نہیں؟ کیا کہیں رب نے تجھے ایسے غیر شرعی لباس پہنانے کا حکم دیا تھا؟ کیا رب اور اس کے رسول ﷺ نے کہیں کسی مقام پر فرمایا ہے کہ اولاد کی ہر بات مانتے رہو۔ وہ تو نادان تھی، کم عقل تھی، زمانے کے سرد و گرم سے ناآشنا تھی۔ تجھے کیا ہوا؟ تجھ پر اس کی ذمے داری تھی۔ تو کیوں اس کے سامنے کمزور پڑی؟" وہ عورت اب اسی کے پاس بیٹھ

گئی تھی۔
"تت...... تم...... تمہیں کیسے علم ہوا کہ میں کمزور پڑ جاتی تھی؟" عطیہ خوفزدہ ہوئی۔ اسی پل اس کی آنکھوں سے غصے کی کیفیت یک لخت کرب میں تبدیل ہوگئی۔
"میں بھی تو یونہی کرتی تھی۔" اس نے اپنے ہونٹ کچلے۔
"تت...... تو کیا تمہارے ساتھ بھی؟"
"ہاں! میں بھی اپنی ممتا کے ہاتھوں کمزور پڑتی تھی۔ یہ کمزور نفس اولاد کے آنسو اور ضد کو اپنے کم اندیش فیصلوں کا جواز بنا لیتا ہے۔ میں بھی بظاہر اس کی ہر ضرورت پوری کر کے مطمئن رہتی تھی۔ وہ ضد کرتی کہ اسے اپنی سہیلی کی آپی ہی سے ٹیوشن پڑھنا ہے۔ اس کی اور بھی بہت سی سہیلیاں وہاں پڑھتی ہیں۔ میں نے یہ خواہش بھی پوری کردی۔ اس نے کہا کہ ہم سب ایک گروپ کی صورت میں واپس آتی ہیں۔ میں مزید بے فکر ہوگئی۔ میری تعلیم، نوکری اور شعور گھر کی ذمے داریوں اور الجھنوں میں پھنسا اس بات کا ادراک ہی نہ کر سکا کہ کسی پہلو کو گہرائی میں جانچ لوں۔ اس کے دادا ان معاملات پر خاصی لے دے کرتے لیکن میں نے ان کی بات پر کان ہی نہ دھرے۔ انہیں یہ جواز دے کر خاموش کر دیتی کہ بچوں میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے خود مختاری فراہم کرنی چاہیے۔
"سہیلی کے گھر کئی بھائی اور کزن رہتے تھے۔ بچیوں سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرلیا کرتے۔ میری بچی ان کی ہوس کی بھینٹ چڑھتی رہی اور پھر ایک روز اس نے اپنی کلائی کی رگیں ہی کاٹ ڈالیں۔ وہ مجھے ایک بار بتاتی تو سہی...... مجھ پر اعتبار کرتی تو سہی...... اس نے بھی میری کم فہمی کو سزا اپنا ڈالا...... اس کی کاپی پر لکھا آخری خط نہ پڑھتی تو ہمیشہ انجان ہی رہتی۔ اس نے بڑے دکھ سے لکھا تھا کہ امی کو یہ سب کیسے بتاؤں؟ انہیں جاب اور گھر کے کاموں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے؟ وہ مجھے کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات نہ مانی اور کسی کو بتانے کی کوشش کی تو تمہارے سب گھر والوں کو آگ لگا دیں گے۔ وہ بہت خطرناک ہیں۔ میں کیا کروں؟ بس یہی سمجھ آیا ہے کہ روز روز کی اس اذیت سے اپنی ہی جان لے لوں۔ اس خط کے بعد شوہر نے میرے فیصلوں کی پاداش میں طلاق دے کر دونوں بیٹے اپنے پاس رکھ لیے اور میں راہوں کی دھول بن گئی۔" وہ دیوانگی کے عالم میں بولتی چلی گئی۔
عطیہ کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ اسے اس نامعلوم عورت کی سابقہ حرکت اور پس پردہ مقاصد کا ادراک ہوگیا تھا۔ اسے بھی تو نفیسہ نے کئی بار سمجھانا چاہا تھا لیکن اس کی ممتا اولاد کی خوشی اور مسکراہٹ کو اپنی کمزور قوتِ ارادی کا جواز بنا لیتی تھی۔ دینِ فطرت میں قائم کردہ حدود سے تصادم کا انجام تباہی نہ ہو تو انسان کو اپنے غلط فیصلوں کا ادراک بھی کیونکر ہو؟
عطیہ کے ذہن پر ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ اسی لمحے اسے بغلی گلی سے درمیانی عمر کا ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ثنا ہی کی ہم عمر لڑکی تھی جس نے اسکول بیگ بے پروائی سے اپنے کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ لڑکی کا مغربی لباس کافی چست تھا اور اسکارف نما ہلکا سا کپڑا گلے میں پڑا تھا۔ اس نے چند راہگیروں کو کن انکھیوں سے لڑکی کی جانب دیکھتے پایا۔ ان کی نظروں میں ایک عجیب گہری چمک لہرانے لگی تھی۔ وہ بے اختیار اٹھی اور وہاں موجود اینٹ اٹھا کر آدمی کو دے ماری۔
"اندھا ہو گیا ہے کیا؟ تیری آنکھوں پر پٹی بندھ گئی ہے کیا؟ تجھے یہ سب دکھائی کیوں نہیں دیتا؟" وہ اپنے حواس میں نہ تھی۔
راہگیر ترحم اور حیرت سے اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔
"یہ مجاہد صاحب کی اہلیہ ہیں نا؟ بے چاروں کے ساتھ بہت بڑا سانحہ ہوا ہے۔ اکلوتی بیٹی کی بربادی نے ان کا بھی ذہنی توازن بگاڑ دیا ہے شاید۔" ہجوم سے ایک آواز ابھری۔
"اچھا! تو یہ وہی ہیں جن کی بیٹی کے ساتھ اسکول واچ مین اور دو لڑکوں......" دوسرے شخص نے تاسف سے کہا۔
"ہاں بھئی! میڈیا پر بھی کافی خبریں آئی تھیں۔ اسی کا اثر ہے شاید۔ بچی مر جاتی تو شاید انہیں صبر آجاتا مگر سنا ہے وہ تو پاگل ہو چکی ہے۔" ایک بے رحمانہ تبصرے نے اس کا دل لہولہو کر دیا۔
"اسی لیے تو میں نے بچی کو لانے اور لے جانے کی ذمے داری خود اٹھالی ہے۔ حالات بہت ہی خراب ہو چکے ہیں۔ ہم تو اپنی طرف سے کوئی بے احتیاطی نہیں برت سکتے۔" اسی آدمی نے اپنا کندھا سہلاتے ہوئے کہا۔
"تم سب اندھے ہو...... اپنی کوتاہیوں کا جواز حالات کو کیوں بنا لیتے ہو؟ اپنی آنکھیں کھول لو...... اب بھی وقت ہے......" وہ ہذیانی انداز میں کہتی چلی گئی۔
ہجوم تاسف بھری چہ میگوئیاں کرتا ہوا اپنے معمولاتِ زندگی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

محفلِ شعر و سخن



❋ زرین خان آفریدی..... حیدرآباد

بہت محدود سا اک حلقۂ احباب تھا میرا
فقط مستیاں، شرارتیں، نادانیاں اور میں
ابھی بھی حلقۂ احباب محدود ہے میرا.....
فقط خاموشیاں، تنہائیاں، اداسیاں اور میں

❋ آذین رضوان..... کراچی

تو کیا چھپا رہا ہے مرا ہاتھ دیکھ کر
اے کف شناس میں بھی قیافہ شناس ہوں

❋ چلبلی ہیر..... جھنگ، صدر

واقف ہی نہ تھا رمزِ محبت سے وہ، ورنہ
دل کے لیے تھوڑی سی عنایت ہی بہت تھی



❋ محمد حذیفہ..... کراچی

محفل ہو دکھاوے کی تو ہیں سب سے نمایاں
اور کہنا پڑے سچ تو شرمسار ہیں ہم لوگ
ریشم سے ملائم ہیں تو ہم کانچ سے نازک
لگتے ہیں سبھی پھول مگر خار ہیں ہم لوگ

❋ محمد رشید سیال..... روہڑی، ضلع سکھر

آج اک اور برس بیت گیا اُس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

❋ شفیق حسین ..... سندھی ہوٹل، نیو کراچی، کراچی

مشہور بہت ہے میرے الفاظ کی تاثیر
اک شخص مگر مجھ سے منایا نہیں جاتا

❋ محمد خواجہ..... کورنگی، کراچی

نقاب رخ پلٹ ڈالا کہ اب تو مر چکے ہوں گے
یہ اپنی خوش نصیبی تھی کہ دم تاخیر سے نکلا

❋ ماہین بابر، فضل عباس..... گلیانہ روڈ، کھاریاں

کوئی لشکر ہے کہ بڑھتے ہوئے غم آتے ہیں
شام کے سائے بہت تیز قدم آتے ہیں
دل وہ درویش ہے جو آنکھ اٹھاتا ہی نہیں
اس کے دروازے پہ سو اہلِ کرم آتے ہیں

❋ وزیر محمد خان..... بٹل ہزارہ

کس سلیقے سے یاد آتے ہو
جیسے بارش ہو وقفے وقفے سے

❋ بابر عباس، مسز بابر عباس..... گلیانہ روڈ کھاریاں

تم بادشاہِ وقت تھے کٹوا دیے تھے ہاتھ
اب قصر گر رہا ہے تو معمار کیا کرے

❋ زریان سلطان..... اردو بازار، کراچی

مجھے خود سے بھی کھٹکا سا لگا تھا
مرے اندر بھی اک پہرا لگا تھا
ابھی آثار سے باقی ہیں دل میں
کبھی اس شہر میں میلا سا لگا تھا

❋ محمد آریز..... کراچی

ممکن نہیں ہے مجھ سے یہ طرزِ منافقت
دنیا تیرے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں

❋ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

کرب کے شہر میں رہ کر نہیں دیکھا تو نے
کیا گزرتی رہی ہم پر نہیں دیکھا تو نے

❋ مدحت..... کراچی

چاند کی دوسری جانب کا بھی منظر دیکھیں
شاید ایسا کبھی کھل جائے دریچہ کوئی
اک یہی بات کہی تھی دمِ رخصت اس نے
کیا کیا جائے ٹھہرتا نہیں لمحہ کوئی

❋ منظر امام..... کراچی

جاناں تیری آنکھوں میں ہے محشر وحشر سب
چاقو واقو چھریاں وریاں خنجر ونجر سب
جب سے تو نے ساتھ ہے چھوڑا سونے دونے لگتے ہیں
چادر وادر تکیہ وکیہ بستر وستر سب

❋ محمد طلحہ..... نارتھ کراچی، کراچی

اے مجھے صبر کے آداب سکھانے والے
جب وہ بچھڑا تھا وہ منظر نہیں دیکھا تو نے

❋ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن خانیوال

اک دیوانہ یہ کہتے ہوئے ہنستا جاتا
کاش منزل سے بھی آگے، کوئی رستہ جاتا
اے میرے ابرگریزاں مری آنکھوں کی طرح
گر برسنا ہی تجھے تھا تو برستا جاتا

❋ محمد کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

غبار جاں نکلتا جاتا ہے
دھواں روزن کا رستہ جانتا ہے
تم اس کی رہنمائی کیا کروگے
کدھر جانا ہے دریا جانتا ہے

❋ عتیق الرحمٰن..... فیصل آباد

کوئی مجھے بتائے کیا جواب دوں اُن کو
وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کیوں میری آرزو کی

❋ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی

سچائی سمو دی تو چمکنے لگی تحریر
حالانکہ ہر اک لفظ سیاہی سے لکھا تھا

❋ جاوید اختر رانا..... پاکپتن شریف

میں محبت ہوں مجھے آتا ہے نفرت کا علاج
تم ہر اک شخص کے سینے میں میرا دل رکھ دو

❋ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس

شکوہ گردشِ حالات لیے پھرتا ہے
جس کو دیکھو وہ یہی بات لیے پھرتا ہے
اُس نے پیکر میں نہ ڈھلنے کی قسم کھائی ہے
اور مجھے شوقِ ملاقات لیے پھرتا ہے

❋ رضیہ عمیر..... کراچی

مل جائے نہ یہ تاج و قبا اور کسی کو
وہ سونپ نہ دے بارِ وفا اور کسی کو
اک دشمنِ جاں کا ہے طرف دار مرا دل
ایسا کوئی ہمدرد ملا اور کسی کو

❋ حسنین عباس، کمیل عباس..... گلیانہ روڈ کھاریاں

دلِ واعظ میں کوئی غم نہیں ہے
نظر رکھتا ہے، چشمِ نم نہیں ہے
میں اس کی گفتگو سے بھاگتا ہوں
کہ اُس کی ریت میں زمزم نہیں ہے

❋ ساگر تلوکر..... چشمہ بیراج

کون اس ہجر زدہ عمر کو تنہا کاٹے
دکھ خیالوں کو ڈسے درد کلیجا کاٹے

❋ بریرہ ..... گلشن اقبال، کراچی

کہا تو تھا کہ ہمیں اس قدر بھی ڈھیل نہ دے
اب اڑ رہے ہیں تو پر کاٹنے کو آتا ہے

❋ ریاض بٹ..... حسن ابدال

برسات کے موسم سے تجھے پیار بہت تھا
اب دیکھ لے آکر میری روتی ہوئی آنکھیں

❋ فرحان شیخ..... پاک کالونی، کراچی

سہمے ہوئے لوگوں پہ مکانوں کی چھتوں پر
اک تیغ نئے خوف کی سو بار گری ہے
کیا حشر بپا ہے کہ اندھیرے میں اچانک
ہمسائے پہ ہمسائے کی دیوار گری ہے

❋ شہباز اکرم..... ڈھپئی، پاکپتن شریف

بچھڑا تو دوستی کے اثاثے بھی بٹ گئے
شہرت وہ لے گیا مجھے رسوائی دے گیا

❋ محمد اکرم ندیم..... کوئٹہ

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
درد میں لذت بہت اشکوں میں رعنائی بہت
اے غمِ ہستی تیری دنیا پسند آئی بہت

❄ ثنا عظیم......ناظم آباد، کراچی
آیا نہیں پلٹ کے کوئی بھی گیا ہوا
میں خود ہی جاؤں گا انہیں ڈھونڈتا ہوا

❄ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

❄ عاصم خان......نواب شاہ
وہی راستے وہی منزلیں، وہی قافلے وہی مرحلے
لیکن اپنے مقام پر کبھی ہم نہیں کبھی تم نہیں

❄ اعجاز احمد......راولپنڈی
خوش ہوا تھا توڑ کر قفس کی تیلیاں
ہائے کر کے رہ گیا ٹوٹے ہوئے پر دیکھ کر

❄ آصف علی......سرگودھا
بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے

❄ یوسف ملک......اورنگی ٹاؤن، کراچی
مل نہ سکے کسی سے ہم ویسے تو عمر بھر
ملنے کے عمر بھر مگر امکان سے رہے

❄ زینب......پشاور
کچھ اس طرح سے لگی آگ بادبانوں میں
کہ ڈوبنے کو بھی ترسے جو کشتیوں میں جلے

❄ شہلا فاروقی......لاہور
اب تو بارود کا اک ڈھیر بنی ہے دنیا
اب تو باقی ہے فقط ایک دھماکا ہونا

❄ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
اک یہی بات کہی تھی دمِ رخصت اُس نے
کیا کیا جائے ٹھہرتا نہیں لمحہ کوئی

❄ کہکشاں ادریس......سیالکوٹ
چاند کی دوسری جانب کا بھی منظر دیکھیں
شاید ایسا کبھی کھل جائے دریچہ کوئی

❄ محمد امین......کراچی
بازی وقت کی پلٹ جائے تو اکثر ایسا ہوتا ہے
جان نچھاور کرنے والے جان چھڑانے لگتے ہیں

❄ انجم ......گوجرانوالہ
میرا ایمان ہے تم کو اندھیرے چھو نہیں سکتے
میں اپنا گھر جلادوں گا تم ذرا شام ہونے دو

❄ انتظار حسین......حیدر آباد
میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی فطرت کیا ہے
میں نے ہر ذہن میں جھانکا ہے ارسطو کی طرح

❄ شگفتہ......اسلام آباد
پہلے تو انجمن میں جلائے بہت چراغ
پھر یوں ہوا چراغ جلانے لگے مجھے

❄ احتشام الدین......لاہور
مجھ کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام تیرا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

❄ وردہ ملک......کراچی
سب مجھ کو جلا کے سو گئے ہیں
میں ایک چراغِ آخرِ شب ہوں

❄ ارم جمال......ملتان
زہر ایجاد کرو اور یہ پیہم سوچو
زندگی ہے کہ نہیں دوسرے سیاروں میں

❄ فرید احمد......فیصل آباد
دھرتی سے لوگ بھاگ کے جائیں تو کس طرف
ہر سمت آسماں ہے زمیں سے ملا ہوا

❄ مدثر حسین......جھنگ
کسی ملال کا اب کوئی بھی جواز نہیں
گزر گئی ہے جس انداز سے گزرنی تھی

کوپن

جون 2018



نام : ---

پتا : ---



کیتھی

عبداللہ احمد حسن

ماحول مغربی ہو یا مشرقی لیکن والدین کی محبت تو اسی احساس سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنی اولاد کو معاشرے کے سرد و گرم سے بچا کر رکھنا چاہتا تھا لیکن زمانے کی سختی نے ان معصوم پھولوں کو مرجھا دیا۔

بیٹی کی محبت میں ہوش کھو دینے والے باپ کا المناک واقعہ

سیونتھ ایونیو پر گاڑیوں کا ازدحام تھا۔ شام اتر رہی تھی۔ سائے لمبے ہو رہے تھے۔ وہ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ لمبے سفید بال اور بے تحاشا بڑھی ہوئی ڈاڑھی مونچھ، جسے عرصے سے نہ پانی لگا تھا نہ کنگھی کی گئی تھی۔ اس کے لاغر بدن پر پرانی سی پتلون، شرٹ اور ایک بوسیدہ سی جیکٹ تھی، جس کا رنگ اڑ چکا تھا اور میل کی وجہ سے سیاہ رنگ غالب آ رہا تھا۔ چہرے پر بھی میل کی تہیں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے قریب سے گزرنے والوں کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس

کے بدن سے بہت ناگوار بو آرہی ہے۔ چہرے کی بے شمار جھریاں ان سختیوں کی اَن گنت کہانیاں سنارہی تھیں جو اس نے سہی تھیں۔ اس کی دھندلی نیلی آنکھوں میں ایک درد بسا ہوا تھا۔ کندھے جھکے ہوئے تھے جیسے زندگی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک چکے ہوں۔ ایک کندھے پر ایک چھوٹا سا پھٹا پرانا بیگ لدا ہوا تھا۔ کل شام سے اس کے سینے میں درد ہورہا تھا جس میں وقت گزرنے کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا تھا، مگر وہ اسے برداشت کررہا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے سیونتھ ایونیو پر چلا جارہا تھا۔ اس کا رخ ٹائمز اسکوائر کی جانب تھا۔ ٹائمز اسکوائر پر معمول کے مطابق ایک ہجوم تھا۔ لوگ آجارہے تھے۔ اداس لوگ، ہنستے بولتے لوگ، گاتے بجاتے لوگ، کھانے پینے میں مصروف لوگ، اپنے آپ سے باتیں کرتے یا کسی جانب ٹکٹکی باندھے گھورتے ہوئے نفسیاتی مریض، پیار کرنے والے جوڑے، دفاتر سے نکل کر بسوں اور ٹرینوں کو پکڑنے کے لیے بھاگتے دوڑتے لوگ، چادریں بچھائے سامان بیچتے لوگ، ان سے خریداری میں مصروف لوگ، تصویریں بناتے آرٹسٹ اور ان سے تصویریں بنواتے لوگ، کہیں بازیگر کمالات دکھارہے تھے، کہیں گلوکار سازوں کی سنگت پر اپنی آواز کا جادو جگارہے تھے، غرض ایک ہجوم بیکراں تھا جس میں وہ تنہا تھا۔ ٹائمز اسکوائر پہنچ کر وہ ایک جانب خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں لوگوں پر تھیں مگر وہ انہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا۔ آج اسے وہ سب کچھ بہت یاد آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے میگی اور کیتھی کی صورتیں گھوم رہی تھیں۔ اچانک اس کا دل بھر آیا اور وہ زارو قطار رونے لگا۔ اس کی آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ سامنے ٹائمز اسکوائر کا منظر دھندلا گیا تھا اور ان دھندلکوں سے ماضی کے در وا ہورہے تھے۔

☆☆☆

رچرڈ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ وہ نیویارک کے ایک پسماندہ علاقے برونکس میں رہائش پذیر تھے۔ یہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ کسی اچھے وقت میں اس کے والد نے وہاں ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا تھا۔ اس علاقے میں بہت غربت تھی اور اسی مناسبت سے جرائم کی شرح بھی بہت زیادہ تھی۔ جب رچرڈ کی عمر چھ سال کی تھی تو اس کی زندگی میں ایک بڑا بحران آگیا۔ اس دن اس کے والد کام سے واپس آرہے تھے۔ جہاں سے وہ گزر رہے تھے اچانک وہاں دو گروہوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ رچرڈ کے والد کو بھی دو گولیاں لگیں۔ انہیں شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا مگر وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گئے۔ رچرڈ اور اس کی ماں کو جب خبر ملی تو ان پر بجلی سی گر پڑی۔ انہیں یقین نہ آتا تھا کہ ان کے ساتھ اتنا بڑا سانحہ گزر گیا ہے۔ ان ماں بیٹے کی آہ و بکا نے وہاں موجود دیگر لوگوں کو بھی آبدیدہ کردیا۔ بالآخر ایک سماجی تنظیم کے تعاون سے انہوں نے اس کی تدفین کردی۔ اب ان کے سامنے مسائل کا پہاڑ منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اس کی ماں پڑھی لکھی نہ تھی اس لیے کوئی بڑی نوکری حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے ایک فیکٹری میں ملازمت کرلی۔ فلیٹ اپنا تھا اور دو ماں بیٹا ہی تھے اس لیے کسی طرح زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔

☆☆☆

سر پر باپ کا سایہ نہ ہونے اور ماں کی مصروفیت کی وجہ سے رچرڈ آوارگی کا شکار ہونے لگا۔ ماں نے اسے اسکول میں داخل کروانے کی کوشش کی مگر وہ وہاں سے بھاگ آیا۔ اب وہ سارا سارا دن گلیوں میں اپنے جیسے دیگر بچوں کے ہمراہ کھیلتا رہتا تھا۔ اس کی عمر چودہ سال ہوچکی تھی۔ اس کی ماں مسلسل محنت کی وجہ سے بہت تھکی تھکی اور بیمار نظر آنے لگی تھی۔ مگر وہ دوا کھانے میں سدا کی چور تھی اس لیے کسی ڈاکٹر کے پاس نہ گئی۔ ایک روز اچانک رات کے وقت اس کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تو اس کی کراہوں سے رچرڈ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنی آوارگیوں کے باوجود اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس رات جو اس نے اسے بے چین اور تکلیف میں تڑپتے دیکھا تو پریشان ہوگیا۔

"ماما، ماما! تمہیں کیا ہوا ہے۔"

"کچھ نہیں بیٹا۔ بس ذرا سینے میں درد ہورہا ہے۔"

"چلو اٹھو، میں ابھی تمہیں اسپتال لے چلتا ہوں۔"

"نہیں رچرڈ اب کوئی فائدہ نہیں۔ لگتا ہے میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "نہیں ماما! ایسا مت کہو، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"رچرڈ میری بات سنو، میرے بعد تم اپنی زندگی کی روش بدل لوگے۔ مجھ سے وعدہ کرو، کہ تم سب آوارگیاں چھوڑ دوگے اور کوئی باعزت کام کروگے۔ ورنہ میری روح کو سکون نہیں ملے گا۔ یہ آوارگی کی روش تمہیں جیل پہنچادے گی۔"

"تم جیسا کہوگی میں ویسا ہی کروں گا مگر پلیز مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہ کرو۔"

"بیٹا میری......بات یاد رکھنا اپنا وعدہ مت بھولنا۔"

اس کے ساتھ ہی اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔ وہ چند ثانیے ساکت سا اپنی ماں کی بے نور آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو اترنے لگے۔

صبح اس کی ماں کو بھی اس کے باپ کے قریب دفنا دیا گیا۔

☆☆☆

چند دن تک وہ سوگ میں ڈوبا رہا پھر ایک عزم کے ساتھ اٹھا۔

"ماما! میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے ضرور نبھاؤں گا۔"

اس نے جب ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی تو اسے احساس ہوا کہ وہ جس تعلیم سے دور بھاگتا تھا وہ کتنی ضروری تھی مگر اسے کوئی اور کام نہ ملا تو اس نے بھی اپنی ماں کی طرح ایک فیکٹری میں ملازمت کرلی۔ ابتدا میں وہ مزدور بھرتی ہوا تھا مگر جلد ہی اپنی محنت لگن اور ایمان داری کے سبب اسے ترقی ملتی گئی اور وہ فورمین بنادیا گیا۔

اب زندگی ایک ڈگر پر آگئی تھی۔ اس نے خود کو بالکل تبدیل کرلیا تھا۔ تمام پرانے دوستوں سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ اب اس کی عمر ستائیس سال ہوچکی تھی۔ وہ اس عرصے میں کوششیں کرکے جیسا تیسا پکانا سیکھ گیا تھا۔ ہر ہفتے وہ کوسٹکو اسٹور سے ہفتے بھر کے لیے گروسری لے آتا تھا۔ پھر رات کو دو وقت کا کھانا ساتھ ہی پکالیتا تھا۔ رات کو کھا کر سو جاتا دوسرے دن بچا ہوا پیک کرکے ساتھ لے جاتا جسے وہ فیکٹری میں کھالیتا۔ ایک روز وہ کوسٹکو اسٹور گیا تو وہاں ایک نئی کیشیئر سے ملاقات ہوگئی۔ وہ سنہری بالوں اور سبز آنکھوں والی دلکش حسینہ مارگریٹ عرف میگی تھی۔ میگی پہلی ہی ملاقات میں.....اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ اب وہ ہفتے کے بجائے ہر تیسرے چوتھے دن اسٹور جانے لگا۔ رفتہ رفتہ میگی نے بھی اس کی آنکھوں کے پیغام کو سمجھ لیا۔ ان میں تھوڑی بہت گفتگو ہونے لگی۔ جب بات کچھ آگے بڑھی تو وہ اسٹور سے باہر بھی ملنے لگے۔ اسے علم ہوچکا تھا کہ اس کی طرح میگی بھی دنیا میں تنہا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے قریب آتے گئے۔ آخر ایک دن وہ اس کی زندگی میں بہار بن کر آگئی۔

☆☆☆

شادی کے بعد بھی میگی نے ملازمت جاری رکھی۔ وہ دن ان کے لیے انتہائی خوشی کا تھا جب شادی کے دو سال بعد ان کے آنگن میں پہلا پھول کھلا۔ اس کا نام انہوں نے اسٹیو رکھا۔ اسٹیو کے دو سال بعد کیتھرائن پیدا ہوئی جسے پیار سے کیتھی کہا جاتا تھا۔ کیتھی کی پیدائش کے بعد رچرڈ کو ترقی مل گئی تو میگی نے ملازمت چھوڑ کر مکمل توجہ گھر پر دینی شروع کر دی۔ ایک روز رچرڈ فیکٹری میں تھا۔ میگی کو کچھ سامان لینا تھا، اس نے کیتھی کو اپنی پڑوسن کے پاس چھوڑا اور چھ سالہ اسٹیو کو ساتھ لے کر اسٹور کی طرف چلی گئی۔ وہاں وہ زیبرا کراسنگ کے پاس سگنل کھلنے کا انتظار کررہی تھی کہ اچانک اسٹیو بھاگ کر سڑک پر چلا گیا۔ سامنے سے ایک بس کافی تیزی سے آرہی تھی۔ میگی کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی، اس نے چھلانگ لگا کر اسٹیو کو پکڑا اور اسے فٹ پاتھ کی طرف اچھالنے کی کوشش کی مگر دیر ہوچکی تھی بس ڈرائیور نے بریک لگانے کی کوشش کی۔ اس کے ٹائر چرچرائے مگر رکتے رکتے بھی اس نے میگی کو ٹکر ماردی۔ میگی اور اسٹیو اچھل کر سڑک پر گرے اور برابر سے گزرتی گاڑی کے وہیل ان پر چڑھ گئے۔ پولیس آئی انہوں نے تفتیش کی اور دونوں لاشیں لے کر اسپتال چلی گئی۔ میگی کے پرس سے ملنے والے شناختی کاغذات کی مدد سے دو پولیس والے اس کے گھر روانہ ہوگئے۔ رچرڈ واپس آیا تو گھر بند تھا۔ اس نے پڑوس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پڑوسن نے دروازہ کھولا۔ اس نے پوچھا۔

"مسز روبرٹ، میگی کہاں ہے؟"

"اوہ رچرڈ، میگی شام کو اسٹور کی طرف گئی تھی مگر ابھی تک واپس نہیں آئی۔ میں خود بہت پریشان ہوں۔"

"کیا؟ اتنی دیر لگادی۔ اور بچوں کا آپ کو پتا ہے؟"

"ہاں، وہ کیتھی کو میرے پاس چھوڑ گئی ہے، اسٹیو اس کے ساتھ تھا۔"

رچرڈ نے پریشانی سے سوچا ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا، آخر اسے کہاں اتنی دیر لگ گئی؟

اسی وقت ایک پولیس کار وہاں آکر رکی۔ دو پولیس والے اس کے دروازے پر آئے تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"جی آفیسر کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"اس اپارٹمنٹ میں رچرڈ رہتا ہے نا؟"

"میں ہی رچرڈ ہوں، کیا بات ہے۔" اس کی پیشانی عرق آلود ہوچکی تھی۔

"آپ کو ہمارے ساتھ اسپتال تک چلنا ہے۔"

"کیوں، سب خیریت تو ہے نا؟"

"مسٹر رچرڈ، خیریت نہیں ہے، آپ کی بیوی کا نام مارگریٹ ہی ہے نا؟"

"جی، جی ہاں، مارگریٹ میری بیوی کا ہی نام ہے کیا ہوا اسے آپ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟"

"دیکھیں مسٹر رچرڈ، آپ پورے حوصلے سے میری بات سنیں۔ آپ کی بیوی اور بیٹے کو سڑک پر حادثہ پیش آگیا ہے۔"

اس کی چیخ نکل گئی۔ ”کیا، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آفیسر، وہ دونوں ٹھیک تو ہیں نا؟“

”رچرڈ مجھے افسوس ہے کہ اس حادثے میں وہ دونوں ہی ہلاک ہوگئے ہیں۔“

رچرڈ پر بجلی سی گر پڑی، اس کی ٹانگوں نے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کردیا۔ سرزور سے چکرایا اور وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

☆☆☆

اسے اس حادثے سے سنبھلنے میں کئی دن لگ گئے۔

اب اسے نئے مسائل کا سامنا تھا۔ ملازمت پر جانا بھی ضروری تھا اور چار سالہ کیتھی کو سنبھالنا اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا بھی ضروری تھا۔ اس کے پڑوسی روبرٹ نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دیا، مگر اس کے لیے میگی کی جگہ کسی اور کو دینا بہت مشکل تھا۔ دوسرے کیتھی کا مسئلہ بھی تھا نہ جانے دوسری عورت اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔ میگی اور اسٹیو کو کھونے کے بعد اب اس کی ساری توجہ سارا پیار صرف کیتھی کے لیے ہی مخصوص ہوکر رہ گیا تھا۔ اس نے مسز روبرٹ سے بات کی۔

”مسز روبرٹ، میں صبح فیکٹری جاتے ہوئے کیتھی کو آپ کے پاس چھوڑ کر جاؤں گا اور واپس آکر لے لوں گا اس کے لیے ہم ایک معاوضہ طے کرلیتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ پہلے بھی اس کا خیال رکھتی رہی ہیں اس لیے میں کسی اور پر بھروسا نہیں کرسکتا۔“

”رچرڈ کیتھی مجھے بھی عزیز ہے پیسوں کی بات مت کرو اسے چھوڑ جایا کرو میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔“

مگر رچرڈ راضی نہ ہوا اس کے اصرار پر مسز روبرٹ کو معاوضہ قبول کرنا پڑا۔ یوں زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی۔

اب وہ صبح فیکٹری جاتا واپس آکر کیتھی کو ساتھ لیتا اور گھر آجاتا۔ کھانا وہ خود ہی پکاتا تھا۔ کپڑے بھی خود دھوتا تھا۔ گھر کی صفائی بھی اسی کی ذمے داری تھی۔ روز صبح کیتھی کو تیار کرتا، اسے مسز روبرٹ کے پاس چھوڑتا۔ پھر باہر نکلتا۔ کیتھی جوں جوں بڑی ہورہی تھی وہ بھی اس کا خیال رکھنے لگی تھی، دوڑ دوڑ کر اس کے سارے کام کرتی۔ وہ بھی اپنے باپ سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے دوست تھے۔ جب کیتھی چھ سال کی ہوئی تو اسے اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ وہ خود تو ان پڑھ رہ گیا تھا مگر چاہتا تھا کہ کیتھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اس کی زندگی کا محور اور مقصد اب صرف کیتھی تھی۔

کیتھی بہت ذہین تھی اس لیے ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اسکول کی تعلیم مکمل کرلی۔ اس کے گریڈز بہت اچھے آئے تھے۔ اب اسے یونیورسٹی بھیجنے کا مرحلہ آیا تو کیتھی نے جھجکتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ کولمبیا یونیورسٹی جانا چاہتی ہے۔ اس نے معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ کولمبیا یونیورسٹی جانا بہت مہنگا پڑے گا، اس کی اتنی استطاعت نہیں تھی۔ اس نے ہر طرح کوشش کی مگر کوئی انتظام نہیں ہوسکا۔

کیتھی یہ سب دیکھ رہی تھی آخر اس سے نہ رہا گیا۔ ایک دن وہ بولی۔

”پاپا، آپ پریشان نہ ہوں اگرچہ کولمبیا جانا میرا خواب تھا مگر میں دیکھ رہی ہوں یہ ممکن نہیں ہے اس لیے میں کسی بھی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے تیار ہوں۔“

اس کے دل پر آرے سے چل گئے۔ اس دن اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرلیا۔ چند دن بعد اس نے سارا پروسیجر مکمل کر کے کیتھی کو کولمبیا جانے کی خوشخبری سنائی۔ کیتھی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہوگیا مگر سامنے رکھے کاغذات بتا رہے تھے کہ یہ سچ ہے اس کا خواب پورا ہوچکا تھا۔ کیتھی جذباتی ہوکر اس سے لپٹ گئی اور کہا۔ ”پاپا، آپ دنیا کے سب سے اچھے پاپا ہیں، آپ جیسا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔“

کیتھی کولمبیا چلی گئی تو اس نے بھی اپنا وہ گھر جس سے اس کی یادیں وابستہ تھیں جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ جس کے ہر ہر کونے میں میگی کی یادیں بسی ہوئی تھیں چھوڑ دیا۔ اس نے کیتھی کا خواب پورا کرنے کے لیے اپنا اپارٹمنٹ فروخت کردیا تھا۔

☆☆☆

وہ اب ایک کرائے کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں اٹھ آیا تھا۔ اس کے لیے وہ دن یادگار تھا جب کیتھی نے دوسرا سیمسٹر بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اس کو یونیورسٹی بلایا گیا۔ وہاں کیتھی کی بہت تعریف کی گئی اور کہا گیا یہ لڑکی بزنس مینجمنٹ میں بہت آگے جائے گی۔ اس کا مستقبل روشن ہے۔ جس دن کیتھی کو ڈگری ملی اس دن دونوں نے باہر کیتھی کے پسندیدہ ریستوران میں ڈنر کیا اور رات گئے تک گھومتے پھرتے رہے۔ پھر وہ دن بھی آگیا جس کے خواب اس نے ہمیشہ دیکھے تھے۔ کالے گاؤن اور گریجویشن کیپ میں ملبوس کیتھی کو اسٹیج پر بلا کر ڈگری دی گئی۔ وہ اس وقت پاگلوں کی طرح تالیاں بجا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ کیتھی نے قریب آکر اپنے

ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے اور کہا۔ ”پاپا، آج تو آپ کو خوش ہونا چاہیے مگر آپ آنسو بہا رہے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”نہیں کیتھی یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“

مگر دل میں سوچا..... کیتھی اب تمہیں کیا بتاؤں اس وقت مجھے تمہاری ماں اور بھائی کی یاد آرہی ہے۔ اگر میگی بھی یہاں ہوتی تو آج کتنی خوش ہوتی اور تمہارا بھائی تم سے پہلے ہی گریجویشن مکمل کرچکا ہوتا۔ یہ آنسو تو ان کی یاد میں بہہ رہے ہیں۔“

واپس آکر کیتھی اس کے ساتھ اسی چھوٹے سے کرائے کے اپارٹمنٹ میں رہنے لگی اس نے ملازمت کی کوشش کی۔ جلد ہی اسے ایک فرم میں بہت اچھی جاب مل گئی۔ اب زندگی میں کچھ ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ وہ اب بھی اسی فیکٹری میں کام کررہا تھا۔

ان دنوں اس علاقے میں اغوا کی وارداتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ لڑکیاں اغوا ہوجاتیں پھر دوسرے تیسرے دن ان کی لاشیں ملتیں۔ پولیس اب تک مجرم کا پتا لگانے میں ناکام تھی۔

ایک دن کیتھی نے کہا۔ ”پاپا، اس علاقے میں جرائم کی وارداتیں بڑھتی ہی چلی جارہی ہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے بہت سی عورتیں اغوا ہوئی ہیں جن کی لاشیں برآمد ہورہی ہیں۔ اب میں بھی اچھی جگہ کام کررہی ہوں ہمیں کسی اچھے علاقے میں شفٹ ہوجانا چاہیے۔“ اس نے سوچا یہ ٹھیک کہہ رہی ہے ان دنوں وہاں کوئی شخص یا گروہ سرگرم تھا اور تواتر سے اغوا اور قتل کی وارداتیں ہورہی تھیں۔ اس نے ہامی بھرلی۔ اس کی کوششوں سے ایک اپارٹمنٹ دیکھنے کا ٹائم مقرر ہوگیا۔

اس روز اس نے فیکٹری سے چھٹی کی تھی۔ اس لیے وہاں سے سیدھا گھر پہنچ گیا کہ شام کو جب کیتھی آئے گی تو اسے یہ خوشخبری سنا دے گا۔

☆☆☆

اس نے چیلسی لوئر مین ہٹن کے 14 اسٹریٹ اسٹیشن کو اپنا ٹھکانا بنالیا تھا، وہ رات کو وہاں سو جاتا تھا اور دن میں باہر گھومتا رہتا۔ اس اسٹیشن میں اس جیسے اور بھی بے گھر لوگ سوتے تھے۔ اکثر شام کو وہ سیونتھ ایوینیو پر بھٹکتا ہوا نظر آتا اس کی منزل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ٹائمز اسکوائر ہوتی جہاں وہ کسی کونے میں خاموش بیٹھا اپنے خیالات میں کھویا رہتا۔ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا تھا نہ ہی کسی سے بات کرتا تھا۔ مگر اسے کوئی نہ کوئی ازخود پیسے یا کھانے کو کچھ دے دیتا تھا۔ اس کے سر کے بال بڑھ کر کندھوں پر جھول رہے ہوتے ڈاڑھی مونچھیں بے ہنگم طریقے سے بڑھ جاتیں۔ چہرے اور جسم پر میل کی تہیں جمی ہوتیں۔ وہ اپنے آپ سے مکمل طور پر بے پروا ہوچکا تھا۔ کبھی کبھار کسی سماجی تنظیم کے لوگ اسے لے جاکر نہلا دھلا کر بال اور ڈاڑھی مونڈھ کر نئے کپڑے پہنا دیتے مگر چند ماہ بعد ہی وہ دوبارہ اسی حالت میں آجاتا۔ اس کے..... سنہری بال اب پوری طرح سفید ہوچکے تھے۔

☆☆☆

ایک روز وہ ٹائمز اسکوائر پر بیٹھا تھا۔ اس روز اسے کیتھی کی یاد بار بار رلا رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر سامنے ایک آدمی پر پڑی جو ہاتھ میں نوٹ پیڈ لیے آس پاس دیکھ کر کچھ اندراج کررہا تھا۔ نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ اٹھ کر اس آدمی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ آدمی اسے دیکھ کر کچھ حیران و پریشان نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک طویل عرصے بعد کسی سے بات کی تھی۔

”کیا آپ لکھنا جانتے ہیں؟“

اس آدمی نے حیرت سے کہا۔ ”ہاں جانتا ہوں۔“

”کیا آپ مجھے ایک خط لکھ دیں گے؟ مجھے لکھنا نہیں آتا اور میں اپنی بیٹی کو خط لکھنا چاہتا ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں..... بے بسی کو دیکھ کر اس شخص کو رحم آگیا۔ اس نے چند صفحات پھاڑ کر الگ کیے اور کہا۔ ”بولو کیا لکھنا ہے۔“

”شکریہ، لکھیے۔ میری پیاری بیٹی کیتھی، جب سے تم گئی ہو میں تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم نے جانے سے پہلے یہ بھی نہ سوچا کہ میں کیا کروں گا تمہارے بغیر کیسے رہ سکوں گا۔ تم تو اتنی خاموشی سے گئیں کہ مجھے پتا ہی نہ چل سکا۔ تم جو اپنے باپ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھیں، پھر بھی اسے اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ میں تمہاری جدائی کیسے برداشت کروں گا۔ تمہیں یاد ہے، تمہاری ماں کے مرنے کے بعد میں نے کتنی مشکلوں سے تمہیں پالا تھا۔ تمہارا خیال رکھا تھا۔ میں تمہارے لیے کھانا بناتا تھا، تمہارے کپڑے دھوتا تھا، روز صبح تیار کر کے تمہیں اسکول چھوڑنے جاتا تھا۔ جب تم ہنستی تھیں تو میں بھی خوش ہوجاتا تھا جب تم اداس ہوتیں تو میں بھی اداس ہوجاتا تھا۔ میں نے تمہارے لیے اپنی زندگی تج دی تھی مگر پھر بھی تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ یاد ہے جب تم نے اسکول سے گریجویشن مکمل کیا تو ہم کتنے خوش تھے۔ ہم نے اس رات ایک ریستوران میں ڈنر کیا تھا۔ تم نے اچھے نمبر لیے تھے تمہیں کولمبیا یونیورسٹی جانے کا شوق تھا۔ مگر میری اتنی گنجائش نہ تھی، پھر میں نے اپنا وہ فلیٹ بیچ دیا جو میرے والدین کی نشانی تھا جس کے کونے کونے میں تمہاری ماں کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس دن تم نے

کہا تھا آپ جیسا پاپا دنیا میں کسی کا نہ ہوگا، پھر بھی تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں تمہارا کتنا خیال رکھتا تھا مگر تم نے سب بھلا دیا اور مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکا ہوں، بوڑھا ہو چکا ہوں، اب مجھ پر ترس کھاؤ، تم میرے پاس آ جاؤ یا مجھے اپنے پاس بلا لو۔ تمہارا بدنصیب پاپا رچرڈ۔"

اس شخص نے خط مکمل کر کے رچرڈ کو دیا تو اس کی پلکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ رچرڈ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور خط کو تہ کر کے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ اس دن کے بعد یہ اس کا معمول بن گیا تھا کہ جب بھی اس کا دل بہت زیادہ گھبراتا تو وہ لوگوں سے خط لکھنے کی درخواست کرتا۔ کوئی منہ پھیر کر نکل جاتا، کوئی جھڑک دیتا کوئی نرمی سے منع کر دیتا اور کوئی ایسا بھی ہوتا جو اسے خط لکھ دیتا۔ مگر وہ سارے خطوط اس کے بیگ میں جمع ہوتے رہتے۔ کوئی بھی خط کبھی حوالۂ ڈاک نہ کیا گیا۔

☆☆☆

اس نے آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر نمی صاف کی تو وہ لمحۂ حاضر میں آ گیا۔ ماضی کے دریچے بند ہو گئے۔ سامنے ٹائمز اسکوائر پر وہی بھیڑ تھی۔ اب اس میں اور اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً اس کا دل گھبرانے لگا ساتھ ہی درد کی ٹیسیں بھی اور تیز اٹھنے لگیں۔ اس نے دیکھا سامنے سے تین لوگ باتیں کرتے آ رہے تھے۔ چہرے سے غیر ملکی لگ رہے تھے شاید ایشیا کے کسی ملک سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک قدرے پستہ قد اور نحنی سے جسم کا مالک تھا پتلی پتلی مونچھیں تھیں اور سر پر عجیب سی رنگین ٹوپی پہنے تھا۔ دوسرا اور میانے قد کا شخص تھا، کلین شیو تھا اور چہرے سے ایک مہربان انسان نظر آ رہا تھا۔ تیسرا دراز قد اور بھاری جسم کا کلین شیو شخص تھا۔ وہ ہنستے بولتے چلے آ رہے تھے۔ رچرڈ اچانک ان کے سامنے پہنچا تو وہ قدرے خوفزدہ نظر آنے لگے اور کنی کاٹ کر نکلنے کی کوشش کی تو رچرڈ نے مہربان چہرے والے کے سامنے آتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ لکھ سکتے ہیں؟" دراز قد شخص نے مہربان چہرے والے سے کچھ کہا تو اس نے ایک بار پھر رخ بدل کر نکلنے کی کوشش کی۔ اب رچرڈ نے مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا اور پھر اپنا سوال دہرایا۔ تب اس نے رچرڈ کو خوفزدہ انداز میں دیکھا، اس کی آنکھوں میں جھانکا اور معاً کانپ سا گیا۔ اس کے چہرے سے خوف کے بادل چھٹ گئے اور نرمی و ہمدردی کے رنگ پھیلتے چلے گئے۔ رچرڈ کی ویران آنکھوں نے اس تک جو خاموش پیغام پہنچایا وہ شاید ہزاروں الفاظ بھی اس طرح نہیں پہنچا سکتے تھے۔ وہ رک گیا۔ چونکہ وہ لوگ راستے میں کھڑے تھے اس لیے اس نے سب کو ایک جانب دیوار کے سائے میں آنے کا کہا اور وہاں بیٹھ کر بولا۔ "ہاں میں لکھ سکتا ہوں۔"

رچرڈ نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنی بیٹی کو خط لکھنا ہے، لیکن میں لکھنا نہیں جانتا۔ میری مدد کرو خدا کی رحمت تم پر نازل ہوگی۔"

اس نے اثبات میں جواب دے کر کاغذ اور پین مانگا۔ رچرڈ نے نفی میں سر ہلایا، تو اس نے اپنے بیگ سے ایک ڈائری نکال کر صفحات پھاڑے اور کہا۔ "اب بتاؤ کس کو اور کیا لکھنا ہے۔"

رچرڈ نے اسے لکھوانا شروع کیا۔ کم و بیش وہی مضمون جو وہ ہمیشہ لکھواتا تھا۔ جب خط ختم ہوا تو ان تینوں کے تاثرات یکسر بدل گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں رچرڈ کے لیے ہمدردی اور رحم کے جذبات لہرا رہے تھے۔ خط لکھ کر مہربان چہرے والے نے رچرڈ کو دیا جسے اس نے تہ کر کے اپنے تھیلے میں دیگر پرانے خطوط کے ساتھ رکھ لیا۔ مہربان نے پوچھا۔ "اس کو پوسٹ نہیں کرنا؟" رچرڈ خاموش رہا تو اس نے دوبارہ پوچھا۔ "کیا اس کا ایڈریس ہے؟"

مگر رچرڈ اب بھی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے پھر پوچھا۔ "تمہاری بیٹی کس اسٹیٹ میں رہتی ہے؟"

آج سے پہلے کسی نے اس سے ایسے سوالات نہیں کیے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے اٹھ کر اپنا بیگ کاندھے پر لادا اور رندھی ہوئی آواز میں یہ کہتا ہوا چل دیا۔ "وہ مر گئی ہے۔"

کچھ دور جا کر وہ رک گیا۔ اب سینے کے درد میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر ان لوگوں کی طرف دیکھا تو ایک حیرتناک منظر اس کا منتظر تھا۔ اس نے دیکھا کہ جس مہربان چہرے والے نے اس کا خط لکھا تھا وہ زار و قطار رو رہا ہے اور اس کے ساتھی اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے اسے تسلیاں دے رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے جنہوں نے سامنے کا منظر دھندلا دیا اور ایک بار پھر ماضی کا دریچہ کھل گیا۔

☆☆☆

کیتھی سات بجے تک گھر پہنچ جاتی تھی مگر اس روز آٹھ بج گئے پھر نو بج گئے مگر اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ پریشان ہو کر باہر نکل آیا اس کے دفتر فون کیا تو وہ بند ہو چکا تھا۔ کیتھی کی زیادہ دوستیاں بھی نہیں تھیں، معدودے چند دوست تھیں

اس نے ان سے بھی معلوم کیا تو انہوں نے بھی انکار کیا کہ اس دن کیتھی ان سے نہیں ملی۔ اس نے پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ درج کروائی۔ پولیس آفیسر نے کہا۔ "پریشان نہ ہو... جوان لڑکی ہے کہیں کسی کے ساتھ گھومنے نکل گئی ہوگی۔ کل تک انتظار کر لو اگر وہ نہیں آئے تو پھر ہم سے رابطہ کرنا۔" وہ رات رچرڈ نے کانٹوں پر گزاری۔ اسے کسی کل چین نہ تھا۔ صبح ہو گئی مگر کیتھی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہ پھر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں رپورٹ لکھ کر اس سے کیتھی کی تصویر لے لی گئی۔

وہ دن بھر بھٹکتا پھرتا اس نے کیتھی کے دفتر سے بھی رابطہ کیا۔ دفتر سے پتا چلا کیتھی کل شام حسب معمول اپنے وقت پر چھٹی کر کے اٹھ گئی تھی اور آج ڈیوٹی پر نہیں پہنچی۔ اس کی پریشانی سوا ہو گئی اب کہاں جائے، کیا کرے، اسے کہاں ڈھونڈے؟ وہ تھکے قدموں سے گھر پہنچا تو اسے اطلاع ملی کہ پولیس اسٹیشن سے اس کے لیے بلاوا آیا ہے۔ وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا۔ اسے ایک سنجیدہ صورت آفیسر سے ملایا گیا۔ "مسٹر رچرڈ کیتھی مل گئی ہے۔"

اس کو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ "تھینکس گاڈ کہاں سے ملی وہ کہاں ہے؟"

"ایزی مسٹر رچرڈ آپ کو میرے ساتھ اسپتال چلنا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

"اسپتال، کیوں وہ خیریت سے تو ہے نا؟ اسے کوئی چوٹ ووٹ تو نہیں لگی؟"

"رچرڈ آپ کو اس کی شناخت کے لیے میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کیا؟" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"سر آپ کیا کہہ رہے ہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ کوئی اور ہوگی میری کیتھی نہیں ہوگی۔"

"آپ میرے ساتھ چلیں اور دیکھ لیں۔"

وہ دھڑکتے دل اور لرزیدہ قدموں سے مردہ خانے پہنچا۔ آفیسر نے ایک خانہ کھینچ کر اسے قریب بلایا۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے، اسے قدم اٹھانا محال ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے قریب پہنچا اور ڈرتے ڈرتے خانے میں نظر ڈالی اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں سے ایک دلخراش چیخ بلند ہوئی۔ "کیتھی ی ی......" اور وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر گر پڑا۔

کیتھی کو دوسری عورتوں کی طرح اغوا کر کے زیادتی کے بعد بڑے بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

اس کی بے خبری کا وہ زمانہ تین چار ماہ پر محیط تھا اس دوران وہ ایک ذہنی امراض کے اسپتال میں رہا۔ کیتھی کی تدفین کس نے کی، کہاں کی، اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ جب اسے اسپتال سے چھٹی ملی تو ذہنی طور پر کافی حد تک ٹھیک ہو چکا تھا، مگر اس کا دل اس دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپارٹمنٹ کی طرف بھی نہیں گیا۔ دن بھر بھٹکنے کے بعد راتیں وہ سب وے اسٹیشن میں گزار لیتا تھا۔ وہ بھیک نہیں مانگتا تھا مگر اسے کبھی کوئی پیسے دے جاتا تھا کبھی کوئی کھانے کی کوئی چیز دے جاتا تھا یوں زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ ایک روز ایک جگہ ہجوم دیکھ کر وہ بھی قریب گیا تو پتا چلا کہ برونکس میں عورتوں اور لڑکیوں کے قاتل پکڑے گئے، یہ تین لوگوں کا گروہ تھا جس میں دو گورے اور ایک کالا تھا۔ یہ لوگ لڑکیوں کو اغوا کر کے وین میں ڈال کر ایک خفیہ مقام پر لے جاتے تھے جہاں وہ اجتماعی زیادتی کے بعد قتل کر دی جاتی تھیں پھر اسی وین میں ان کی لاشوں کو کسی سنسان سڑک یا گلی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر یہ لوگ لاش سمیت پکڑ لیے گئے تھے۔ اب ان پر مقدمہ چل رہا تھا۔

اس دن اسے..... سکون محسوس ہوا۔ "کیتھی دیکھو تمہارے قاتل پکڑے گئے۔"

☆☆☆

اچانک سینے میں درد کی اٹھنے والی ٹیس اسے پھر حال میں لے آئی اس نے سینے کو دبا کر درد کم کرنا چاہا مگر وہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ اب سیونتھ ایونیو کے قریب پہنچ چکا تھا کہ درد نے اسے بے حال کر دیا۔ رچرڈ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ آس پاس موجود لوگوں میں سے کسی نے ایمبولینس کو کال کر دی۔ اس کی بصارت زائل ہوتی جا رہی تھی، سانسیں اٹک رہی تھیں۔ نبضیں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے بیگ کی زپ کھولی اور تمام خطوط نکال کر انہیں آنکھوں سے لگایا چوما اور سرسراتی آواز میں کہا۔ "کیتھی میں آ رہا ہوں میری پیاری میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ آہ میری سزا ختم ہوئی۔ کیتھی ی ی...."

اسے ہچکی سی آئی اور سانس کی ڈور ٹوٹ گئی۔ اس کا ہاتھ ایک جھٹکے سے گرا اور بہت سے پھٹے پرانے کاغذ جو اس کے ہاتھ میں دبے تھے نکل کر سڑک پر اڑنے لگے۔ جب تک ایمبولینس پہنچی تب تک اس کا رابطہ زندگی سے ٹوٹ چکا تھا۔

قسط نمبر: 14

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

قت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے ۔کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا ہے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے "علی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا میکڈ ایلین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقتِ رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی لفنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد والا سا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا تھا۔ یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے اینگلٹن میں واقع "سرکل اے" نامی ایک اسٹور پر جزوقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے "سرکل اے" میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کوفی نکس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ "وٹی لاؤنج" نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل نشیں مہ جبیں نے علی کے دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات وٹی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس مار ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی...... "مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب کبھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کر لینا۔" اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بہ گاہے مڈھ بھیڑ ہوتی رہی۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ وٹی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شارو اسٹیلے اسٹورز سے گروسری خریدنے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیبلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر پیبلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔ علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیبلو کو ادھ موا کر دیا۔ آئندہ روز پیبلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈائے اسپورٹس کار میں لیک جیکسن سے ہوسٹن پہنچ گیا۔ پھر سرخ ہنڈائے اسپورٹس میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔ اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے علی کو پیبلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال...... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی...... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک باروخ لاڈ اور یما ایبل بام سے علی کی ملاقات بھی کروا دی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی "اسکل اینڈ بونز" سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے "اسکل اینڈ بونز" کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان)۔۔۔ نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی

مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ اس صورتِ حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے تیاری کی اور ہوسٹن سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ائرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنا دیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے وزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دیں۔ علی کو ایک رات خواب میں ڈیلفینا نظر آئی۔ اس نے علی کو دھمکی دی کہ وہ کہیں بھی چلا جائے اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کر کے علی کی والدہ کو قتل کر دیا۔ علی نے تہیہ کر لیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔ علی نے تمام حقیقت بینا کو بھی بتا دی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی۔ علی کو اس کی رہائش گاہ کے پتے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔ علی نے نادر شاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادر شاہ کو اغوا کر کے اس سے سچ اگلوایا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادر شاہ کو اغوا کرا لیا۔ تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کر کے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادر شاہ اور اغوا کنندگان پولیس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر بنگلا چھوڑ دیا اور بینا کے ہمراہ اس کے فلیٹ پر آ گیا۔ علی نے بنگلے پر جمشید کو چھوڑا تھا اور خاص نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی اپنی ماں کے قتل کا سراغ لگاتے خان ہاؤس پہنچ گیا۔ ابھی بات چیت جاری تھی کہ جمشید کا فون آ گیا۔ اس کی دی اطلاع پر علی پریشان ہو گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جمشید کی یکے بعد دیگرے تین مس کالز نے مجھے اس سے رابطہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے میری کال ریسیو کی تو اگلے ہی لمحے میری سماعت پر ایک زوردار دھماکا ہوا اور میری کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والے ابتدائی جملے نے میرے دماغ میں کھلبلی مچا دی تھی۔ جمشید نے نہایت ہی پریشانی کے عالم میں مجھے بتایا تھا۔

"سر! غضب ہو گیا......" اس کے لہجے سے گہری فکرمندی جھلکتی تھی۔ "تھوڑی دیر پہلے وہ غیر ملکی میڈم یہاں آئی تھی۔ اب کی بار وہ اپنے ساتھ دو خطرناک کتے بھی لائی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان کتوں کی مدد سے آپ کو تلاش کرنا چاہتی ہے...... ان لوگوں نے واش روم کے اندر سے آپ کے کپڑے اٹھا لیے ہیں۔"

اگر جمشید کو یقین تھا تو شک مجھے بھی نہیں تھا۔ غیر ملکی میڈم سے اس کی مراد ڈیلفینا تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ ہسپانوی دوشیزہ میری "چاہت" میں کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔ وہ ایسی ہی سرپھری اور جنونی مزاج والی تھی۔ مجھ سے زیادہ اسے اور کون جانتا تھا......

جمشید کی اطلاع اگرچہ خاصی سنسنی خیز تھی اور اس نے مجھے چکرا کر بھی رکھ دیا تھا لیکن میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی موجودہ پوزیشن کو فراموش نہیں کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ان لمحات میں، میں کہاں اور کس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میرے چہرے پر نمودار ہونے والی تفکر کی ہلکی سی پرچھائیں بھی جنید خان کو میری طرف سے کسی شبہے میں ڈال سکتی تھی اور میں نفسیات کا طالب علم تھا لہٰذا میں کسی بھی قیمت پر جنید خان کو ایسا کوئی بھی موقع فراہم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جمشید کی اطلاع نے میرے ذہن کو ایک دھچکا تو پہنچایا تھا مگر یہ لمحاتی ذہنی بحران تھا۔ چشم زدن میں، میں نے اپنی اندرونی کیفیات پر قابو پا لیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے...... میں اس وقت ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد تمہیں کال کرتا ہوں۔"

"اوکے سر۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اپنا خیال رکھیے گا۔"

"ضرور!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ "تم پریشان نہیں ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے بعد میں نے لائن کاٹ دی اور جنید خان کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"سوری خان صاحب! ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا تھا۔"

"خیریت......" اس نے پوچھا۔ "مجھے بتائیں، کیا پرابلم ہے؟"

"پرابلم یہاں نہیں، ادھر پنڈی، اسلام آباد میں ہے۔" میں نے سرسری انداز میں بتایا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ دو افراد میں معمولی سا جھگڑا ہو گیا ہے۔ دونوں ہی میرے قریبی رشتے دار ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ شادی بیاہ کے مواقع پر خاندان میں اس قسم کے ایشوز چلتے

ہی رہتے ہیں۔“

یہ بات میں نے جنید خان کو ملاقات کی ابتدا ہی میں بتادی تھی کہ میں شادی کی ایک تقریب میں شرکت کی غرض سے امریکا سے پاکستان آیا ہوا ہوں۔ وہ ایک مطمئن سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔ یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ پھر مجھ سے پوچھا۔ ”آپ اسلام آباد کے کس علاقے میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“

میں نے جنید خان سے ملاقات کی سوچ کے ساتھ ہی گوگل بادشاہ کے دربار میں حاضری دے کر وہاں سے اچھا خاصا فیض اٹھا لیا تھا لہٰذا جنید خان کے ہر ضروری سوال کا جواب میرے پاس موجود تھا۔ اس کے استفسار کے جواب میں، میں نے بتایا۔

”میں نے دراصل راولپنڈی کے علاقے ”لالہ زار“ میں قیام کیا ہوا ہے۔ میں لڑکے والوں کی طرف سے اس شادی میں شریک ہوا تھا۔ لڑکی کا تعلق اسلام آباد سے ہے اس لیے پنڈی، اسلام آباد کے چکر لگتے رہے ہیں۔“

”ایک ہی بات ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اوہ، ایک چیز تو میں آپ سے معلوم کرنا بھول ہی گیا...... آپ کا روزہ ہے کیا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”ماشاءاللہ!“ وہ توصیفی انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہمارے پروڈکشن ہاؤس میں افطاری کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ آج آپ روزہ ادھر ہی کھولیے گا۔“

میں جن خیالات کے ساتھ ”خان ہاؤس“ کی طرف آیا تھا ان کے پیش نظر جنید خان کی یہ پیشکش خاصی پُرکشش تھی۔ افطار تک کیا، میں تو رات بھر یہاں رکنے کے لیے بھی تیار تھا مگر جمشید کی سنسنی خیز اطلاع نے میری منصوبہ بندی کا ستیاناس مار کر رکھ دیا تھا۔ اب مجھے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا تاکہ وہ شکاری حسینہ ڈیلفینا میرے پیچھے یہاں تک نہ پہنچ جائے لیکن...... جنید خان کے ساتھ اس اہم میٹنگ کو منطقی انجام تک پہنچانا بھی ضروری تھا۔ یکایک اٹھ کر میں اسے کسی شک کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا لہٰذا میں نے نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں کہا۔

”آئی ایم سوری خان صاحب! آج کی افطاری کا پروگرام عظیم کے گھر پر پہلے سے طے ہے۔ آپ کے ساتھ کل یا پھر کسی اور دن میں ضرور افطار کروں گا۔ تھوڑی دیر میں عظیم مجھے لینے آجائے گا اس لیے ہمیں اس کاروبار میٹنگ کے ابتدائی مراحل کو نمٹا لینا چاہیے۔“

”بالکل...... ضرور!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ پوچھا۔ ”ہم کہاں پر تھے؟“

میں نے کہا۔ ”خان صاحب! میں ایک چھوٹا سا میسیج لوں۔ پھر پلٹ کر دیکھتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے تھے......“

اس کے بعد میں نے عظیم کے نمبر پر یہ ٹیکسٹ کیا۔ ”برو! تم جہاں بھی ہو، ٹھیک ساڑھے چار بجے تمہیں گاڑی میں بیٹھ کر ”خان ہاؤس“ کے سامنے پہنچنا ہے اپنے ساتھ پرفیوم کی ایک بوتل بھی لیتے آنا۔ جب تم یہاں آجاؤ تو مجھے اطلاعاً ایک ٹیکسٹ کر دینا۔ میں خود ہی باہر آجاؤں گا۔ جب تک میں بنگلے سے برآمد نہیں ہوں، تمہیں تحمل سے میرا انتظار کرنا ہوگا۔“

فوراً ہی اس کا ریپلائی میسج آگیا۔ ”اوکے برو، ڈن! مگر تمہارا تو وہاں رات کو رکنے کا پروگرام تھا۔ اتنی جلدی واپسی...... سب خیریت تو ہے نا؟“

”خیریت ہوتی تو میں تمہیں کیوں بلاتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جبکہ میں تمہیں چند روز کے لیے خود سے دور رہنے کے لیے کہہ چکا ہوں۔“

”تمہاری اسی ہدایت کے پیش نظر تو میں یہ پوچھ رہا ہوں۔ اگر تم کہو تو میں ابھی آجاتا ہوں؟“

”آجاؤ...... مگر اسٹینڈ بائی رہنا۔“ میں نے ریپلائی کیا۔ ”بس، یہاں پہنچ کر مجھے اپنی آمد کی اطلاع دے دینا یا اگر اپنے گرد و پیش میں کسی قسم کی نقل و حرکت دیکھو تو مجھے مس کال کر دینا۔ اغلب امکان اس بات کا ہے کہ پولیس میری تلاش میں ”خان ہاؤس“ کی طرف آسکتی ہے۔“

”اوہ...... میں سمجھ گیا۔“ عظیم کا ریپلائی موصول ہوا۔

میں نے سیل فون کو ایک طرف رکھا اور جنید خان کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”خان صاحب! میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ ایک سو اسی سوڈ والا یہ طویل سیریل کتنے عرصے میں تیار ہوجائے گا؟“

”بالکل، آپ نے مجھ سے یہی سوال کیا تھا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھیں جناب! ایک محتاط اندازے کے مطابق اس سیریل کی تیاری میں پانچ ماہ لگ جائیں گے جن میں چار ماہ تو خالصتاً شوٹنگ کے ہیں اور ایک مہینا پوسٹ پروڈکشن کا رکھ لیں۔ میں نے آپ کو جو مدت بتائی ہے اس میں ہفتہ، دس دن کی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔“

”اتنا مارجین تو رکھنا ہی پڑتا ہے خان صاحب۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”یعنی اگر میں پانچ ماہ کے لیے پانچ کروڑ انویسٹ کروں تو اس سے میری خواہش کی تکمیل کے علاوہ مجھے ایک کروڑ روپے کی آمدنی بھی ہوگی...... بیس لاکھ روپے ماہانہ...... بیس ہزار ڈالرز پر ...... اٹس ناٹ بیڈ!“

”یہ تو وہی بات ہوئی جناب کہ...... آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔“ وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مطلب یہ کہ آپ کے مرحوم والد کا خواب بھی پورا ہوجائے گا اور آپ اس پروجیکٹ میں ایک ہینڈسم اماؤنٹ بھی کمالیں گے۔“

”خان صاحب! میں اس پروجیکٹ میں پانچ لاکھ ڈالرز کی سرمایہ کاری کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مگر اس سلسلے میں میری تین اہم شرائط ہوں گی۔“

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ ”جی بتائیں، آپ کی کیا شرائط ہیں؟“

”نمبر ایک!“ میں نے کہا۔ ”میں اتنی بھاری رقم آپ کو یکمشت ادا نہیں کر پاؤں گا۔“

اس نوعیت کی باتیں میں ایک خاص مقصد سے کر رہا تھا تاکہ اسے یہی محسوس ہو کہ...... اس پروجیکٹ کو لے کر میں بہت سنجیدہ ہوں۔ اس نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔

”جناب! یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ ففٹی پرسنٹ پیمنٹ پہلے کر دیں گے تو ہمارا کام چل جائے گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمیں بڑے آرٹسٹوں کی ڈیٹس فکس کرتے وقت انہیں ہاف پیمنٹ دینا ہوتی ہے۔“

”نمبر دو......“ میں نے شرائط کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ابتدائی پیمنٹ بھی میں اگست کے پہلے ہفتے میں کر پاؤں گا۔“ میرے انداز میں خالص کاروباری پن جھلکتا تھا۔

”یہ بھی کوئی ایشو نہیں ہے۔“ وہ اطمینان بھرے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں ویسے بھی جولائی کے اینڈ میں شفٹنگ کرنے والا ہوں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے مجھے پیمنٹ کر سکتے ہیں۔“

”شفٹنگ!“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں خان صاحب؟“

”یہ بنگلا، اس وقت آپ جس میں بیٹھے ہوئے ہیں یہ میں نے کرایے پر حاصل کر رکھا ہے جس کا میں ہر ماہ ایک لاکھ روپے کرایہ ادا کرتا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس بنگلے کی مالک نے اسے فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے لہٰذا مجھے جولائی کے اختتام تک یہ بنگلا خالی کرنا ہوگا۔“

عظیم کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ ”خان ہاؤس“ کسی کے ڈی خان کی ملکیت ہے اور جنید خان کو اس نے یہ بنگلا کرایے پر دے رکھا ہے لیکن جنید خان بتا رہا تھا کہ اس بنگلے کی مالک کوئی عورت ہے۔ میں نے چہرے پر کسی قسم کی الجھن یا حیرت کو ظاہر کیے بغیر تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

”خان صاحب! کیا یہ بنگلا کسی خاتون کی ملکیت ہے؟“

”جی بالکل!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اصل میں اس بنگلے کا مالک خلق داد خان ہے جو ”کے ڈی خان“ کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن یہ بنگلا چونکہ اس نے اپنی بیگم سلطانہ خان کے نام کروا رکھا ہے لہٰذا سلطانہ خان ہی بنگلے کی قانونی مالک ہیں اور وہ ایک مجبوری میں اس بنگلے کو فروخت کر رہی ہیں۔ میں ان کی مجبوری کو سمجھتا ہوں اس لیے میں نے کوئی حیل و حجت نہیں کی اور فوراً ہی اپنے ”پروڈکشن ہاؤس“ کے لیے ایک اچھا انتظام کرلیا ہے۔ آپ والے سیریل کی شوٹنگ کا آغاز میں اسی بنگلے سے کروں گا۔ نیا سیریل، نیا پروڈکشن ہاؤس......“

”خان صاحب! یہ سب آپ کے پروفیشنل معاملات ہیں۔ آپ ہی انہیں بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تو صرف اتنا چاہوں گا کہ میرے سیریل کے سلسلے میں آپ تمام متعلقہ افراد کا معاوضہ ان کا پسینا خشک ہونے سے پہلے ادا کردیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں؟“

میں نے آخری جملہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”اللہ کے فضل و کرم سے ”گلیکسی پروڈکشنز“ نے کبھی کسی کا ایک روپیا نہیں کھایا لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ دنیا میں ہر قسم کے انسان بستے ہیں۔ ہماری انڈسٹری میں بھی بعض ایسے فنکار ہیں کہ اگر انہیں ایڈوانس میں کچھ رقم دے دی جائے تو پھر وہ گدھے کے سینگوں کی طرح منظر سے غائب ہوجاتے ہیں۔ اب ان کے پیچھے دن رات کون چکر کاٹے......“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس لیے ہر شخص کو اس کے مزاج اور خصلت کے مطابق ڈیل کرنا پڑتا ہے۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔

"آپ نے اپنی تیسری شرط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا......!"

"نمبر تین!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "خان صاحب! یہ آخری اور سب سے اہم شرط ہے۔ اس وقت ہمارے درمیان ایک طویل سیریل کے سلسلے میں جو بھی گفتگو اور منصوبہ بندی ہو رہی ہے وہ ہم دونوں کے بیچ ہی میں رہے گی۔ کوئی تیسرا شخص اس پروجیکٹ کے بارے میں کچھ نہیں جان پائے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ پروجیکٹ میری زندگی کا ایک نہایت ہی قیمتی راز ہے اور آپ کو اس راز کی حفاظت کرنا ہوگی، کم ازکم اس وقت تک جب تک یہ سیریل آن ایئر نہیں ہو جاتا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی اس خواہش کی تکمیل کی جائے گی اور یہ جنید خان کا وعدہ ہے......" اس نے اپنا سینہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اور میں نے ہمیشہ اپنی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا پاس کیا ہے۔ وعدہ نبھاتے ہوئے میں نے کبھی سود وزیاں کا حساب نہیں کیا لیکن کیا میں آپ سے ایک سوال کر سکتا ہوں......؟"

بات کے اختتام پر اس نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "ضرور خان صاحب۔ آپ ایک نہیں، دس سوال کریں۔"

اس نے پوچھا۔ "آپ اپنے اس پروجیکٹ کو اتنا خفیہ کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟"

"آپ میرا مذاق تو نہیں اڑائیں گے......" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

"نہیں جناب...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"آپ مجھے توہم پرست کہیں، دقیانوسی سمجھیں یا جو جی چاہے، میرے بارے میں سوچیں لیکن میں آپ سے وہی کہوں گا جو حقیقت ہے، جو میری زندگی کا تجربہ ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نظر پر بہت یقین رکھتا ہوں۔"

"نظر پر تو میرا بھی یقین ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اچھی، بری نظر تو ہوتی ہے جناب......!"

"خان صاحب! میری زندگی کا یہ تجربہ ہے کہ اگر میں اپنے کسی منصوبے کو اس کی تکمیل سے پہلے عام کر دوں تو میرے کام کو نظر لگ جاتی ہے۔" میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے میں، میں نے کافی نقصان بھی اٹھایا ہے لہٰذا میں نے اپنی یہ عادت بنالی ہے کہ جب تک میرا کوئی پروجیکٹ مکمل نہیں ہو جاتا، میں کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔ آپ سے بھی میں نے اسی لیے استدعا کی ہے کہ جب تک یہ سیریل آن ایئر نہیں ہو جاتا، آپ اس کی تشہیر نہیں کریں گے۔"

"میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ اسی لمحے میرے سیل فون پر میسج ٹون بجی۔ میں نے میسیج کو چیک کیا۔ عظیم نے ٹیکسٹ کیا تھا۔ "بروا میں پہنچ گیا۔"

میں نے اسے "اوکے" کا ریپلائی کیا پھر جنید خان کی جانب متوجہ ہوا۔

"آپ بے فکر ہو جائیں۔" وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی خواہش کے احترام میں کسی کو کانوں کان یہ خبر نہیں لگنے دوں گا کہ اس پروجیکٹ کے فنانسر آپ ہیں۔ میں اسے سیلف پروڈکشن ہی ظاہر کروں گا۔ ہاں، البتہ بیگ صاحب کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا پڑے گا لیکن میں انہیں سمجھا دوں گا کہ وہ کسی سے آپ کا ذکر نہ کریں۔ بیگ صاحب نہایت ہی شائستہ اور بردبار انسان ہیں۔ وہ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میری بات مان لیں گے۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ میرا ڈراما وراما پروڈیوس کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو اپنے دشمن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے "خان ہاؤس" میں ایک خاص پلاننگ کے ساتھ گھسا تھا۔ اس وقت تک حاصل شدہ معلومات سے ہم نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ چنگیز خان کے ساتھ کوئی گہرا تعلق ہوگا لیکن جنید خان سے ہونے والی اس ملاقات نے کئی حقائق سے پردہ ہٹا دیا تھا۔ جیسے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ جنید خان اور کے ڈی خان میں کوئی گہری دوستی نہیں تھی۔ وہ مالک بنگلا اور کرایے دار کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اگر ان کے بیچ کوئی مضبوط سمبندھ ہوتا تو سلطانہ خان، جنید خان سے بنگلا خالی کرنے کے لیے ہرگز نہ کہتیں۔ ویسے میری ماہرانہ رائے میں جنید خان ایک معقول شخص تھا۔ میں نے اسی لمحے یہ طے کر لیا تھا کہ کسی مناسب موقع پر اسے حقیقت حال سے آگاہ کر دوں گا۔ اسے زیادہ عرصے تک بے وقوف بنانے کا میرا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"یاسر صاحب!" وہ مجھے میرے فرضی نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھ پر بھروسا کریں۔ میں آپ کو کسی قسم کی شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔ آج

سے ہم دوست ہیں۔“

بات پوری کرتے ہی اس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”پکی دوستی خان صاحب۔ اور آیندہ ہم باہر کسی پرسکون مقام پر ملاقات کیا کریں گے۔“ میں نے کہا۔ ”جہاں ہم دونوں کے سوا ہمارا جاننے والا اور کوئی موجود نہیں ہوگا۔ ہم اپنے معاملات کو خفیہ یعنی زمانے بھر کی نظروں سے چھپا کر رکھیں گے۔“

”ڈن......!“ وہ پُرجوش انداز میں میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

اسی لمحے میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جنید خان نے میرا ہاتھ چھوڑ کر ریسیور اٹھالیا پھر کھردرے لہجے میں بولا۔ ”میں نے کہا بھی تھا کہ ایک ضروری میٹنگ میں بیٹھا ہوں......“

یقیناً دوسری جانب آپریٹر تھی۔ میں نے جنید خان کے کمرے کی طرف آتے ہوئے ایک طرح دار حسینہ کو ریسپشن پر کمر سیدھی رکھے براجمان دیکھا تھا۔ آپریٹر یا ریسپشنسٹ نے ادھر سے جو بھی وضاحت پیش کی اس کے نتیجے میں جنید خان نے خاصے معتدل انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے، شاہ جی سے میری بات کراؤ۔“

”شاہ جی......“ کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا اور میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تاہم اپنے چہرے کے تاثرات سے میں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ جنید خان کی زبان سے ادا ہونے والے نام نے مجھے اس کی جانب متوجہ کردیا ہے۔ میں اپنی سماعت کو جنید خان پر مرکوز کرتے ہوئے سیل فون کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

”میں چند منٹ بعد بنگلے سے نکل آؤں گا۔“ میں نے عظیم کو ٹیکسٹ کیا۔ ”تم پرفیوم کی بوتل ساتھ لائے ہونا؟“

”شاہ جی! آپ کہاں غائب ہوگئے تھے؟“ جنید خان کی خفگی بھری آواز میری سماعت تک پہنچی۔ ”آپ کی وجہ سے ہمارا بہت نقصان ہوا ہے۔ بنگلے کے چوکیدار نے ہمارے یونٹ کو اندر داخل نہیں ہونے دیا اور آپ کا فون مسلسل آف آرہا تھا......“

”پرفیوم کی بوتل لایا ہوں اور گاڑی میں ایئر فریشنر بھی موجود ہے۔“ عظیم کا ریپلائی موصول ہوا۔ ”اگر کہو تو دوسری بوتل بھی مہیا کرسکتا ہوں۔“

”فی الحال مجھے اس بوتل کی ضرورت نہیں۔“ میں نے عظیم کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ ”تم گاڑی کی اندرونی فضا کو ایئر فریشنر سے مہکا دو۔“

میرے اور عظیم کے بیچ ٹیکسٹ میسجنگ کا سلسلہ جاری تھا اور میں نے اس کے ساتھ جنید خان پر بھی توجہ مبذول رکھی تھی۔

”شاہ جی! شکر کریں کہ پولیس والوں سے آپ کی جان چھوٹ گئی۔“ جنید خان نے دوسری جانب موجود نادر شاہ عرف شاہ جی کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اب اس کے لفڑوں سے دور رہیے گا۔ مجھے آپ کی اشد ضرورت ہے۔ آپ میرے لیے بہت اہم ہیں اس لیے آپ اپنا خیال رکھیں۔“

”گاڑی کو تو میں خوشبو سے ایسا معطر کردوں گا کہ تمہارا دل خوش ہوجائے گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہ کیا چکر ہے؟“

”شاہ جی! میری طرف آنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اطمینان سے اپنے گھر پر آرام کریں۔ کل کسی وقت آپ سے ملاقات ہوگی۔“ جنید خان نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”اور ہاں...... کل صبح آپ کو اس بنگلے پر موجود ہونا چاہیے۔ جب میرا یونٹ وہاں پہنچے تو آپ ان لوگوں کا استقبال کریں گے اور انہیں ہر نوعیت کی آسانیاں بھی فراہم کریں گے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا!“

”سارے چکر تمہیں بتا دوں گا۔“ میں نے عظیم کو ٹیکسٹ ریپلائی کیا۔ ”بس چند منٹ انتظار کرو اور اس انتظار کے دوران میں اپنی آنکھوں اور کانوں کو حساس اینٹینا ز بنا دو جو تمہارے اردگرد میں ہونے والی معمولی سے معمولی جنبش کو بھی نوٹ کرلیں۔“

”او کے۔ خدا حافظ۔“ جنید خان نے نادر شاہ سے ٹیلی فونک رابطہ موقوف کرتے ہوئے کہا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”عجیب لوگ ہیں......“

”کیا ہوگیا خان صاحب؟“ میں نے استفسار کیا۔

اگرچہ نادر شاہ کی رہائی نے مجھے خاصا بے چین کردیا تھا لیکن میں نے اپنی اندرونی کیفیات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ جنید خان نے میرے سوال کے جواب میں جو کچھ بتایا وہ میرے لیے بڑا سنسنی خیز اور چونکا دینے والا تھا۔

”اسٹیٹ ایجنٹس اور بروکرز کے بارے میں بزرگ صحیح کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے مفاد کو ہر چیز سے زیادہ مقدم جانتے ہیں اور اپنی بوٹی کے لیے دوسرے کا بکرا حلال کرنے میں ذرا آسرا نہیں کرتے۔“ جنید خان نے بیزاری بھرے انداز میں بتایا۔ ”یہ بھی ایک اسٹیٹ ایجنٹ نادر شاہ

ی تھا۔ شاہ جی کو کسی چکر میں پولیس نے اٹھالیا تھا۔ ابھی ی دیر پہلے بے چارے کی جان چھوٹی ہے۔ اس کے ی کی وجہ سے میری شوٹنگ نہیں ہوسکی۔ اب کل صبح میں کو دوبارہ ادھر بھیجوں گا۔ ایک ٹیلی فلم کے چند ان ڈور کی ریکارڈنگ باقی ہے اور یہ کام اگلے دو دن میں ہر ت مجھے مکمل کرانا ہے۔“

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”خان صاحب! بروکر کا آپ کی شوٹنگ سے کیا تعلق؟ کیا یہ اسٹیٹ ٹ لوکیشنز کرائے پر دیتا ہے؟“

میں نے اپنی معلومات کی روشنی میں اس سے سوال کیا اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”شاہ جی ایسے دھندے بھی کرتا ہے۔ اس کے پاس حت ہونے کے لیے جو بنگلے آتے ہیں یہ انہیں چند دنوں لیے کرائے پر اٹھا کر کچھ پیسے کما لیتا ہے لیکن ابھی میں جس بنگلے کا ذکر کیا ہے وہ میں نے شاہ جی کی بروکری میں کروڑ کا خریدا ہے اور میں اپنا پروڈکشن ہاؤس اسی بنگلے شفٹ کرنے والا ہوں۔“

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس اطلاع پر وہ ایسے اچھل رہ جاتا جیسے اسے گرم توے پر بٹھا دیا گیا ہو لیکن میں نے یا کوئی بھی ردعمل ظاہر نہیں کیا جو جنید خان کے لیے چونکا ینے والا ہو۔ اگرچہ اس کی زبان سے نادر شاہ کے مذموم رنامے کا ذکر سن کر میرے تن بدن میں آگ سی بھڑک ی تھی تاہم میں نے بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

”مبارک ہو خان صاحب! میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ نے اپنے پروڈکشن ہاؤس کے لیے کوئی دوسرا بنگلا کرائے پر صل کیا ہوگا۔ یہ سن کر مجھے دلی مسرت ہوئی ہے کہ آپ نے وہ بنگلا خرید لیا ہے۔“

”خیر مبارک!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ دوستوں کو اسی طرح اپنے دوستوں کی کامیابیوں سے خوش ونا چاہیے جیسے آپ ہو رہے ہیں......“ لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے تھوڑی دیر پہلے نادر شاہ سے جو یہ کہا کہ مجھے اس کی اشد ضرورت ہے، وہ میرے لیے بہت اہم ہے اس لیے وہ اپنا خیال رکھا کرے تو میری ان باتوں کا ایک خاص سبب ہے......“

وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر میرے انہماک کے پیشِ نظر وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ بنگلا ایک خاتون نہایت عجلت میں فروخت کرکے ملک سے باہر جانا چاہ رہی تھیں، مگر پچھلے دنوں کسی سفاک قاتل نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا ہے......“

جنید خان میرے سامنے میری ماں کی ٹارگٹ کلنگ کا ذکر کر رہا تھا اور میں نارمل انداز میں یہ سب سننے کے لیے مجبور تھا۔ انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں زبان مقفل اور چہرے کو بے تاثر رکھنا لازم ٹھہرتا ہے۔ ڈے ون ہی سے نادر شاہ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ اب تو اس کی حرام زدگیاں کھل کر سامنے آرہی تھیں۔ جنید خان سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا۔

”نادر شاہ نے مجھ سے کہا کہ وہ خاتون جلدی میں ہیں اور مجھ پر بہت زیادہ اعتماد کرتی ہیں۔ میں ان سے جو کہوں گا، وہ مان جائیں گی۔ بنگلے کی مارکیٹ ویلیو پندرہ سے سترہ کروڑ کے درمیان ہے لیکن اگر میں اسے اس کی مرضی کا کمیشن دوں تو وہ مجھے یہ بنگلا دس کروڑ میں دلوا دے گا۔ عام طور پر اتنی بڑی رقم پر بروکرز کا کمیشن ایک پرسنٹ سے دو پرسنٹ تک ہوتا ہے یعنی دونوں پارٹیوں سے ایک ایک پرسنٹ لیکن نادر شاہ نے مجھ سے دس پرسنٹ کا مطالبہ کیا اور یہ کہا کہ وہ ان خاتون سے کمیشن کی بات نہیں کرسکتا البتہ انہیں یہ بنگلا دس کروڑ میں فروخت کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ میں نے نادر شاہ کی آفر قبول کرلی۔ سولہ سترہ کروڑ کا بنگلا مجھے دس کروڑ میں مل رہا تھا۔ یہ سودا مجھے فائدے کا لگا اور میں نے وہ بنگلا خرید لیا۔ میں نہیں جانتا، نادر شاہ نے ان خاتون کو کس طرح اپنے شیشے میں اتارا ہوگا۔ میں مطمئن تھا کہ میں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ نادر شاہ نے ان خاتون کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ایک کروڑ کا کمیشن کما لیا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ اپنی بوٹی کے لیے دوسرے کا بکرا حلال کرنے میں ذرا آسرا نہیں کرتے...... شاہ جی نے ان خاتون کے اعتماد کا خون کرکے اپنی جیب گرم کرلی۔“

”آپ نے بالکل درست فرمایا ہے خان صاحب!“ میں نے ایک بوجھل سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ چلیں اس اسٹیٹ ایجنٹ کی عیاری کی بدولت آپ دونوں کا کام تو ہوگیا۔“

”ہم دونوں...... مطلب، میرا اور نادر شاہ کا؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”نہیں!“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ کا اور سلطانہ خان کا۔ آپ کو ذاتی پروڈکشن ہاؤس

مل گیا اور سلطانہ خان کا مقصد بھی پورا ہو گیا۔"

"اوہ......!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بے چاری پیسوں کے لیے بہت پریشان ہے اسی لیے وہ یہ بنگلا فروخت کرنا چاہتی ہے۔ اس کا شوہر جیل میں ہے اور آپ کو تو پتا ہی ہے، مقدمے بازی میں پیسا پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے۔"

جنید خان نے ایک اور چونکا دینے والی بات کر دی تھی۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "آپ کے ڈی خان کی بات کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ "کے ڈی خان پچھلے چند سال سے جیل میں ہے۔ اس کی رہائی کے چکر میں سب کچھ بک گیا ہے۔ بس یہ آخری بنگلا ہی بچا ہے۔"

"اوہ...... یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔" میں نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "کے ڈی خان پر کس نوعیت کا مقدمہ چل رہا ہے؟"

"برے کام کا برا نتیجہ......!" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "کے ڈی خان کے جرائم کی نوعیت بہت سنگین ہے۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خان صاحب! کیا میں اس بارے میں کچھ جان سکتا ہوں...... اگر کوئی حرج نہ ہو تو۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔" وہ ایک تھکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "آپ سے تو دوستی کا رشتہ قائم ہو چکا ہے لہٰذا آپ کے سوال کا جواب دینا مجھ پر لازم ہے......" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے مجھے بتانے لگا۔

"کے ڈی خان کا بزنس چند سال پہلے تک بہت صاف ستھرا تھا۔ وہ کراچی کے کمرشل ایریا میں "منی چینجر" کی حیثیت سے ایک طویل عرصے سے کام کر رہا تھا۔ ان دنوں ہنڈی یعنی حوالہ وغیرہ کا کام بھی منی چینجر ہی کیا کرتے تھے اور اس دھندے کو غیر قانونی بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس شعبے میں نائن الیون کے بعد بہت زیادہ پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور اب یہ کام ویسٹرن یونین اور دیگر منی ٹرانسفر کمپنیوں کے ذریعے ہو رہا ہے جنہیں پائی پائی کا حساب رکھنا پڑتا ہے گویا منی لانڈرنگ کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خیر...... میں آپ کو بتا رہا تھا کہ چند سال پہلے کے ڈی خان کا بزنس ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ پھر وہ لالچ میں آ گیا۔ اس نے دو کائیاں افراد کو اپنے بزنس میں شریک کر لیا۔ ان میں سے ایک منجھا ہوا سیاست داں جابر فیضی اور دوسرا بدنام زمانہ اسمگلر چنگیز خان تھا۔ میں نے ان دونوں افراد کے لیے "کائیاں" کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں کہ یہ دونوں پردے کے پیچھے بیٹھے ڈوریاں ہلا رہے تھے اور انہوں نے سامنے کے ڈی خان کو رکھا ہوا تھا۔ کے ڈی خان بھی کوئی بے وقوف قسم کا انسان نہیں تھا لیکن راتوں رات امیر بننے کے لالچ نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور وہ گھاگ چنگیز خان اور شاطر جابر فیضی کا "فرنٹ مین" بن کر رہ گیا تھا۔"

جنید خان کی زبان سے چنگیز خان کا نام سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور چشم زدن میں، میں ریڈ الرٹ ہو گیا۔ وہ چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے میرے مقصد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں جس مشن کے ساتھ خان ہاؤس میں داخل ہوا تھا اس کا ڈراپ سین ہونے والا تھا۔ میری تمام حسیات، قوت سماعت میں بدل گئیں اور میں بے چینی سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ جنید خان ٹھہرے ہوئے لہجے میں آگے بڑھا۔

"یاسر صاحب! جابر فیضی اور چنگیز خان نے اپنی بندوقیں کے ڈی خان کے کندھوں پر رکھ کر ایسی تابڑ توڑ فائرنگ کی کہ کے ڈی خان کی منی چینجنگ کمپنی نے پاکستان کی تاریخ میں "منی لانڈرنگ" کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ قصۂ مختصر، جس طرح ہر عروج کو زوال لازمی ہے، بالکل اسی طرح تین افراد کی اس مثلث کا بھی انجام بہ خیر ہوا۔ قانون نافذ کرنے والے ایک حساس ادارے کی کارروائی نے کے ڈی خان کا بیڑا غرق کر دیا۔ اس کی منی چینجنگ کمپنی کو سیل کر کے اسے حراست میں لے لیا گیا۔ جب چنگیز خان کا نام کے ڈی خان کی زبان سے پھسلا تو اس کی گرفتاری کے لیے قانونی چارہ جوئی میں تیزی آ گئی۔ چنگیز خان پہلے ہی انٹرپول کو مطلوب تھا۔ کے ڈی خان سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں چنگیز خان کو ترکی میں گرفتار کر لیا گیا۔"

"اس وقت چنگیز خان کہاں ہے؟" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "کیا گرفتاری کے بعد اسے ترکی سے پاکستان لایا گیا تھا؟"

"نہیں!" اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "ترکی میں منشیات کے کاروبار میں ملوث افراد کو قاتل سے زیادہ خطرناک مجرم سمجھا جاتا ہے اور ترکی کے قانون میں ڈرگ ٹریفکنگ کی سزا سب سے زیادہ سخت اور

ن ہے۔ چنگیز خان اپنے کالے کرتوتوں کی بنا پر پچھلے کچھ صے سے ترکی کو "انتہائی مطلوب" تھا لہٰذا اس معاشرتی ور کو ترکی کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ اس وقت تنبول کسی جیل میں ہے۔"

"او مائی گاڈ!" میں نے بہ زبانِ خاموشی خود کلامی کی۔ "میں اپنے جس دشمن کو کراچی میں تلاش کرتا پھر رہا ں وہ اس وقت استنبول کی جیل میں بند ہے۔"

اس کا تو سیدھا سادہ یہ مطلب ہوا کہ ماں کی ہلاکت یں چنگیز خان کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ استنبول کی جیل کوئی کستان کی جیل تو ہے نہیں کہ چنگیز خان اپنی اسیری میں بھی کے معاملات کو کنٹرول کر رہا ہو۔ یقیناً میری ماں کو کسی شخص نے قتل کروایا تھا اور میرے محتاط اندازے کے ابق یہ "کوئی" نادر شاہ کے سوا اور کوئی دوسرا ہو ہی نہیں تا تھا۔ اب اس بات میں بھی کسی شک و شبے کی گنجائش اش نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ دھمکی آمیز خط بھی نادر شاہ ہی نے مجھے ڈیلیور کرایا تھا تاکہ میں خوف زدہ ہو کر جلد از جلد ہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ فوری طور پر میرے ہاتھ چنگیز ان کی گردن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے لیکن نادر اہ میری پہنچ میں تھا۔ میں نے شاہ جی سے بھیانک انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور جنید خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خان صاحب! میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ...... برے کام کا برا نتیجہ۔ ہر برے شخص کو جلد یا بدیر اس کے عبرت ناک انجام تک پہنچنا ہے۔"

"لیکن جابر فیضی جیسے لوگ "کرشماتی" طور پر صاف بچ جاتے ہیں۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "فیضی نے پتا نہیں کون سی جادو کی چھڑی گھمائی اور اس معاملے میں کہیں بھی اس کا نام نہیں آیا۔ وہ آج بھی بڑے دھڑلے سے اپنی سیاست کی دکان چمکائے بیٹھا ہے۔"

"خان صاحب! ہر شخص کارخانۂ قدرت میں اپنے اچھے برے اعمال کی بی سی (کمیٹی) ڈالتا ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "قدرت سب کی بی سی کھولتی ہے، کسی کی پہلے اور کسی کی بعد میں۔ اپنے نمبر پر جابر فیضی کی بھی کمیٹی ضرور کھلے گی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں یاسر صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"اور اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔ میرا دوست مجھے لینے آ گیا ہے اور بار بار مجھے میسج کر رہا ہے۔"

اس نے اپنی میز کی دراز میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لیں۔ اس کارڈ پر میرا اسیل نمبر اور آفس کے نمبرز درج ہیں۔ آپ کا جب موڈ ہو، مجھے کال کر سکتے ہیں۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جنید خان سے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک آدھ روز میں آپ سے رابطہ کروں گا اور ہماری اگلی ملاقات کسی پُرفضا مقام پر ہوگی۔"

"خان ہاؤس" میں میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ میں جس مقصد کے حصول کی خاطر یہاں آیا تھا وہ میری توقع کے برعکس وقت سے بہت پہلے پورا ہو چکا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ کبھی دوبارہ مجھے اس طرف آنے کی ضرورت محسوس ہو اور جنید خان سے بھی مزید کسی ملاقات کا امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ کل کیا پیش آنے والا تھا، یہ صرف مالک جانتا تھا۔

جنید خان بصد اصرار مجھے گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ عظیم نے مجھے دیکھتے ہی پسنجر سیٹ والا دروازہ کھول دیا تھا لیکن میں نے عقبی نشست کا رخ کیا اور گاڑی کے اندر بیٹھتے ہی اضطراری انداز میں کہا۔

"عظیم! فوراً سے پیشتر گاڑی کو اس علاقے سے نکال لو۔"

وہ کوئی سوال کیے بغیر بولا۔ "اوکے برو......!"

"پرفیوم والی بوتل کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے ڈیش بورڈ میں سے ایک برانڈڈ پرفیوم کی بوتل نکال کر میری جانب بڑھا دی۔

میں نے بے دریغ آدھی سے زیادہ بوتل اپنے لباس پر اسپرے کر دی۔ عظیم بیک ویو مرر میں حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری کارروائی دیکھتا رہا تاہم وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔

جب ہماری گاڑی "خان ہاؤس" والی اسٹریٹ سے نکل کر قدرے چوڑی سڑک پر آئی تو میں نے ایک ڈبل کیبن ٹویوٹا ہائی لکس ویگو کو بڑی تیزی سے خان ہاؤس والی گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ مذکورہ بلیک ویگو کے عقبی کھلے حصے میں مجھے دو جی ایس ڈی (جرمن شیفرڈ ڈاگ) بھی نظر آئے۔ اس بلیک ویگو جیپ کے ساتھ ہی ایک پولیس موبائل بھی مذکورہ گلی میں مڑی تھی۔ ریئر ویو مرر میں دکھائی دینے والے اس منظر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسی لمحے جمشید کے کہے ہوئے الفاظ کی گونج مجھے اپنی سماعت میں سرایت کرتی محسوس ہوئی...... "سر! وہ کتوں

کی مدد سے آپ کو تلاش کرنا چاہتی ہے۔ ان لوگوں نے واش روم کے اندر سے آپ کے کپڑے اٹھا لیے ہیں۔“

میں نے حلق کے بل چلا کر کہا ”عظیم! جلدی کرو۔ وہ لوگ خان ہاؤس کی طرف گئے ہیں۔ ہمیں ان کی پہنچ سے دور نکلنا ہوگا...... جلد از جلد۔“

اگلے ہی لمحے عظیم نے گاڑی کو ”فلائنگ ہارس“ بنا دیا۔ ہماری گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

☆☆☆

وہ بہت ہی نازک لمحات تھے۔ گاڑی کی اندرونی فضا کو ایئر فریشنر کی مخصوص خوشبو نے مہکا رکھا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ میں نے عقبی نشست پر قبضہ جماتے ہی پرفیوم کی آدھی سے زیادہ بوتل اپنے لباس پر اسپرے کر ڈالی تھی۔ یہ محض میں نے احتیاطی تدابیر کے ذیل میں کیا تھا تاکہ میرے بدن کی مخصوص بو فضا میں شامل نہ ہونے پائے ورنہ جو دو جرمن شیفرڈ کتے مجھے سونگھتے ہوئے ماں والے بنگلے سے خان ہاؤس تک آن پہنچے تھے، وہ کسی بھی لمحے مجھ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ جمشید کی اس اطلاع نے مجھے سخت بے چین کر دیا تھا کہ وہ لوگ واش روم میں سے میرے کپڑے اٹھا لے گئے تھے۔ یہ میرے استعمال شدہ کپڑے تھے۔ ان کے اندر میرے جسم کی مخصوص بو رچی بسی تھی۔ انہوں نے یقیناً میرے یہ کپڑے ان دو کتوں کو اچھی طرح سونگھائے ہوں گے جبھی تو وہ میرے بدن کی مخصوص بو کو فالو کرتے ہوئے میرے تعاقب میں خان ہاؤس تک آگئے تھے۔ میری خوش قسمتی کہ میں چھاپ لیے جانے سے چند لمحے پہلے وہاں سے بحفاظت نکل آیا تھا اور اب تو میں نے خود کو کچھ اس انداز میں تیز خوشبو میں لپیٹ لیا تھا کہ جرمن شیفرڈ کا باپ بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

میں تو اسی وقت خان ہاؤس سے باہر آجاتا جب جمشید نے مجھے ڈیلفینا کی ماں والے بنگلے پر آمد اور دو کتوں کے بارے میں بتایا تھا لیکن سوئے اتفاق کہ جنید خان کے پاس نادر شاہ کا فون آجانے کے بعد وہاں کی صورت حال یکایک اتنی سنسنی خیز ہوگئی تھی کہ میں وہاں بیٹھے رہنے پر مجبور ہوگیا اور میری یہ ”بیٹھک“ ہر لحاظ سے مفید اور سود مند ثابت ہوئی تھی۔ چنگیز خان، کے ڈی خان اور جابر فیضی کا سارا کچا چٹھا میرے سامنے آگیا تھا۔ اس تناظر میں میں نہیں سمجھتا تھا کہ آئندہ جنید خان سے میری کبھی ملاقات ہو۔ میں جو کچھ حاصل کرنے کی غرض سے ”خان ہاؤس“ گیا تھا، اس سے کہیں زیادہ پا لیا تھا۔

جمشید نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ غیر ملکی میڈم لیڈی ڈیلفینا دو خطرناک کتوں کے ساتھ وہاں پہنچی تھی اور اب میں نے اپنی آنکھوں سے ڈبل کیبن ویگو کے پچھلے حصے میں ان جرمن شیفرڈ کتوں کو دیکھ لیا تھا...... جیپ کے ساتھ پولیس کی موبائل کی موجودگی بھی بڑے واضح انداز میں اسی حقیقت کی جانب اشارہ کر رہی تھی کہ ان دونوں جرمن شیفرڈ ڈاگ نے میرے بدن کی مخصوص بو کو سونگھتے ہوئے پولیس والوں کی یہاں تک راہنمائی کی تھی تاہم ویگو جیپ یا پولیس موبائل کے اندر ڈیلفینا مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ مالک کا شکر کہ میری بروقت حکمتِ عملی نے فی الحال مجھے جرمن شیفرڈ ڈاگ کی دستبرد سے بہت دور کر دیا تھا۔ ان کتوں کو کے۔ نائن (K-9) کہا جاتا ہے۔

ہم جیسے ہی قدرے کشادہ سڑک پر آئے، عظیم نے کہا۔ ”برو! اگر تم خان ہاؤس سے نکلنے میں چند لمحات کی تاخیر کر دیتے تو یقیناً پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے۔ یہ کمبخت تو خطرناک کتوں کی مدد سے تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں نے پولیس موبائل کے ساتھ بلیک ویگو میں دو السیشن کتوں کو بھی دیکھا ہے۔“

”تم نے ابھی جو کچھ دیکھا ہے وہ ایک سنگین حقیقت ہے۔“

”جب تم نے مجھے پرفیوم کی بوتل لانے کے لیے کہا اور بعد ازاں گاڑی کی اندرونی فضا کو ایئر فریشنر کی مدد سے مہکانے کی بات کی تو میرا دھیان اس چشما ٹو نادیہ کی طرف چلا گیا تھا۔“ وہ گاڑی کو تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں سمجھا تم نادیہ کو کوئی سرپرائز دینے کا ارادہ رکھتے ہو لیکن تم نے جس انداز میں اپنے لباس پر پرفیوم اسپرے کیا ہے اس سے صورت حال واضح ہوگئی ہے اور پھر دو السیشن کتوں والی ویگو نے تو سب کچھ کھول کر رکھ دیا ہے۔“

”جب سب کچھ تمہاری نگاہ کے سامنے کھل چکا ہے تو کسی قریبی شاپنگ مال میں چلو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا اور میرا باڈی فریم تقریباً ایک ہی جیسا ہے۔ میں تمہیں اپنے کالر اور ویسٹ کا نمبر بتا دیتا ہوں۔ میں گاڑی ہی میں بیٹھوں گا اور تم مال میں جا کر میرے لیے دو تین جینز، پانچ چھ ٹراؤزر اور چند شرٹس وغیرہ خرید کر لے آؤ گے جن میں ٹی شرٹ اور ڈریس شرٹ ملی جلی ہونا چاہئیں۔ تم میری بات تو سمجھ رہے ہو نا؟“

”بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں برو۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میرا ذہن حالات کی اس

پیچیدہ [illegible]نک کروٹ میں الجھا ہوا ہے۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں...... میں تمہیں بہت کچھ بتاؤں گا جس سے تمہارے ذہن کی ہر الجھن دور ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پہلے میں ایک دو ضروری کالز کر لوں۔ پھر تفصیلی بات کرتے ہیں۔“

”اوکے برو! میں شاپنگ مال کی طرف جا رہا ہوں۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔

میں نے کچھ رقم نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ رکھ لو۔ شاپنگ میں کام آئیں گے۔“

”ابھی رہنے دو۔“ اس نے کہا۔ ”میں اپنے کریڈٹ کارڈ سے شاپنگ کر لوں گا۔ ہم بعد میں حساب کر لیں گے۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ میں نے اصرار کرنا مناسب نہ جانا اور عظیم کی بات رکھتے ہوئے کہا۔ ”گاڑی کسی ایسی جگہ پارک کرنا کہ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ میں گاڑی سے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔ میں جب تک اس تیز خوشبو کے حصار میں رہوں گا، جرمن شیفرڈ ڈاگ میری لوکیشن کا پتا نہیں چلا سکیں گے کیونکہ باوجود کوشش کے بھی انہیں میرے بدن کی وہ مخصوص بو مل نہیں پائے گی۔“

”آل رائٹ برو!“ وہ مضبوط لہجے میں بولا اور گاڑی ایک سائڈ میں کھڑی کر دی۔ میں نے بینا کا نمبر ملایا۔

”ہیلو......!“ بینا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے پہلی ہی گھنٹی پر میری کال اٹینڈ کر لی تھی۔ ”تم کیسے ہو اور تمہارا مشن کیسا چل رہا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور مشن بھی تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔“

اس نے خالصتاً بیویوں والا سوال کیا۔ ”تم گھر کب آرہے ہو؟“

”جب باہر کے کاموں سے فارغ ہو جاؤں گا تو سیدھا گھر ہی آؤں گا۔ میں کوئی تفریح کرنے نہیں نکلا ہوا ہوں۔“ میں نے بھی شوہروں والا رٹا رٹایا جواب دیا پھر پوچھا۔ ”نادیہ واپس آگئی؟“

”ابھی نہیں۔“ بینا نے بتایا۔

”اوہ...... اسے گھر سے نکلے ڈھائی تین گھنٹے ہو گئے ہیں۔“ میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

”آ ہی جائے گی۔“ وہ سرسری انداز میں بولی۔ ”آج کراچی میں اس کا آخری دن ہے۔ صبح وہ اسلام آباد روانہ ہو جائے گی۔ وہ اپنے دوستوں اور کولیگز وغیرہ سے ملنے ملانے نکل گئی ہوگی۔“

”اوکے!“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اب میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں اسے توجہ سے سنو اور فوراً اس پر عمل بھی کرنا ہے۔“

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”ارشاد......!“

”اس وقت گھر کے اندر میرے استعمال کے جتنے بھی کپڑے ہیں انہیں اٹھا کر فوراً واشنگ مشین میں ڈالو اور مشین کو آن کر دو۔“ میں نے کہا۔ ”واش روم کی کھونٹیوں کو بھی اچھی طرح چیک کر لینا۔ اور ہاں، ڈیٹرجنٹ کی مقدار بھی نارمل سے زیادہ ہونا چاہیے......“

”یہ تم مجھے کس قسم کا کام بتا رہے ہو۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ”کیا تم نے مجھے کوئی دھوبن سمجھ رکھا ہے؟“

”میں نے تمہیں جتنا کہا ہے وہ فوراً کرو۔ اس کے بعد گھر سے نکل کر کسی کاسمیٹکس اسٹور یا باڈی شاپ کا رخ کرو اور درجن بھر پرفیومز اینڈ باڈی اسپرے خرید کر لے آؤ اور ہاں......“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں باقاعدہ دھوبن بننے کی ضرورت نہیں۔ بس، کپڑوں کو واشنگ مشین میں دو تین چکر دلا کر چھوڑ دینا۔“

”تم جو کہہ رہے ہو، میں وہ کر دیتی ہوں۔“ وہ فرماں برداری سے بولی۔ ”لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟“

”تفصیل تو تمہیں میں بعد میں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”سردست اتنا جان لو کہ وہ تمہاری نام نہاد فرضی سوتن ڈیلفینا خطرناک جرمن شیفرڈ ڈاگ کی مدد سے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگر میں ”خان ہاؤس“ سے نکلنے میں چند لمحات کی تاخیر بھی کر دیتا تو اس وقت پولیس کی حراست میں ہوتا۔ ماں والے بنگلے سے انہیں میرے استعمال شدہ کپڑے مل گئے ہیں۔“

”اوہ...... میں سمجھ گئی کہ تم نے مجھے یہ کام کیوں بتائے ہیں۔“ وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”جب یہ سب نمٹ جائے تو تمام کاسمیٹکس کو گھر میں رکھ کر تم باہر نکل آنا اور کسی بھی مال کی کافی شاپ میں یا کسی بھی موزوں ایریا میں وقت گزاری کے لیے بیٹھ جانا۔ میں تمہیں وہیں جوائن کر لوں گا۔“

”اوکے۔ یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔

”اور اب ہمارے بیچ رابطہ ٹیکسٹ میسج کے ذریعے ہوگا۔“

"سمجھ گئی۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے بینا کو "اللہ حافظ" کہہ کر جمشید کی سمت جست بھری۔

اس نے تیسری گھنٹی پر کال ریسیو کر لی اور چھوٹتے ہی بولا۔ "سر! آپ کیسے ہیں؟"

"تمہاری دعا سے میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ مالک نے ابھی تک مجھے اس... غیر ملکی میڈم کے شر سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اب میں تم سے جو بھی پوچھوں اس کا ٹو دی پوائنٹ مختصر جواب دینا۔ او کے......"

"او کے سر! آپ پوچھیں۔" وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔

"کیا تم نے اس غیر ملکی میڈم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا یہ تمہارا اندازہ ہے؟"

"سر! میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔" اس نے پروثوق انداز میں بتایا۔ "وہ اس مرتبہ بھی سفید لیکسس میں تھی تاہم اس کی گاڑی بنگلے کے مین گیٹ سے ہٹ کر چند گز کے فاصلے پر کھڑی تھی جبکہ ڈبل کیبن ویگو اور پولیس موبائل بنگلے کے سامنے آکر رکی تھیں پھر وہ لوگ دو السیشن کتوں کے ساتھ بنگلے کے اندر گھس آئے تھے۔ میں پولیس کی وجہ سے مجبور تھا اس لیے میں نے ان کی کارروائی میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے اور آئندہ بھی اسی پالیسی پر کاربند رہنا ہے۔" میں نے اس کی تعریف کی۔ "تم بہت سمجھدار انسان ہو۔"

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ تو آپ کی محبت ہے سر۔"

"تم نے یہ کیسے جانا کہ بلیک ویگو کے عقبی کیبن میں دو السیشن کتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! میں کتوں کی بہت سی نسلوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔" وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ "ادھر گوجرہ میں میرے گاؤں میں کتوں کے مقابلے ہوتے ہیں اور میں یہ مقابلے بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔"

"تمہارے اس شوق کے بارے میں جان کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پاکستان میں اس قسم کے ہیلدی ٹورنامنٹ منعقد کرائے جاتے ہیں۔"

"سر! کتوں کی لڑائی تو رہی ایک طرف۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "میں نے سنا ہے السیشن کتے میں بلا کی سونگھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ سر! آپ بہت زیادہ ہوشیار رہیے گا۔ یہ السیشن کتا بڑا ضدی اور مستقل مزاج ہوتا ہے، جس کے پیچھے پڑ جائے پھر اس کی جان نہیں چھوڑتا اس لیے اس کی قیمت لاکھوں میں ہوتی ہے۔"

"تمہیں میرے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں جمشید!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہارے اس السیشن جوڑے کے نتھنوں میں ڈاٹ لگانے کا بندوبست کر لیا ہے اور دیگر حوالوں سے بھی بہت محتاط ہوں۔"

"سر! میرے لیے کیا حکم ہے؟" اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"نادر شاہ کو پولیس نے چھوڑ دیا ہے۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں اسے بتایا۔ "وہ قابلِ بھروسا شخص نہیں ہے اور اب تو ممکن ہے وہ پولیس کا مخبر بن کر آیا ہو لہٰذا اس سے بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

"سر! اگر آپ کا حکم ہو تو میں اس ذلیل انسان کو بنگلے میں قدم بھی نہ رکھنے دوں۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

"نہیں...... میں تمہیں اس قسم کا کوئی حکم دینے کا حق نہیں رکھتا۔" میں نے گمبھیر انداز میں جواب دیا۔

وہ تڑپ کر بولا۔ "سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

"جمشید! اگر مجھے تم پر بھروسا نہ ہوتا تو میں تمہیں اپنی اصلیت کے بارے میں کچھ نہ بتاتا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "سچی بات یہ ہے کہ میں اب اس بنگلے کا مالک نہیں ہوں۔ ماں نے نادر شاہ کے ہاتھوں یہ بنگلا فروخت کر دیا ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ بنگلا جنید خان نامی ایک شخص نے خریدا ہے جو عنقریب یہاں ایک پروڈکشن ہاؤس کھولنے والا ہے۔ میں جنید خان سے ملاقات کر کے حقیقتِ حال جان چکا ہوں۔ نادر شاہ نے ماں کے ساتھ جو بھی ہیر پھیر اور دغا بازی کی ہے وہ ایک الگ کہانی ہے لیکن قانون کی نگاہ میں اب اس بنگلے کا مالک جنید خان ہی ہے۔"

"سر! کیا اسی جنید خان کے بندے یہاں کسی ڈرامے کی شوٹنگ کرنے آئے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل! وہ ڈراما یونٹ جنید خان کے پروڈکشن ہاؤس ہی سے تعلق رکھتا ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اب وہ لوگ کل صبح دس اور گیارہ بجے کے درمیان دوبارہ آئیں گے اور اب تک کے پروگرام کے مطابق نادر شاہ ان کی آمد سے قبل تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ نادر شاہ کو تم جنید خان کا ایجنٹ سمجھ لو اور جنید خان اب

اس بنگلے کا مالک ہے۔ امید ہے، تم میری بات سمجھ گئے ہو گے؟"

"سمجھ تو میں گیا ہوں سر۔" وہ متذبذب انداز میں بولا۔ "لیکن یہ سب ٹھیک نہیں ہوا......!"

"ہاں جمشید! یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔" میں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ "ماں نادر شاہ جیسے رذیل شخص پر اندھا اعتماد کر کے چین کی بانسری بجا رہی تھیں۔ اس انسان نما نجس جانور نے سب کچھ برباد کر دیا۔ اپنے بھاری کمیشن کے لیے اس مردود نے ماں کا بنگلا اونے پونے داموں جنید خان کے ہاتھ بیچ ڈالا۔"

"سر! ایسے نمک حرام کتے کے ساتھ بھی تو کچھ ہونا چاہیے نا۔" وہ زہریلے انداز میں بولا۔ "مجھے تو شک ہے کہ میڈم کو پیش آنے والے واقعے کے پیچھے بھی اسی شیطان کا ہاتھ ہے......"

"تمہیں جو شک ہے، مجھے اس بات کا یقین ہے۔" میں نے کہا۔

"سر! یہ بنگلا میڈم کا یا آپ کا نہیں رہا تو مجھے بھی یہاں نہیں رہنا۔" وہ جوش بھرے انداز میں بولا۔ "میں کسی جنید خان یا نادر شاہ کی چاکری نہیں کر سکتا۔"

"میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ میری طرف سے تم آزاد ہو۔" میں نے کہا۔ "تم جب چاہو، اس بنگلے کی نوکری چھوڑ سکتے ہو۔"

"مجھے یاد ہے، آپ نے ایسا کہا تھا۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "میں تو آپ کی وجہ سے رک گیا تھا ورنہ اب تک میں اپنے گاؤں روانہ ہو چکا ہوتا۔"

"تم جب چاہو، چلے جاؤ۔"

"وہ تو میں جاؤں گا ہی سر!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں اس سے پہلے دو اہم کام کرنا چاہتا ہوں جس کے لیے مجھے آپ کا تعاون چاہیے۔"

"بولو...... تمہیں مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہیے۔" میں نے پوچھا۔ "اور یہ بھی بتاؤ کہ تم کون سے دو اہم کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"سر! پہلی خواہش تو یہ ہے کہ میں آپ سے ایک تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ پُراشتیاق انداز میں بولا۔ "اور دوسری تمنا یہ ہے کہ آپ نادر شاہ کے معاملے میں مجھے آزاد چھوڑ دیں۔ اس خبیث کو میں اپنے ہاتھوں سے عبرت ناک انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں نے میڈم کی زندگی میں ان سے وفاداری کی ہے مگر حقِ نمک اس وقت ادا ہوگا جب میں شاہ جی کی بداعمالیوں کا حساب چکتا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"جمشید! میرا تم سے یہ وعدہ ہے کہ جب تک میں پاکستان میں ہوں، کوئی مناسب موقع نکال کر میں تم سے ایک بھرپور ملاقات ضرور کروں گا۔ باقی جہاں تک نادر شاہ کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کا معاملہ ہے تو......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ میرے ہاتھوں سے بچ گیا تو تمہارا ہوا......!"

"اوہ...... تو آپ نے اس کے بارے میں کچھ سوچ رکھا ہے؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"بہت ہی بھیانک......!" میں نے سنگین لہجے میں کہا۔ "تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔"

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر عظیم شاپنگ سے واپس لوٹ آیا۔ میں نے الوداعی انداز میں جمشید سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔ تم میرے لیے دعا کرنا۔"

"ضرور سر...... ان شاء اللہ!" وہ پُرخلوص انداز میں بولا۔

میں نے جمشید سے سیلولر رابطہ ختم کر دیا۔

"گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔" عظیم نے شاپنگ بیگز کو پسنجر سیٹ پر پھینکا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔ "باہر سے آنے کے بعد محسوس ہو رہا ہے کہ میں پرفیوم آئی لینڈ میں آ گیا ہوں۔ گاڑی کی اندرونی فضا تو خوشبو کے کسی جزیرے کا سماں پیش کر رہی ہے۔"

اسی لمحے میرے اندر سے ٹیل آئی۔ یہ آواز دل کی گہرائی سے اٹھی تھی۔ گرو جی ایم سر نے مجھے نصیحت کی تھی کہ دل کی آواز کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا۔ دل ہمیشہ درست راہنمائی کرتا ہے۔ میں نے اپنی تمام تر توجہ صدائے قلب پر مرکوز کر دی۔ دل مجھے ایک بار پھر وارن کر رہا تھا۔

"علی! بیساکھیوں کا سہارا لینا چھوڑ دو اور اپنے قدموں سے چلنا سیکھو ورنہ کسی بھی لمحے تم خود بھی کسی بڑی مصیبت میں گھر جاؤ گے اور اپنے چاہنے والوں کو بھی سپردِ عذاب کرو گے......"

میں دل کا یہ اشارہ واضح طور پر سمجھ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ دو تین بار اسی نوعیت کی وارننگ دے چکا تھا لیکن میں بوجوہ اس کی پکار پر دھیان نہیں دے پایا تھا مگر اس

مرتبہ میں بے حد سنجیدہ تھا۔ تازہ ترین صورتِ حال اسی امر کی متقاضی تھی کہ میں دل کے اشاروں کو نظر انداز نہ کروں۔ میں نے ان الفاظ کے ساتھ دل کو اپنی فرماں برداری کا یقین دلا دیا۔

''آج عظیم کو میں عارضی طور پر کچھ عرصے کے لیے خود سے دور کردوں گا۔ اگر زندگی رہی اور مالک کو منظور ہوا تو بہت جلد دوبارہ اس سے ملاقات ہوگی۔''

''برو! کیا آج ادھر ہی گاڑی میں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟'' عظیم نے تعجب خیز انداز میں پوچھا۔ ''میں شاپنگ کر کے واپس بھی آ گیا اور تم بت بنے خاموش بیٹھے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تم گم صم کیوں ہو......؟''

عظیم کی استفساریہ آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ میں نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے پرفیوم آئی لینڈ کا ذکر کیا تو میں نے سوچا، ذرا میں بھی اس جزیرے کی سیر کو نکل جاتا ہوں۔ بس، چشمِ تصور مجھے اسی حسین نگری میں لے گئی تھی۔''

''میرا اندازہ صد فیصد درست ہے یا کوئی اور بات ہے۔'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہو۔ بتاؤ، کیا پریشانی ہے؟''

''تم گاڑی کو آگے بڑھاؤ، میں تمھیں موجودہ حالات کی تفصیل سے آگاہ کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''پھر ساری پریشانی تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔''

''اوکے برو!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''تمہارے پاس چھ بجے تک کا وقت ہے۔ گاڑی کو مختلف سڑکوں پر رواں دواں رکھو۔ آج میرا کراچی کی سیر کرنے کا موڈ ہے۔'' میں نے عقبی نشست پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس دوران میں، میں تمھیں پیش آمدہ حالات سے بھی باخبر کردوں گا۔''

اس نے پوچھا۔ ''ہم نے خان ہاؤس کی طرف سے آتے ہوئے بلیک ویگو میں جو دو خطرناک السیشن دیکھے تھے، ان کا ... خطرہ ٹل گیا ہے یا وہ ابھی تک تمہارے تعاقب میں ہوں گے؟''

''جرمن شیفرڈ کی اسنفنگ پاور کی ایک رینج ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کتے اپنی سونگھنے کی اس صلاحیت کی بنا پر زمین کے اندر کم و بیش چالیس فٹ تک، پانی کے اندر لگ بھگ اسّی فٹ تک اور کھلی فضا میں ایک سے ڈیڑھ کلومیٹر کے ریڈیس میں اپنے شکار کو ٹیل کر لیتے ہیں لیکن جب سے تمہاری گاڑی ''پرفیوم آئی لینڈ'' بنی ہے، ہم نے اس شاطر پولیس ڈاگ ''کے۔ نائن'' کی اس صلاحیت کی راہ میں ایک مضبوط دیوار کھڑی کردی ہے۔ جس نے اس کی صلاحیت کو عارضی طور پر زنگ آلود کردیا ہے۔ جب تک میں خوشبو میں بسا ہوا ہوں، میرے بدن کی مخصوص بو فضا تک رسائی حاصل نہیں کر سکے گی۔ وہ بوجس کی پولیس ڈاگ کو تلاش ... لہٰذا تم اطمینان رکھو کہ میں ان کا ٹارگٹ ضرور ہوں لیکن فی الحال وہ مجھے ڈھونڈ نہیں سکتے۔''

''برو! تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تمہارا کیس واقعی ہائی پروفائل ہے ورنہ ہماری پولیس کسی کو کھوجنے کے لیے ایسے جاسوس کتے کہاں استعمال کرتی ہے۔''

''یہ جو کچھ بھی کیا جارہا ہے اسی بااثر عورت ڈیلفینا کے اشارے پر کیا جارہا ہے۔ میں نے تمھیں اس کے بارے میں کافی کچھ بتا رکھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ میری ''چاہت'' میں کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔ یہاں کی پولیس کو اپنے اعلیٰ افسران کی طرف سے ایسے احکامات ملے ہوں گے کہ میری تلاش میں ان کی نیندیں حرام ہوچکی ہیں۔ جرمن شیفرڈ کا استعمال تو رہا ایک طرف، ڈیلفینا یہاں کی انتظامیہ کو کوئی بھی قدم اٹھانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اس وقت تم پولیس کی جو بھی پھرتیاں دیکھ رہے ہو اس کے پیچھے اسی کافر ادا حسینہ کا دماغ کام کر رہا ہے۔ تمھیں اس کی طاقت اور اختیار کا اندازہ نہیں ہے......''

''کبھی اس سے واسطہ پڑا تو اندازہ لگانے کی کوشش کروں گا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں، میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں عظیم کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''یہ نادر شاہ تو واجب القتل ہے اور اس ننگِ انسانیت کو جہنم واصل کرنے سے پہلے اس کی ساری دولت بھی سمیٹ لینا چاہیے کیونکہ یہ تمام تر دولت اس کمینے نے تمہاری مدد اور انہی جیسے دوسرے معصوم لوگوں سے اپنی عیاری کے طفیل ہتھیا رکھی ہے۔ یہ شخص کسی بھی طور پر قابلِ معافی نہیں۔''

''میں تمہارے آخری جملے سے مکمل اتفاق کرتا ہوں عظیم۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''صرف آخری جملے سے اتفاق......'' وہ الجھن زدہ

انداز میں بولا۔ ''اور باقی کا کیا ہے؟''

''زندگی اور موت کا معاملہ کلی طور پر مالک کے ہاتھ میں ہے عظیم۔'' میں نے کہا۔ ''لہٰذا میں نادر شاہ کی جان لینے کے بارے میں تو سوچ ہی نہیں سکتا۔ میں اس اصول کا حامی ہوں کہ مارنے سے ڈرانا بہتر ہے اور موت دکھا کر بیماری پر راضی کرلینا زیادہ سودمند ہوتا ہے۔ میں نادر شاہ کو ایسا تاریخی سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے جیسے کم ظرف اور احسان فراموش لوگوں کے لیے درسِ عبرت بن کر رہ جائے اور......اور یہ کام آج رات ہی نمٹانا ہے......''

''تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟'' وہ ہائی الرٹ لہجے میں مستفسر ہوا۔

''میں نادر شاہ سے ایک پائی بھی وصول کرنے کا خواہش مند نہیں ہوں۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''البتہ...... میں اس کے ساتھ جو کچھ بھی کرنے جارہا ہوں اسے وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ وہ دنیا بھر کی دولت بھی خرچ کرلے لیکن کبھی اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہوسکے گا اور نہ ہی میرے ڈھائے ہوئے اس ستم کی کہانی کسی کو سنانے کے قابل رہے گا۔''

''آخر تم شاہ جی کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

اچانک مجھے کچھ یاد آگیا۔ میں نے عظیم کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھ لیا۔ ''کیا تم نے اس شخص کو دیکھا تھا جو ابھی مجھے گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا۔ میرا اشارہ ''خان ہاؤس'' کی طرف ہے؟''

''ہاں، دیکھا تھا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیوں......کیا ہوا؟''

''جانتے ہو، وہ کون تھا؟''

''نن...... نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں نے آج پہلی بار اسے دیکھا ہے۔''

''وہ جنید خان تھا...... اصلی جنید خان۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اسے بتایا۔ ''تم نے کہا تھا کہ جنید خان ایک بھاری بھرکم شخص ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمھیں مغالطہ ہوا ہے۔ اسی طرح تمہاری یہ اطلاع بھی غلط ثابت ہوئی ہے کہ جنید خان، کے ڈی خان کا گہرا دوست ہے۔ کے ڈی خان یعنی خلق داد خان کی تفصیلی کہانی میں تمھیں سنا چکا ہوں۔''

''برو! میں نے جو بھی معلومات تم تک پہنچائی ہیں اس کا ذریعہ ساجد محمود ہے جو ''خان ہاؤس'' والی اسٹریٹ میں رہتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس رات ایک بھاری بھرکم شخص جب نادر شاہ کو سی آف کرنے خان ہاؤس سے باہر آیا تو ساجد نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈراما پروڈیوسر جنید خان ہے اور یہ اسٹیٹ ایجنٹ جنید خان کے کسی پروجیکٹ میں تگڑی رقم لگا رہا ہے جبھی جنید خان اسے ''خدا حافظ'' کہنے کے لیے گاڑی تک آیا ہے۔''

''مجھے تمہاری بات کا یقین ہے عظیم!'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اگر تمھیں مغالطہ نہیں ہوا تو پھر یقیناً ساجد نے دانستہ یا نادانستگی میں تم سے غلط بیانی کی ہے۔ صورت کوئی بھی رہی ہو مگر میرا مشورہ یہی ہے کہ کچھ عرصے کے لیے تم ساجد سے قطعی لاتعلقی اختیار کرلو بلکہ یہ بھی بھول جاؤ کہ کل یا پرسوں تم اس سے ملے تھے اور تم نے اس سے میرے یا جنید خان یا نادر شاہ کے بارے میں کسی قسم کی بات چیت کی تھی۔ اپنی یادداشت میں تم یہ بات فیڈ کرلو کہ تم کافی عرصے سے ساجد سے ملے ہی نہیں۔ اگر تمھیں کہیں اس حوالے سے کوئی بیان وغیرہ دینا پڑ جائے تو تم اپنے اسی موقف پر ڈٹے رہنا۔ میری ایک بات ذہن نشین کرلو کہ اگر تم نے احتیاط سے کام نہیں لیا تو یہ لڑکا تمہارے لیے کوئی بہت بڑی مصیبت کھڑی کردے گا۔''

''برو! میں تمہاری ہدایت پر لازمی عمل کروں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''لیکن یہ تو بتاؤ کہ ساجد میرے لیے کس قسم کی مصیبت کھڑی کرسکتا ہے؟''

''تم نے ساجد کے ذریعے جنید خان کے ساتھ میری میٹنگ سیٹ کی تھی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جنید خان جب مجھے سی آف کرنے گاڑی تک آیا تو اس نے تمھیں بھی دیکھا تھا۔ جب پولیس جنید خان سے پوچھ تاچھ کرے گی تو وہ انہیں کسی یاسر بیگ اور اس کے دوست عظیم کی کہانی سنائے گا کہ وہ ڈراما یا فلم بنانے اس کے پاس پہنچا تھا۔ پولیس کو اسد علی کی یعنی میری تلاش ہے۔ جرمن شیفرڈ نے میرے استعمال شدہ کپڑے سونگھ کر پولیس والوں کو ''خان ہاؤس'' تک پہنچایا ہے لہٰذا پولیس کی زبانی جنید خان کو یہ حقیقت معلوم ہوجائے گی کہ میں نے یاسر بیگ بن کر اسے الو بنایا ہے۔ میری اس ''حرکت'' کے اغراض و مقاصد تک تو اس کا ذہن نہیں پہنچ سکے گا لیکن وہ پولیس کا کام آسان کرنے کے لیے انہیں اب تک ساجد محمود تک ضرور پہنچا چکا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ اس کے بعد پولیس نے تمہارے گھر کا رخ کیا ہو......''

''او مائی گاڈ......!'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو خاصی تشویش ناک صورتِ حال ہے۔''

’’صورتِ حال چاہے کتنی بھی سنگین اور تشویش ناک کیوں نہ ہو، اگر انسان اپنے دماغ کو قابو میں رکھے تو پھر ہر الجھن کی سلجھن نظر آجاتی ہے۔‘‘ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ’’اگر تم میرے بتائے پوائنٹس کو ذہن نشین کرلو گے تو پھر پریشانی والی کوئی بات نہیں۔‘‘

’’بتاؤ برو...... تمہارے ذہن میں کون سے پوائنٹس ہیں؟‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے مستفسر ہوا۔

’’میں بتاتا ہوں۔ پہلے تم اپنے گھر فون کرو۔‘‘ میں نے کہا۔

اس نے چونک کر پوچھا۔ ’’وہ کس لیے؟‘‘

’’گھر پر جو بھی موجود ہو اسے تاکید کر دو کہ اگر تمہارے بارے میں پولیس یا کوئی اور بھی پوچھنے آئے تو اسے یہی کہا جائے کہ تم کہیں باہر گئے ہوئے ہو۔ کہاں؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اگر کوئی اسد علی کے حوالے سے ان سے کوئی سوال کرے تو وہ لوگ اپنی کامل لاعلمی کا اظہار کردیں کہ وہ کسی اسد علی کو جانتے ہی نہیں۔‘‘

’’برو! یہ بہت بڑا جھوٹ ہوگا۔‘‘ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ’’اسے نبھانا مشکل ہوجائے گا۔‘‘

’’جھوٹ چھوٹا ہو یا بڑا، اسے نبھانے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’اور میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم بہت عقل مند ہو......!‘‘

’’میری عقل کے لیے کسی سمت کا تعین بھی تو کرو۔‘‘ وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ’’میں تو اس وقت بالکل بلینک ہوں۔‘‘

’’ویری سمپل عظیم الشان صاحب!‘‘ میں نے اسے اس کے ابتدائی اور دیسی گھی کے مانند اصلی نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’بلینک چیک، بھرے ہوئے چیک سے ہمیشہ زیادہ مالیت کا ہوتا ہے۔ میری بات دھیان سے سنو...... یہ راز صرف ماں کو معلوم تھا کہ تم میرے دوست ہو اور میں تمہارا دوست ہوں، تمہاری فیملی کا دوست ہوں اور تمہاری فیملی میری دوست ہے اور...... ماں اب اس دنیا میں باقی نہیں رہیں لہٰذا یہ راز بھی ان کے ساتھ ہی منوں مٹی کے نیچے جاسویا ہے۔ جہاں تک دیگر لوگوں کا سوال ہے تو......‘‘ میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

’’اس سوال پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے تم اپنے گھر والوں کو فون کرکے وہ سب ذہن نشین کرادو جس کی میں نے تمہیں تاکید کی ہے تاکہ ایک طرف سے اطمینان ہوجائے۔‘‘

اس نے میری ہدایات پر فوری عمل کیا۔ مالک کا شکر کہ ابھی تک پولیس نے عظیم کے گھر تک رسائی حاصل نہیں کی تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ ساجد محمود تا حال پولیس کے ہتھے نہیں چڑھا ہوگا۔ میں دوبارہ عظیم کی جانب متوجہ ہوگیا اور مدبرانہ لہجے میں کہا۔

’’جہاں تک ایسے تمام دوسرے لوگوں کا سوال ہے۔ جنہوں نے تمہیں میرے ساتھ ماں کے بنگلے پر یا کہیں اور دیکھا ہے ان میں جمشید اور بینا ہمارے کیمپ میں ہیں لہٰذا ان کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ خانساماں محمد حسین عرف بنگالی بابو ایک غیر متعلق اور بے ضرر انسان ہے اور وہ میرا احسان مند بھی ہے چنانچہ اس کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ نگینہ آنٹی اور ان کی لڑکیاں اگر تمہیں میرے ساتھ نتھی کرتی ہیں تو تم صاف مکر جانا کہ تم ان میں سے کسی کو نہیں جانتے۔ نادر شاہ ان میں سب سے زیادہ اہم بندہ ہے جس نے تمہیں کئی بار میرے ساتھ ماں کے بنگلے پر دیکھا ہے۔ سمجھ لو کہ اسی لمحے سے اس کا چہرہ تمہاری یادداشت سے محو ہوگیا۔ وہ تمہارے لیے ایک مکمل اجنبی شخص ہے۔ جنید خان سے بھی کبھی تمہاری ظاہرہ یا غائبانہ شناسائی نہیں رہی۔ ساجد محمود تمہارا دوست تو ہے مگر پچھلے کچھ عرصے سے تمہاری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس تناظر میں، تم مجھ سے ہرگز ہرگز واقف نہیں ہو اور میں بھی تمہیں نہیں جانتا۔ ہماری کبھی زندگی میں ملاقات ہوئی اور نہ ہی کبھی آمنا سامنا۔‘‘

’’برو......‘‘ وہ تعجب خیز لہجے میں بولا۔ ’’تمہاری کھوپڑی میں تو شیطان کا دماغ فٹ ہے۔‘‘

’’دماغ درحقیقت شیطان کی قیام گاہ ہے۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’اگر انسان دماغ کو چلانا سیکھ لے تو وہ حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔ اگرچہ میں دماغ کو بہت زیادہ استعمال کرنے کے حق میں نہیں ہوں لیکن یہ بھی ایک کڑوا سچ ہے کہ گھی نکالنے کے لیے انگلی کو ٹیڑھا کرنا ہی پڑتا ہے۔ وقت کے ابلیسوں سے نمٹنے کے لیے اسی نوعیت کی شیطانی منصوبہ بندی کرنا پڑتی ہے۔ اگر تم نے دونوں پاؤں جوڑ کر کمال ڈھٹائی سے، سامنے والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری ہدایت کے مطابق دروغ گوئی سے کام لے لیا تو سمجھو، بیڑا پار ہوگیا۔‘‘

وہ پُرسوچ انداز میں مستفسر ہوا۔ ’’تمہاری ساری باتیں میری سمجھ میں آگئی ہیں لیکن ’نامعلوم افراد‘ نے اگر میرے حوالے سے پولیس کو کچھ بتادیا تو پھر کیا ہوگا؟‘‘

’’تمہارا براہِ راست واسطہ شاکر سے تھا۔‘‘ میں نے

کہا۔ ’’اور شاکر پولیس کے ہتھے نہیں چڑھا تھا اور جہاں تک دیگر نامعلوم افراد کا معاملہ ہے تو ان میں سے دو افراد گرے ہائی روف میں نادر شاہ کے ساتھ تھے اور شاہ جی کے ساتھ ہی وہ پولیس کسٹڈی میں چلے گئے ہوں گے۔ یقیناً انہوں نے پولیس کو نادر شاہ کے اغوا کی کہانی سنائی ہوگی۔ وہ دونوں نامعلوم افراد تمہیں جانتے ہیں اور نہ ہی مجھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟‘‘

اپنی بات کے اختتام پر میں نے عظیم کے لیے ایک سوال چھوڑا تھا۔ اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔

’’برو! تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔‘‘

’’اب ذرا ٹائمنگ پر تھوڑا غور کرو۔‘‘ میں نے اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’پولیس کی چار موبائلز نے جمعے کی رات یعنی گیارہ جولائی کو لگ بھگ نو بجے یونیورسٹی روڈ پر کارروائی کرکے نادر شاہ اور دو نامعلوم افراد کو حراست میں لے لیا تھا اور آج ہفتے کی سہ پہر کم و بیش تین بجے پولیس نے نادر شاہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقریباً اٹھارہ گھنٹے یہ لوگ پولیس کے ٹرائل پر رہے ہیں۔ اگر نامعلوم افراد یا نادر شاہ نے پولیس کو تمہارے بارے میں کچھ بتایا ہوتا تو اس وقت تم یوں آزادانہ نہیں گھوم رہے ہوتے۔ پولیس کب کی تمہیں شاملِ تفتیش کرچکی ہوتی......‘‘

’’تمہاری بات میں وزن ہے برو۔‘‘ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’لیکن ہماری اطلاع کے مطابق پولیس نے نادر شاہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اس بات کا ہمیں علم نہیں کہ انہوں نے نامعلوم افراد کے ساتھ کیا کیا ہے۔ ہوسکتا ہے، وہ لوگ ابھی تک پولیس کسٹڈی میں ہوں......‘‘

’’جس چیز کا علم نہ ہو، اس کا علم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں عظیم۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟‘‘ اس نے چونک کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ’’تم گاڑی کو کسی محفوظ مقام پر روکو اور ابھی نامعلوم افراد سے رابطہ کرکے معلوم کرنے کی کوشش کرو۔‘‘

’’لیکن میں تو صرف شاکر کو جانتا ہوں۔‘‘ وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ’’اور اس نے تمہارے سامنے ہی اسپیکر فون پر مجھے تاکید کی تھی کہ میں اسے فون نہ کروں۔ وہ اپنا سیل فون آف کرکے منظر سے غائب ہورہا ہے۔‘‘

’’یہ ماضیِ قریب کا قصہ ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اور اس وقت ہم زمانۂ حال میں سانس لے رہے ہیں۔ اتفاق سے بدلتی ہوئی صورتِ حال نے ماضی کے قصے کو کالعدم کردیا ہے لہٰذا تم ٹرائی کرکے دیکھو۔ ہوسکتا ہے، شاکر سے تمہارا رابطہ ہوجائے اور یہ رابطہ ہمارے لیے کسی حوالے سے مفید ثابت ہو۔‘‘

’’ٹھیک ہے برو! میں شاکر کو فون کرتا ہوں۔‘‘ وہ گاڑی کو سڑک کے کنارے روکتے ہوئے بولا۔

ادھر عظیم کا جملہ مکمل ہوا، ادھر میرے سیل فون پر میسج ٹون بجی۔ بینا نے ٹیکسٹ کیا تھا۔

’’میں تمام ضروری کام نمٹانے کے بعد تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئی ہوں۔‘‘

’’اوکے!‘‘ میں نے ریپلائی ٹائپ کیا۔ ’’تم ادھر ہی وقت گزاری کرو۔ میں تھوڑی دیر میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔‘‘

بینا کا ’’اوکے‘‘ کا جواب آیا۔ میں عظیم کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس دوران میں اس نے شاکر سے رابطہ کرلیا تھا اور اپنے سیل فون کے اسپیکر کو بھی آن کرچکا تھا تاکہ ان کے بیچ ہونے والی گفتگو میں بھی سن سکوں۔

چوتھی، پانچویں یا شاید چھٹی گھنٹی پر دوسری جانب سے کال اٹینڈ کرلی گئی پھر اسپیکر میں سے شاکر کی جھنجلاہٹ بھری آواز ابھری۔ یہ آواز میں گزشتہ روز ماں کے بنگلے پر بھی اسی طرح عظیم کے سیل فون کے اسپیکر میں سن چکا تھا لہٰذا شناخت کے سلسلے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ عظیم سے مخاطب تھا۔

’’یار! میں نے تمہیں سختی سے منع بھی کیا تھا کہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرنا......‘‘

’’اگر بات محض منع کرنے تک محدود رہتی تو خیر تھی۔‘‘ عظیم نے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے تحمل سے بات چیت کا آغاز کیا۔ ’’تم نے تو پولیس کی خطرناک کارروائی کے نتیجے میں میرے ’’شکار‘‘ اور تمہارے دو ساتھیوں کے پکڑے جانے کا ذکر بھی کیا تھا۔ یہ سنگین اطلاع مجھے چین سے کیسے بیٹھنے دے گی۔‘‘

’’میرے ساتھیوں کے گرفتار ہونے سے تمہیں کیا پریشانی ہے؟‘‘ شاکر نے جھلاہٹ آمیز لہجے میں پوچھا۔

’’پریشانی کیوں نہیں ہوگی۔‘‘ عظیم بڑی ہوشیاری سے نپے تلے الفاظ کا استعمال کر رہا تھا۔ ’’اگر تمہارے ساتھیوں میں سے کسی نے پولیس کو بتادیا کہ انہوں نے میری فرمائش پر نادر شاہ کو اغوا کیا تھا تو کیا میری شامت نہیں آجائے گی۔‘‘

’’ایسا کچھ نہیں ہوگا۔‘‘ شاکر بے پروائی سے بولا۔ ’’اول تو میرے ساتھی تمہیں نہیں جانتے اور اگر وہ تم سے واقف بھی ہوتے تب بھی وہ پولیس کو تمہارے بارے میں کچھ نہ

بتاتے۔ ہم لوگ اپنے کلائنٹ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاتے، تم بے فکر رہو۔ ہم تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔''

میں نے اپنے سیل فون پر یہ ٹیکسٹ ٹائپ کر کے عظیم کے سامنے کر دیا۔ ''شاکر سے پوچھو، کیا اس کا اپنے ساتھیوں سے کوئی رابطہ ہوا...... اور ان کی پوزیشن کیا ہے......؟''

''میرے شکار کو تو آج تین بجے پولیس نے چھوڑ دیا ہے۔'' عظیم میرے حسبِ منشا شاکر سے بات کرنے لگا۔ ''تمہارے ساتھیوں کا کیا حال ہے۔ کیا تم سے ان کا کوئی رابطہ ہوا یا کسی اور ذریعے سے تم تک کوئی اطلاع پہنچی؟''

''پولیس میرے ساتھیوں کو بھی چھوڑنے پر آمادہ ہے۔'' شاکر نے بتایا۔ ''لیکن اس کام کے لیے ان کی فرمائش پوری کرنا پڑے گی۔''

''اوہ......!'' عظیم نے بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ''وہ کیا مانگ رہے ہیں؟''

''تین پیٹی!'' اسپیکر میں شاکر کی آواز ابھری۔

میں نے سوالیہ نظر سے عظیم کی جانب دیکھا۔

اس نے اشارے کی مدد سے مجھے سمجھایا کہ تین پیٹی کا مطلب ہے، تین لاکھ روپے۔ پھر وہ شاکر کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''کیا پولیس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے رقم کا بندوبست کر لیا گیا ہے؟''

''انہوں نے کل دوپہر تک کا وقت دیا ہے۔'' شاکر نے بتایا۔ ''میں اسی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ انہوں نے تو پانچ پیٹی کا مطالبہ کیا تھا۔ بڑی مشکل سے تین پیٹی پر راضی ہوئے ہیں۔''

''تم رقم کے انتظام کی کوشش میں لگے ہوئے ہو۔'' عظیم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، تم اپنے بندوں سے رابطے میں ہو اور تمہاری بات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک تمہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی یعنی تم تین لاکھ کا بندوبست نہیں کر سکے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو......'' شاکر نے گول مول جواب دیا۔

میں نے عظیم کو اشارہ کیا کہ فون مجھے دو۔ میں شاکر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ عظیم نے یہ کہتے ہوئے اپنا سیل فون میری جانب بڑھا دیا۔

''شاکر! لو، میرے ایک دوست سے بات کرو......''

''ہیلو باس!'' میں نے عظیم کے ہاتھ سے سیل فون لے کر شاکر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں عظیم کا ایک گہرا دوست ہوں۔ تم اگر کہو تو میں تمہارا یہ مسئلہ حل کر سکتا ہوں......''

''کون سا مسئلہ؟'' اس نے محتاط انداز میں دریافت کیا۔

''تین پیٹی کا مسئلہ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر تم چاہو تو میں کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے تمہیں تین لاکھ کیش فراہم کر سکتا ہوں۔''

وہ چوکنا انداز میں مستفسر ہوا۔ ''اس کے بدلے میں تم مجھ سے کیا چاہو گے؟''

''ادھورے مشن کی تکمیل!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ''کل عظیم نے تم لوگوں کو ایک مشن سونپا تھا جو پولیس کی کارروائی کے باعث پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا تھا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اب میں یہ کام تین لاکھ کے عوض کرانا چاہتا ہوں۔''

''تم چاہتے ہو کہ ہم اس اسٹیٹ ایجنٹ کو دوبارہ اٹھا کر کسی خفیہ مقام پر منتقل کر دیں اور پھر تمہاری ہدایات کے مطابق اس کا آڈیو ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کریں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، میں یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مگر تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ۔''

''کیسی تبدیلی؟''

''اب کی بار میں خود اس کے سامنے بیٹھ کر انٹرویو کروں گا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس انٹرویو کو ریکارڈ بھی نہیں کیا جائے گا مگر اس انٹرویو کے موقع پر تمہارا کوئی بندہ بھی وہاں موجود نہیں ہو گا۔''

''ہوں......'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تھوڑا اور تفصیل سے بتاؤ۔''

''تفصیل وفصیل کچھ نہیں ہے باس۔'' میں نے... دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''میں تمہیں نادر شاہ کی لوکیشن سے آگاہ کروں گا۔ تم اسے اٹھا کر اپنے کسی خفیہ اڈے پر منتقل کر دو گے۔ میں وہاں پہنچ کر اپنی طبیعت کے مطابق رج کر نادر شاہ کی ''خاطر داری'' کروں گا۔ تم میں سے کوئی بھی ہمارے بیچ نہیں آئے گا اور...... یہ کام آج ہی رات میں کرنا ہے۔ صبح تمہیں تین پیٹی کیش مل جائے گا...... بولو منظور ہے؟''

''یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔'' وہ بھاؤ کھانے لگا۔ ''ہمارے دو آدمی پہلے ہی پولیس کی تحویل میں ہیں۔ یہ نادر شاہ بہت ہی منحوس شخص ہے۔ اس کی وجہ سے ہم خوامخواہ مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ اگر دوبارہ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ہمارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

''میں تمہاری صرف ایک بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''باقی تم نے جو کچھ کہا اس کا بڑا کھرا جواب ہے میرے پاس......!''

''تم میری کون سی بات سے اتفاق کرتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نادر شاہ کے منحوس ہونے میں مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''اور وہ کھرا جواب بھی دے دو......''

''میری نظر میں تم ایک بزدل انسان ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میرا مشورہ یہ ہے کہ جرائم کی دنیا کو خیرباد کہہ کر تم کسی چوراہے پر سبزی فروٹ کا ٹھیلا لگا لو۔''

''تمہیں اندازہ نہیں کہ اس فیلڈ میں کتنی باریکیاں اور نزاکتیں ہوتی ہیں۔'' شاکر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''اوکے ...... میں اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے شاکر سے کہا پھر لائن کاٹ کر سیل فون عظیم کی جانب بڑھاتے ہوئے اسے پینا کو پک کرنے کے لیے مطلوبہ جگہ چلنے کے لیے کہا۔

''ٹھیک ہے، سمجھ گیا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ پھر متذبذب انداز میں اضافہ کیا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا کہ شاکر ایسی بزدلی کی بات کرے گا۔ وہ بہت زیادہ پولیس کے پریشر میں لگ رہا تھا ورنہ تین لاکھ کی آفر بڑی پُرکشش تھی۔''

''وہ بزدل ہے یا تیس مار خاں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میری چند باتیں ذہن نشین کر لو عظیم......''

''یس برو!'' وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔

''نمبر ایک......'' میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آئندہ چند روز تک تم شاکر سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں رکھو گے۔ اس کا فون آئے تو تم اٹینڈ نہیں کرو گے بلکہ تم اس کا کانٹیکٹ نمبر اپنے سیل فون کی بلیک لسٹ میں ڈال کر فون بک سے یہ نمبر ڈیلیٹ کر دو۔ نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری......''

''ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر وہ تمہاری آفر کو قبول کرنے کی بات کرنا چاہے تو......؟''

عظیم نے بہت اہم سوال کیا تھا لیکن اس حوالے سے میں اپنا ذہن بنا چکا تھا۔ شاکر نے جس انداز کی بات کی تھی اس کے بعد میں ان ''نامعلوم افراد'' سے کوئی بھی کام لینے کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے عظیم کے سوال کے جواب میں کہا۔

''میں نے وہ آفر کینسل کر دی ہے۔ جس نوالے میں کنکر نکل آئے اسے تھوک دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اگر نادر شاہ ان لوگوں کے لیے منحوس ثابت ہوا ہے تو یہ لوگ ہمارے لیے بھی کوئی سعد ثابت نہیں ہوئے لہٰذا اس چیپٹر کو کلوز کرنا ہی مناسب ہو گا۔''

''اوکے...... ہم ایسا ہی کریں گے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ پھر پوچھا۔ ''برو! مجھے اور کون سی باتیں ذہن نشین کرنا ہیں؟''

''نمبر دو......'' میں نے گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پینا اور میں اس وقت پینا کی دوست نادیہ یعنی بقول تمہارے، اس چشما تو حسینہ کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں جو چائنا ٹاؤن کے نزدیک ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتی ہے۔ تم ابھی ہم دونوں کو مذکورہ بلڈنگ تک ڈراپ کرو گے۔''

''یہ بھی ہو جائے گا اور کچھ......؟''

''نمبر تین......'' میں نے سب سے اہم نکتہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ڈراپ کرنے کے بعد تم سیدھے اپنے گھر جاؤ گے اور میری تمام ہدایات تو تم اپنے ذہن میں ہمیشہ تر و تازہ رکھو گے اور......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور...... ہم چند روز کے لیے ایک دوسرے سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے یعنی ہم واقعتاً ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی ہو جائیں گے۔''

''یہ تو بہت ہی مشکل کام ہے برو......'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

''آسان کام تو ہر کوئی کر لیتا ہے عظیم۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مزہ تو مشکل کام کرنے ہی میں آتا ہے۔ مشکلات کا سامنا کرنا بہادر لوگوں کا شیوہ ہے اور میری نظر میں تم ایک دلیر اور بہادر انسان ہو۔''

''جبھی تو تم سے یہ عارضی جدائی مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔'' وہ پُرخلوص انداز میں بولا۔ ''مشکل کی اس گھڑی میں، میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ تم چاروں جانب سے مصائب میں گھرے ہوئے ہو۔''

''جانتا ہوں...... اسی لیے میں نے تمہیں یہ مشورہ دیا

ہے۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن ہمارا لاتعلق رہنا ہم دونوں کے تحفظ اور سلامتی کے لیے بہت ضروری ہے۔“

”دل پر بھاری پتھر رکھ کر میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔“ وہ دکھی لہجے میں بولا۔

”میرے دل پر بھی بہت بوجھ ہے۔“ میں نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تمہاری شکل میں مجھے ایک وفادار دوست میسر ہے جسے میں کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہوں گا تاہم یہ عارضی جدائی موجودہ سنگین حالات کے پیشِ نظر ہے۔ انشاء اللہ...... بہت جلد ہم دوبارہ ایک ساتھ ہوں گے۔“

”انشاء اللہ!“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

☆☆☆

ڈیلفینا کے ساتھ میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ وہ تو مجھے اپنا حقیقی دوست بنانے کے لیے کوشاں تھی۔ پریسٹن ہالو والے بنگلے پر ربی آئزک نے ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے باور کرا دیا تھا کہ میں ان کا مطلوبہ بندہ ہوں۔ ربی ہی کے اشارے پر ڈیلفینا مجھے اپنی سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنانے کی خواہش مند تھی۔ میں نے اس کی قربت میں، ڈیلس کے پوش علاقے پر پریسٹن ہالو میں جو رنگین اور سنگین بہتر گھنٹے گزارے تھے اس دوران میں مجھے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا اور ڈیلفینا کو بھی...... کیونکہ میں اس کی پیشکش کو جوتے کی نوک پر مار کر وہاں سے چلا آیا تھا۔ زمینی خداؤں کے لیے اس سے بڑا اور کوئی دھچکا ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص ان کی آفر کو ٹھکرا دے جبکہ دنیا کے ذہین ترین افراد اس سنہری موقع کی تلاش میں برسوں سے خواب دیکھ رہے ہوں۔

ایک میں ہی تھا جو ڈیلفینا کے ارمانوں پر اوس چھڑک آیا تھا۔ اس کی بیش بہا پیشکش کو میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ مجھے زمینی خدا بنانا چاہتی تھی لیکن میں ان کی طاقت اور قدرت سے مرعوب نہیں ہوا تھا اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ میں آسمانی خدا کو ماننے والا تھا۔ میں اپنے رب کی طاقت اور قدرت پر یقین رکھتا تھا اور مجھے اپنے مالک کی تقسیم سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔

ڈیلفینا کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے خیالات کا دھارا یکایک شارو کی جانب مڑ گیا۔

پتا نہیں کیوں، مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میرا دل جیتنے کے لیے ڈیلفینا، شارو کی عزت و آبرو پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دے گی۔ ڈیلفینا جانتی تھی کہ شارو میری کمزوری ہے۔ وہ مجھے جھکانے کے لیے میری کمزوری کو صحیح وسالم حالت میں ضرور ہاتھ میں رکھتی تاکہ بہ وقتِ ضرورت مجھے حاصل کرنے کے لیے وہ شارو کو استعمال کر سکے۔

شارو کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے عجیب سی لذت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی یاد میں بڑی فرحت بخش مہک تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی خوشبو میری رگوں میں رچی بسی ہو۔ انکل علی سلطان نے مجھے بتایا تھا کہ شارو کے معنی ہیں، خوب صورت پھول۔ وہ واقعی ایک تر و تازہ مہکتا ہوا پھول ہی تھی۔ ریو ڈی جنیرو سے تعلق رکھنے والی اس ہسپانوی برازیلین دوشیزہ نے اپنے احساس کی خوشبو سے میری روح کو سرشار کر رکھا تھا۔

یہ تمام تر خیالات بڑے تواتر کے ساتھ میرے ذہن سے گزر رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے مشن میں بھی مصروف تھا۔ وہ مشن جس کے نتیجے میں، میں نے دو خطرناک ذہین جرمن شیفرڈ کو گمراہ کرنا تھا۔ وہ میرے بدن کی مخصوص بو کو سونگھتے ہوئے مجھ تک رسائی حاصل کر سکتے تھے اور میں ان کی اسی صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ دشمن کے ہتھیار کو اسی کے اوپر استعمال کرنے کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے اور میں اپنے کمرے میں بند تھا۔ عظیم ہمیں مذکورہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے گیٹ پر ڈراپ کر کے واپس چلا گیا تھا۔ میں نے اور نادیہ نے ایک ساتھ روزہ کھولا تھا۔ بینا نے بھی ہمارا ساتھ دیا تھا۔ لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے میں ان کے بیچ سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں آ گیا تھا۔ بینا کو میں نے اپنے اس ”مشن“ کے بارے میں بتا رکھا تھا لہٰذا جب میں اپنے بیڈروم کی جانب بڑھا تو اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

میں اپنے بیڈروم میں بند تھا اور میرا پورا بدن پسینا اگل رہا تھا۔ میں مسلسل ایکسر سائز میں مصروف تھا جس کی وجہ سے میرا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا اور اس پسینے نے وجود پر موجود لباس کو بھگو دیا تھا۔ میں نے دانستہ کمرے کا اے سی آف کر رکھا تھا تاکہ بیڈروم کا اندرونی موسم گرم رہے جس کے نتیجے میں میرا بدن بھل بھل پسینا اگلتا رہے۔ جس کی وجہ سے مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ ایک لباس جب پوری طرح پسینے میں بھیگ جاتا تو میں اسے اتار کر پلاسٹک کے ایک شاپنگ بیگ میں بند کر دیتا اور نیا لباس پہن کر دوبارہ

ایکسر سائز شروع کر دیتا۔ میرا یہ عمل بڑے تسلسل کے ساتھ جاری تھا۔

آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد میں نے چار ایسے ایئر ٹائٹ شاپنگ بیگ تیار کر لیے جن کے اندر میرے پسینے میں نہائے ہوئے لباس بند تھے۔ جب بھی ان بیگز کو کھلی فضا میں کھولا جاتا تو وہ مخصوص بو چشم زدن میں قید سے رہائی پا کر ارد گرد کے ماحول میں سرایت کر جاتی جس سے جرمن شیفرڈ کے نتھنے خوشی سے پھڑ پھڑا اٹھتے اور وہ اپنی اسنفنگ پاور کو کام میں لا کر میری تلاش میں بھاگ نکلتے۔ ان چار شاپنگ بیگز کو میں نے کب اور کہاں استعمال کرنا تھا اس حوالے سے ایک جامع منصوبہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

میں نے ان تیار شدہ چار شاپنگ بیگز کو ایک سفری بیگ کے اندر رکھ کر اس کی زپ کو اچھی طرح بند کر دیا۔ اس کے بعد میں نے بیگ کو بیڈ کے نیچے گھسا دیا۔ یہ وہی لباس تھے جو عظیم نے میرے لیے خریدے تھے۔ اس کے بعد میں نے ایک بھرپور شاور لیا اور نیا لباس پہن کر بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ نیا لباس پہننے سے پہلے میں نے اپنے جسم پر باڈی اسپرے کا استعمال کیا تھا۔ اگرچہ میں اس وقت ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر واقع اس اپارٹمنٹ کے اندر بند تھا لیکن حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ حتی الامکان احتیاط سے کام لیا جائے۔ خوشبو کا استعمال اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

سٹنگ روم میں بینا کو اکیلے بیٹھے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

”وہ لاتورترا کہاں گئی ہے؟“

”کون......؟“ وہ الجھن زدہ انداز میں مستفسر ہوئی۔

”ارے یار! میں نادیہ کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر لاتورترا کیوں کہہ رہے ہو؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”کیا یہ بھی چشماٹو کی طرح کا کوئی نیا نام ہے۔“

”چشماٹو عظیم کا دیا ہوا نام ہے۔“ میں نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے وضاحت کی۔ ”جو اس نے نادیہ کے چشمے کی وجہ سے دیا تھا۔“

”اور یہ لاتورترا کیا تمہارا دیا ہوا نام ہے۔“ وہ چونک کر بولی پھر اچانک اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیکھے انداز میں گویا ہوئی۔ ”میں تمہاری بدمعاشی کو سمجھ رہی ہوں۔“

”کیا یہ میری کسی ایسی بدمعاشی کا ذکر ہے جو میں نے ابھی کی ہی نہیں...... مگر عنقریب کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں؟“

”زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں۔“ وہ مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی۔ ”تم نے پھر شکیرا کا تذکرہ چھیڑ دیا ہے نا۔ یہ اسی کے ایک پاپ سونگ کا ٹائٹل ہے۔“

”اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”اپنی غائبانہ نام نہاد سوتن کے جس گانے کو تم ”پاپ سونگ“ کہہ رہی ہو وہ میری نگاہ میں ایک ”ٹریجڈی سونگ“ ہے۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

”تمہیں تو اپنی اسی چہیتی کی حمایت کرنا ہے نا۔“ وہ خفگی آمیز انداز میں بولی۔

میں نے کہا...... لاتورترا“ کا مطلب ہے ”دی ٹارچر“ اور...... ٹارچر کسی بھی نوعیت کا ہو وہ ٹریجڈی کے زمرے ہی میں آتا ہے۔ اگر تم نے وہ گانا توجہ سے سنا اور دیکھا ہے تو تمہیں اس کے تھیم میں نادیہ کی اسٹوری دکھائی دے گی۔“

”میں اسپینش نہیں سمجھ سکتی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”اور یہ سونگ اسپینش میں ہے۔“

”اسی لیے تمہیں غلط فہمی ہوئی کہ وہ کوئی پاپ سونگ ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وضاحت کی۔

”تو تم یہ سمجھتے ہو کہ نادیہ کا بے وفا محبوب عمران بھی ایک دن لوٹ کر اس کے پاس آئے گا......“ اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”اور منت خوشامد کر کے اسے منانے کی کوشش کرے گا؟“

”یہ تو آنے والا وقت ہی بتلائے گا۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ جو کسی کا دل توڑتا ہے وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ وہ اندر ہی اندر پچھتاوے، ندامت اور شرمندگی کی آگ میں جلتا رہتا ہے اور ایک دن یہی آگ اسے جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ کسی بھی مرد کی طرف سے عورت کو دیا جانے والا سب سے قیمتی اور انمول تحفہ عزت ہوتا ہے اور مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ عورت کو یہ اہم اور بیش قیمت تحفہ دینا ہر مرد کے بس کی بات نہیں۔“

”حالانکہ اس تحفے پر ایک روپیہ بھی خرچ نہیں

ہوتا......“ وہ بولی۔

”ہم کسی کو وہی کچھ دے سکتے ہیں جو ہمارے پاس موجود ہوتا ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”سامنے والے کو عزت دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم خود بھی عزت دار ہوں۔ میری نظر میں عمران ایک گھٹیا اور بے غیرت شخص ہے۔ اس نے نادیہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچا کر اس کی محبت کا مذاق اڑایا ہے اور اس نوعیت کی بے حسی اور سفاکی کا مظاہرہ کرنے والے لوگ ایک دن بری طرح ذلیل و رسوا ہوتے ہیں۔“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”اگر تمہیں میرا کہا ہوا ٹھیک لگ رہا ہے تو پھر بتاؤ، وہ لاتور ترا...... میرا مطلب ہے، نادیہ کہاں ہے؟“

”وہ اپنے بیڈ روم میں ہے اور میرا خیال ہے، وہ اب تک سو چکی ہوگی۔“ بینا نے بتایا۔ ”وہ خاصی تھکی ہوئی تھی اور تمہارے جاتے ہی وہ بھی سٹنگ روم سے اٹھ گئی تھی۔ صبح اسے اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے۔“

”نادیہ کی فلائٹ کتنے بجے کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ائرپورٹ جانے کے لیے صبح سات بجے گھر سے نکلے گی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس کی آٹھ کے بعد کی فلائٹ ہے۔“

”تم نے ابھی تک مجھے اپنی خریداری نہیں دکھائی......“

”وہ سب بیڈروم میں رکھا ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”چلو وہیں چل کر دیکھتے ہیں۔“

میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بینا نے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کی کنڈیاں اور لاک وغیرہ چیک کیے۔ اس دوران میں، میں فش ایکوریم کے سامنے کھڑا رنگ برنگی مچھلیوں کی اٹھکیلیاں دیکھتا رہا۔ بینا نے سٹنگ روم کی لائٹ کو آن ہی رہنے دیا اور ہم اپنے بیڈروم میں آگئے۔

”تم کافی فریش اور مطمئن نظر آرہے ہو۔“ بینا نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، تم نے اپنا کام مکمل کرلیا ہے۔“

بیڈروم والے اے سی کو میں نے اسی وقت آن کردیا تھا جب میں شاور لینے کی غرض سے واش روم میں گھسا تھا۔ اب تک کمرے کا موسم خاصا خوشگوار ہو چکا تھا۔ میں نے بیڈ کے نیچے سے سفری بیگ کو کھینچ کر باہر نکالا اور بینا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”اس بیگ کے اندر میں نے چار شاپنگ بیگز تیار کرکے بند کردیے ہیں جن میں سے ہر شاپنگ بیگ میں میرا پسینے سے تربتر ایک لباس موجود ہے۔ میں نے تمام شاپنگ بیگز کو ایئر ٹائٹ کردیا ہے گویا ہر بیگ کے اندر میرے بدن کی مخصوص بو کا عظیم ذخیرہ موجود ہے۔ میں نے اپنا کام کردیا۔ اس کے بعد تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔“

”میں اپنے حصے کے کام کے لیے تیار ہوں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”تم بریف کردو، صبح مجھے کیا کرنا ہے؟“

میں نے سفری بیگ کو واپس بیڈ کے نیچے پہنچا دیا اور کہا۔ ”تم صبح جب نادیہ کو ائرپورٹ چھوڑنے جاؤ گی تو یہ بیگ تمہارے ساتھ جائے گا۔ اس مقصد کے لیے تم اپنی گاڑی استعمال نہیں کروگی۔ بہتر ہوگا کہ تم کسی ریڈیو کیب کو کال کرلو اور......“

”نادیہ نے وہائٹ کیب منگوالی ہے۔“ بینا میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔ ”مذکورہ کیب پونے سات بجے اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے گیٹ پر پہنچ جائے گی۔“

”گڈ......!“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”بیگ کے حوالے سے تم نادیہ سے کوئی بھی بہانہ کرسکتی ہو کہ کسی کی امانت واپسی میں تمہیں کہیں پہنچانا ہے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میں نے اس حوالے سے پہلے ہی اسے ایک جاندار اسٹوری سنا دی ہے۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ ”وہ پوچھ رہی تھی، میں اپنی گاڑی میں اسے ائرپورٹ چھوڑنے کیوں نہیں جارہی؟ میں نے کہہ دیا کہ میری گاڑی میں کچھ کام ہے۔ میں تمہارا راستہ کھوٹا نہیں کرنا چاہتی۔ جب تک میری گاڑی مکینک کے ورکشاپ کا ایک چکر نہ لگالے، میں اس پر بھروسا نہیں کرسکتی اور نہ ہی اسے کسی اہم سفر کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ ہے۔ میری بات بینا کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے کوئی حیل حجت نہیں کی۔“

”گویا تم نے اپنے حصے کا آدھا کام نمٹا دیا ہے۔“ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”باقی کا آدھا کام اس وقت کرنا ہے جب تم نادیہ کو ائرپورٹ پہنچانے کے بعد واپسی کی راہ لوگی۔ تمہیں راستے میں تقریباً ایک جیسے فاصلے سے چار مختلف مقامات پر ایک ایک شاپنگ بیگ کو کھول کر کہیں رکھ دینا ہے۔“ میں نے اسے مطلوبہ مقامات کے بارے میں سمجھایا جہاں جہاں اسے بیگ رکھنے تھے۔ ”تم میری بات سمجھ رہی ہونا......“

”اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”تم ڈیلفینا کے کتوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہو کہ اسد علی اتوار کی صبح اس علاقے سے نکل کر ائرپورٹ کی طرف گیا ہے یعنی وہ کراچی سے باہر کسی

دوسرے شہر یا پاکستان سے باہر کسی دوسرے ملک روانہ ہوگیا ہے۔ ایم آئی رائٹ......؟“

بات کے اختتام پر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”یو آر ایبسولیوٹلی رائٹ!“

”ویسے ایک بات ہے علی۔“ وہ توصیفی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم نے اپنے پسینے والے کپڑوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ شاپنگ بیگز کے اندر بند کیا ہے۔ تمہارے بدن کی مخصوص بو صحیح معنوں میں ان بیگز کے اندر قید ہوکر رہ گئی ہے ورنہ اے سی والے کمرے میں نفوذ پذیری کے باعث ہلکی سی بو بھی فوراً محسوس ہوجاتی ہے۔“

”جیسے تمہارے بدن کی بھینی بھینی خوشبو میری سانسوں کو مہکا رہی ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہ بھی نفوذ پذیری کا کرشمہ ہے......؟“

”ٹھہرو، میں تمہیں وہ پرفیومز دکھاتی ہوں جو میں نے تمہارے کہنے پر خریدے ہیں۔“ وہ میرے سامنے سے اٹھ کر الماری کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ ”اب یہ سب تمہیں پسند آجائیں......“

پتا نہیں، یہ میرے چٹکی لینے کا اثر تھا یا اس کے ذہن میں کوئی اور بات تھی کہ وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے الماری کی طرف بڑھ گئی تھی۔ چند لمحات کے بعد وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں دو تین بیگز تھے جن کے اندر مختلف اقسام کی خوشبویات بھری ہوئی تھیں۔ اس نے وہ بیگز بیڈ پر الٹ دیے اور معتدل انداز میں بولی۔

”چیک کرلو......“

میں نے ”چیک“ کیا۔ ان خوشبویات میں پرفیومز اور باڈی اسپرے شامل تھے۔ میں نے ان میں سے ایک فینسی فرانسیسی پرفیوم اٹھا کر کہا۔

”یہ او ڈی کولون مجھے بہت پسند ہے۔ فور سیون ڈبل ون مردوں کے استعمال کا ایک ہائی کلاس پرفیوم ہے۔“

اس نے سراہنے والے انداز میں دیکھا پھر اس نے کولون کی بوتل میں سے میرے لباس پر اسپرے کرتے ہوئے زندہ دلی سے کہا۔ ”علی! یہ تمہارے تحفظ اور سلامتی کے نام اور...... کتوں کی اس جوڑی کو گمراہ کرنے کی خاطر۔“

مجھے شرارت سوجھی اور میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تم نے کتوں کے لیے ”جوڑی“ کا لفظ استعمال کیا ہے لہٰذا تمہیں بتاتا چلوں کہ وہ واقعی جرمن شیفرڈ کی جوڑی ہے۔“

”بھئی! اگر کتے دو ہیں تو وہ جوڑی ہی کہلائیں گے نا۔“ وہ حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولی۔ ”کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟“

”نہیں...... تم نے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔“ میں نے بہ دستور معنی خیز انداز میں بات کو آگے بڑھایا۔ ”لیکن وہ دو کتوں کی ایک جوڑی محض نہیں ہے......“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔

میں نے انکشاف انگیز لہجے میں اسے بتایا۔ ”ان جرمن شیفرڈ ڈاگز میں سے ایک نر اور ایک مادہ ہے۔ مطلب یہ کہ وہ صحیح معنوں میں ایک جوڑی ہیں۔“

”واہ وا...... سبحان اللہ......!“ وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ”علی! تم نے بڑی کمال کی نگاہ پائی ہے۔ ارے یار، تم نے تو کتوں کی ایک جوڑی میں مادہ کو بھی شناخت کرلیا۔ مطلب، نظر اٹھی بھی تو مادہ ہی پر پڑی...... کیا کہنے!“

”میں نے مادہ کے ساتھ نر کا بھی ذکر کیا ہے۔“ میں نے قدرے مصنوعی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”انسان کی کھوپڑی میں دماغ اور چہرے پر آنکھیں موجود ہوں تو اسے نر اور مادہ میں صاف فرق نظر آجاتا ہے۔“

”ذرا مجھے بھی تو بتاؤ کہ تم نے نر اور مادہ جرمن شیفرڈ کو الگ الگ کیسے پہچان لیا؟“

”اس لیے کہ دونوں کا قد اور وزن ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے امید ہے، آیندہ ملاقات میں تمہارا جادو اس پر چل جائے گا۔ وہ مادہ جرمن شیفرڈ تمہاری خاطر اپنے نر سے جھگڑا کرے گی۔ اس طرح تم اس کے سایے میں محفوظ ہوجاؤ گے......“ لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”نتیجے کے طور پر تمہاری چاہنے والیوں میں ایک جرمن نژاد کا خاصا ہیلدی اضافہ ہوجائے گا۔ اس کے آگے تین تین اسپینش کھڑی ہیں۔“

”تمہاری اطلاع اور ریکارڈ کی درستی کے لیے عرض ہے کہ اس جرمن شیفرڈ نام نہاد چاہنے والی کے آگے تین اسپینش کے علاوہ ایک جرمن نژاد پہلے سے کھڑی ہے۔ بے چاری اس جرمن شیفرڈ کو کسی فرینکفرٹن کے عقب میں کھڑا ہونا پڑے گا۔“

بینا جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کی

ماں ایلس کا تعلق جرمنی سے تھا لہٰذا وہ میرا اشارہ بخوبی سمجھ گئی تھی۔ بینا میرے دوستوں کی فہرست میں ایک گراں قدر اضافہ تھی۔ میرے ریمارکس پر اس نے گھور کر مجھے دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، میرا سیل فون بول اٹھا۔

میں نے بے ساختہ نگاہ اٹھا کر دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا۔ وال کلاک دس بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ ایک گھنٹی بجنے کے بعد سیل فون خاموش ہو گیا تھا۔ بینا نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔

''اس وقت تمہیں کون مس کال دے رہا ہے؟''

''دے رہا نہیں، دے رہی ہے۔'' میں نے اس سے تفریح لینے کی غرض سے کہا پھر سیل فون اٹھا کر چیک کیا۔

''مادہ جرمن شیفرڈ کی مس کال ہے۔'' میں نے سیل فون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''علی! میں سیریس ہوں۔'' وہ جھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

میں مذاق کے موڈ میں تھا اس لیے سنجیدگی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی سیریس ہوں بینا اور...... وہ جرمن شیفرڈ مادہ بھی......!''

''یہ کیا بے ہودگی ہے......''

''یہ بے ہودگی نہیں، سچائی ہے۔'' میں نے ناٹک کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔

''مجھے الو بنا رہے تھے نا......؟''

''ارے یار! میں مذاق کر رہا تھا۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''غصہ تھوک دو۔ یہ جمشید کی مس کال تھی۔ میں اسے فون کر رہا ہوں۔ ذرا سنیں تو سہی، وہ کیا کہہ رہا ہے۔''

بینا کیا یک شانت ہو گئی۔

میں نے جمشید کا نمبر ملایا۔ دوسری گھنٹی پر اس نے کال اٹینڈ کر لی۔ اس کے ''ہیلو'' کے جواب میں، میں نے پوچھا۔

''جمشید! کیا خبریں ہیں؟''

میں نے اپنے سیل فون کا اسپیکر بھی آن کر دیا تھا تاکہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو بینا بھی سن سکے۔ جمشید نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''سر! نادر شاہ واپس آ گیا ہے۔''

''اس کی واپسی کے بارے میں تو میں نے تمہیں دن میں بتا ہی دیا تھا۔''

''جی سر۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ پولیس نے اسے چھوڑ دیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اور یہ بھی کہا تھا کہ زیادہ امکان اس بات کا ہے، وہ اب کی بار پولیس کا مخبر بن کر آیا ہو لہٰذا اس کی طرف سے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو مس کال کیا تھا۔''

میں جمشید کی بات سن کر چونک اٹھا۔ ''کیا اس نے کوئی نیا گل کھلا دیا ہے؟'' میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''وہ تھوڑی دیر پہلے بنگلے پر پہنچا ہے۔'' جمشید نے بتایا۔ ''اور کہہ رہا ہے، وہ آج کی رات ادھر ہی رکے گا۔ اس نے آپ والے بیڈ روم میں ڈیرا ڈال دیا ہے، مجھے اس کے ارادے اچھے نظر نہیں آ رہے سر......''

میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''کیا بنگالی بابو بنگلے پر موجود ہے؟''

جمشید نے نادر شاہ کے بنگلے پر قیام کے حوالے سے جو انکشاف کیا تھا اس نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ میرا دماغ معمول سے ہزار گنا زیادہ تیز رفتار سے سوچ رہا تھا۔ چشم زدن میں مجھے نامعلوم افراد کا ''نعم البدل'' نظر آ گیا تھا۔

''نہیں سر۔ وہ تھوڑی دیر پہلے یعنی نادر شاہ کی آمد سے چند منٹ قبل... اپنے گھر چلا گیا ہے۔'' جمشید نے بتایا۔ ''اب وہ پیر کی صبح دس بجے تک آئے گا۔''

''گڈ......!'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا پھر اس سے پوچھا۔ ''سامنے والے بنگلے کی طرف کیا سچویشن ہے؟''

''اس جانب امن و امان ہے سر۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پہلے دن کے بعد سے مجھے اس بنگلے کی چھت پر کسی نوعیت کی مشکوک حرکت دکھائی نہیں دی۔ لگتا ہے، یا تو وہ میرا وہم تھا اور یا پھر وہ لوگ مایوس ہو کر واپس چلے گئے ہیں۔''

''اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مذکورہ بنگلے میں کوئی ایسا حساس نظام لگا دیا ہو جو تمہارے والے بنگلے کے اندر اور باہر ہونے والی سرگرمیوں کو اپنے پاس محفوظ کر رہا ہو......'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''جی سر۔ میں آپ کی بات سے اختلاف نہیں کروں گا۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''احتیاط کا دامن تو ہمیں کسی بھی صورت میں ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم ہر لحظہ حالتِ جنگ میں ہیں۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے سر؟'' اس نے گہری سنجیدگی

سے پوچھا۔

''حکم نہیں احکامات ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب میں تم سے جو کچھ بھی کہنے جا رہا ہوں اسے پوری توجہ سے سن کر ذہن نشین کر لینا۔ جب میں فون بند کروں تو تم نے میری باتوں پر نمبروار عمل شروع کر دینا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''سر! میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس وقت تمہارے اور نادر شاہ کے سوا اور کوئی بنگلے میں موجود نہیں اور شاہ جی نے میرے والے بیڈ روم کو شب بسری کے لیے چن لیا ہے؟''

''جی سر۔ ایسا ہی ہے۔''

''تم جی جان سے نادر شاہ کی خدمت میں لگ جاؤ اور اس کے سامنے میرے خلاف باتیں کرو۔ اسے باور کراؤ کہ تم مجھے کوئی فراڈ قسم کا انسان سمجھتے ہو۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں ایسا ہی کروں گا سر۔'' اس نے کہا۔

''اس کے ساتھ ہی تم اپنے ریلوے کالونی والے دوست غلام عباس کو فون کر کے بتاؤ کہ آج کی رات تم اس کے ساتھ گزارنے آ رہے ہو کیونکہ کل صبح تمہیں اپنے گاؤں گوجرہ روانہ ہونا ہے۔'' میں نے احکامات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تم نے غلام عباس کو کسی تفصیل سے آگاہ نہیں کرنا۔ میں نے جتنا کہا ہے، بس اسی پر عمل کرنا ہے۔''

''میں آپ کی ہدایت کے مطابق ہی چلوں گا سر۔'' وہ معتدل انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ''کیا میں کل واقعی گوجرہ جا رہا ہوں؟''

''اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ کل صبح تم اپنے گاؤں جا رہے ہو۔'' میں نے دوٹوک انداز میں اسے بتایا۔ ''اس کے بارے میں تفصیلات میں تمہیں تھوڑی دیر کے بعد بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے سر۔ میں ابھی غلام عباس کو فون کرتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''اس فون سے پہلے تمہیں اپنا سامان پیک کرنا ہے۔'' میں نے ہدایات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''دیگر سامان کے علاوہ اپنے استعمال شدہ اور صاف تمام کپڑے ایک بیگ میں بھر کر ریڈی ہو جاؤ۔ تمہارا کوئی بھی میلا یا دھلا ہوا کپڑا یہاں نہیں رہنا چاہیے ورنہ تمہیں تو پتا ہی ہے، وہ جرمن شیفرڈ کتنے کاریگر قسم کے کتے ہیں۔ وہ تمہیں سونگھتے ہوئے صبح سے پہلے ہی غلام عباس کے کوارٹر پر پہنچ جائیں گے۔''

''میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ گیا سر۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے، میری ایک خواہش کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔''

''ایک نہیں، تمہاری دونوں خواہشات بیک وقت پوری ہونے والی ہیں۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں اسے بتایا۔

آخری گفتگو میں جمشید نے میرے سامنے اپنی دو شدید خواہشات کا ذکر کیا تھا۔ نادر شاہ کے حوالے سے میں نے جمشید سے کہا تھا...... اگر وہ میرے ہاتھوں سے بچ گیا تو تمہارا ہوا۔

''سر! اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو......'' وہ فرطِ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔ ''تو آپ شاہ جی کو کیفرِ کردار تک پہنچانے بنگلے پر آ رہے ہیں......''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے اس کی مسرت کو سہ بالا کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس نیک کام میں تم میرے اسسٹنٹ کا کردار ادا کرو گے۔''

''یہ میری خوش نصیبی ہو گی سر۔'' وہ توانا لہجے میں بولا۔ ''ویسے آپ کی آمد کب تک ہو گی؟''

''میں آدھے پونے گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں یا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا۔ یوں سمجھو کہ ساڑھے گیارہ ڈیڈ لائن ہے۔ اس سے پہلے میں کسی بھی وقت بنگلے پر پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''او کے سر! میں آپ کے استقبال کے لیے گیٹ پر موجود رہوں گا۔'' وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔

''تم میرے استقبال کے لیے اپنی توانائی ضائع نہیں کرو گے جمشید!'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''پھر میں کیا کروں سر......؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''اس مشن میں تم میرے اسسٹنٹ ہو۔'' میں نے کہا۔ ''بس، میں جو ہدایات دوں، اس کے مطابق عمل کرتے جاؤ۔ باقی جہاں تک میری آمد کا معاملہ ہے تو میں جب تمہارے نمبر پر کال کروں تو سمجھ لینا، میں بنگلے کے اندر پہنچ چکا ہوں۔ تم میری کال کو ریسیو نہیں کرنا۔ لائن کو کاٹ کر ریڈ الرٹ ہو جانا۔ اگر میری کال نادر شاہ کے سامنے آئے تو کہہ دینا کہ رانگ نمبر ہے...... ہر صورت میں تمہیں میری

کال کو کاٹ دینا ہے۔"

"سمجھ گیا سر۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اگر آپ کی آمد سے قبل کرنے کا کوئی اہم کام ہو تو بتا دیں۔"

"تم نے کبھی قصاب کو بیل گراتے دیکھا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جی سر، دیکھا ہے اور اپنے ہاتھوں سے گرایا بھی ہے۔" جمشید کے ہلکے قہقہے کی آواز میری سماعت تک پہنچی پھر اس نے پُرعزم انداز میں کہا۔

"سر! آپ بالکل مطمئن ہو جائیں۔ یہ اسسٹنٹ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔ میں آپ کو ہر آسانی فراہم کروں گا۔ اس بدذات نادر شاہ کے لیے میرے دل و دماغ میں نفرت کا ایک طوفان چکرا رہا ہے۔ جب آپ یہاں پہنچیں گے تو یہ چھل سرکاری سانڈ آپ کو زمین پر گرا ملے گا۔"

میں نے اطمینان بھری گہری سانس خارج کرتے ہوئے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا۔

بینا نے یہ تمام تر گفتگو سنی تھی تاہم وہ اس دوران میں ایک دم خاموش بیٹھی رہی تھی۔ میں نے سیل فون کو ایک طرف رکھا تو وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"علی! مجھے تمہارے ارادے بڑے خطرناک نظر آ رہے ہیں۔"

"کس بارے میں؟" میں انجان بن گیا۔

"میں نادر شاہ کی بات کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "تم نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"فی الحال تو میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے جواب دیا۔

"میں سمجھی نہیں۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

"دن بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے بری طرح تھکا دیا ہے۔" میں نے ایک انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "میری بیٹری ڈاؤن ہو چکی ہے۔ میں اسے چارج کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھی کی اداکاری کرتے ہوئے بڑی معصومیت سے مستفسر ہوئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

میں نے اپنا مطلب سمجھانے کے لیے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس نے شمہ بھر مزاحمت نہیں کی۔ وہ کسی خزاں رسیدہ پتے کے مانند ڈالی سے ٹوٹ کر ہوا کے دوش پر ڈولتے ہوئے میری آغوش میں آ گری۔

میں نے بڑی احتیاط مگر وارفتگی کے ساتھ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ وہ خود سپردگی کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھی۔ میں نے بہ آہستگی اپنے تشنہ لبوں کو اس کے رسیلے ہونٹوں میں پیوست کر دیا۔ اگلے ہی لمحے ہم حواس یافتگی اور حواس باختگی کی منزلوں سے گزر کر کیف و سرور کے جزیرے کی سیر کو نکل گئے۔

اس کے بدن کی معنی خیز اور لذت آفریں جنبش میرے بازوؤں کے حلقے میں اعضا کی شاعری پیش کر رہی تھیں۔ میں بڑی مہارت سے اس "دی بیوٹی فل آئی لینڈ" کو اپنی گرفت میں سمیٹے قدرت کی کاریگری کا لطف اٹھا رہا تھا۔ میرے لباس پر چھڑکی جانے والی اوڈی کولون فورسیون ڈبل ون، بینا کے جسم سے اٹھنے والی خمار آلود خوشبو میں اپنا نام و نشان کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

مایوسی گناہ ہے۔ انسان کو بدترین حالات میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اسی لیے کہا گیا ہے، پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ۔ جب آگے بڑھنے کے تمام دروازے بند ہو جائیں تو قدرت کی جانب سے جہد مسلسل پر گامزن انسان کے لیے اچانک ایک ایسا دروازہ کھل جاتا ہے جو اسے اس کی مطلوبہ منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں ہر صورت میں آج رات نادر شاہ کا معاملہ نمٹا دینا چاہتا تھا۔ اپنے ابتدائی منصوبے کے مطابق اس سلسلے میں، میں "نامعلوم افراد" کے تعاون سے اس کام کو نمٹانا چاہتا تھا لیکن عین وقت پر ان لوگوں نے پیٹھ دکھا دی تھی اور یہ میرے حق میں اچھا ہی ہوا تھا کیونکہ مالک نے میرے لیے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے زیادہ بہتر بندوبست کر دیا تھا۔

میں اور بینا ٹھیک گیارہ بجے رات چائنا ٹاؤن والے اپارٹمنٹ سے ریڈ کلفس میں نکلے تھے۔ بینا نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال رکھی تھی اور میں اس کے پہلو میں پسنجر سیٹ پر براجمان تھا۔ ہمارا رخ اس بنگلے کی سمت تھا جو کبھی میری ماں کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔ پھر نادر شاہ نے اپنی فطری خباثت کو استعمال کر کے مذکورہ بنگلے کو جنید خان کی ملکیت بنا دیا تھا۔ میرے اندر نادر شاہ کے لیے بے انتہا غم و غصہ بھرا ہوا تھا اور میں یہی حساب چکتا کرنے اس کی طرف جا رہا تھا۔

اپارٹمنٹ سے نکلتے وقت ہم نے نادیہ کے لیے

ٹیبل پر ایک پرچہ چھوڑ دیا تھا کہ اگر ہماری عدم موجودگی میں اس کی آنکھ کھلے تو وہ ہمیں اپارٹمنٹ میں نہ پا کر پریشان نہ ہو۔ مذکورہ پرچے پر میں نے بولڈ مار کر سے یہ الفاظ لکھے تھے۔

"ہم ہوا خوری کے لیے سمندر کی طرف جا رہے ہیں اور جلدی لوٹ آئیں گے۔ بفرضِ محال، اگر ہماری واپسی میں دیر بھی ہو جائے تو اسے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اپنے ٹارگٹ پر پہنچنے سے پہلے میں نے بینا سے ہر بات ڈسکس کر لی تھی۔ پروگرام کے مطابق میں نے بنگلے کی عقبی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہونا تھا۔ میں نے اس بنگلے پر قیام کے دوران میں اچھی طرح گھوم پھر کر باؤنڈری وال کا جائزہ لے لیا تھا لہٰذا اس کام کے لیے مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا۔ بینا کو عقبی گلی کے کونے پر گاڑی میں ریڈ الرٹ موجود رہنا تھا۔

ہم سوا گیارہ بجے مذکورہ کونے پر پہنچ گئے۔ میں نے ایک منٹ تک گہری نظر سے قرب و جوار کا جائزہ لیا اور وہاں کے ماحول کو اپنے حق میں سازگار پایا۔ میں نے بینا سے کہا۔

"میں بہت جلد جمشید کو فارغ کر کے تمہاری طرف بھیج دوں گا۔ تم اسے کسی ایسی جگہ پر پہنچا آنا جہاں سے وہ... بہ آسانی رکشا یا ٹیکسی پکڑ کر اپنے دوست غلام عباس کے پاس پہنچ جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "کیا تم جمشید کے ساتھ واپس نہیں آؤ گے؟"

"میں نادر شاہ کو قابو کرنے کے لیے جمشید کی مدد لے رہا ہوں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "باقی اس کمینے شخص سے ہر نوعیت کی پوچھ تاچھ میں اکیلے میں ہی کرنا چاہتا ہوں۔"

"سمجھ گئی۔" اس نے ایک مرتبہ پھر سر کو اثباتی جنبش دی۔ "میں جمشید کو کسی مناسب مقام پر پہنچا کر لوٹ آؤں گی اور پھر اسی جگہ رک کر تمہاری واپسی کا انتظار کروں گی۔"

"گڈ......!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ "تم نے پرفیوم کی کوئی بوتل تو گاڑی میں رکھ لی ہے نا؟"

"میں اپنے پرس میں تین بوتلیں رکھ کر لائی ہوں۔"

"تمہارے بدن کی نشاط انگیز مہک کے آگے کسی خوشبو کا چراغ نہیں جلتا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔

مجھے اپنے عقب میں بینا کی آواز سنائی دی۔ "آل دی بیسٹ!"

ٹھیک ایک منٹ کے بعد میں بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے عقبی دیوار پھلانگ کر بنگلے کے اندر پہنچ چکا تھا۔ اندر کا ماحول پُرسکون تھا۔ میری آمد کے بعد وہاں کی فضا میں کسی قسم کی ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں اندرونی عمارت کی اوٹ لے کر دبے قدموں جمشید والے کوارٹر کی جانب بڑھا اور ایک محفوظ مقام پر ٹھہر کر میں نے جمشید کو کال کی۔ میں نے اس مشن کی نزاکت کے پیشِ نظر اپنا سیل فون سائلنٹ موڈ پر رکھا ہوا تھا۔

اگلے ہی لمحے جمشید کے کوارٹر کے اندر....... موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اس وقت اپنے کوارٹر کے اندر موجود تھا۔ اس نے میری ہدایت کے مطابق لائن کاٹ دی۔ میں سانس روک کر اس کے کوارٹر سے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

ٹھیک آدھے منٹ کے بعد وہ نمودار ہوا۔ وہ سیکیورٹی گارڈ کی مخصوص یونیفارم میں ملبوس تھا۔ کندھے پر گن بھی لٹک رہی تھی۔ میں اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لہٰذا اس کی حرکات و سکنات کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں کچھ سامان بھی اٹھا رکھا تھا۔

میں نے دھیمی آواز میں اسے پکارا۔ "جمشید! میں ادھر ہوں۔"

اس نے فوراً میری پکار پر لبیک کہا اور میرے قریب آ گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "سر! آپ خیریت سے تو ہیں نا؟"

"مالک کے کرم سے میں ٹھیک ہوں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "تم سناؤ، ہمارے شکار کا کیا حال ہے؟"

"میں نے آپ کے حکم کے مطابق ہر کام تسلی بخش انداز میں کر دیا ہے۔ آپ دیکھیں گے تو آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔" اس نے جوش بھرے لہجے میں بتایا۔ "آپ آئیں میرے ساتھ۔"

میں اس کی معیت میں چپ چاپ اس بیڈروم کی جانب قدم اٹھانے لگا جہاں چند روز میں نے بھی قیام کیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں موجود سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ ایک ٹول کٹ ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور اسی نوعیت کی چند دیگر چیزیں۔ کیا پتا، کس وقت آپ کو کس چیز کی

ضرورت پیش آجائے۔"

"شاباش!" میں نے توصیفی انداز میں کہا۔

ہم پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے مذکورہ بیڈروم کے دروازے پر پہنچ گئے۔ جمشید نے کہا۔ "سر! میں دروازہ کھول رہا ہوں۔ اندر آپ کا شکار بڑی بری حالت میں موجود ہے۔ میں نے اسے بے بس کردیا ہے جیسے کسی قصاب کا اسسٹنٹ بیل کو بے بس کردیتا ہے۔"

جمشید کے ایک ایک لفظ سے دبا دبا جوش جھلکتا تھا جو اس امر کا غماز تھا کہ اس نے کوئی عظیم کارنامہ انجام دے ڈالا ہے۔ میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور اسے دروازہ کھولنے کا اشارہ دے دیا۔ اس نے میرے حکم کی تعمیل کردی۔

دروازہ کھلا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نادرشاہ بیڈروم کے فرش پر بڑی کسمپرسی کی حالت میں پڑا تھا۔ جمشید نے اس کے دونوں پاؤں کو ٹخنوں۔۔ اور دونوں ہاتھوں کو کلائیوں کو نائیلون کی مضبوط رسیوں سے جکڑ رکھا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر عارضی طور پر اسے قوت گویائی سے بھی محروم کردیا گیا تھا۔

نادرشاہ کی مجھ پر نگاہ پڑی تو خوف کے مارے اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ جمشید کے شاندار سلوک نے اس کی پہلے ہی سٹی گم کررکھی تھی، میری آمد نے اس کے حواس کا سوا.... ستیاناس ماردیا تھا۔ اگر وہ کچھ بولنے کی پوزیشن میں ہوتا تو یقیناً بہت کچھ بولتا۔ اس کی اندرونی کیفیت کو میں اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں بخوبی پڑھ سکتا تھا۔ جمشید نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں سر! میری کارروائی آپ کو پسند آئی؟"

"ایکسیلنٹ!" میں نے کھلے دل سے اس کی تعریف کی اور ایک کرسی کھینچ کر نادرشاہ کے نزدیک بیٹھ گیا۔

جمشید نے ٹول کٹ کو کھول کر بیڈ پر رکھ دیا اور دیگر سامان بھی اس کے نزدیک ہی بستر پر سجادیا۔ اس سامان میں مختلف سائز کی چھریاں اور چاقو شامل تھے۔ اس اریجنمنٹ کو دیکھ کر نادرشاہ کی دہشت زدگی ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔ میں نے اس خبیث شخص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اگر تم چیخنے چلانے کا ارادہ نہ رکھتے ہو تو تمہارا یادگار انٹرویو شروع کیا جائے......؟"

وہ سراسیمہ نظر سے باری باری مجھے اور جمشید کو تکنے لگا۔ نادرشاہ کی حالت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ میری آمد سے قبل جمشید نے اپنے ہاتھوں کی خارش مٹانے اور دل کا غبار دھونے کے لیے اس کی بڑی ٹھیک ٹھاک مرمت بھی کی تھی۔

"سر! اگر یہ کمینہ شور مچانے کی کوشش کرے گا تو میں اپنی گن کا پورا میگزین اس کی کھوپڑی میں خالی کرکے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردوں گا۔" جمشید اس کے قریب پہنچا اور گن کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"سر! آپ انٹرویو شروع کریں۔"

"اوکے......تم اس کے منہ سے کپڑا نکال دو۔" میں نے کہا۔ "تاکہ یہ میرے سوالات کے جواب دینے کے قابل ہوجائے۔"

جمشید نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کردی۔

میں نے نادرشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نفرت آمیز لہجے میں پوچھا۔ "حرام خور! تم نے میری ماں کو دھوکا کیوں دیا، ان کے اعتماد کو ٹھیس کیوں پہنچائی؟"

"بیٹا......" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"اپنی ناپاک زبان سے مجھے بیٹا مت کہو غلیظ انسان۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہاری حقیقت مجھ پر کھل چکی ہے۔ تمہارے جرائم کی فہرست اتنی طویل ہے کہ تمہیں سزا دینے کے لیے مجھے ایک مدت چاہیے ہوگی لیکن میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے اگر جان کی سلامتی عزیز ہے تو میں جو پوچھوں اس کا سیدھا اور کھرا جواب دینا......"

میں نے لمحاتی توقف کیا تو وہ تھوک نگل کر رہ گیا۔ میرے خطرناک تیوروں سے اس نے بھانپ لیا تھا کہ میں کسی بھی قیمت پر ٹلنے والا نہیں ہوں۔ خوف کی زیادتی کے باعث اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی اور آنکھوں سے بے پناہ ڈر ٹپک رہا تھا۔ میں نے غراہٹ آمیز انداز میں استفسار کیا۔

"تم نے میری ماں کو کیوں قتل کروایا؟"

"مم......میں نے نہیں...... سلمیٰ بہن کو چنگیز خان نے......"

میں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منحوس گال پر رسید کیا تو وہ اپنی بات مکمل نہ کرسکا۔ میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"وہ تمہاری ماں کا یار چنگیز خان اس وقت ترکی کی ایک جیل میں بند ہے۔ میں نے آج سہ پہر میں تمہارے پرائیویٹ باپ جنید خان سے "خان ہاؤس" میں ایک بھرپور ملاقات کرلی ہے۔ اس لیے یہ نہیں سمجھنا کہ میں

تمہاری حرام زدگیوں سے لاعلم ہوں۔ تم نے اپنے بھاری کمیشن کے لالچ میں ماں کا یہ سترہ کروڑ مالیت والا بنگلا محض دس کروڑ میں جنید خان کے ہاتھ بیچ دیا۔ میری ماں نے تم پر اندھا اعتماد کیا اور تم انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹتے رہے اور جب تمہاری دولت ہتھیانے کی ہوس ختم نہ ہوئی تو تم نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا پھر چنگیز خان کا نام استعمال کرکے مجھے وہ دھمکی آمیز خط ڈیلیور کرایا تاکہ میں خوف زدہ ہوکر یہاں سے چلا جاؤں اور تم آزادی کے ساتھ نمک حرامی کا کھیل جاری رکھ سکو......؟"

اس کے پاس میرے کسی سوال کا ایسا جواب موجود نہیں تھا جو اس کی نجات کا وسیلہ بن سکتا۔ اس نے میرے عزائم کو اچھی طرح پڑھ لیا تھا لہٰذا ہتھیار پھینکتے ہوئے اس نے اپنے ہر جرم کا اقرار کرلیا۔ اس مکروہ شخص نے میری عظیم ماں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ایک ٹارگٹ کلر کو دو لاکھ روپے میں ہائر کیا تھا۔ اس کی ناپاک زبان سے ماں کے قتل کا اقبالی بیان سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس گھٹیا شخص کے اتنے ٹکڑے کرڈالوں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا حساب داں انہیں شمار کرتے ہوئے ناکامی سے ہینڈز اپ ہوجائے لیکن میں نے اپنے ذہن کو تھپک کر شانت کردیا۔ میں یہاں جس مقصد سے آیا تھا اس میں نادرشاہ کی جان لینا شامل تھا اور نہ ہی اس سے ایک پائی وصول کرنا مقصود تھا۔ میں نے اسے نمونۂ عبرت بنانا تھا تاکہ اسے دیکھ دیکھ کر اس جیسے خبیث لوگ سبق حاصل کریں اور کسی مہربان ذات کو دھوکا دینے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

میں نے اپنے غصے کو لعاب دہن میں شامل کرکے نادرشاہ کے مکروہ چہرے پر تھوک دیا پھر سلگتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"تم نے یہ سب شیطانی کارروائیاں دولت کے لالچ میں کی ہیں نا؟"

"میں......بھٹک گیا تھا......" وہ گھگیایا۔

میں نے اس کی گھگیاہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے سخت الفاظ میں پوچھا۔ "تم نے ٹارگٹ کلر کو جو دو لاکھ روپے دیے وہ میری ماں سے ہتھیائی ہوئی رقم ہی تھی نا؟"

"جج......جی۔" وہ لکنت زدہ انداز میں بولا۔

"تمہاری کم ظرفی، احسان فراموشی، بے حسی، درندگی اور شیطانیت کی داستان کو سیاہ حروف میں تحریر کرکے پوری دنیا کی لائبریریز اور کتب خانوں میں رکھوا دینا چاہیے تاکہ آنے والی نسلوں کو تمہارے کالے کرتوتوں سے آگاہی حاصل ہو۔" میں نے اس کے منہ پر اپنے پاؤں کی ٹھوکر مارتے ہوئے پھنکار سے مشابہ لہجے میں کہا۔

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر منت ریز لہجے میں بولا۔ "مجھے ایک موقع دیں۔ میں سب ٹھیک کردوں گا۔"

"کیا تم میری ماں کو واپس لاسکتے ہو؟" میں نے اسے کھاجانے والی نظر سے گھورا۔

"غلطی ہوگئی...... مجھے معاف کردیں......" اس نے ایک بار پھر ساجت کی۔

"تم نے تو گھٹیا پن کا عالمی ریکارڈ قائم کردیا نادرشاہ!" میں نے نفرت انگیز انداز میں کہا۔ "ماں کی گردن کاٹنے کے لیے تم نے تلوار بھی انہی کے پیسوں سے خرید ڈالی۔ تم سے زیادہ بے حس اور کمینہ انسان دنیا میں اور کون ہوگا......"

"رحم......رحم......" اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

میں رحم کے موڈ میں نہیں تھا۔ نادرشاہ کے مگرمچھ والے آنسو میرے دل میں ایک ذرا سی نرمی پیدا نہ کرسکے۔ میں نے جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"اس شیطان کا منہ دوبارہ سیل بند کردو......"

نادرشاہ وحشت زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ جمشید نے گن کو کندھے سے اتار کر بیڈ پر رکھا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ نادرشاہ کے ہاتھ پاؤں بڑی مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے لہٰذا وہ جمشید کی ہنگامی کارروائی کی راہ میں کوئی مزاحمت کھڑی نہ کرسکا۔ جمشید نے پہلے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا پھر اس کے اوپر ایک کپڑا ڈریسنگ کرنے والے انداز میں کس کر باندھ دیا۔ اب اگر نادرشاہ جسم وجان کی پوری توانائی اور حلق کی ساری قوت کے ساتھ بھی چلانے کی کوشش کرتا تو بنگلے سے باہر یا اس بیڈروم سے باہر تو بہت دور کی بات ہے، اس کی آواز منہ پر بندھی ہوئی ڈریسنگ میں بھی نقب نہیں لگاسکتی تھی۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد جمشید نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس کی اس شاندار کارکردگی پر میں نے اپنا انگوٹھا ہوا میں لہرا کر اطمینان کا اظہار کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم میرے ساتھ ذرا باہر آؤ۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گن کی جانب ہاتھ

بڑھادیا۔

”اس کو ادھر بیڈ پر ہی رہنے دو۔“ میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔

اس نے خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کردی۔

اس دوران میں نادر شاہ التجا آمیز اور الجھن زدہ نظر سے ہم دونوں کو دیکھتا چلا جارہا تھا۔ اس کی بے بسی دیدنی تھی۔ ان لمحات میں وہ صحیح معنوں میں ”نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن“ والی کیفیت سے گزر رہا تھا...... اور یہ سب اس کے اپنے اعمال کا ثمر تھا۔

ہم بیڈ روم سے باہر آئے تو میں نے جمشید سے کہا۔

”پچھلی گلی میں بینا اپنی سرخ گاڑی میں موجود ہے۔ تم فوراً اپنا ریڈی بیگ اٹھاؤ اور بینا کے پاس پہنچو۔ وہ تمھیں کسی ایسی جگہ پر ڈراپ کردے گی جہاں سے تمھیں آسانی کے ساتھ رکشا یا ٹیکسی مل جائے گی۔ تم نے پہلی فرصت میں غلام عباس کے کوارٹر میں پہنچنا ہے۔“

”اور سر آپ......؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”میں تھوڑی دیر کے بعد یہاں سے نکلوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”رات میں کسی وقت میں تمھیں فون کروں گا۔ پھر تفصیلی بات ہوگی۔“

وہ میرے دوٹوک، اٹل اور حتمی انداز کو دیکھ کر ایک لفظ نہیں بولا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کوارٹر کی سمت بڑھ گیا۔ میں دوبارہ بیڈ روم میں داخل ہوگیا۔

نادر شاہ کو بخوبی اندازہ ہوچکا تھا کہ میں اس کے ساتھ کوئی تاریخ ساز سلوک کرنے والا ہوں مگر وہ اتنا مجبور تھا کہ کسی قسم کی رعایت حاصل کرنے کے لیے... اپنے منہ سے ایک لفظ بھی ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

انسان جب اختیار اور طاقت کے نشے میں چور ہوتا ہے تو اسے مطلق یہ احساس نہیں ہوتا کہ آج اگر وہ کسی پر ظلم ڈھا رہا ہے تو کل اس کی بھی باری آنا ہے۔ یہ مکافاتِ عمل کا کھیل ہے جو ہر خاص و عام پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔

میں نے ٹول کٹ میں سے ایک زنبور نکالا تو نادر شاہ کے چہرے پر موت کا سایہ لہرا گیا۔ مجھے اس کی بے بسی پر ذرا ترس نہ آیا۔ ان لمحات میں میرے اندر کا وہ جلاد بیدار ہوگیا تھا جس نے انصاف کا پرچم سربلند رکھنے کے لیے مجرم کو قرار واقعی سزا سے گزارنا تھا۔ میں نے نادر شاہ کی تکلیف کی پروا کیے بغیر بڑی بے دردی سے یکے بعد دیگرے زنبور کی مدد سے اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے ناخنوں کو جڑ سے اکھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔

اگر نادر شاہ کا منہ کھلا ہوا ہوتا تو وہ ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند ڈکراتا اور اذیت کی انتہا سے گزر کر اپنی کرب ناک فریاد ہر طرف پھیلا دیتا لیکن افسوس کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ نادر شاہ کو تکلیف کی اس منزل سے گزارتے ہوئے میری بے قصور مرحوم ماں کا چہرہ میرے تصور میں روشن تھا اور وہ منظر خونچکاں بھی میری یادداشت میں محفوظ تھا جب مائی کولاچی روڈ پر ایک ٹارگٹ کلر نے پلک جھپکتے میں میری ماں کو انھی کے خون میں نہلا دیا تھا اور یہ سب کچھ اسی موذی نادر شاہ کے اشارے پر کیا گیا تھا۔ میں بھلا اس شیطان ابنِ شیطان کو کیسے اپنے در سے خالی ہاتھ جانے دیتا......

میں نے بستر پر موجود مختلف سائز کی چھریوں میں سے ایک تیز دھار سلم ماڈل چھری کا انتخاب کیا اور نادر شاہ کے پیروں پر توجہ مرکوز کردی۔ ناخن اکھاڑے جانے کے باعث اس کے دونوں پاؤں لہولہان ہو رہے تھے۔ میں نے ٹخنے کے عقبی حصے کو اپنی کارروائی کے لیے منتخب کرلیا۔ میں نے بڑی سفاکی سے سلم ماڈل چھری کی مدد سے نادر شاہ کے دونوں پاؤں کی ایکیلیس ٹینڈن یعنی ٹخنے کے عقبی حصے کو چیر ڈالا۔

نادر شاہ میرے جبر کو برداشت نہ کر پایا اور اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے چھری کو ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میرا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ نادر شاہ تمام عمر کے لیے اپاہج ہوچکا تھا۔ محتاجی کی زندگی اب اس کا مقدر تھی۔

میں نے واپسی کے لیے جیسے ہی بیڈ روم کے دروازے کی جانب قدم بڑھائے، بنگلے کے باہر کسی ہیوی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ”یہ کون آگیا......“

قبل اس کے کہ میں صورتِ حال کو سمجھ پاتا، پہلے اس گاڑی کا ہارن بجا پھر ایک خوف ناک غراہٹ کے ساتھ فضا کتوں کے بھونکنے کی آواز سے گونج اٹھی۔ میں نے چشمِ تصور سے کھلے تھوبڑوں والے جرمن شیفرڈز کو اپنی مخصوص للکار کے ساتھ اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔

”غوں...... بھوں...... بھوں بھوں......!“

امنگوں، حوصلوں اور آھوں کے بیچ رلاتی. کبھی محبتوں اور چاھتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمن نازیوں کے جنگی کیمپوں میں بے بس و مجبور قیدیوں پر جو مظالم ڈھائے گئے، اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ یہ جرمن نازی ہی تھے جنھوں نے جنگی قیدیوں کو آگ کی بھٹی میں جلایا، انھیں زندہ دفن کیا اور ان پر اذیت و تشدد کے نت نئے حربے آزمائے گئے...... ان نازی کیمپوں میں بربریت کے

جنونی انتقام

محمد یاسر اعوان

انسانی فطرت ہے کہ جب جان سے عزیز لوگ زندگی کے سفر میں ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو انسان یا تو صبر کے رستے پر گامزن ہوجاتا ہے یا انتقام کی آگ میں جلتا ہے۔ جاپان پر گرائے جانے والے بم اور اس عہد کی سیاسی و جنگی کشمکش میں جانے کتنے ہی دلوں کا خون ہوا اور کتنے ہی لوگ جنونی انتقام میں مبتلا ہوئے۔

صنفِ نازک کی حیرت انگیز سفاکانہ کارروائیوں کی روداد



ایسے مظاہرے دیکھنے میں آئے کہ انسانیت تھرا اٹھی۔ لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ جاپان میں بھی جنگی قیدیوں سے جو انسانیت سوز سلوک روا رکھا گیا، اسے دیکھ کر ہلاکو اور چنگیز خان جیسے سفاک ترین انسانوں کی روحیں بھی کانپ اٹھی ہوں گی......

جنرل فلپ تھامس فلپائن واپس پہنچ چکا تھا۔ مارچ 1945ء میں منیلا میں موجود امریکی فوجیں جنرل فلپ تھامس کی کمان میں آچکی تھیں لیکن امریکی فضائیہ کے بمبار طیارے اس سے پہلے ہی ایک علاقے میں نہایت عجلت میں تعمیر کیے جانے والے ہوائی اڈے استعمال کرنا شروع کرچکے تھے۔ ان اڈوں سے پرواز کرنے والے بی۔ 24 بمبار طیارے چینی سمندروں پر جنوب میں بورنیو سے سلیبس تک اور شمال میں فارموسا اور روکویو کے جزائر پر کامیاب بمباری کر رہے تھے۔ ان طیاروں کا مشن ایک ہی تھا کہ بحری اور بری راستوں سے جاپانیوں کی سپلائی لائن کاٹ دی جائے۔

15 جنوری کو بی۔ 24 بمبار طیاروں کا ایک اسکواڈرن ایک ایسے ہی مشن پر روانہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق ان طیاروں کو فارموسا پر بمباری کرکے واپس آنا تھا۔ گرین گوز نامی طیارہ اس فارمیشن کے آخر میں تھا لیکن ہنان کی بندرگاہ پر بمباری کرتے ہوئے یہ طیارہ اپنی فارمیشن کھو بیٹھا...... اور بھٹکتا ہوا، اس ساحل کے اتنے قریب پہنچ گیا جہاں دشمن کی توپیں اس کے استقبال کے لیے پہلے ہی تیار تھیں۔

سولہ سو فٹ کی بلندی پر طیارے کا زمینی توپوں کی زد سے بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ ایک گولہ طیارے کے دائیں بازو پر لگا اور طیارہ کسی زخمی پرندے کی طرح قلابازیاں کھاتا ہوا تیزی سے زمین کی طرف آنے لگا۔ طیارے کے پائلٹ موچرس رچرڈ نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے طیارے کو سنبھال لیا اور ساحل کے قریب ریت کی ایک پٹی پر کریش لینڈنگ کرنے میں کامیاب ہوگیا لیکن اس سے پہلے کہ طیارے کے عملے کے افراد اپنے یا جہاز کے نقصان کا جائزہ لے سکتے، طیارے کو چاروں طرف سے لاتعداد جاپانی فوجیوں نے گھیر لیا۔

اس بمبار طیارے کا عملہ دس افراد پر مشتمل تھا، جنہیں گرفتاری کے فوراً ہی بعد ہنان بھیج دیا گیا... جہاں جاپانی بحریہ کے انٹیلی جنس آفیسر تین دن تک ان سے پوچھ گچھ کرتے رہے اور بالآخر انہیں بتایا گیا کہ انہیں جزیرے کے اندرونی حصے میں واقع ایک جنگی کیمپ میں بھیجا جا رہا ہے۔ جہاں وقتاً فوقتاً ان سے پوچھ گچھ کی جاتی رہے گی۔ اسی روز ایک جاپانی محافظ نے انہیں بتا دیا تھا کہ انہیں اکاساکی کے جنگی کیمپ نمبر تین میں بھیجا جانے والا ہے۔ کیمپ نمبر تین کا نام سنتے ہی پائلٹ موچرس رچرڈ اور اس کے ساتھی لرز اٹھے۔

کوئی امریکی فوجی ایسا نہیں تھا، جس نے اس کیمپ سے متعلق خوفناک داستانیں نہ سنی ہوں...... وہ یہ بھی جانتے تھے کہ منچوریا کے وسط میں واقع اس جنگی کیمپ سے کوئی قیدی آج تک فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

انہوں نے کسی ایسے قیدی کے بارے میں بھی نہیں سنا تھا جو اس کیمپ سے زندہ بچ نکلا ہو۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ اس جنگی کیمپ میں جانے والے قیدیوں کے بارے میں بعد میں کچھ نہیں سنا گیا تھا۔

اسی شام انہیں کیمپ نمبر تین کی طرف روانہ کردیا گیا تھا۔ دو تین گھنٹوں تک ٹرک نہایت تیز رفتاری سے سفر کرتا رہا۔ شدید سردی کے باعث قیدی ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے تاکہ ایک دوسرے کے جسموں کی حرارت حاصل کرسکیں لیکن سردی کی شدت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی ٹرک کی رفتار بھی کم ہوگئی۔

پختہ سڑک ختم ہوچکی تھی اور اب ٹرک برفانی میدان میں ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چاندنی رات میں تاحدِ نگاہ برف کی چادر پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ جہاز کا مشین گنر سارجنٹ ہولڈنگ اس ٹرک کی دیوار سے ٹیک لگائے سکڑا بیٹھا تھا۔ سردی کی شدت سے اس پر کپکپی سی طاری تھی۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے، اس جاپانی کی طرف دیکھا جو مترجم کی حیثیت سے ان کے ساتھ جا رہا تھا۔

''کیا یہاں ہمیشہ ایسی ہی سردی ہوتی ہے؟'' ہولڈنگ نے پوچھا۔

''یہ ماؤنٹ مورس ہے، ہم اس وقت سطح سمندر سے ساڑھے تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کر رہے ہیں جبکہ اکاساکی صرف پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ علاقہ، جہاں سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں، سردیوں میں برف سے ڈھکا رہتا ہے لیکن موسمِ بہار میں بارشوں کے

ساتھ ہی یہاں کی برف پگھلنا شروع ہوجاتی ہے۔'' مترجم نے بتایا۔

تقریباً تین گھنٹے مزید ہچکولے کھانے کے بعد وہ کھٹارا ٹرک ایک زبردست ہچکی لے کر رک گیا۔ ہولڈنگ نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، جگہ جگہ نصب آرک لائٹس کی تیز روشنیوں میں، اکاساکی جنگی کیمپ نمبر تین کے خاردار تاروں کے جنگلے کا گیٹ نظر آرہا تھا۔ ٹرک کے رکتے ہی ایک ہیولا کیبن سے نکل کر ان کی جانب بڑھا۔ وہ سر سے پاؤں تک گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔

جہاز کا ریڈیو آپریٹر جانسن پیٹر پہلا شخص تھا، جس کی آنکھیں تیز روشنی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوسکی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے ساتھیوں کی طرف گھوم گیا۔

''عورت!'' اس کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔

''دیکھو، وہ محافظ ایک عورت ہے۔ حیرت انگیز! یہ کیمپ عورتوں کی نگرانی میں ہے۔'' جانسن نے سرگوشی کی۔

موچرس رچرڈ اور ہولڈنگ بھی اب ٹرک کی کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ امپیریل آرمی کی یونیفارم میں ملبوس تقریباً ایک درجن عورتیں گیٹ کے قریب رائفلیں سنبھالے مستعد کھڑی تھیں۔

''اوہو!'' جہاز کے انجینئر جمی نے سیٹی بجائی۔ ''معلوم ہوتا ہے، ہمیں جنگی کیمپ کے بجائے بھول کر کسی نائٹ کلب میں بھیج دیا گیا ہے۔''

ان کے ساتھ آنے والے مسلح جاپانی مترجم نے انہیں ٹرک سے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ وہ جیسے ہی نیچے اترے، دو محافظ لڑکیوں نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں رائفلوں کی زد میں لے لیا اور خاردار تاروں کے گیٹ سے گزرتے ہوئے کمپاؤنڈ کے وسط میں پہنچ گئے۔ اسی لمحے چند اور محافظ لڑکیوں نے انہیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ تیز روشنی میں ان کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ جب کوئی لڑکی اپنی جگہ سے حرکت کرتی تو اس کی رائفل کے آگے لگی ہوئی سنگین روشنی میں بجلی کی طرح چمک اٹھتی۔

موچرس رچرڈ انہیں دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ جاپانیوں نے عورتوں کو بھی فوج میں بھرتی کرنا شروع کردیا تھا۔ ضروری تربیت کے بعد صرف انتظامی امور ان عورتوں کے سپرد کیے گئے تھے، جہاں ان کے لیے زیادہ خطرہ نہیں تھا لیکن جنگی قیدیوں کے کسی کیمپ کی نگرانی عورتوں کے سپرد کردینا، موچرس کے نزدیک حماقت کے سوا... کچھ نہیں تھا...... اس کیمپ کے بارے میں دل کو ہلا دینے والے قصے اسے فرضی اور من گھڑت معلوم ہونے لگے۔

موچرس رچرڈ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک عورت دائرے میں کھڑی محافظ لڑکیوں کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے آگئی۔ اسے دیکھ کر ہر قیدی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس کیمپ میں کسی ایسی حسین عورت کی موجودگی کا تو وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

وہ قیدیوں کے سامنے تن کر کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ ریشمی بال ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ اس کے جسم پر امپیریل آرمی میجر کی وردی تھی جو کمر پر سے خاصی چست تھی۔ پیروں میں برفانی جوتے تھے جو پنڈلیوں تک آرہے تھے۔ پتلون کے پائنچے نہایت سلیقے سے جوتوں کے اندر اڑسے ہوئے تھے۔

قیدیوں کے ساتھ آنے والا مترجم آگے بڑھا اور اس نے اپنی زبان میں اسی عورت سے کوئی بات کی پھر قیدیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ اوٹسوسان ہیں۔ تم لوگ اس کیمپ میں اپنے قیام کے دوران انہیں اسی نام سے مخاطب کرو گے۔ اس کیمپ میں تمہارا قیام کتنا طویل ہوگا؟ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہماری زبان میں سان میڈم کو کہتے ہیں...... تم لوگ اگر چاہو تو اپنی آسانی کے لیے انہیں سان کے بجائے میڈم بھی کہہ سکتے ہو۔ اوٹسوسان، میجر رینک اور اس کیمپ کی انچارج ہیں۔ ان کے بعد اس کیمپ کی نگرانی کی ذمے داری جیکوسان اور لاکوسان پر عائد ہوتی ہے۔'' جاپانی مترجم چند لمحے خاموش ہونے کے بعد پھر بولا۔ ''تمہیں ان کے احکامات کی بے چون و چرا... تعمیل کرنا ہوگی۔ اس کیمپ کے محافظوں میں کوئی مرد شامل نہیں ہے۔ سارا انتظام ان لڑکیوں کے سپرد ہے لیکن تم انہیں مردوں سے کم نہیں پاؤ گے۔''

جاپانی مترجم نے تھوڑا توقف کیا پھر کیمپ کی محافظ لڑکیوں کے بارے میں بتانے لگا۔ اکاساکی کے اس بدنام زمانہ جنگی کیمپ کی محافظ لڑکیوں کی تعداد صرف پچیس تھی، جن کی انچارج میڈم اوٹسو تھی، جو کیمپ سے متعلق معاملات میں ہر لحاظ سے خود مختار تھی، البتہ بعض معاملات میں وہ صرف اور صرف فارموسا ہائی کمان کو جواب دہ تھی۔

مترجم کے بیان کے مطابق بہت عرصہ پہلے یہ کیمپ مردفوجیوں کی نگرانی میں تھا لیکن جنرل فلپ تھامس کے فلپائن واپس آنے کے بعد مردفوجیوں کو ساحل کی حفاظت کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ مترجم نے اس یقین کا اظہار بھی کیا تھا کہ جنرل فلپ تھامس کو اس علاقے میں زیادہ کامیابی نہیں حاصل ہوگی۔

''ایک بات اور!'' مترجم نے قیدیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان میں پانچ لڑکیاں شادی شدہ ہیں اور ان کے شوہر بحریہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح ان لڑکیوں کو شہنشاہ کی خاص توجہ بھی حاصل ہے...... ایک بات اور ذہن نشین کرلو کہ یہ لڑکیاں تمہارے لیے مردوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتی ہیں۔ انہیں تم سے شدید نفرت ہے اور کسی سے نفرت کرنے کی اس سے بڑی وجہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے شوہر، بھائی، باپ اور رشتے دار تم لوگوں کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں یا مارے جارہے ہیں...... میں آخری مرتبہ تم لوگوں کو تنبیہ کردینا چاہتا ہوں کہ یہاں سے تمہارے فرار کی کوئی کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوسکتی۔ یہ بات بھی نوٹ کرلو کہ جب تک تم لوگ یہاں ہو، یہ سب تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیں گی۔''

مترجم نے تقریر ختم کرکے میڈم اوٹسو کی جانب دیکھا۔ اوٹسو نے پسندیدگی کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور ایک ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ مترجم اسے سلامی دے کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میڈم اوٹسو اس وقت تک اس کی طرف دیکھتی رہی جب تک وہ گیٹ کے قریب کھڑے ہوئے ٹرک پر سوار نہ ہوگیا۔ پھر وہ قیدیوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی بے رحمانہ مسکراہٹ تھی۔

''ارشیا انیو......'' اس کے خوب صورت ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔

مترجم کی وارننگ کے باوجود جہاز کا، کو پائلٹ لیفٹیننٹ سوشان، اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بے بی! میں تمہاری زبان نہیں سمجھتا، لیکن اگر تمہیں کسی محبوب کی تلاش ہے تو وہ میرے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

لیکن جب میڈم اوٹسو نے انگلش میں جواب دیا تو سوشان اور اس کے ساتھی سناٹے میں رہ گئے۔ خصوصاً سوشان کا تو چہرہ دھواں ہوگیا تھا۔

''لیکن میں تمہاری زبان بول اور سمجھ سکتی ہوں۔'' میڈم اوٹسو اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ میں نے جو الفاظ کہے تھے، اس کا مطلب ہے، خوش آمدید کتو!'' جملہ ختم کرتے ہی میڈم اوٹسو نے ایک ہاتھ اٹھا کر مخصوص اشارہ کیا۔ لیفٹیننٹ سوشان کے پیچھے کھڑی ہوئی دو محافظ لڑکیوں نے سوشان کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے، اسے اس کے ساتھیوں سے الگ کرلیا۔ اس سے پہلے کہ سوشان کچھ سمجھ سکتا، دونوں لڑکیوں نے رائفلوں کے بٹ پوری قوت سے اس کی پنڈلیوں پر مارے۔ سوشان چیختا ہوا زمین پر گر پڑا۔ پنڈلیوں پر لگنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ کوشش کے باوجود اٹھنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

محافظ لڑکیوں نے رائفلوں کے بٹ مار مار کر اسے چت لٹادیا اور اس کے بازوؤں پر کھڑی ہوگئیں۔ سوشان برف پر پشت کے بل لیٹا بری طرح چیخ رہا تھا۔ اسی دوران ایک اور لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور تقریباً دو انچ موٹی لکڑی کا ایک ٹکڑا اس کے دانتوں میں پھنسا دیا۔ سوشان اب بھی چیخ رہا تھا لیکن اس کی آواز اب عجیب سی نوعیت اختیار کرچکی تھی۔ دانتوں میں لکڑی ہونے کی وجہ سے اس کا منہ دو انچ کے قریب کھلا ہوا تھا۔

اور پھر وہ سب کچھ اس قدر سرعت سے ہوا تھا کہ موچرس رچرڈ اور اس کے ساتھی کوئی اندازہ نہ لگا سکے۔ میڈم اوٹسو نے ہپ پاکٹ سے چاقو نکال لیا اور نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی سوشان کے قریب پہنچ گئی۔

چند لمحے وہ سوشان کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر ایک پاؤں اٹھا کر اس کے سینے پر رکھ لیا۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے میڈم اوٹسو کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو آہستہ آہستہ اس پر جھک رہی تھی۔

پھر دفعتاً وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور چاقو کا پھل اس کے کھلے منہ میں داخل کردیا۔ سوشان بری طرح مچلنے لگا، مگر میڈم اوٹسو نے اس کے سینے پر اپنا پورا بوجھ ڈال دیا تھا اور اس کا چاقو والا ہاتھ تیزی سے حرکت کررہا تھا۔ چاقو کی تیز نوک سے سوشان کی زبان کو جڑ سے کاٹ دیا گیا تھا۔ سوشان کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز کے ساتھ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔

میڈم اوٹسو اچھل کر اس کے اوپر سے ہٹ گئی اور

ہاتھ میں پکڑے ہوئے تقریباً پانچ انچ لمبے گوشت کے لوتھڑے کو، جو سوشان کی زبان تھی، ہوا میں لہراتے ہوئے چیخی۔ ''بانز آئی!'' یہ خوشی کا نعرہ تھا۔ اس نے سوشان کی طرف دیکھا، اس کے منہ سے بہنے والا خون چہرے، گردن اور زمین پر جمی ہوئی برف کو سرخ کیے دے رہا تھا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دانتوں میں پھنسی ہوئی لکڑی کی وجہ سے وہ نہ تو خون کو نگل سکتا تھا اور نہ ہی تھوک سکتا تھا۔ لیفٹیننٹ سوشان کے ساتھی خاموش کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے کھڑی ہوئی محافظ لڑکیوں کی رائفلوں کی سنگینیں ان کی گردنوں کو چھو رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام بھی سوشان سے مختلف نہیں ہوگا۔

موچرس رچرڈ کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ اس نے سختی سے دانت پر دانت جمار کھے تھے۔ سفاکی کا یہ مظاہرہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور وہ خون میں لت پت سوشان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''میں اس کتیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، اسے...... اسے ایسی اذیت ناک موت ماروں گا کہ جاپانیوں کی آنے والی کئی نسلیں یاد رکھیں گی۔'' رچرڈ کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے اس کے ساتھیوں نے اس کی یہ بڑبڑاہٹ سن لی...... اور اسی لمحے انہوں نے موچرس رچرڈ کو اپنا لیڈر تسلیم کرلیا۔

اس کے جبڑوں کا ابھار اور لہجے کی کرختگی کا احساس کرکے اس کے افسروں کیلانڈ اور اسٹوان کے ساتھ سارجنٹ ہولڈنگ وغیرہ نے بھی تسلیم کرلیا کہ رچرڈ اس گروپ کا واحد آدمی ہوگا، جو بھی انہیں اس عذاب سے نجات دلا سکے گا۔

میڈم اوٹسو نے جو موچرس رچرڈ کی بڑبڑاہٹ نہیں سن سکی تھی، اپنا خون آلود ہاتھ اور چاقو کا پھل سوشان کے کپڑوں سے صاف کیا۔ سوشان کی زبان ابھی اس کے ہاتھ میں تھی...... وہ قیدیوں کی طرف دیکھتے ہوئے خونخوار بلی کی طرح غرائی۔ ''میں اس کیمپ میں آنے والوں کو (قیدیوں کو) ہمیشہ اسی قسم کی وارننگ دیتی ہوں، اس طرح کوئی بے ہودہ خیال ان کے ذہن میں جگہ نہیں پاسکتا۔'' اس نے خاموش ہوکر ایک طرف اشارہ کیا۔ یہ گویا استقبالیہ تقریب ختم ہونے کا سگنل تھا۔ محافظ لڑکیاں

قیدیوں کو دھکیلتی ہوئی روشنی کے دائرے سے نکال لے گئیں۔

ان کی بیرک گھاس پھوس کا ایک سائبان ثابت ہوئی۔لکڑی کے چارستون کھڑے کرکے ان پر چھت قائم کردی گئی تھی۔ چاروں طرف سے کھلا ہونے کے باعث یخ ہوا سے بچاؤ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نیچے کچی زمین تھی اور انہیں اوڑھنے یا بچھونے کے لیے کمبل وغیرہ بھی فراہم نہیں کیے گئے تھے۔

کچھ دیر بعد ہی آرک لائٹس بجھا دی گئیں۔ چند منٹ کے وقفے کے بعد ہی ان کی آنکھیں تاریکی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوسکی تھیں۔ ان کے اردگرد اسی قسم کے تیرہ چودہ اور سائبان بھی تھے، جن میں موجود قیدی اپنے آپ کو سردی سے بچانے کے لیے ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش کررہے تھے۔

لیفٹیننٹ سوشان ختم ہوچکا تھا۔اس کی لاش برف پر پڑی تھی۔اب وہ صرف نو رہ گئے تھے۔ٹرک سے اتر کر، ان لڑکیوں کو دیکھ کر ان میں سے جن لوگوں نے سوچا تھا کہ وہ کسی جنگی کیمپ کے بجائے نائٹ کلب میں آگئے ہیں، جہاں خوب صورت لڑکیاں ان کی دلجوئی کے لیے موجود ہیں...... انہیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔اب وہ سب یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ اس کیمپ کے بارے میں انہوں نے جو داستانیں سن رکھی تھیں، ان میں ذرا بھی مبالغہ آرائی نہیں تھی۔ ان کے خیال میں یہ موت کا کیمپ تھا، جہاں قدم رکھتے ہی موت نے ان کا استقبال کیا تھا...... اور ان کے ایک ساتھی کو چاٹ لیا تھا۔موت...... جو حسین لڑکیوں کی صورت میں ان کے گرد منڈلا رہی تھی......

☆☆☆

صبح سب سے پہلے موچرس رچرڈ ہی کی آنکھ کھلی تھی۔ ایک نظر چاروں طرف دیکھتے ہی یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ یہ کیمپ، موت کے کیمپ کے نام سے کیوں مشہور تھا۔ ایک لمحے کو تو اسے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ سترھویں صدی کے کسی عقوبت خانے میں پہنچ گیا ہو۔ ہر سائبان میں پانچ سے دس تک قیدی تھے اور ان کی حالت دیکھ کر یہ مشکل ہی یہ فیصلہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ بھی انسانوں کے زمرے میں آتے ہیں...... پھٹے، پرانے، غلاظت آلود کپڑوں میں لپٹے ہوئے وہ لوگ ڈھانچوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ وہ لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر متحرک ہوگئے تھے۔ ان کے جسموں اور پھٹے پرانے کپڑوں سے اٹھنے والی بدبو سے رچرڈ کو ابکائی سی آگئی۔

ایک سائبان کی طرف دیکھتے ہی رچرڈ چونک گیا۔ اس سائبان کے ڈھانچا نما قیدی اپنے دو ساتھیوں کو برف پر گھسیٹتے ہوئے کمپاؤنڈ کے وسط میں لے جارہے تھے۔ وہ لاشیں تھیں، یہ ان قیدیوں کے وہ ساتھی تھے جو گزشتہ رات زندگی کی اذیت سے نجات پاگئے تھے۔

موچرس رچرڈ یہ خوفناک منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ کسی طرف سے کانگ کی آواز سنائی دینے لگی۔ تمام قیدی اپنی اپنی بیرکوں کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ رچرڈ نے اپنے ساتھیوں کو جگادیا اور وہ بھی دوسرے قیدیوں کی تقلید کرتے ہوئے اپنے سائبان کے سامنے لائن لگا کر کھڑے ہوگئے۔ اسی لمحے محافظوں کے ہٹ کی طرف سے دو محافظ لڑکیاں ٹرالی دھکیلتی ہوئی اس طرف بڑھتی نظر آئیں۔ موچرس رچرڈ اور اس کے ساتھی دو نمبر بیرک میں تھے، لڑکیاں پہلی بیرک کے سامنے رک گئیں۔

ایک لڑکی رائفل سنبھالے کھڑی رہی جبکہ دوسری لڑکی ٹرالی پر رکھے ہوئے دیگچے میں سے کوئی چیز ڈونگے سے نکال نکال کر اس بیرک کے قیدیوں کے سامنے برف پر ڈھیر کرنے لگی۔ وہ آٹھ قیدی تھے۔ کھانے کے لیے کوئی برتن وغیرہ نہیں تھا۔ ان کا کھانا ان کے پاؤں کے قریب برف پر ڈال دیا گیا اور پھر جیسے ہی ٹرالی آگے بڑھی، وہ آٹھوں قیدی بھوکے کتوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے کتوں ہی کی طرح کھارہے تھے۔

ٹرالی رچرڈ وغیرہ کے سائبان کے سامنے رک گئی۔ وہ سب لائن میں کھڑے تھے۔ کھانا تقسیم کرنے والی محافظ لڑکی نے ایک ایک مگا ان کے پیروں کے نزدیک برف پر الٹ دیا۔ جہاز کے نیوی گیٹر پورٹر نے گھٹنوں کے بل جھک کر برف میں پڑا ہوا تھوڑا سا کھانا اٹھا کر چکھا...... اور پھر دوسرے ہی لمحے وہاں سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اس طرح ناک اور منہ پر ہاتھ رکھ لیا جیسے شدید تعفن محسوس کررہا ہو۔ ہولڈنگ اور رچرڈ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، پھر وہ بھی جھک کر کھانے کو سونگھنے لگے۔ بڑی سخت قسم کی بدبو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ ابکائیاں لیتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے۔

”کیوں، کھانا پسند نہیں آیا؟ کل تک انتظار کرو کل میل ڈے ہے، تم پر کچھ اور انکشافات ہوں گے۔“ یہ آواز ساتھ والے سائبان سے ابھری تھی۔ پرانے قیدیوں میں سے کسی نے پہلی مرتبہ انہیں مخاطب کیا تھا۔ وہ ایک انفنٹری آفیسر تھا، جسے چند ماہ قبل فارموسا سے گرفتار کرکے اس کیمپ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اس کے سامنے کے دو تین دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور شیو بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی۔ ”دوسرے دن منگل تھا۔ اس روز کیمپ میں ڈاک آیا کرتی تھی اور قیدیوں کے لیے یہ دن ہفتے کا بدترین دن ہوتا تھا۔

کیمپ کی محافظ لڑکیاں اپنے نام آنے والے خطوط پڑھنے کے بعد ردِعمل کے اظہار میں زیادہ دیر نہیں لگاتی تھیں۔ یہ خطوط مختلف شہروں میں مقیم ان کے رشتے داروں کی طرف سے آتے یا شوہروں کی طرف سے، جو کسی نہ کسی محاذ پر دشمن کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ ان خطوط میں ہمیشہ کسی نہ کسی کی موت کی اطلاع ضرور ہوتی۔“ اور جب انہیں اپنے کسی رشتے دار کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے، تو یہ وحشی بن جاتی ہیں۔“ انفنٹری آفیسر نے بتایا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی رچرڈ اور اس کے ساتھیوں نے محافظ لڑکیوں کے رویے میں تبدیلی محسوس کرلی۔ ان کے سامنے برف پر انہیں دیا جانے والا کھانا بکھرا ہوا تھا۔ وہ غالباً چاول تھے، جو کسی اور چیز میں ملا کر پکائے گئے تھے مگر ان چاولوں سے اس قدر بدبو اٹھ رہی تھی کہ اگر وہ کوئی لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈال بھی لیتے تو اسے نگلنا ان کے لیے ممکن نہ تھا...... اس کے برعکس پرانے قیدیوں نے زمین پر سے چاولوں کا ایک ایک دانہ صاف کردیا تھا۔

موچرس رچرڈ کیمپ کے دوسرے سرے پر لکڑی کے ان ہٹس کی جانب دیکھ رہا تھا، جو کیمپ انچارج میڈم اوٹسوا اور دیگر محافظ لڑکیوں کے لیے مخصوص تھے۔ باہر سے دیکھنے پر بظاہر وہ ہٹ بھی اچھی حالت میں نظر نہیں آرہے تھے، مگر رچرڈ کو یقین تھا کہ وہاں زندگی کی ہر آسائش موجود ہوگی۔

دوپہر کے لگ بھگ میڈم اوٹسوا اپنے ہٹ سے باہر نکلی۔ یہ ہٹ اس کے آفس کے علاوہ رہائش گاہ کا کام بھی دے رہا تھا۔ وہ چند لمحے دروازے کے سامنے کھڑی متجسس نگاہوں سے اطراف میں دیکھتی رہی...... پھر بڑے نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی کمپاؤنڈ کے وسط میں آکر

زبان

اگر زبان کی ہیئت یعنی ظاہری شکل پر جائیں تو یہ جسم کے باقی اعضا میں آٹے میں نمک کے برابر ہے لیکن آیئے زبان کے متعلق جائزہ لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ان گنت احسانات میں سے انسان کو دوسری مخلوقات پر اس وجہ سے شرف حاصل ہے کہ اسے قوتِ گویائی عطا فرمائی گئی ہے جس سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا ہے۔اس زبان کی قیمت اللہ تعالیٰ کے یہاں اس وقت بڑھتی ہے جب اس سے صداقت اور نیکی کے پھول جھڑیں اور یہ زبان اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے۔ اس کی کبریائی کا اعلان کرے اور دعوتِ حق کو پھیلانے میں مصروف ہوجائے۔ مگر صد افسوس کہ آج آدمی اپنی زبان کا سب سے زیادہ غلط استعمال کرتا ہے اور اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالتا ہے جس سے دوسرے کو دکھ پہنچے' اپنی زبان سے وہ بھلائی کے الفاظ نکالنے کے بجائے برائی کے الفاظ نکالتا ہے۔ زبان حق کے اعتراف کے لیے ہے مگر آدمی اپنی زبان ناحق کے لیے استعمال کرتا ہے۔

دل

☆جس نے مومن کے دل کو ستایا گویا اس نے اللہ کو ستایا۔

☆ دل صاف نہیں تو تمام جسم میں فساد برپا ہوگا۔

☆ فکرِ آخرت دل کا چراغ ہے۔ جب وہ نہ رہے گا تو دل کی روشنی جاتی رہے گی۔

☆ روشن ترین دل وہ ہے جو دنیا کی گرد سے بچا ہو۔

محمد حیات خان نیازی کی کتاب
سنہرے اقوال سے انتخاب
مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

رک گئی۔

اس کے ایک ہاتھ میں چمڑے کا کوڑا اور دوسرے میں میگافون تھا۔ اس نے قیدیوں کی بیرکوں کی طرف رخ کرکے میگافون منہ سے لگایا اور چیختے ہوئے بولی۔

”امریکی کتو! میری بات غور سے سنو! آج کی ڈاک سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ہمارے بے شمار جوان امریکی بھیڑیوں کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں لیکن میں تم لوگوں کو یقین دلادینا چاہتی ہوں کہ ان جاپانیوں کی قربانی رائگاں نہیں جائے گی اور ہم ان کے ایک ایک قطرۂ خون کا بدلہ لیں گے۔“ اس کی تقریر ختم ہوتے ہی محافظ لڑکیاں ہاتھ والی دو گاڑیاں کھینچتی ہوئی کمپاؤنڈ کے درمیان میں لے آئیں...... یہ ہاتھ گاڑیاں گدھا گاڑیوں سے مختلف نہیں تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انہیں گدھوں کے بجائے محافظ لڑکیاں کھینچ رہی تھیں۔ کمپاؤنڈ کے وسط میں پہنچ کر لڑکیوں نے گاڑیاں چھوڑ دیں۔

ایک گاڑی پر میڈم اوتسو اور دوسری پر میڈم جیکو، سوار ہوگئی...... اس کے ہاتھ میں بھی چمڑے کا کوڑا نظر آرہا تھا۔ محافظ لڑکیوں نے دو قیدیوں کو ایک سائبان سے گھسیٹ کر نکال لیا اور انہیں گاڑیاں کھینچنے کا حکم دیا۔ وہ دونوں قیدی ڈھانچوں کے مانند تھے۔ ان کے لیے اپنے جسموں کے بوجھ کو گھسیٹنا مشکل ہورہا تھا لیکن وہ گاڑیاں کھینچنے پر مجبور تھے۔

وہ چیونٹی کی رفتار سے گاڑیاں کھینچ رہے تھے۔ دفعتاً فضا میں زناٹے کی آواز ابھری۔ میڈم اوتسو کے کوڑے نے اپنی گاڑی کھینچنے والے قیدی کی پشت سے کھال ادھیڑ دی تھی۔ یہ گویا میڈم جیکو کے لیے سگنل تھا۔ اس نے بھی اپنی گاڑی میں جتے ہوئے قیدی پر کوڑے برسانے شروع کردیے...... چابک پڑتے ہی قیدیوں کی رفتار بڑھ گئی۔ دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو برف پر دوڑنے لگیں۔

اچانک میڈم اوتسو اور میڈم جیکو پاگلوں کی طرح چیخنے لگیں اور گاڑیوں میں جتے ہوئے لاغر قیدیوں پر لگاتار کوڑے برسانے لگیں۔ دفعتاً...... میڈم اوتسو کی گاڑی والے قیدی کا پاؤں برف پر پھسل گیا۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو گرنے سے بچاسکتا۔ وہ اوندھا پڑا تھا کہ دوسری گاڑی کا پہیا اس کے اوپر سے گزر گیا۔ قیدی کے گرنے سے گاڑی الٹتے الٹتے بچی تھی۔

اس صورتِ حال نے میڈم اوتسو پر جنون سا طاری کردیا۔ وہ گاڑی سے نیچے کود گئی۔ اس نے ہاتھوں پکڑے ہوئے کوڑے کے دستے سے قیدی کی پسلیو ضرب لگائی مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ میڈم نے ا کے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کردی مگر بے سود...... قیدی جسم میں حرکت تک نہیں ہوئی...... بالآخر میڈم اوتسو ہوئی وہاں سے ہٹ گئی...... اس طرح یہ کھیل ملتوی ہو گیا۔

اگلے منگل کو اگرچہ کیمپ کے قیدیوں کو یہ معلوم ہوسکا کہ آج کی ڈاک سے کیمپ کی محافظ عورتوں کو اطلاع مل گئی تھی کہ منیلا میں جاپانی فوجوں نے جنرل فا تھامس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور...... ایک ا محاذ پر میڈم اوتسو کا باپ جس رجمنٹ کی کمان کررہا تھا، امریکی فوج نے اس کا مکمل صفایا کردیا تھا لیکن میڈم او اور دیگر محافظ عورتوں کے چہروں سے وہ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ لگاسکتے تھے۔

اس مرتبہ اپنے وحشیانہ کھیل کے لیے میڈم اوتسو موچرس رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کا انتخاب کیا۔ اوتسو او جیکو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی ان کے سائبان سامنے رک گئیں اور انہیں باہر نکلنے کا حکم دیا۔

وہ سب اپنے سائبان کے سامنے لائن میں کھڑے ہوگئے اور میڈم اوتسو اس طرح ان کا جائزہ لینے لگی، جیسے قصائی بکروں کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہو کہ کون سا بکرا اس کے لیے زیادہ منافع بخش ثابت ہوسکتا ہے۔ بالآخر میڈم نے رچرڈ اور سیکنڈ ریڈیو آفیسر جیک کو لائن سے الگ کرلیا۔ ”تم دونوں قد و قامت میں ایک جیسے لگتے ہو۔ اپنی اپنی قمیصیں اتار دو۔“ میڈم نے حکم دیا۔ انہوں نے قمیصیں اتار دیں...... وہ خاصے تندرست اور تومند تھے۔ میڈم کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور بولی۔

”مجھے تم جیسے تومند اور مضبوط آدمیوں کی ضرورت تھی۔ پرانے قیدیوں میں اب اپنے آپ کو سنبھالنے کی سکت نہیں رہی لیکن میں کہہ سکتی ہوں کہ آج کے مقابلے میں مزہ آجائے گا۔“

محافظ لڑکیاں انہیں رائفلوں کے بٹ مارتے ہوئے کمپاؤنڈ کے وسط میں لے آئیں اور ایک بار پھر درندگی اور بربریت کا ایک نیا مظاہرہ ہونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں اس قابل بھی نہ رہے کہ اپنے قدموں پر چل سکتے۔ میڈم اوتسو اور جیکو کے

ان میں دلچسپی کی کوئی بات نہ رہی تھی۔ وہ دونوں اس کھیل کے اختتام کا اعلان کرکے رخصت ہوگئیں۔

رچرڈ کے چہرے، سر اور جسم کے ہر حصے سے خون بہ رہا تھا۔ اس نے جیک کی طرف دیکھا جو اس سے بھی زیادہ بدتر حالت میں تھا۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ممکن ہے موسم کی یخ بستگی ان کے زخموں کو انفیکشن سے بچالے، لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں توانائی کی بھی ضرورت تھی، جس کا حصول بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ موچرس رچرڈ سوچ رہا تھا کہ اگر مناسب خوراک کا انتظام نہ ہوا تو زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے اندر اندر وہ بھی پرانے قیدیوں کی طرح ڈھانچوں میں تبدیل ہوکر رہ جائیں گے اور اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہیں گے۔ انہیں خوراک حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

لیکن سوال تو یہ تھا کہ خوراک کہاں سے آتی؟ امریکیوں سے نفرت کے باعث کیمپ کی محافظ عورتیں انتقامی جنون میں مبتلا تھیں۔ رچرڈ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر انہیں زندہ رہنے کے لیے مناسب خوراک حاصل کرنا ہے تو اسے انہی عورتوں میں سے کسی ایک کو قابو میں کرنا پڑے گا۔

دو دن گزر گئے اور پھر...... بالآخر محض اتفاق سے اسے وہ موقع مل گیا جس کا وہ منتظر تھا۔

اس روز حسبِ معمول ان کے سامنے کتوں کی طرح کھانا ڈالا جارہا تھا۔ رچرڈ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا محافظ لڑکی کو دیگچے میں سے چاول نکال نکال کر ان کے سامنے زمین پر ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی باری آئی تو برف پر لڑکی کا پاؤں پھسل گیا اور چاولوں سے بھرا ہوا گا رچرڈ کے پیر پر الٹ گیا۔

”گومن ناسائی!“ لڑکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ لڑکی کے چہرے پر ندامت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ معذرت کے ان سیدھے سادے الفاظ نے رچرڈ کے دماغ میں ایک جھماکا سا پیدا کردیا اور وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر کیمپ کی خونخوار محافظ لڑکیوں میں سے کسی کی ہمدردی حاصل کی جاسکتی تھی تو وہ یہی ہوسکتی تھی۔ کیمپ کے پرانے قیدیوں سے موچرس رچرڈ کو اس محافظ لڑکی کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ وہ لیزا تھی۔ اس کا تعلق ہنان کے ایک ایسے کلب سے تھا جہاں جاپانی فوجی افسر تفریح کی غرض سے جاتے تھے۔

رچرڈ تین چار دن تک گہری نظروں سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ اس سے تنہائی میں بات کرنے کے لیے کسی مناسب موقعے کی تلاش میں تھا۔ آخرکار اسے یہ موقع مل ہی گیا۔

اس روز لیزا، محافظوں والے ہٹس کے قریب ایک شیڈ میں اسٹاک کو چیک کررہی تھی کہ...... رچرڈ بھی نہایت خاموشی سے رینگتا ہوا شیڈ میں داخل ہوگیا۔

”لیزا!“ رچرڈ نے دھیرے سے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ درد تھا۔ اس ایک لفظ سے وہ لیزا کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ جس طرح اس کیمپ کے قیدی سوشل سسٹم کے مظالم کا شکار تھے، اس طرح لیزا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھی۔

لیزا، اپنا نام سن کر چونک سی گئی۔ اس نے تیزی سے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ رچرڈ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر رچرڈ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا...... اور محتاط قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

☆☆☆

سب کچھ رچرڈ کی توقع سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا تھا۔ لیزا، رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کو چوری چھپے اضافی راشن فراہم کرنے لگی، کبھی وہ انہیں چاول پہنچا دیتی اور کبھی ڈبل روٹی وغیرہ۔

مارچ کا مہینا ختم ہوتے ہی برسات کا موسم شروع ہوگیا۔ اس سائبان کے علاوہ قیدیوں کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ بارش کی تیز بوچھاڑ میں وہ دن رات پانی میں بھیگتے اور سردی میں ٹھٹھرتے رہے......

اپریل کے وسط میں میڈم جیکو کو اطلاع ملی کہ اس کا شوہر اوکی ناوا کے محاذ پر امریکیوں کے ہاتھوں مارا جاچکا ہے۔ وہ ایک بنکر میں مشین گن سے فائر کررہا تھا کہ دشمن کی توپ کا چلایا ہوا ایک گولہ بنکر کے اندر آکر گرا...... اور مشین گن کے ساتھ اس کے بھی پرخچے اڑ گئے...... جیکو نے میڈم اوتسو سے شکار کی اجازت مانگی، جو بلا جھجک مل گئی۔ اس مقصد کے لیے جیکو نے سارجنٹ ہولڈنگ کا انتخاب کیا تھا۔

قیدیوں کو کچھ علم نہیں تھا کہ ان پر کیا قیامت ٹوٹنے والی تھی...... وہ تو صرف ایک رات پہلے لیزا نے ٹوٹی پھوٹی

انگریزی اور اشاروں کی زبان میں رچرڈ کو بتا دیا تھا کہ اپنے شوہر کی موت کا انتقام لینے کے لیے جیکو کیا منصوبہ بنا رہی ہے۔ دوسرے دن صبح دو محافظ لڑکیاں ہولڈنگ کو گھسیٹتی ہوئی میدان کے درمیان میں لے گئیں اور ہولڈنگ کو کچھ سوچنے کا موقع دیے بغیر وحشی درندوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں۔ ہولڈنگ کی قمیص تار تار ہوگئی۔ لڑکیوں کے نکیلے ناخنوں سے اس کے چہرے اور جسم پر گہری خراشیں آگئی تھیں، جن سے خون رسنے لگا۔ ایک لڑکی نے اس کے گلے میں جھولتی ہوئی قمیص کھینچ کر دور پھینک دی پھر وہ دونوں رائفلیں تان کر دور کھڑی ہوگئیں۔ اب میڈم جیکو کی باری تھی۔

وہ قہر برساتی نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے اشارے پر دو محافظ لڑکیوں نے ہولڈنگ کے بازو پشت پر جکڑ لیے۔ جیکو کے پاس اس وقت کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے ہولڈنگ کی طرف جھکتے ہوئے اچانک ہی انگلیاں اس کی ایک آنکھ میں گاڑ دیں......

ہولڈنگ بلبلا اٹھا۔ جیکو نے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا۔ ہولڈنگ کی آنکھ نکل کر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ چند سیکنڈ بعد وہ ہولڈنگ کی دوسری آنکھ بھی نکال چکی تھی۔

ہولڈنگ اس گروپ کا طاقتور ترین شخص تھا۔ پہلی آنکھ نکلتے وقت اس کے منہ سے بس ایک چیخ نکلی تھی......

اس کے بعد پھر اس نے اف تک نہیں کی جبکہ جیکو اس سے کسی خاص ردِعمل کی توقع کر رہی تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ہولڈنگ اس طرح خاموشی سے یہ اذیت برداشت کر جائے گا۔

اس کی قوتِ برداشت نے جیکو کے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔ اس نے ایک محافظ لڑکی سے رائفل چھینی اور چیختے ہوئے رائفل کی سنگین سے ہولڈنگ کے بازوؤں اور ٹانگوں پر وار کرنے لگی...... اس نے سنگین اتار کر رائفل پھینک دی اور قصائی کی طرح ہولڈنگ کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر پھینکنے لگی۔ ہولڈنگ کے جسم سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کے منہ سے اب تک کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔

اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ اس کا ایک بالائی دانت نچلے ہونٹ میں پیوست تھا، جس سے خون رس رہا تھا۔ جیکو اب بھی بربریت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ہولڈنگ نیچے گر گیا۔ جیکو کا جنون اس وقت کم ہوا، جب اسے احساس ہوگیا...... کہ وہ ایک لاش پر خنجر چلا رہی ہے۔ اس واقعے کے ایک ماہ بعد جہاز کے نیوی گیلر نے کیمپ کے خاردار تاروں کو پھاند کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر اسے بھی ایسی اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا کہ کیمپ کے قیدی لرز اٹھے۔

اس کے چند روز بعد جہاز کے آفیسر اسٹیوان نے میڈم اوٹسو پر حملہ کر دیا۔ اس کا شاید دماغ چل گیا تھا۔ محافظ لڑکیوں نے اسے سنگینوں کے کچوکے دے دے کر میڈم اوٹسو سے الگ کیا اور میڈم اوٹسو نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر اسٹیوان کے سر میں گولی اتار دی۔

جون کے شروع میں جب کیمپ میں اوکی ناوا کے سقوط کی بازگشت سنائی دی تو رچرڈ کے دل میں بھی امید کی کرن جگمگا اٹھی۔ اسے یقین تھا کہ اوکی ناوا کے بعد اب فارموسا کی باری آئے گی...... اس میں چند مہینے بھی لگ سکتے تھے اور اس دوران انہیں صبر و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کچھ برداشت کرنا تھا۔

پھر وہ ہوا جس کا رچرڈ کو خطرہ تھا۔ کیمپ کے کچن سے راشن کی چوری کا راز پوشیدہ نہ رہ سکا۔ میڈم اوٹسو نے کچن کی نگرانی شروع کر دی اور ایک روز لیزا، راشن چراتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔

پہلے تو لیزا اسے ویسے ہی پوچھ گچھ کی جاتی رہی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ راشن کس کے لیے چرایا کرتی تھی۔ پھر اسے گھسیٹ کر میدان کے درمیان لا کر اور تمام قیدیوں کے سامنے اس پر تشدد کرتے ہوئے اصل بات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی لیکن سارا جسم خون میں تر ہونے کے باوجود اس کی زبان نہ کھل سکی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے ہٹا دیا گیا اور اس کے بعد لیزا کی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کو اضافی راشن کی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ دوسری طرف امریکی فضائیہ کے بمبار طیارے جاپانیوں کی بیشتر سپلائی لائنیں کاٹ چکے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیمپ میں بھی راشن کی قلت پیدا ہوگئی۔

مزید برآں جون کی چلچلاتی دھوپ نے بھی ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ برف پگھلنے کے بعد کیمپ میں پڑی ہوئی لاشوں سے سڑاند اٹھنے لگی۔

اگست کے شروع میں قیدیوں کی حالت انتہائی خراب ہو چکی تھی۔ سورجس رچرڈ آخرکار اس نتیجے پر پہنچا کہ

کتے کی موت مرنے کے بجائے انہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس دن میڈم اوٹسو کے ہٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اندر سے آنے والی کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب کر ڈالیں اور وہ رینگتا ہوا دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ وہ نہایت آہستگی سے اندر رینگ گیا۔ اندر پہنچنے کے بعد ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا لیکن اب سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ میز پر مختلف قسم کے کھانے لگے ہوئے تھے جن کی خوشبو اس پر سحر سا طاری کر رہی تھی لیکن میڈم اوٹسو بھی ہٹ میں موجود تھی۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔

رچرڈ نے دروازہ مقفل کر دیا اور رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ معمولی سی آہٹ سن کر میڈم اوٹسو تیزی سے گھومی۔ رچرڈ کو دیکھ کر اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے متغیر ہوا اور دوسرے ہی لمحے اس نے دیوار پر لٹکے ہوئے ہولسٹر کی طرف چھلانگ لگا دی۔

ہولسٹر سے ریوالور نکالتے ہوئے اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے کھانے کی میز الٹ دی۔ ریوالور نکالتے ہی اس نے یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیے مگر بدحواسی میں اس کی کوئی بھی گولی نشانے پر نہیں لگی تھی۔ اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ بھاری ریوالور اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔

میڈم اوٹسو کی یہ بدحواسی دیکھ کر رچرڈ کے ذہن میں ایک اور شیطانی خیال ابھرا۔ اگر وہ اوٹسو کی انا کو مجروح کر سکے تو......؟ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ میڈم اوٹسو نے ایک اور فائر کیا مگر نشانہ اس مرتبہ بھی خطا گیا۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ نے اوٹسو پر چھلانگ لگا دی۔

دنیا کی سفاک ترین عورت میڈم اوٹسو بے بس چڑیا کی طرح رچرڈ کی گرفت میں تھی۔ رچرڈ پر جنون سا طاری تھا۔

فائرنگ اور میڈم کی چیخوں کی آواز سن کر محافظ لڑکیاں ہٹ کے باہر جمع ہو چکی تھیں اور زور زور سے دروازہ دھڑدھڑایا جا رہا تھا مگر رچرڈ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس پر تو جنون طاری تھا۔ اس نے میڈم کو نیچے گرا کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ انتقام کا جذبہ اب بھی شدید تر تھا۔ اس نے میڈم کے جسم پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

ممکن تھا وہ اسے جان ہی سے مار ڈالتا لیکن اسی لمحے محافظ لڑکیاں دروازہ توڑ کر اندر گھس آئیں۔ وہ بڑی مشکل سے رچرڈ کو گرفت میں لینے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔

میڈم اوٹسو کے جسم اور چہرے پر لاتعداد خراشیں تھیں۔ ہونٹوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ دو لڑکیوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تو وہ ہونٹوں کا خون پونچھتے ہوئے غرائی۔ ”تم امریکی کتے! تمہاری یہ جرأت...... تمہیں اس جرم کی اتنی بھیانک سزا دوں گی کہ تمہاری چیخوں سے آسمان تک کانپ اٹھے گا۔“

میڈم اوٹسو، میڈم جیکو اور میڈم لاکو، کو بھی احکامات جاری کرتی رہی۔ موچرس رچرڈ کو ہٹ سے باہر لایا گیا۔ تین محافظ لڑکیوں نے اپنی رائفلیں اس کی پشت سے لگا رکھی تھیں۔ کیمپ کے آخری سرے پر خاردار تاروں کے قریب اسے روک لیا گیا۔ اس جگہ کے قریب ہی جنگلے کے دوسری طرف گندگی کا ایک جوہڑ تھا۔ رچرڈ کے ہاتھ میں ایک بیلچہ دے کر اسے گڑھا کھودنے کا حکم دیا گیا۔ تین رائفلوں کے سائے میں وہ گڑھا کھودتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کے باقی ساتھیوں کو بھی اس کام میں شامل کر دیا گیا۔ وہ سب تقریباً پانچ گھنٹے تک گڑھا کھودتے رہے۔

ان میں سے جو بھی ذرا سستی دکھاتا، میڈم جیکو کا ہنٹر اس کی کھال ادھیڑ دیتا۔

دس فٹ کی گہرائی میں پہنچنے کے بعد پانی نکل آیا۔ اس کے باوجود وہ گڑھا کھودتے رہے۔ بدبودار پانی تیزی سے گڑھے میں بھر رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد جب پانی پنڈلیوں تک پہنچ گیا تو انہیں رسیوں کے ذریعے باہر نکال لیا گیا۔

قیدیوں کو دو محافظوں کی نگرانی میں ان کی بیرک میں واپس پہنچا دیا گیا اور میڈم جیکو کے حکم پر چار محافظ لڑکیاں جنگلے کے دوسری طرف جوہڑ کے بدبودار پانی سے بالٹیاں بھر بھر کر اس گڑھے میں انڈیلنے لگیں۔ ان کا یہ کام ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر اطلاع پا کر میڈم اوٹسو بھی اپنے ہٹ سے نکل کر وہاں پہنچ گئی۔

رچرڈ کی قمیص پھاڑ کر اس کے جسم سے الگ کر دی گئی اور پھر اسے اور اس کے ساتھیوں کو دھکیلتے ہوئے گڑھے کے قریب لایا گیا۔ اس وقت تک گڑھے میں چار فٹ تک پانی جمع ہو چکا تھا۔ میڈم اوٹسو چند لمحے خونخوار

نظروں سے موچرس رچرڈ کی جانب دیکھتی رہی اور پھر معنی خیز لہجے میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”لگتا ہے تم بہت اچھا کھانا کھانے کے شوقین ہو، امریکی کتے! آج میں نے تمہارے لیے ایک بہت ہی خاص ڈش تیار کرائی ہے۔ اسے ہماری زبان میں لنفا ہی کہا جاتا ہے۔“

میڈم اوٹسو بات کرتے ہوئے رچرڈ کے قریب آ گئی تھی...... آخری الفاظ منہ سے نکالتے ہی اس نے رچرڈ کو زوردار دھکا دیا۔ رچرڈ قلابازی کھاتا ہوا گڑھے میں جاگرا۔ پانی اس کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ کمر اور ٹانگوں پر سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔ وہ پانی میں ہاتھ ڈال کر کمر سہلانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

کوئی چیز اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی، جسے اس نے نوچ لیا۔ پھر اپنے ہاتھ میں پانچ انچ لمبی جونک دیکھ کر اسے اپنا سانس سینے میں رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ایک جونک اس کے پیٹ پر چپک گئی تھی جسے کوشش کے باوجود وہ نوچنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا اور پھر تو اسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے پیٹ کے نچلے حصے پر نشتر سے چل رہے ہوں...... جونکیں اب اس کی کمر اور پیٹ پر رینگتی ہوئی جسم کے ہر حصے پر پہنچ رہی تھیں اور بڑی آزادی سے اس کا خون پی رہی تھیں۔ رچرڈ چیختا ہوا گڑھے کی دیوار کی جانب لپکا۔ اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر چکنی مٹی پر اس کے ہاتھ پھسلتے رہے۔ اس نے بے بسی سے اوپر دیکھا۔ اس کے ساتھی گڑھے کے کنارے پر کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔ ہر چہرہ خوف و دہشت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ رچرڈ اپنے جسم سے جونکیں نوچتا اور پانی میں ناچتا رہا۔ اس نے ایک بار پھر اوپر دیکھا۔ اس مرتبہ اسے کوئی محافظ لڑکی دکھائی نہیں دی تھی۔ البتہ اس کا ایک ساتھی گڑھے کے کنارے پر لیٹا ہاتھ نیچے لا رہا تھا۔ رچرڈ نے پوری قوت سے اچھل کر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ ان کی انگلیاں مس ہوئیں، مگر دونوں میں سے کوئی بھی کسی کے ہاتھ پر گرفت نہ جما سکا۔ آخرکار...... تیسری چوتھی کوشش میں وہ جمی کا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ایک اور ساتھی جانسن نے فوراً ہی زمین پر لیٹ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچ تان کر گڑھے سے باہر نکال لیا۔

ہوا اور دھوپ کے باعث اس کے جسم پر جونکوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ رچرڈ کے ساتھی اس کے جسم سے جونکیں نوچ نوچ کر پھینکتے رہے۔

”کک...... کیا ہوا...... یہ وحشی لڑکیاں یہاں سے کیوں چلی گئیں......؟“ رچرڈ نے حواس بحال ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

”پپ...... پتا نہیں۔“ جمی بولا۔ کچھ دیر پہلے ایک کار گیٹ پر آ کر رکی تھی۔ نیچے اترنے والے ایک جاپانی فوجی نے چیخ کر ہیرو یا شاید اس کے ساتھ کچھ اور بھی کہا تھا۔ تمام لڑکیاں دوڑتی ہوئی کار کے قریب چلی گئیں۔ جاپانی افسر کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا...... موچرس رچرڈ اور اس کے ساتھیوں کے قریب پہنچ گیا۔

چھ اگست کے دن...... امریکی فضائیہ کے بی-29 طیارے نے ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرا دیا تھا۔ اس کے تین دن بعد ایک اور ایٹم بم نے ناگاساکی کو مٹی میں ملا دیا تھا...... چودہ اگست کو جاپان نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس طرح جنگ ختم ہو گئی تھی اور جنگی کیمپوں میں تمام امریکی قیدی اب آزاد تھے۔ رچرڈ اور اس کے ساتھیوں نے کیمپ کے تمام قیدیوں کو یہ خوش خبری سنائی۔ ہر وہ شخص جو چلنے پھرنے کے قابل تھا، خوشی سے اچھل پڑا...... اور پھر انہوں نے محافظ لڑکیوں کے ہٹس کو گھیرے میں لے لیا۔ اب وہ کسی چیز سے خوف زدہ نہیں تھے۔ ان کے دلوں میں شدید نفرت تھی اور وہ کیمپ کی ان درندہ صفت محافظ لڑکیوں سے انتقام لینا چاہتے تھے جنہوں نے انہیں زندہ درگور کر رکھا تھا۔

وہ مختلف ہٹس کی تلاشی لیتے ہوئے اس بڑے ہٹ کے سامنے پہنچ گئے جو میٹنگ ہال کہلاتا تھا۔ ہٹ کا دروازہ بند تھا، جسے قیدیوں نے توڑ دیا۔ سب سے پہلے اندر داخل ہونے والا موچرس رچرڈ ہی تھا...... لیکن پہلا قدم اندر رکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے سامنے فرش پر کیمپ کی تمام محافظ لڑکیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اپنے اسلاف کی روایات پر عمل کرتے ہوئے ان جاپانی لڑکیوں نے بھی شکست تسلیم کرنے کے بجائے ہاراکاری، (جاپانی خودکشی) کر لی تھی۔



”وہ اگر اب جادو کرے گا تو اس کی قوم کے نافرمان گروہ پر بھی یہ جادو اثر انداز ہوگا۔ اس لیے وہ جادو نہیں کرے گا۔“ ہامان نے بڑی چالاکی سے فرعون اور دوسرے اراکین کو قائل کر لیا اور دوسرے ہی دن سے اس نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

اس نے ایسے لوگ تیار کیے جو اسرائیلی بستیوں میں جائیں اور انہیں شیشے میں اتارنے کی کوشش کریں۔ ان میں بیشتر وہ بنی اسرائیلی تھے جو پہلے ہی فرعون کو خوش کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دور دور رہتے تھے۔ وہ بھی تھے جو شاہی

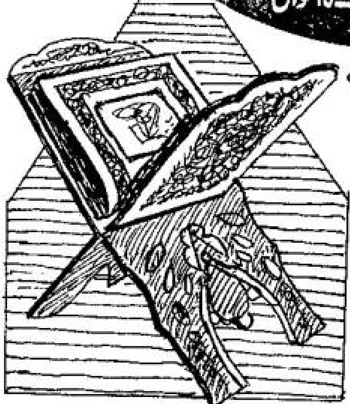
حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

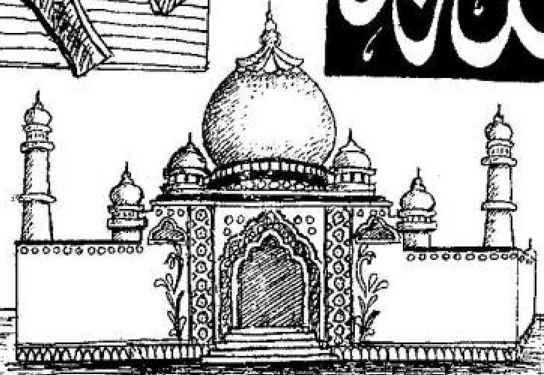
بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ”اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“ سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

پانچواں حصہ







محل میں مختلف کاموں پر مقرر تھے۔

ان لوگوں نے احکام ملتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ اسرائیلیوں کو طرح طرح کے لالچ دیے گئے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جانے سے انکار کر دیں تو وہ فرعون کی نوازشات کے حق دار بن جائیں گے۔ ان سے جبری محنت نہیں لی جائے گی اور انہیں برابری کے حقوق ملیں گے۔ خود اسرائیلیوں کا حال یہ تھا کہ وہ یہیں پیدا ہوئے تھے یہیں پلے بڑھے تھے۔ ان کے باپ دادا اسی سرزمین پر پیدا ہوئے تھے۔ انہیں مصر سے محبت تھی۔ اسی کو وہ اپنا وطن سمجھتے تھے۔ اب انہیں بے وطن کیا جا رہا تھا۔ مصریوں کے مظالم سے تنگ آ کر وہ ہجرت کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ جب انہیں یہ یقین دہانی کرائی جانے لگی کہ ان پر مظالم نہیں ہوں گے اور انہیں برابری کا درجہ دیا جائے گا تو وہ ڈانواں ڈول ہونے لگے۔ کئی نے تو وعدہ کر بھی لیا اور کئی پس و پیش میں تھے۔

یہ کارروائیاں ایسی نہیں تھیں کہ پوشیدہ رہتیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا تو انہیں یقین ہو گیا کہ فرعون کی نیت پھر بدل گئی ہے ورنہ اب تک جانے کی اجازت دے چکا ہوتا۔ اس کے برخلاف بنی اسرائیل کو میرے خلاف کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ضروری سمجھا کہ وہ فرعون سے ملیں اور اس کے کارندوں کی حرکت سے اسے آگاہ کریں۔ مزید یہ کہ اس سے تقاضا کریں کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام فرعون سے ملاقات کے لیے اس کے محل پہنچ گئے۔ اب فرعون کو اپنی وعدہ خلافی پر پردہ ڈالنے کے لیے بہانہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس لیے ملاقات میں کوئی حرج نہ تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

"اے فرعون! تجھے یاد ہے تو نے وعدہ کیا تھا کہ مچھروں کی وبا ٹل جانے کے بعد تو ہمیں مصر سے جانے دے گا۔"

"میں تمہیں کب روک رہا ہوں۔ جاؤ، اسی وقت چلے جاؤ۔"

"تو نے میری قوم کے ساتھ مجھے جانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"اگر تیری قوم تیرے ساتھ نہ جانا چاہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے طور پر معلوم کرایا ہے۔ آدھے سے زیادہ لوگ تمہارے ساتھ جانے کو تیار نہیں۔ جب تک تیری قوم کے تمام افراد تیرے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوتے میں اجازت نہیں دے سکتا۔"

"اے فرعون! عہد توڑنے کے لیے بہانے تلاش مت کر۔ یہ تیرا معاملہ نہیں کہ کون میرے ساتھ جاتا ہے کون نہیں۔ کسی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہو گی۔ جو میرے ساتھ جانا چاہے گا چلا جائے گا۔"

"بدعہدی میں نہیں تو کر رہا ہے۔" فرعون کی آواز میں غصہ تھا۔ "تو نے کہا تھا تو اپنی پوری قوم کو ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ اب کہہ رہا ہے کسی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں۔"

"یہ حرکت بھی تیرے آدمیوں نے کی ہے۔ اس سازش میں تیرا وزیر ہامان بھی شامل ہے۔ یہ لوگ اسرائیلیوں سے ملتے رہے ہیں اور انہیں بہکاتے رہے ہیں۔"

"میں نے تجھے پہلے ہی بتایا کہ میرے لوگ یہ معلوم کرنے کے لیے اسرائیلیوں کے پاس گئے تھے کہ وہ تیرے ساتھ جانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ان میں سے اکثر نے انکار کر دیا۔ اس میں سازش کہاں سے آ گئی۔"

"ان لوگوں نے انہیں لالچ دیا ہے۔"

"تو اپنے لوگوں سے کہو لالچ میں نہ آئیں۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں تجھے اسی وقت اجازت دوں گا جب تیری پوری قوم تیرے ساتھ جانے پر تیار ہو۔ تو اپنی قوم سے کہہ کہ اس کا ایک ایک فرد میرے پاس آئے اور جانے کی اجازت طلب کرے۔ جب میں دیکھ لوں گا کہ سب لوگ جانا چاہتے ہیں تو میں اجازت دے دوں گا۔"

"اے فرعون! میں دیکھ رہا ہوں کہ تو اللہ سے مذاق کرنے پر تلا ہوا ہے۔ افسوس کہ تو اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے کسی عذاب سے سبق نہ سیکھ سکا اور اب بھی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ میں تجھے تین دن کی مہلت دے رہا ہوں۔ اگر اس کے بعد بھی تو نے اجازت نہ دی تو میں خدا سے دعا کروں گا کہ وہ تجھ پر اور تیری رعیت پر کوئی اور عذاب نازل کرے۔"

"یہ عذاب ان لوگوں پر بھی نازل ہونا چاہیے جو تیری نافرمانی کرتے ہوئے تیرے ساتھ جانے سے انکار کر رہے ہیں۔"

"اللہ جو چاہے گا کرے گا۔ وہ دلوں کا حال جاننے والا ہے۔"

تین دن گزر گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے مدد چاہی اور دعا کی کہ اے اللہ! مجھے کوئی راہ دکھا۔ میں نے تیرے حکم سے فرعون کو تین دن کی مہلت دی تھی۔ تین دن گزر گئے۔ وہ بدعہدی پر اترا ہوا ہے۔ میرے لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں دیتا۔

ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نماز ختم ہوئی تھی کہ آپ پر وحی اتری۔

اس وحی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ پھر فرعون کے پاس گئے اور اس سے مخاطب ہوئے۔

"عبرانیوں کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تو کب تک میرے سامنے نیچا بننے سے انکار کرے گا۔ میرے لوگوں کو جانے دے۔ اگر تو نے میرے لوگوں کو نہیں جانے دیا تو میں تیرے ملک پر ٹڈیاں لے آؤں گا اور وہ زمین کی سطح کو ایسا ڈھانک لیں گی کہ کوئی زمین کو دیکھ بھی نہیں سکے گا اور وہ تیرے اور تیرے نوکروں کو بلکہ سب مصریوں کے گھروں میں بھر جائیں گی اور تمہارے جتنے درخت میدان میں لگے ہیں ان کو بھی چٹ کر جائیں گی اور ایسا تیرے اور تیرے آباؤ اجداد نے جب سے وہ پیدا ہوئے آج تک نہیں دیکھا ہو گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ کہہ کر دربار سے نکل آئے۔

فرعون پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ نہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو روک سکا اور نہ ان سے یہ کہہ سکا کہ جس عذاب کی وہ اطلاع دے رہے ہیں اسے روک دیں۔ نہ آنے دیں۔

ایک خاموش تصویر تھی جو فرعون کے نام پر تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سکتہ سا ہو گیا تھا۔ یہ سکتہ اس وقت ٹوٹا جب اس کے مشیر، مصاحبین اور وزراء کو معلوم ہوا اور وہ اس کے پاس آئے۔ ان میں ہامان بھی شامل تھا۔ فرعون کی حالت دیکھ کر کسی کو جرأت نہیں تھی کہ کوئی اس سے بات کرتا۔

ایک مصاحب ہمت کر کے آگے بڑھا۔

"خداوندا!" اس نے فرعون کو مخاطب کیا۔ "یہ جادوگر کب تک ہمارے گلے کا پھندا بنا رہے گا۔ جب موقع ملتا ہے وہ اس پھندے کو سخت کر دیتا ہے۔ اب ٹڈیوں کی دھمکی دے کر چلا گیا ہے۔ اگر اس نے اس جادو پر عمل کر لیا تو مصر برباد ہو جائے گا۔"

اس نے اتنی بات کی تو ایک اور مصاحب کی بھی ہمت ہوئی۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے فرعون کو مشورہ دیا۔

"اس جادوگر کا کوئی توڑ ہمارے پاس نہیں لہٰذا اسے جانے دے تاکہ مصریوں کی جان چھوٹے۔"

اب تو ہامان بھی اسی رائے کے حق میں تھا حالانکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سخت خلاف تھا لیکن مصر میں جتنے کھیت تھے اس کے تھے۔ ٹڈیوں کا نام سن کر اسے اپنے کھیت یاد آ گئے تھے اور وہ دل سے چاہنے لگا تھا کہ یا تو یہ معجزہ ٹل جائے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام چلے جائیں۔

فرعون سب کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا شیطانی دماغ کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کی تجویز پر عمل بھی ہو جائے اور موسیٰ علیہ السلام کا جانا بھی رک جائے۔

بہت سوچ سمجھ کر اس نے حکم جاری کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو بلوا لیا جائے۔ میں اسے جانے کی اجازت دے دوں گا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر بلا لیے گئے۔

فرعون نے کہا۔ "میں اپنے لوگوں کی ضد سے مجبور ہو گیا ہوں اور تجھے جانے کی اجازت دیتا ہوں لیکن یہ پوچھنا میرا حق ہے کہ تیرے ساتھ کون کون لوگ جائیں گے۔"

یہ بدعہدی کا دوسرا حربہ تھا جو فرعون آزمانے والا تھا۔

"ہم اپنے جوانوں اور بڈھوں اور عورتوں اور جانوروں سمیت جائیں گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم میرا ملک ہی خالی کر کے چلے جاؤ اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤ۔ تو نے کہا تھا میں تیرے لوگوں کو جانے دوں تاکہ تو بیابان میں جا کر خدا کی عبادت کرے لہٰذا میں تجھے صرف مردوں کو لے جانے کی اجازت دوں گا کہ وہ جائیں اور عبادت کریں۔ عورتیں اور بچے تیرے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔"

"فرعون! یہ تیری بدعہدی ہے۔ تو اپنے عہد سے پھر رہا ہے۔"

"تو نے جو کہا تھا میں اسے مان رہا ہوں۔ اس سے زیادہ کی مجھ سے توقع مت رکھ۔"

فرعون نے گفتگو منقطع کر دی اور تخت سے اٹھ کر چلا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام مزاج کے بہت گرم تھے لیکن وادی سینا میں جب وہ اللہ تعالیٰ سے پہلی مرتبہ ہم کلام ہوئے تو اللہ نے ان کو ہدایت کی تھی کہ فرعون سے نرمی سے بات کرنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی تک اس کی پاس داری کرتے چلے آئے تھے۔ فرعون کی ہر زیادتی برداشت کرتے رہے تھے۔ اس وقت اس کی بدعہدی پر انہیں سخت غصہ آیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب بندے کا غصہ دیکھا نہیں گیا، فوراً وحی نازل ہوئی۔

”ملکِ مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ ٹڈیاں ملک مصر پر آئیں اور ہر قسم کی سبزی جو اس ملک میں ہے چٹ کر جائیں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی کا رخ آسمان کی طرف کیا اور پھر اس لاٹھی کو چاروں طرف گھما دیا۔ کچھ ہی دیر میں تیز آندھی آئی۔ یہ آندھی پورے دن اور پوری رات چلتی رہی۔ صبح ہوتے ہی آندھی کے ساتھ ٹڈیاں چلی آئیں۔ یہ ٹڈیاں اتنی بڑی تعداد میں تھیں کہ پورے مصر پر شامیانے کی طرح چھا گئیں۔ شہروں میں اندھیرا ہو گیا۔ یہ ٹڈیاں کھیتوں میں اتریں۔ ایک ایک سبزی کو اس طرح کھا گئیں کہ گویا یہ کھیت کبھی تھے ہی نہیں۔ کھیت خالی، درخت ننگے ہو گئے۔

ہامان دوڑا ہوا آیا اور فرعون کے قدموں میں گر گیا۔

”میں تو برباد ہو گیا۔ کیا میری وفاداری کا یہی صلہ ہے کہ میرے کھیت ٹڈیوں کے حوالے ہو گئے۔ ان کھیتوں سے مصریوں کو غذا فراہم ہوتی تھی۔ اب تو ملک میں قحط نازل ہو جائے گا۔ لوگ بھوکوں مریں گے۔ تو موسیٰ علیہ السلام کو بلا اور اس سے کہہ کہ اس عذاب کو واپس لے۔“

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو بلوایا۔

”میں تیرا اور تیرے خدا کا گناہ گار ہوں۔ تو اپنے خدا سے کہہ کہ اس بار میرا گناہ بخش دے۔ میں ضرور تیرے لوگوں کو جانے دوں گا۔“

”جب تو کسی عذاب کا منہ دیکھتا ہے یہی کہتا ہے۔ پھر میں کیسے یقین کرلوں ؟“

”اس بار اس موت سے چھٹکارا مل جائے تو میں ضرور اپنا وعدہ پورا کروں گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خلقِ خدا پر رحم آنے لگا اور اسے پھر ایک موقع دے دیا۔

خدا کتنا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ فرعون بار بار سرکشی دکھاتا ہے اور اللہ کی ذات اسے بار بار معاف کر دیتی ہے۔ اسے پورا موقع دے رہی ہے کہ وہ اب بھی راہِ راست پر آجائے تاکہ وہ کل کو یہ نہ کہہ سکے کہ مجھے موقع نہیں دیا گیا تھا۔

اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شفاعت فرعون کے حق میں قبول کر لی۔ پھر ایک آندھی آئی اور ٹڈیوں کو اڑا کر لے گئی اور ان کو بحرِ قلزم میں ڈال دیا۔

مصر کی حدود میں ایک ٹڈی بھی باقی نہ رہی۔

عذاب ٹلتے ہی فرعون کا دل پھر سخت ہو گیا اور اس نے بنی اسرائیل کو نہ جانے دیا۔

اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرا دیا جائے۔ فرعون کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا لیکن چونکہ خدا کو یہ منظور نہیں تھا لہٰذا فرعون کے دل میں ایسا ڈر بٹھا دیا گیا تھا کہ وہ اپنے اس قبیح فعل پر عمل کرنے سے ڈرتا تھا اور چاہتا یہ تھا کہ اس کی طرف سے کوئی اور شخص یہ کام کر گزرے اور اس کے ہاتھ صاف رہیں۔ مصر کی کئی معزز شخصیتوں کے نام اس کے سامنے آئے لیکن اس کی چالاکی نے اسے یہ مشورہ دیا کہ اس قتل میں اگر کوئی بنی اسرائیل کا آدمی ملوث ہو تو اس کا خمیازہ مصری قوم کو بھگتنا نہیں پڑے گا اور وہ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا اندرونی معاملہ کہہ کر رفع دفع کر دے گا۔ اس سے وہ مصری بھی مطمئن ہو جائیں گے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

وہ کئی دن تک اپنی اس تجویز پر غور کرتا رہا۔ ایک ایک پہلو کو دیکھتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے اس کی بزرگی و عظمت میں اضافہ بھی ہوگا۔ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھا سکے گا کہ .... موسیٰ علیہ السلام چونکہ تمہارے خداوند کے خلاف ہو گیا تھا اس لیے مختلف دیوتاؤں نے مل کر اس کے خلاف جنگ کی اور وہ ہلاک ہو گیا۔

اب وہ اس پر غور کر رہا تھا کہ قتل اس طرح ہو کہ قتل نہ لگے بلکہ سزا معلوم ہو۔ اس نے دل ہی دل میں سزا کا جواز بھی تلاش کر لیا لیکن ابھی وہ اس راز کو کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لیے اسے ایسے آدمی کی تلاش تھی جسے وہ اس کام کے لیے استعمال کر سکے۔ یہ آدمی بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا ہو اور اس قوم کا معزز شخص ہو جس کی بات کا لوگ یقین کر لیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہمدرد نہ ہو بلکہ اس کی قوم کا فرد ہونے کے بجائے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اختلاف رکھتا ہو۔ غریب نہ ہو کیونکہ غریب اسرائیلی ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار تھے۔

ایسے لوگوں کا ملنا مشکل نہیں تھا کیونکہ بہت سے اسرائیلی تھے جو محل میں فرعون کی خدمت پر مامور تھے۔ وہ ایک ایک نام پر غور کرتا رہا لیکن کسی نام پر اس کا دل نہیں ٹھکا۔ ان میں ہر شخص ایسا تھا جو پکڑے جانے پر فرعون کا نام لے سکتا تھا۔ آدمی ایسا ہو جو میری ہی طرح بااثر ہو۔ لوگ اس سے ڈرتے ہوں۔ اللہ اس کے لیے کم بختی کی راہیں کھولتا ہی رہتا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں قارون کا نام گونجا۔ یہ اسرائیلی بھی تھا اور دولت مند بھی۔ بنی اسرائیل کے لوگ اس کی دولت سے مرعوب تھے اور اس کے آگے پیچھے گھومتے رہتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ فرعون کا پیروکار تھا۔ کسی معزز کی حیثیت سے دربار میں آتا تھا تو فرعون کو سجدہ کیا کرتا تھا۔

فرعون نے اسے بلا بھیجا۔

قارون بنی اسرائیل کا ایک نہایت متمول شخص تھا۔ اس کے خزانے زر و جواہر سے بھرے ہوئے تھے۔ قوی ہیکل مزدوروں کی جماعت بہ مشکل اس کے خزانوں کی چابیاں اٹھا سکتی تھی۔

اس بے پناہ دولت نے اسے بے حد مغرور بنا دیا تھا۔ وہ دولت کے نشے میں اس قدر چُور ہو گیا تھا کہ اپنے عزیزوں اور قوم کے افراد کو نہایت حقیر سمجھتا تھا۔ دوسروں کا حق مارنے میں طاق تھا اور کنجوس ایسا کہ ایک دمڑی کسی پر خرچ کرنے کا روادار نہ تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اسے اکثر نصیحت کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بے شمار دولت سے نوازا ہے لہٰذا اس کا شکر ادا کرو اور اپنی دولت کا کچھ حصہ غریبوں میں تقسیم کیا کرو۔

قارون نے اس نصیحت کے جواب میں نہایت حقارت سے جواب دیا۔

”مجھے یہ دولت اس نے نہیں دی جسے تو رب العالمین کہتا ہے۔ یہ تو میرے تجربے، علمی کاوشوں اور کفایت شعاری کا نتیجہ ہے۔ پھر تو یہ کیوں کہتا ہے کہ میں اسے غریبوں میں تقسیم کر دوں۔ میں تو ان غلاموں کو اپنی قوم کا فرد کہنے میں بھی شرم محسوس کرتا ہوں۔“

اس دن کے بعد سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس کے راستے جدا ہو گئے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب موقع ملتا تھا اسے راہِ ہدایت دکھانے کے لیے تبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہتے تھے۔ وہ ان ہدایتوں سے بے حد نالاں تھا اور کوشش کرتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کا آمنا سامنا نہ ہو بلکہ اب تو یہ سوچنے لگا تھا کہ فرعون انہیں کسی طرح قتل کرا دے تاکہ اس کا پیچھا چھوٹے۔

فرعون نے اسے بلوایا تو وہ یہ سوچ کر گیا تھا کہ موقع دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا تذکرہ بھی چھیڑ دے گا۔ اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ فرعون نے خود ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

”قارون، یہ بتا تو نے موسیٰ کو کیسا پایا ؟“

”میں اسے ایک بڑے جادوگر سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا حالانکہ وہ میرا چچا زاد بھائی ہے لیکن میرے دل میں اس کے لیے ذرا سی بھی ہمدردی نہیں۔“

”اس کی وجہ ؟“

”مجھے جب ملتا ہے کہتا ہے تیرے پاس اتنی دولت ہے پھر میں اسے غریبوں میں تقسیم کیوں نہیں کرتا۔ میں کہتا ہوں یہ دولت تیرے رب العالمین نے نہیں دی ہے۔ میری اپنی کوششوں سے جمع ہوئی ہے۔ پھر کیوں میں اسے برباد کروں۔“

”تم اس کے لوگوں کو اس کے خلاف کیوں نہیں ورغلاتے ؟“

”اس نے ان پر بھی جادو کیا ہوا ہے۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ عبرانیوں کے خدا کا بھیجا ہوا رسول ہے۔“

”اسے نیک اور مردِ صالح بھی سمجھتے ہوں گے۔“

”وہ تو یہی کہتے ہیں۔“

”اگر انہیں اچانک ایک دن یہ معلوم ہو کہ موسیٰ کا دامن زنا کے گناہ سے داغدار ہے تو ان کا ردِعمل کیا ہوگا ؟“

”ان کا ردِعمل جو بھی ہو لیکن ہمیں موسیٰ کو سنگسار کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

''تو پھر بستی میں جا کر موسیٰ کے خلاف یہ بات خوب پھیلاؤ۔''

''سب جانتے ہیں کہ موسیٰ سے میرے اختلافات ہیں۔ میری بات کون سنے گا۔ وہ ثبوت ضرور مانگیں گے۔ اگر میں جھوٹا پڑ گیا تو تہمت لگانے کے الزام میں مجھے سنگسار کر دیا جائے گا اور میں اتنی دولت چھوڑ کر مرنا نہیں چاہتا۔''

''یہ دولت تو نے کہاں سے جمع کی ہے ؟''

''اس ملک میں جس کے پاس جو کچھ ہے آپ ہی کی عنایت سے ملا ہے۔''

''میں نے تجھے اتنی دولت دی اور تو میرا اتنا سا کام نہیں کر سکتا۔''

''میں تو خود یہ سوچ کر آیا تھا کہ آپ سے کہوں گا موسیٰ کو کسی طرح قتل کرا دیا جائے۔ آپ کے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے۔''

''کاش! میرے باپ نے اسے اسی وقت قتل کرا دیا ہوتا جب وہ بچہ تھا۔ ہامان نے مشورہ دیا تھا لیکن وہ نہ مانا۔ مجھے بھی چاہیے تھا جب وہ مدین سے مصر آیا تھا اسی وقت قتل کرا دیتا۔ میں نے وہ موقع ضائع کر دیا۔ اب یہ میرے لیے مشکل ہے کیونکہ مصریوں میں اس کے بہت سے ہمنوا پیدا ہو گئے ہیں۔ موسیٰ کو میں نے قتل کیا تو وہ میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہاں تو یہ کام کر سکتا ہے کیونکہ تو بنی اسرائیل میں سے ہے۔ موسیٰ کا رشتے دار بھی ہے۔ اسے آپ لوگوں کا آپس کا معاملہ سمجھا جائے گا۔''

''یہ میرے لیے بھی اتنا آسان نہ ہوگا۔ میں بنی اسرائیل کے غضب کا نشانہ بن جاؤں گا۔''

''میں یہ کب کہتا ہوں کہ تو اپنے ہاتھ سے اسے قتل کرے...... تو تو محض ذریعہ ہوگا۔''

''میرے پاس ایک تجویز ہے اگر آپ اجازت دیں۔''

''بتا کیا تجویز ہے؟''

''مصر میں بہت سی بدکار عورتیں ہیں۔ میں کسی کو بھی دولت کا لالچ دوں گا اور وہ بنی اسرائیل کے سامنے جا کر یہ کہہ دے گی کہ موسیٰ نے اس سے جسمانی تعلق قائم کیا ہے۔ اس فاحشہ عورت کے لیے الزام لگانا مشکل نہ ہوگا۔ اسرائیلیوں کو بھی یقین آ جائے گا۔''

''ایسا موقع کیسے آئے گا کہ بنی اسرائیل کی بڑی تعداد بھی موجود ہو اور موسیٰ بھی وہاں ہو۔''

''اس کا موقع میں نکال لوں گا۔ بس آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔''

''ترکیب تُو نے خوب نکالی ہے۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو دولت کی تجھے ضرورت نہیں، میں تجھے اپنا قرب بخشوں گا۔ تُو شاہی مقرب کہلائے گا۔ اپنی ساری دولت خرچ کر کے بھی تو یہ رتبہ نہیں خرید سکتا جو میں تجھے عطا کروں گا۔''

قارون اس سے ملاقات کرنے کے بعد اپنے محل کی طرف چلا۔ راستے بھر وہ کسی ایسی عورت کے بارے میں سوچتا رہا جس کی بدکاری مشہور ہو۔ اس کی کنجوسی نے اسے کبھی کسی ایسی عورت کے پاس جانے نہیں دیا تھا لیکن وہ ایسی بہت سی مصری عورتوں کو جانتا ضرور تھا۔ محل تک پہنچتے ہی بہت سے نام اس کے ذہن میں آ گئے تھے لیکن جب اس نے غور کیا تو یہ سب نام قبطی (مصری) عورتوں کے تھے۔ اس نے سوچا بنی اسرائیل کسی مصری عورت کی طرف سے لگائے ہوئے الزام کو تسلیم نہیں کریں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ دشمنی میں ان کا نام لے رہی ہے۔ لوگوں کا دھیان فرعون کی طرف بھی چلا جائے گا۔ یہ عورت تو بنی اسرائیل سے ہونی چاہیے۔ وہ اسرائیلیوں سے میل جول کم ہی رکھتا تھا۔ اس لیے ایسی عورتوں کے بارے میں بھی کم ہی جانتا تھا۔ وہ کسی کو رازدار بنانا بھی نہیں چاہتا تھا ورنہ ایسی عورتوں کے بارے میں معلومات کا ملنا مشکل نہیں تھا۔ اس کے محل میں جتنے غلام اور کارندے تھے سب اسرائیلی تھے۔ اس لیے کہ عام دستور یہی تھا۔ معمولی کاموں کے لیے اسرائیلی ہی ملازم رکھے جاتے تھے۔ اس نے ایک کارندے کو بلایا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ فاحشہ عورتوں کے پاس جاتا رہتا ہے۔ قارون کو اس کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغی مجلسوں میں جانے لگا ہے۔ اس نے اس کارندے کو اپنے پاس بلایا۔

''سنا ہے تو موسیٰ کی باتیں سننے اس کی محفلوں میں جانے لگا ہے؟''

''مالک! میری کیا مجال جو میں آپ کا غلام ہوتے ہوئے اس کی باتیں سنوں۔ میں تو اپنے کان بند کر لیتا ہوں۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ باتیں کانوں میں پڑ جاتی ہوں تو میں کہہ نہیں سکتا۔ وہ خود ہمارے دروازوں پر آتا ہے اور نصیحتیں کر کے چلا جاتا

ہے۔ وہ آپ کے بارے میں بھی طرح طرح کی باتیں کر کے ہمیں ورغلاتا رہتا ہے۔ اس لیے میں تو اس کی باتیں قطعی نہیں سنتا۔ اگر کسی نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ میں خود اس کی باتیں سننے جاتا ہوں تو یہ غلط ہے۔''

''تم لوگ اسے اپنے دروازوں پر آنے ہی کیوں دیتے ہو؟''

''مجھے تو ان دونوں بھائیوں کے جادو سے بہت ڈر لگتا ہے، اس لیے میں ڈرتا رہتا ہوں۔''

''سنا ہے وہ بدکار عورتوں کے بہت خلاف ہے۔ کہتا ہے انہیں سنگسار کرا دے گا؟''

''ہاں کہتا تو ہے۔ بہت سی بیوہ عورتیں ایسی تھیں جو کچھ پیسے کما لیتی تھیں' موسیٰ کے ڈر سے دروازے بند کر کے بیٹھ گئی ہیں۔ اگر یہ کام کرتی بھی ہیں تو نہایت رازداری سے۔ اکثر عورتیں اپنے گاہکوں کو گھر کے اندر نہیں بلاتیں بلکہ ان کے ساتھ کہیں جانے کو ترجیح دیتی ہیں۔ ان کا خیال ہے ان کے گھروں کی نگرانی کی جاتی ہے۔''

''اسی لیے تو نے بھی جانا چھوڑ دیا؟'' قارون نے اس سے مزید باتیں کریدنے کے لیے پوچھا۔

''مالک! کیوں مذاق کرتے ہیں۔ میرے پاس اتنے پیسے کہاں کہ لٹاتا پھروں۔ ایسی عورتیں ہم غریبوں کو منہ بھی کہاں لگاتی ہیں۔ خوب صورت عورتوں کا تو ہم تصور ہی نہیں کر سکتے۔''

''ان خوب صورت عورتوں کے بارے میں جانتا تو ہوگا؟''

''چند کے بارے میں تو مجھے خوب اچھی طرح معلوم ہے بلکہ ایک تو میں ایسی عورت کو جانتا ہوں جو بہت پارسا مشہور ہے لیکن رات کے اندھیرے میں اس کے پاس مخصوص گاہک آتے ہیں۔ سنا ہے بہت خوب صورت ہے۔''

''تو ایسی عورتوں کی ایک فہرست بنا کر مجھے دے تاکہ موسیٰ ... کسی وقت کسی عورت کو سنگسار کرائے تو میں اس فہرست کو دیکھ کر اندازہ کروں کہ اس نے کسی غلط عورت کو تو سنگسار نہیں کرا دیا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ یہ عورتیں اب بھوکی مر رہی ہوں گی۔ میں ان کا کچھ وظیفہ مقرر کر دوں۔''

''مالک! یہ تو بہت نیک کام ہوگا۔''

''بس جلدی سے ایسی عورتوں کے نام اور پتے لکھ کر مجھے دے دو۔''

''مالک! یہ اتنی جلدی تو نہیں ہوگا۔ مجھے دو دن تو لگ جائیں گے۔''

''اور ہاں! اس عورت کا نام سب سے اوپر لکھنا جو بہت خوب صورت ہے اور لوگ اسے پارسا بھی سمجھتے ہیں۔''

''جی مالک۔''

قارون کو اب اس ایک نام سے دلچسپی ہو گئی تھی جس کے بارے میں کارندے نے بتایا تھا کہ وہ مشہور فاحشہ نہیں ہے۔ لوگوں میں وہ پارسا سمجھی جاتی ہے لیکن درپردہ بدکاری کرتی ہے۔ یہی عورت اس کے کام آ سکتی تھی۔ فہرست بنانے کا تو اس نے اس لیے کہہ دیا تھا کہ کارندے کو شک نہ ہو۔ وہ یہی سمجھے کہ قارون ایسی عورتوں کے لیے وظیفہ مقرر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

کارندے نے سوچ سوچ کر ایسے نام لکھ دیے اور ایک فہرست بنا کر قارون کو پیش کر دی۔

''کیا تو اس عورت کا مکان مجھے دور سے دکھا سکتا ہے جس کا نام تو نے اس فہرست میں سب سے اوپر لکھا ہے؟''

''کیوں نہیں مالک بلکہ آپ کہیں تو میں اسے یہیں لے آؤں۔ آپ کا نام سن کر تو وہ دوڑی چلی آئے گی۔''

''مجھے اس سے کیا لینا دینا جو تو اسے یہاں لانے کی بات کر رہا ہے۔ میں تو ایسی عورتوں کو اپنے محل کے قریب بھی نہ پھٹکنے دوں۔'' کارندہ حیران تھا کہ قارون جب اس سے کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتا تو مکان کیوں دیکھنا چاہتا ہے۔

قارون اس کے ساتھ اسرائیلی بستیوں کی طرف گیا اور اس عورت کا مکان دور سے دیکھ کر چلا آیا اور اچھی طرح ذہن نشین بھی کر لیا۔

یہ دن کا وقت تھا۔ رات کا اندھیرا پھیل جانے کے بعد اسے پھر یہاں آنا تھا۔

جب رات ہوئی تو وہ اکیلا نکلا اور دن میں دیکھے ہوئے مکان پر پہنچ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔

''کون ہے...... رات کے وقت کسی شریف گھر پر دستک کیوں دے رہے ہو؟''

''دروازہ کھولو تو میں بتاؤں کہ میں کون ہوں۔''

''میں اکیلی رہتی ہوں۔ رات کے وقت دروازہ نہیں کھول سکتی۔''

''میں قارون ہوں۔ دروازہ تو کھول۔''

اندر خاموشی ہوگئی جیسے وہ عورت سوچ رہی ہو کہ دروازے پر واقعی قارون ہے یا کوئی اس کا نام استعمال کر رہا ہے تاکہ میں دروازہ کھول دوں۔ پھر دروازہ پورا کھول دیا۔

''میری تو قسمت کھل گئی۔ میرے ساتھ شب گزارنے قارون آیا ہے لیکن بُرا ہو موسیٰ کا۔ میں تجھے کیا کسی کو بھی اپنے گھر نہیں ٹھہرا سکتی۔ موسیٰ کے پیروکاروں کو مجھ پر شک ہے۔ وہ میرے گھر کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ہم پکڑے گئے تو میرا تو خیر کچھ نہیں، آپ بہت باعزت ہیں۔ آپ کوئی رات طے کرلیں اور مجھے اپنے مکان پر بلوالیں۔ مجھے آپ کی خدمت کرکے خوشی ہوگی۔''

''میں بھی تجھ سے یہی کہنے آیا تھا۔ میں جس آرام دہ بستر کا عادی ہوں وہ یہاں کہاں۔ تُو میرے محل میں چلی آ۔ ایک کیا کئی راتیں تجھے گزارنی ہوں گی۔ میں تجھے اتنی دولت دوں گا کہ زندگی بھر آرام سے بیٹھ کر کھائے گی۔''

کارندے نے اس عورت کو جتنا خوب صورت بتایا تھا، یہ عورت اس سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ ایسی حسین کہ کوئی بھی اسے دیکھ کر پھسل سکتا تھا۔ قارون سوچ رہا تھا یہ عورت جب موسیٰ پر الزام لگائے گی تو سب کو یقین آجائے گا کیونکہ یہ ہے ہی اتنی خوب صورت۔ یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ باتیں بھی خوب کرلیتی ہے۔

عورت بھی سوچ رہی تھی کہ قارون جیسا دولت مند شخص اس پر عاشق ہوا ہے۔ اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔

''مجھے بتا کب تیرے بستر کا دیدار نصیب ہوگا؟'' عورت نے بے تابی سے کہا۔

''میں تجھ سے زیادہ جلدی میں ہوں۔ اب تو رات بہت ہوگئی۔ دربان دروازے پر ہوگا۔ میں کل دربان کو کہیں بھیج دوں گا، تو بے کھٹکے چلی آنا۔''

''تمہارے محل کا کوئی خفیہ راستہ نہیں؟''

''وہاں بھی دربان ہوتا ہے۔ بس تو کل رات کا طے کرلے۔ میں تجھے اندر لے جانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گا۔''

''پھر تم جلدی یہاں سے چلے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہوجائے گا۔''

قارون کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے اٹھنا پڑا۔ اس عورت کے حسن کو دیکھ کر خود اس کا دل مچلنے لگا تھا لیکن اس وقت ایک ایسا مقصد اس کے سامنے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

صبح ہوئی تو فرعون کا وہ کارندہ جس نے فہرست بنا کردی تھی' اس عورت کے گھر گیا تاکہ احسان جتا سکے کہ اس نے قارون سے کہہ کر اس کا وظیفہ مقرر کرادیا ہے جو عنقریب اسے ملنے لگے گا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اس حسین عورت سے کوئی تعلق استوار کرسکے۔ وہ عورت اسے کبھی گھر کے اندر نہ بلاتی لیکن یہ سوچ کر بلالیا کہ یہ قارون کا ملازم ہے، شاید کوئی پیغام لایا ہو۔ جب اس نے وظیفے کے بارے میں سنا تو بے اختیار کہہ اٹھی۔

''اچھا تو اس لیے کل رات قارون یہاں آیا تھا۔''

''مالک یہاں آئے تھے؟''

''ہاں اور آج رات مجھے بلا کر گئے ہیں۔ میں رات کو ان کے محل میں جاؤں گی۔ میں سمجھ رہی تھی وہ مجھ پر عاشق ہوگئے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ بات وظیفے کی ہے۔ خیر میں جاؤں گی ضرور...... ان کا وظیفہ کوئی معمولی نہیں ہوگا یا کیا خبر میں اپنی اداؤں سے انہیں اپنا عاشق بنا ہی لوں۔''

''جو کچھ وہ کہیں مجھے ضرور بتانا۔''

''وہ تو میں بتا ہی دوں گی لیکن خبردار تُو کسی کو یہ مت بتانا کہ قارون نے مجھے اپنے محل میں بلوایا تھا ورنہ میں یہ بتانے میں دیر نہیں لگاؤں گی کہ تُو یہاں آیا تھا۔''

''تُو بے فکر رہ۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

اس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا لیکن قارون کا اس گھر میں آنا معمولی بات نہیں تھی۔ اسے قارون پر ہنسی آنے لگی۔ اس بڑھاپے میں وہ کس راہ پر چل نکلا ہے۔ کس بہانے سے اس نے فاحشہ عورتوں کی فہرست مجھ سے بنوائی اور اب ایک ایک کرکے سب کے گھر جائے گا۔ پھر اس نے گردن جھٹک کر اپنی جھنجلاہٹ کم کی۔ مجھے کیا وہ کچھ بھی کرے۔ اچھا ہے اس کی

دولت سے کسی کا بھلا ہوجائے۔

قارون نے یہ دن بڑی بے چینی سے گزارا۔ شام ہوتے ہی دربان کو اس نے دروازے سے ہٹا دیا۔ اندھیرا ہوا تو وہ اس عورت کے انتظار میں دروازے کے پاس ہی ٹہلنے لگا کہ کب وہ آئے اور کب وہ اسے لے کر اندر جائے۔

عورت کا حال بھی اس سے جدا نہیں تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی خراب تھا۔ اسے یہ فخر بھی ہو رہا تھا کہ قارون اس کے دام پر آیا تھا اور یہ خوشی بھی ہو رہی تھی کہ اب اسے بے پناہ دولت ملنے والی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اپنی اداؤں سے قارون کو اتنا خوش کروں گی کہ وہ اپنی دولت میرے قدموں میں رکھ دے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرلے پھر تو میں راج کروں گی۔ شام ہوئی تو وہ تیار ہونے بیٹھ گئی۔ شاندار پوشاک پہنی۔ بال بال میں موتی پروئے، خود کو خوشبو میں بسالیا۔ اندھیرا ہوا تو ایک چادر میں خود کو لپیٹ لیا اور باہر نکل گئی۔

قارون کے محل کے قریب پہنچ کر اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ وہ اپنے کسی گاہک کے گھر جا رہی تھی لیکن یہ کوئی اور نہیں قارون تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ قارون کو ان کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ تو میرے حسن کی کشش ہے جو اسے میرے قریب کھینچ لائی ہے۔ میں بھی اسے اب کسی اور کے پاس نہیں جانے دوں گی۔

محل کے قریب پہنچ کر اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ اگر دربان ہوا تو اس سے کیا کہوں گی؟ قارون نے کہا تو تھا کہ میں دربان کو ہٹا دوں گا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس نے محل کے دروازے پر قارون کو کھڑا دیکھا۔ اس نے عورت کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے اندر گھسیٹ لیا۔ دروازے کے ساتھ ہی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ وہ اسے لے کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ یہاں بھی چند دروازوں کو کھولتا بند کرتا ہوا وہ اسے لے کر ایک کمرے میں پہنچ گیا۔

''قارون! تمہارا گھر تو بڑا شاندار ہے۔'' عورت نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی اور اسے نام لے کر پکارا۔ قارون کو بُرا تو بہت لگا لیکن اس وقت اس کا مطلب تھا۔ عورت ایک طرف بیٹھ گئی اور کمرے کی آرائش کو غور سے دیکھنے لگی۔

''تجھے معلوم ہے میرے پاس کتنی دولت ہے؟'' قارون نے اچانک عجیب سا سوال کرڈالا۔

''مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں، مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ تو نے مجھے شب باشی کے لیے بلایا ہے۔ میں اپنی اداؤں کی تمام دولت تجھ پر نچھاور کردوں گی اور اس کے صلے میں تو مجھے مالا مال کردے گا۔ اور یہ کہ میرے تمام گاہکوں میں تُو بہترین گاہک ہے۔''

''تو میرا مطلب غلط سمجھی ہے۔''

''مجھے جو بھی بلاتا ہے اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے۔''

''میں تجھ سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔''

''میرا ایک ہی کام ہے، اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی۔''

''تو جو بھی کام کرتی ہے، کس لیے کرتی ہے؟''

''ظاہر ہے پیٹ کے ایندھن اور تن کے کپڑوں کے لیے۔''

''اور موسیٰ تیرے راستے میں مزاحم ہو رہا ہے۔ وہ کہتا ہے میں ایسی عورتوں کو سنگسار کرادوں گا اور ایسے مردوں کو بھی۔''

''ہاں کہتا تو ہے۔ اسی لیے تو میں یہاں تیرے پاس آئی ہوں۔ یہاں نہ وہ مجھے دیکھ سکے گا نہ تجھے۔''

''اگر موسیٰ کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوجائیں؟ وہ نہ تجھے دیکھ سکے نہ مجھے؟''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''یہ سمجھانے سے پہلے میں تجھے کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور دیوار میں بنی ایک تجوری کھولی۔ سونے کی چند ٹھوس ٹکیاں اور دو بیش قیمت جڑاؤ کنگن اس کے سامنے رکھ دیے۔

''یہ سب تمہارے ہیں، انہیں سمیٹ لو۔''

عورت اتنی حریص تھی کہ اپنے گریبان سے ایک رومال نکال کر سب کچھ اس میں باندھ لیا۔

''مجھے خوش کردو گی تو میں اس سے زیادہ اور دوں گا۔''

''مجھے بتا میں تجھے کیسے خوش کروں؟''

''میں کہہ رہا تھا اگر موسیٰ کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوجائیں اور تو نے کہا تھا تو سمجھی نہیں...... آ میں تجھے سمجھاتا

ہوں۔'' عورت کی طبیعت الجھنے لگی تھی۔ یہ شخص میری رات خراب کر رہا ہے۔ جانے کیا قصے لے کر بیٹھ گیا ہے لیکن اتنی دولت اسے مل گئی تھی کہ پچاس گاہک مل کر بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے وہ قارون کی باتوں میں دلچسپی لینے پر مجبور تھی۔

''تجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ اس نے بنی اسرائیل اور مصریوں دونوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ جادو کے کرشموں سے کبھی ٹڈیاں لے آتا ہے۔ کبھی پانی میں خون ملا دیتا ہے۔ کبھی مینڈک اور کبھی مچھر لے آتا ہے۔ فرعون سے دشمنی مول لے لی ہے جس کی وجہ سے اسرائیلیوں پر مظالم بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم لوگ صدیوں سے رہتے چلے آ رہے تھے لیکن جب سے یہ شخص مدین سے واپس آیا ہے، بنی اسرائیل کی زندگی مشکل میں پڑ گئی ہے۔ اگر یہ شخص درمیان سے ہٹ جائے تو سب کی جان چھوٹ جائے۔ خاص طور پر تیری کہ تجھے کسی وقت بھی سنگسار کرا سکتا ہے۔''

''تم کہیں اسے میرے ہاتھوں قتل کرانے کی بات تو نہیں کر رہے ہو۔ اگر تمہارا مقصد یہ ہے تو اتنی دولت ملنے کے باوجود بھی اسے قتل کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔'' عورت نے زیورات کا رومال آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اگر قتل ہی کرانا ہوتا تو فرعون اسے قتل کرا سکتا تھا۔ میں تو تجھ سے وہ کام لینا چاہتا ہوں جس سے وہ سنگسار کر دیا جائے۔''

''میں اسے سنگسار بھی نہیں کر سکتی۔''

''سنگسار تجھے نہیں کرنا ہے۔ وہ تو خود اس کے لوگ کریں گے۔ پہلا پتھر اس کے پیروکار ہی اٹھائیں گے۔''

''پھر یہ دولت اس کے پرستاروں میں تقسیم کرو۔ اگر تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ میں اس کی رسالت پر ایمان لے آئی ہوں تو تم نے غلط اندازہ لگایا ہے۔''

''سنگسار تمہیں نہیں کرنا ہے۔ تمہیں تو صرف یہ کہنا ہے کہ موسیٰ نے تم سے جسمانی تعلق قائم کیا تھا۔ وہ کام کیا تھا جسے وہ زنا کہتا ہے اور جس کی سزا سنگسار ہے۔ نہ صرف کہنا ہے بلکہ اداکاری کرتے ہوئے خوب پھوٹ پھوٹ کر روتا بھی ہے۔''

''یہ بات مجھے کب کہنی ہوگی؟''

''جب وقت آئے گا، میں تجھے بتا دوں گا۔''

وہ عورت رات کے اندھیرے میں آئی تھی، رات کے اندھیرے ہی میں واپس چلی گئی۔

گھر پہنچتے ہی اس عورت کے ضمیر نے ملامت کرنی شروع کر دی۔ وہ قارون سے مرعوب ہو کر اس کی ہر بات مانتی چلی گئی تھی۔ اب قارون سامنے نہیں تھا اور اس نے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پوری شخصیت اس کے سامنے آ گئی۔ پوری بستی انہیں پاکباز اور محترم سمجھتی ہے۔ جو ان پر ایمان نہیں بھی لائے ہیں، وہ بھی ان کے کردار پر کیچڑ اچھالنے کی جرأت نہیں کرتے۔ ان کے گھرانے میں بھی کوئی فرد ایسا نہیں ہے۔ قارون مجھ سے کیسا گھناؤنا کام لے رہا ہے۔ میں ابھی جا کر اسے منع کرتی ہوں کہ میں اس کا یہ کام نہیں کر سکتی۔ وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ اسے چاندی سونے سے بھری ہوئی وہ پوٹلی یاد آ گئی جو وہ قارون کے گھر سے لائی تھی۔ یہ پوٹلی بھی واپس کرنی پڑے گی۔ یہ خیال آتے ہی وہ پھر اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ یہ دولت بھی ہاتھ سے جائے گی اور قارون سے دشمنی بھی ہو جائے گی۔ قارون، موسیٰ سے زیادہ بااثر ہے۔ میرے ساتھ کوئی بھی سلوک کر سکتا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے میں اس کی بات مان ہی لوں۔ صرف موسیٰ پر تہمت ہی تو لگانی ہے۔ الزام غلط ہوگا لیکن وہ اسے غلط ثابت نہیں کر سکے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا قارون خود سنبھال لے گا۔

صبح ہونے تک اس کا لالچ اس کے ضمیر پر غالب آ گیا۔ اگر میں نے موسیٰ کو بچایا تو دولت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ میں یہ موقع کیوں ہاتھ سے جانے دوں۔ مجھے قارون کا ساتھ دینا چاہیے۔

اب وہ چاہتی تھی قارون جلد سے جلد موقع نکالے۔ ایسا نہ ہو کہ میں اپنا فیصلہ تبدیل کر لوں اور دولت ہاتھ سے چلی جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قاعدہ تھا کہ بنی اسرائیل کی بستیوں میں وعظ و تلقین کیا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے۔ ان قبائل کے خیالات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جدا جدا تھے۔ ہر ایک کے مسائل بھی الگ الگ تھے۔ مصریوں پر ہی کیا منحصر، ان کے ہم قوم بھی سب کے سب ایمان نہیں لے آئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پوری قوم کو متحد کرنے کا سوال تھا۔ اس کے لیے وہ ان بستیوں میں تبلیغی دورے کرتے رہتے تھے۔ اسرائیلیوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو معجزات دیکھ کر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے قائل نہیں ہوئے تھے۔ ان کے دل اب بھی فرعون کی طرف جھکتے تھے۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک فرعون سے اجازت لینے کا وقت طلب مسئلہ تھا، دوسرا وہ یہ چاہتے تھے کہ مصر سے روانگی سے قبل پوری قوم متحد ہو جائے۔

قارون ابتدا میں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقاتیں کرتا رہتا تھا لیکن جب سے انہوں نے اس کی بے پناہ دولت پر لعن طعن شروع کی تھی اور یہ مطالبہ کر دیا تھا کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ غریبوں میں تقسیم کرے، اس وقت سے قارون ان کے سامنے جانے سے کترانے لگا تھا لیکن اب ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر اس نے ایسے کسی اجتماع میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے نہایت قیمتی اور بھڑکیلا لباس زیب تن کیا۔ شاندار گھوڑے پر سوار ہوا اور اس مقام پر پہنچ گیا جہاں اس روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا۔

اسرائیلیوں نے جب اسے اس شان سے آتے دیکھا کہ وہ شاندار گھوڑے پر سوار ہے اور خدام اس کے پیچھے دوڑے چلے آ رہے ہیں تو سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خطاب میں خلل پڑ گیا۔

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیمے کی طرف آیا اور گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہوا۔

''تم نے میری شان دیکھی۔ کوئی تمہاری باتیں سننے کو تیار نہیں۔ سب میری طرف دیکھ رہے ہیں۔''

''صرف وہ دیکھ رہے ہیں جنہیں دنیا عزیز ہے۔ جنہیں آخرت عزیز ہے وہ تیری طرف اگر دیکھتے بھی ہیں تو عبرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تیری یہ شان و شوکت سب یہیں رہ جائے گی۔ کیا تو اپنی دولت اپنے ساتھ لے کر جائے گا؟''

''اپنے رب العالمین سے کہہ وہ یہ دولت واپس لے لے۔''

''اللہ کا قاعدہ ہے کہ وہ خوب ڈھیل دیتا ہے۔ تجھے بھی ڈھیل دی ہوئی ہے۔ کسی دن رسی کھینچ لی تو زمین میں دھنس جائے گا۔''

''زمین میں نہ دھنسوں اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''میں تجھ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی دولت کا کچھ حصہ ضرورت مندوں پر خرچ کیا کر۔''

''تاکہ تیری طرح مفلس ہو جاؤں۔''

''جس نے تجھے یہ دولت دی ہے، اس کا یہی حکم ہے۔''

''میں نے تجھ سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ دولت تیرے خدا نے مجھے نہیں دی۔ میں نے اپنے ہنر سے حاصل کی ہے۔''

''خدا کو غرور سخت ناپسند ہے۔ میں تجھے پھر نصیحت کرتا ہوں کہ غرور سے گریز کر۔''

''میرے پاس وقت نہیں ہے ورنہ میں اس بحث کو طول دے سکتا تھا اور تجھے لاجواب کر سکتا تھا۔ اس کے لیے میں تجھے مناظرے کی دعوت دیتا ہوں۔ جشن کے میدان میں تمام ہم قوموں کو جمع کرا اور مجھ سے بحث کر لے تاکہ ہمیشہ کے لیے یہ جھگڑا ختم ہو جائے۔''

''قارون! تو میرا چچا زاد بھائی ہے۔ میرے ہی خاندان کا فرد ہے۔ اسی لیے مجھے تیری فکر بھی زیادہ ہے۔ تو فرعون کی باتوں میں آ کر عذاب کا مستحق نہ بن۔ دیکھ جب مصریوں پر مختلف عذاب آئے تو تو محض اس لیے محفوظ رہا کہ بنی اسرائیل میں سے تھا۔ کیا تو اسے اللہ کا انعام نہیں سمجھتا؟ تو پھر بھی شکر ادا نہیں کرتا اور مجھ سے بحث و تکرار کے لیے آمادہ ہے۔ فرعون کا ساتھ چھوڑ اور ایک اللہ پر ایمان لے آ۔''

''تو میرا مقابلہ نہیں کر سکتا اسی لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ تو مجھ سے مناظرہ کر لے۔ اگر تُو جیت گیا تو میں تجھ پر ایمان لے آؤں گا۔''

''سوچ لے، تیرا یہ وعدہ فرعون کے وعدوں کی طرح نہ ہو کہ بار بار وعدے کرتا ہے اور پھر بدعہدی کرتا ہے۔''

''تو ٹھیک دو دن بعد اپنے لوگوں کو لے کر جشن کے میدان میں پہنچ جانا۔'' قارون کے خدام نے اسی وقت بنی اسرائیل کے مجمعے میں اعلان کر دیا۔

پورے شہر میں شور مچ گیا کہ قارون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ ہونے والا ہے۔ قارون نے اس بدکار عورت کو بھی پیغام بھجوا دیا کہ وہ اس میدان میں پہنچ کر خاموشی سے بیٹھی رہے اور جب وہ اسے اشارہ دے وہ سامنے آ جائے اور اپنا کام شروع کر دے۔

یہ وہی میدان تھا جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ جادوگروں سے ہوا تھا۔ پورے شہر میں شور مچا ہوا تھا۔ مصری یہ سوچ کر خوش تھے کہ اگر قارون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکست دے دی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جادو سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔

مقابلے والے دن بنی اسرائیل کی ایک بڑی تعداد میدان میں جمع ہوئی۔ مصری بھی اس مقابلے میں دلچسپی لے رہے تھے لہٰذا وہ بھی بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ قارون کا تخت میدان کے بیچ میں بچھا ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اس کے مقابل ایک تخت پر بیٹھ گئے۔ فرعون کے مخبر بھی ادھر ادھر ٹہلتے پھر رہے تھے۔ ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ پل پل کی خبریں فرعون کے دربار میں پہنچ رہی تھیں۔

فرعون اس مناظرے سے ناخوش تھا۔ اس نے تو قارون کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سنگسار کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھائے گا اور وہ مناظرہ کرنے بیٹھ گیا۔ قارون نے اسے پیغام بھجوایا کہ وہ اسے مناظرہ نہ سمجھے۔ اسی مناظرے سے سنگساری کی راہ نکلے گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا۔ ''قارون! سوال کرنے میں تم پہل کرو گے یا بحث کا آغاز میں کروں؟''

قارون نے کہا۔ ''موسیٰ! آج تمہارے بولنے کا دن نہیں۔ آج میں بولوں گا اور تم خاموشی سے سنو گے۔ فیصلہ یہ لوگ کریں گے جو تجھے اور مجھے سن رہے ہیں۔ تیری سزا کا اعلان بھی یہ لوگ ہی کریں گے۔''

''تجھے اگر یہی شوق ہے تو یہ شوق پورا کرلے۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

''تو مجھے صرف ایک سوال کا جواب دے دے۔ اس کے بعد صرف میں بولوں گا۔''

''تو سوال کر۔ میرے خدا نے چاہا تو تجھے مطمئن کردوں گا۔''

''تیرے خیال میں زانی کی سزا کیا ہوتی ہے جبکہ وہ شادی شدہ بھی ہو۔''

''مصر میں بڑھتی ہوئی فحاشی کو دیکھتے ہوئے میں اپنی ہر تقریر میں کہتا رہا ہوں کہ ایسے زانی کی سزا یہ ہے کہ اسے سنگسار کردیا جائے۔''

''ہر تقریر کا ذکر چھوڑ، آج بتا زانی کی سزا کیا ہوتی ہے۔''

''میں آج بھی یہ کہتا ہوں کہ زانی کی سزا یہ ہے کہ اسے سنگسار کردیا جائے۔''

''اگر وہ با حیثیت اور صاحب مرتبت ہو؟''

''قانون کسی کے لیے نہیں بدلتا۔ چاہے میں ہوں یا تُو ہو۔''

قارون نے مجمعے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم سب نے وہ کچھ سن لیا جو موسیٰ نے کہا؟''

مجمعے نے چیخ کر کہا۔ ''ہاں سن لیا۔''

''تو اب سنو، میں نے یہ تمہید کیوں باندھی۔ یہ بتانے کے لیے کہ جسے تم اپنا راہنما سمجھتے رہے ہو، نہایت پارسا سمجھتے ہو، جو خود کو خدا کا بھیجا ہوا رسول کہتا رہا ہے وہ اپنی خلوتوں میں کیسے گل کھلاتا رہا ہے۔ میرا اشارہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ دوسروں کے لیے جس گناہ کی سزا سنگساری قرار دیتا ہے، خود اسی گناہ میں مبتلا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ڈانٹ کر کہا۔ ''بدبخت! تو یہ کیا بکواس کررہا ہے۔ میں اس گناہ کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پرستاروں نے بھی چیخ چیخ کر قارون کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ کچھ تو آگے بڑھے کہ قارون کو اس کا مزہ چکھائیں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں روک دیا۔

''یہ مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔ میں ہی اس کا جواب دوں گا۔''

''تیرے پاس ان باتوں کا کیا جواب ہوگا؟'' قارون نے کہا۔ ''تیری بھولی بھالی قوم تیرے اس گناہ سے اس لیے بے خبر ہے کہ تو رات کے اندھیرے کو دیوار بنا لیتا ہے اور صبح اٹھتے ہی وعظ و تلقین شروع کردیتا ہے۔ لیکن میں نے تمام معلومات جمع کرلی ہیں۔ تو اب ان الزامات میں سے کسی کا جواب نہیں دے سکتا۔''

مجمع جوش جذبات سے بے قابو ہوتا جارہا تھا۔ بہت سے لوگ اسے قارون کی ایک چال قرار دے رہے تھے لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جنہیں یقین آرہا تھا کہ ان باتوں میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔

''قارون، اس وقت سے ڈر جب اس تہمت لگانے کی سزا تجھے ملے گی۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

''مجھے معلوم ہے تو پھر کوئی جادو دکھانے والا ہے اور اسی کو تو سزا کہہ رہا ہے لیکن اب تیرا کوئی جادو نہیں چلے گا۔ تجھے اپنی قوم کے سامنے تسلیم کرنا پڑے گا کہ تو گناہ گار ہے۔''

''قارون! تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے۔ محض تیرے کہہ دینے سے تو ہمیں

یقین نہیں آئے گا۔'' مجمعے سے کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

''میں اتنا نادان نہیں کہ ثبوت کے بغیر کسی پر اتنا بڑا الزام لگا دوں۔ میں ثبوت اپنے ساتھ لایا ہوں۔ وہ عورت یہاں موجود ہے موسیٰ...... جس کے گھر رات کے اندھیرے میں جاتا رہا ہے۔ وہ عورت اپنی زبان سے سب کچھ بتائے گی۔''

ہجوم کی آنکھیں اس عورت کو ڈھونڈنے لگیں جو ابھی ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس وقت پریشان نظر آرہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے اور قارون یہ سب کیوں کررہا ہے۔

قارون نے اپنا رخ اس طرف کیا جہاں بنی اسرائیل کی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور مطلوبہ عورت کا نام لے کر اسے پکارا اور اپنے قریب آنے کو کہا۔ عورتوں میں سے ایک عورت اٹھی اور میدان میں آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں زمین سے لگی ہوئی تھیں۔

بہت سے لوگ اسے دیکھتے ہی پہچان گئے تھے۔ وہ ایک مشہور فاحشہ عورت تھی جو کچھ دنوں سے گھر میں بند ہوکر رہ گئی تھی۔

قارون اس سے اصرار کررہا تھا کہ جو کچھ اس پر گزری ہے وہ لوگوں کو بتائے لیکن وہ عورت خاموش کھڑی تھی۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہورہا تھا۔

قارون نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔ ''وہ سب کچھ کیوں نہیں بتاتی جو تُو مجھے پہلے ہی بتا چکی ہے اور کہہ رہی تھی کہ موسیٰ...... کے منہ پر کہنے کو تیار ہے۔'' وہ عورت مسلسل خاموش تھی۔ اس کی نظریں زمین پر تھیں۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر قارون کی طرف دیکھ لیتی تھی۔

اب موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی۔

''اے عورت! میں نے تو تجھے کبھی دیکھا تک نہیں اور تُو مجھ پر اتنا بڑا الزام لگا رہی ہے۔ تو میرا خوف نہ کر۔ سچ سچ بتا کیا بات ہے اور تجھے کون اکسا رہا ہے؟''

قارون نے کھیل بگڑتے دیکھا تو عورت کو ڈانٹا۔ ''تُو نے مجھے بتایا تھا کہ موسیٰ...... تیرے پاس راتوں کو آتے ہیں اور اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب تیرے ہونٹ کیوں سل گئے؟ بتا دے پوری بات تاکہ موسیٰ...... کی قوم کو بھی تو معلوم ہو۔''

قارون سمجھ رہا تھا کہ عورت گھبراہٹ کی وجہ سے بھول گئی ہے کہ اسے کیا کہنا ہے۔ اس لیے باتوں باتوں میں اس نے اسے یاد دلا دیا۔ عورت نے گھبرا کر قارون کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی جیسے کہہ رہی ہو، میں یہ سب کچھ نہیں کہہ سکوں گی۔ قارون نے اس کی آنکھوں کی عبارت پڑھ لی تھی اور اب اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔

''اے عورت! کیوں خدا کے غضب کو دعوت دے رہی ہے۔ جو سچ ہے بتاتی کیوں نہیں۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

''موسیٰ! خدا کے غضب سے ڈرا کر تُو اس عورت کو خاموش رہنے پر کیوں مجبور کررہا ہے؟''

''قارون! کھیل تیرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ تو اس عورت کو سمجھا کر لایا ضرور تھا لیکن اب اس کا ضمیر جاگ گیا ہے۔''

''موسیٰ! تو واقعی بڑا جادوگر ہے۔ تو نے اپنے جادو سے اس کی زبان بند کردی ہے ورنہ یہ وہ سب کچھ بتا دیتی جو میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ خیر، ایسی کئی عورتیں ہیں جن سے تیرے تعلقات رہے ہیں۔ اس وقت تُو مجھے جانے دے۔ میں کسی عورت کو پیش کروں گا جو تجھ پر تیری حقیقت ظاہر کردے گی۔''

قارون نے یہی مناسب سمجھا کہ اس قصے کو یہیں دفن کردے۔ واپس جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ عورت کو جیسے ہوش آگیا۔

''موسیٰ......... اسے جانے مت دینا۔ میں بتاتی ہوں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور عورت سے کہا کہ وہ مجمعے کے سامنے بیان کرے جو اسے کہنا ہے۔ اس عورت نے قارون کا اپنے گھر آنا پھر قارون کے محل میں جانا اور دولت دے کر موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگانے تک کی تمام تفصیلات بتا دیں۔

''قارون کی طرف سے دی گئی دولت اب تک میرے گھر میں موجود ہے۔ یہ دولت دیکھ کر آپ سب لوگ اندازہ کرلیں گے کہ قارون نے سونے کی اینٹیں اور زیورات کیوں دیے ہوں گے۔ موسیٰ علیہ السلام ہرگز جادوگر نہیں ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرے دل نے کہا کہ میں کسی بے قصور پر کیوں تہمت لگاؤں۔ میں نے جو سچ تھا بتا دیا۔''

قارون پھر چیخا۔ ''موسیٰ! تم نے اس عورت پر جادو کیا ہے۔ ایک بدکار عورت کی شہادت پر مجھے قصوروار نہیں کہا جاسکتا۔ میں کبھی اس کے گھر نہیں گیا۔ یہ خود میرے پاس آئی تھی اور موسیٰ سے اپنے تعلقات کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ میں اس کی مدد کروں۔ موسیٰ میرے پاس روز آجاتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں کوئی اور گاہک بھی نہیں آسکتا۔ میں قوم کو بتانا چاہتی ہوں کہ ایک مقدس چہرے کے پیچھے کیسا چہرہ چھپا ہوا ہے اور اب موسیٰ ...... کے جادو نے اسے انکار کرنے پر مجبور کردیا ہے۔''

اسی وقت مجمعے سے ایک اسرائیلی باہر آیا۔ یہ وہی کارندہ تھا جس سے قارون نے فاحشہ عورتوں کی فہرست بنوائی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

''مجھے معلوم ہے کہ قارون کا آقا فرعون میرا کیا حشر کرے گا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قارون رات کے اندھیرے میں اس عورت کے گھر آیا تھا اور پھر اسے اپنے محل پر بلوالیا تھا۔ راز نہ کھل جائے اس لیے دربان کو اپنے دروازے سے ہٹادیا تھا۔ مجھے چونکہ یہ تشویش تھی کہ قارون نے اس عورت کو کیوں بلوایا ہے، اس لیے میں ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا تھا جہاں سے یہ دونوں صاف نظر آرہے تھے۔ اس عورت نے ایک ایک لفظ سچ کہا ہے۔ قارون نے اس کے سامنے چاندی سونے کے ڈھیر لگائے تھے اور اسے آمادہ کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگائے تاکہ انہیں سنگسار کرنے کا موقع مل جائے۔ فرعون چونکہ خود قتل کراتے ہوئے ڈر رہا تھا اس لیے قارون کے ذمے یہ کام سونپا تھا۔''

اس گواہی کے بعد تو مجمعے کا برا حال تھا۔ لوگ قارون کی تکابوٹی کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہتے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت بھی انہیں روک دیا۔

''اے قارون! تجھے سنگساری کی سزا یاد رہ گئی لیکن یہ یاد نہیں رہا کہ میں نے تہمت لگانے والے کی سزا بھی مقرر کی تھی اور ثابت ہوگیا کہ تو نے مجھ پر تہمت لگائی۔''

''موسیٰ، مجھے معاف کردو۔ میں واقعی اس معاملے میں جھوٹا تھا۔''

''افسوس کہ تو نے اپنی غلطی ماننے میں دیر لگادی۔ میں دل ہی دل میں دعا کرچکا۔ میری دعا پروردگار نے قبول بھی کرلی۔ میں تو شاید تجھے معاف بھی کردیتا لیکن اللہ سے میری تکلیف دیکھی نہیں گئی۔ میں تجھے جانے دیتا ہوں۔ اس کے بعد جو کرے گا اللہ کرے گا۔''

قارون نے اسی میں عافیت سمجھی کہ چھٹکارا ملا۔ اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر پہلے ہی جاچکے تھے۔ وہ اکیلا اپنے محل کی طرف چلا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پرستار سخت طیش کے عالم میں تھے۔

''آپ نے قارون کو کیوں جانے دیا؟'' وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

حضرت.... موسیٰ علیہ السلام نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

''اسے میں نے جانے دیا ہے، خدا اسے نہیں جانے دے گا کیونکہ مجھے یہی بتایا گیا ہے۔''

قارون دل میں سوچتا ہوا جارہا تھا کہ میری ہوشیاری سے اس وقت مجھے بڑی مصیبت سے چھٹکارا مل گیا۔ اس بے خبر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سے بڑی مصیبت اس کے انتظار میں ہے۔ وہ بہ مشکل اپنے محل تک گیا تھا کہ زمین ہلنے لگی اور پھر جہاں وہ تھا، وہاں کی زمین پھٹ گئی۔ قارون کمر تک زمین میں دھنس گیا۔ ابھی اس کے ہاتھ باہر تھے۔ وہ ہاتھ پاؤں چلاسکتا تھا۔ اس نے زمین کی پکڑ سے نکلنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ وہ مدد کے لیے چلاتا رہا لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ جو لوگ اس کے پیچھے چل رہے تھے اس خوفناک منظر کو دیکھ کر رک گئے اور پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ زمین نے پھر ایک جھٹکا لیا اور وہ گردن تک زمین میں چلا گیا۔

(جاری ہے)

ماخذات

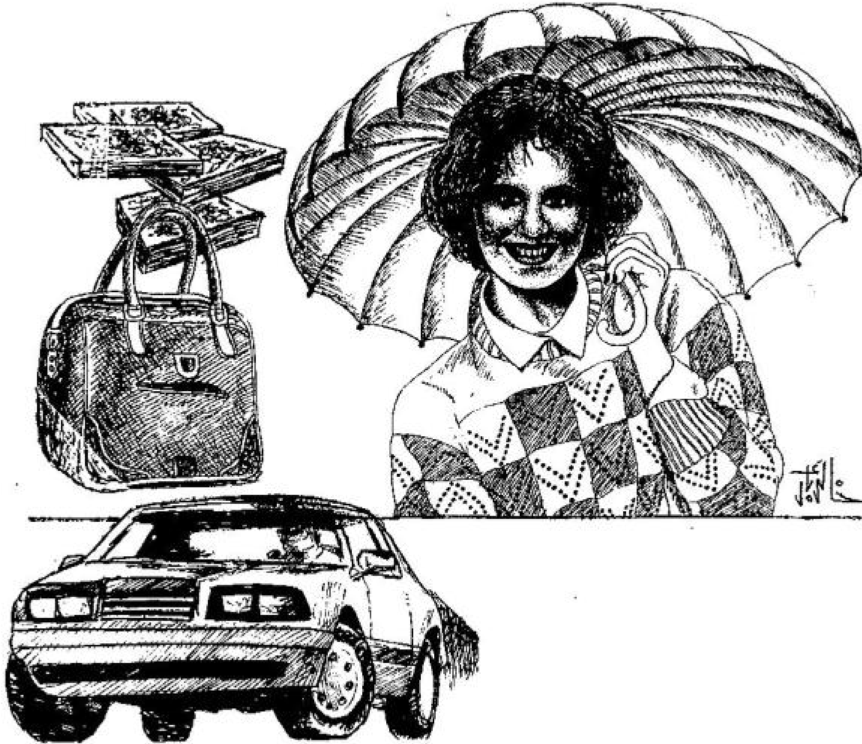
قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن۔ قصص الانبیاء، ابنِ کثیر۔ توریت...... ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

سودا

شاہ زین رضوان

کہتے ہیں جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر... یہاں تو جھوٹ کا چہرہ بھی نہیں تھا گویا وہ سر سے لے کر پاؤں تک بے بنیاد باتوں کا چلتا پھرتا وجود تھا... جس نے محبت کی تشنگی دور کرنے کے لیے عجب سودا کیا اور بھول گئی کہ اس کا انجام خسارے کے سوا کچھ نہیں۔

پرائے محبوب پر قبضہ جمانے والی ایک سرپھری حسینہ کا قصہ



وہ بار ایک ایسی جگہ پر واقع تھا جہاں ہائی وے ایک سو ایک پر جانے والے ضرور کچھ دیر رکتے۔ یہ سڑک شمال میں سان فرانسسکو اور جنوب میں سین جوز کے طویل سفر کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ میلنڈا جب اپنی بی ایم ڈبلیو میں سوار ہوئی تو اس کا مشروب پینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ویسے بھی گزشتہ تین گھنٹے سے مسلسل بارش ہورہی تھی اور اس کے رکنے کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن میٹنگ کے بعد وہ بہت تھک چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ ایک گلاس مشروب پینے میں

کیا حرج ہے، اس طرح اس کے اعصاب کو سکون مل جائے گا اور وہ بہ آسانی ڈرائیونگ کر سکے گی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک یا دو گلاس پینے سے اس کے خون میں الکحل کی مقدار قانونی حد سے تجاوز نہیں کرے گی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ اس جیسی دبلی پتلی اور پانچ فٹ سات انچ لمبی عورت کے لیے ایک گلاس مشروب پینے میں کوئی حرج نہیں۔ ہر کوئی تھوڑی بہت شراب پی کر گاڑی چلاتا ہے اور اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آتا پھر بھی وہ حفظ ماتقدم کے طور پر کئی اشتہا آور چیز مثلاً پنیر کا ٹکڑا لے لے گی تاکہ وہ مشروب کو جذب کر سکے۔

اسے میراج جانا اچھا لگتا تھا۔ وہاں پر بیٹھنے کی جگہ بالکل کسی لیونگ روم کی طرح آرام دہ تھی۔ بار کے پیچھے شیشے کی الماریوں میں تمام بہترین مشروب رکھے ہوئے تھے۔ وہاں کمپیوٹر کمپنیوں کے انجینئرز اور مارکیٹنگ کے لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ وہ خود بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔

اسے موہوم سی امید تھی کہ شاید وہاں ایلیکس سے ملاقات ہو جائے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ ایک ایسے شخص سے ملنے کی توقع کر رہی تھی جس کے ساتھ وہ ایک سال سے ملاقاتیں کر رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ کوئی اس بارے میں نہ جانتا ہو لیکن انہوں نے خود سے ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی ان پر کوئی پابندی تھی۔ وہ اس کا منیجر نہیں تھا لیکن وہ حد سے باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے اپارٹمنٹ میں آجاتا یا وہ اس کے گھر چلی جاتی۔ ویک اینڈ پر وہ ایک یا دو راتیں ساتھ گزارتے۔ کبھی وہ باہر کھانا کھانے چلے جاتے یا کسی تھیٹر میں اچھی سی فلم دیکھتے۔ ان کا تعلق آئی لو یو، سے بڑھ کر اگلے درجے میں چلا گیا تھا اور وہ اس پر مطمئن تھے۔ اس کے باوجود ابھی حدود باقی تھیں۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے میلنڈا کو لگتا کہ وہ ایک ایسے طیارے کے مانند ہے جو زمین پر اترنے کے لیے ہوائی اڈے کے گرد چکر لگا رہا ہو۔ کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا کہ یہ تعلق کبھی ٹھوس شکل اختیار نہیں کر سکے گا۔ وہ جب بھی ایلیکس سے شادی کی بات کرتی تو وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال دیتا اور میلنڈا مایوسیوں کے اندھیرے میں ڈوب جاتی۔

اس نے دروازہ کھولا جس پر تانبے کی چمک دار پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ اندر کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہاں محبت کرنے والے جوڑوں کے لیے علیحدہ کیبن نہیں تھے بلکہ سب کچھ کھلم کھلا ہو رہا تھا۔ پہلی نظر میں وہ جگہ ایک ایسے دفتر کی طرح معلوم ہو رہی تھی جہاں سب لوگ ساتھ مل کر کام کرنے پر مجبور تھے۔

میلنڈا نے ہال کا جائزہ لیا اور اسے فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ ایلیکس وہاں نہیں ہے۔ البتہ اس کی اسسٹنٹ کیرولین موجود تھی۔ میلنڈا نے اپنی چھتری بند کی اور چھڑی کی طرح اسے کولہے سے لگا لیا۔ کیرولین کی نظریں اسی پر تھیں۔ وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ دونوں کبھی دوست تھیں اور میلنڈا نہیں سمجھ سکی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ ان کے درمیان کچھ بھی ایک جیسا نہیں تھا اور نہ ہی کام کے حوالے سے ان کی ذمے داریوں میں کوئی مماثلت تھی۔ کیرولین اس طرح کی عورت تھی جسے میلنڈا نے ہمیشہ نظرانداز کرنے کی کوشش کی۔ ایسی عورتیں معمولی حالات میں بھی سازش کا پہلو تلاش کر لیتی ہیں۔

کیرولین اپنی جگہ سے اٹھی اور کچھ ہچکچاتے ہوئے اس طرف بڑھی جہاں میلنڈا کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک اونچا اسکرٹ پہن رکھا تھا جس میں اس کی پتلی ٹانگیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ اس نے مصنوعی مسکراہٹ سے کہا۔

”یہاں بہت رش ہے، تم میرے ساتھ بیٹھ سکتی ہو۔“

میلنڈا بھی جواب میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں دیکھ رہی تھی......“

”اگر تم ایلیکس کو تلاش کر رہی ہو تو وہ آج نہیں آئے گا۔“

”نہیں۔ یہ بات نہیں۔“

کیرولین نے اس بری طرح آنکھیں جھپکیں کہ اس کی اوپر اور نیچے کی پلکوں پر لگا ہوا مسکارا آپس میں چپک گیا۔ اس نے میلنڈا کا بازو پکڑا اور بولی۔

”آؤ، میرے ساتھ بیٹھو۔ ہمیں کبھی بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہاں کوئی کرسی خالی نہیں ہے۔“

میلنڈا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیرولین نے کیا کہا تھا۔ ایلیکس نہیں آئے گا یا اسے خود بھی اس کے آنے کے بارے میں یقین نہیں تھا مگر وہ یہ بات کیرولین سے نہیں پوچھ سکی کیونکہ اس کے جواب میں وہ ایک بار پھر آنکھیں جھپکنے لگتی۔ بہتر یہی تھا کہ وہ واپس چلی جائے لیکن یہ بڑی عجیب بات ہوتی اور اس طرح کیرولین کو مزید کچھ کہنے کا موقع مل جاتا۔ اس نے چھتری کو مضبوطی سے باندھا اور کیرولین کی میز کی طرف چل دی۔

کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے اپنی چھتری پشت سے لٹکائی اور پرس دوسری جانب لٹکا دیا۔ فوراً ہی ویٹرس آگئی۔ میلنڈا نے اسے مشروب کا آرڈر دیا۔

کیرولین نے اپنا مشروب اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم میرے ساتھ فرائز میں شرکت کرنا پسند کرو گی؟“

میلنڈا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ویٹرس مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی کیرولین نے اپنی دن بھر کی مشکلات بیان کرنا شروع کر دیں۔ میلنڈا نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں اور ہال کا جائزہ لینے لگی۔ شاید اسے امید تھی کہ ایلیکس کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ ویٹرس ایک چھوٹا نیپکن اور مشروب کا گلاس لے کر آئی اور بولی۔

”فرائز تیار ہو رہے ہیں۔“

”میرے پاس کچھ دلچسپ خبریں ہیں۔“ کیرولین نے کہا۔ ”آؤ جام نوش کریں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک گھونٹ لیا اور میلنڈا کی طرف گلاس بڑھا دیا۔

”اوکے۔“ میلنڈا نے بھی اپنا گلاس اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں دوسرے لوگوں کو شاید یہ بات نہ بتاتی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم سے کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی پھر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ ”ایلیکس اور میں...... میرا مطلب ہے کہ ہمارے درمیان کچھ چل رہا ہے۔“

اس نے اپنا گلاس میلنڈا کے گلاس سے ٹکرایا اور مسکرا دی۔

”معاف کرنا۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔“ میلنڈا نے کہا۔

”کیا تم اس پر خوشی کا اظہار نہیں کرو گی یا مجھے مبارکباد نہیں دو گی؟“ کیرولین نے دانت نکالتے ہوئے کہا اور اپنے بال پیچھے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ مبارکباد کا مرحلہ بعد میں آئے گا جب ہمیں اس کی اجازت مل جائے گی۔“

میلنڈا نے مشروب کا گھونٹ لیا۔ کمرے میں کافی شور تھا۔ وہ ٹھیک طرح سے اس کی بات نہ سن سکی۔ کیا کیرولین نہیں جانتی کہ میلنڈا اور ایلیکس ایک سال سے مل رہے ہیں؟ شاید ایلیکس نے اسے بھی نہ بتایا ہو۔

”کیا تم نے ایلیکس کے بارے میں کچھ کہا؟“

”ہاں۔ تم تو جانتی ہو، وہ میرا باس ہے اور مجھے معلوم ہے کہ ایسے شخص سے تعلق قائم نہیں کر سکتی جس کی ماتحتی میں کام کر رہی ہوں۔ لہٰذا وہ میرے لیے کوئی دوسری جگہ تلاش کر رہا ہے۔ اس نے انتظامیہ کو بھی ہمارے تعلق کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے۔ اب صرف ان کی طرف سے اجازت ملنے کا انتظار ہے۔“

”واقعی......“ میلنڈا نے مشروب کا لمبا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ اس نے صحیح سنا تھا۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا اور کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ اسے لگا کہ اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ جائے گی۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے کہا کہ شاید کیرولین کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا زیادہ پی جانے کی وجہ سے وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے حالانکہ اس نے واضح طور پر باس کا لفظ استعمال کیا تھا پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔

”تم ایلیکس کارٹر کی بات کر رہی ہو؟“

”کیا تم بہری ہو گئی ہو؟ میں نے کہا نا میرا باس۔“

میلنڈا چاہتی تو اسے چیلنج کر سکتی تھی اور کہتی کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ کیرولین ناقابل اعتبار ہے اور وہ اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتی۔ وہ اس سے ایسی جگہ الجھنا نہیں چاہتی تھی جہاں اس کے بہت سے جاننے والے موجود تھے اس لیے محتاط رہنا بہتر تھا۔

”یہ سب کیسے ہوا؟“ اس نے کریدنے کی خاطر پوچھا۔

”اوہ...... تم جانتی ہو۔“ کیرولین نے اپنا گلاس فضا میں لہرایا۔ ”اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ یہ کیسے ہوا؟“

”کیا تم نے اسے بہکایا؟“

کیرولین نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ خود میری طرف راغب نہیں ہو سکتا؟“

”حیرت ہے۔“ میلنڈا یقین نہ کرنے والے انداز میں بولی۔

”اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ کیا تمہارے خیال میں مرد مجھ میں کشش محسوس نہیں کرتے؟“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ اپنی پوزیشن کو سمجھتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اسے انتظامیہ کی ہدایات کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔“

”میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ مجھے عرصے سے چاہتا تھا۔“ کیرولین نے کہا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”لڑکیوں کو ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

میلنڈا کی اس جواب سے تشفی نہیں ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سلسلہ کیسے شروع ہوا؟“

”تمہیں اتنا تجسس کیوں ہو رہا ہے؟“

”تم نے ہی مجھے اس پر مجبور کیا ہے۔ اگر تم یہ بات نہ بتاتیں تو مجھے معلوم بھی نہ ہوتا۔“

”یہ بہت ہی ذاتی نوعیت کا معاملہ ہے۔ ہمارے درمیان کئی پیغامات کا تبادلہ ہوا جن سے لگتا تھا کہ ہم تفریحاً

محبت کر رہے ہیں۔ پہلے تو میں بھی یہی سمجھی کہ وہ مجھ سے فلرٹ کر رہا ہے۔''

''حیرت ہے کہ ایک سینئر ڈائریکٹر اپنی اسسٹنٹ سے دل پھینک قسم کے پیغامات کا تبادلہ کرتا رہا اور وہ بھی کمپنی کے فون پر؟''

کیرولین نے اپنا پورا منہ کھول کر گلاس میں بچا ہوا مشروب حلق سے نیچے اتار لیا پھر اپنے ہونٹ صاف کر کے ویٹرس کو اشارہ کرنے لگی۔ اس نے میلنڈا سے پوچھا۔

''تمہارے لیے اور منگواؤں؟''

''نہیں۔''

''تکلف نہیں کرو۔''

''ابھی میرا گلاس ختم نہیں ہوا۔''

کیرولین نے ویٹرس کو ایک اور ڈرنک لانے کے لیے کہا اور بولی۔ ''کچھ بھی ہو، کسی سے محبت ہو جانے کا احساس ہی بڑا دل خوش کن ہے۔''

میلنڈا نے فرائی کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھا اور مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جانتی کہ اس پر کیا کہوں لیکن تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''کس بارے میں؟''

''ہم نے اسے مشتہر نہیں کیا۔ اس لیے میرا اندازہ ہے کہ تم بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتیں لیکن جو کچھ تم اپنے اور ایلیکس کے لیے سوچ رہی ہو، وہ محض تمہارا تصور ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں اور ایلیکس گزشتہ ایک سال سے اکٹھے ہیں۔''

کیرولین نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اس کی آواز اونچی اور ناہموار تھی۔ اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگایا اور میلنڈا کو دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

میلنڈا نے ایک ساتھ فرائی کے دو ٹکڑے منہ میں رکھے اور گلاس میں بچا ہوا مشروب بھی حلق میں انڈیل لیا۔ اس نے کیرولین سے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے دماغ میں کیا ہے لیکن میں ہر ویک اینڈ اس کے اپارٹمنٹ پر گزارتی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے اور ایلیکس کے درمیان کیا واقعہ پیش آیا لیکن تم اسے غلط معنی دے رہی ہو۔''

اسے کیرولین سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ وہ ایلیکس کے مزاج سے واقف تھی۔ وہ الگ تھلگ رہنے والا شخص تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے میلنڈا کو زیادہ وقت نہ دے پا رہا ہو لیکن وہ اس سے بے وفائی نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ دوسرے مردوں کی طرح اس کے قدم بھی پھسل گئے ہوں اور اس نے تفریح کی خاطر کیرولین سے دل لگی کر لی ہو لیکن وہ بددیانت نہیں تھا اور اس سے محبت کرتا تھا۔

اس نے پرس کھول کر اس میں سے کچھ نوٹ نکالے اور انہیں میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

''یہ میری طرف سے ہے۔'' پھر اس نے اپنی چھتری اٹھائی اور عورتوں کے ریسٹ روم کی طرف بڑھ گئی۔

فارغ ہونے کے بعد اس نے ہاتھ دھونے کے لیے ٹونٹی کھولی۔ اس میں ہلکا گرم پانی آ رہا تھا۔ اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر صابن لگایا اور وہ ہاتھ دھو رہی تھی کہ ریسٹ روم کا دروازہ کھلا اور ایک دوسری اسسٹنٹ اندر داخل ہوئی۔ میلنڈا اسے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ''ہائے گریس۔''

اس نے پانی کی ٹونٹی بند کر دی اور پیپر ٹاول سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ ''تم کیرولین کے ساتھ ہی کام کرتی ہو؟''

گریس نے اثبات میں سر ہلایا پھر وہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس نے اپنی انگلی ہونٹوں پر پھیری اور فالتو لپ اسٹک صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''تمہارے خیال میں وہ کیسی لڑکی ہے؟ میں اسے زیادہ نہیں جانتی لیکن اس نے مجھے ایک کہانی سنائی ہے جس پر یقین نہیں آ رہا اور مجھے اس کے بارے میں تجسس ہو گیا ہے۔''

گریس آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''وہ اپنی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہے لیکن لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ اچھا ہے۔ البتہ اس کے جڑواں بھائی کی کہانی مختلف ہے۔ وہ کسی جرم میں جیل کاٹ چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے جعلی چیک کیش کرانے کی کوشش کی تھی۔''

میلنڈا کے لیے یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کیونکہ جعلی چیک کیش کروانا کوئی معمولی جرم نہیں تھا اور اس طرح کے واقعات ہر روز نہیں ہوتے لیکن اسے کیرولین کے بھائی یا اس کے جیل جانے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس نے گریس سے پوچھا۔

''کیا وہ چیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہے؟''

''یہ میں نہیں جانتی لیکن جیسا کہ میں نے کہا...... کہ وہ اپنی دنیا میں رہنا پسند کرتی ہے۔''

باتھ روم کا دروازہ کھلا اور دو عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر میلنڈا نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا اور

گریس سے بولی۔ ''اوکے۔ تمہارا شکریہ...... بعد میں بات ہو گی۔''

وہ باہر راہداری میں آئی اور واپس بار کی طرف چل دی جس میز پر وہ کیرولین کے ساتھ بیٹھی تھی، وہاں اب کوئی نہیں تھا اور اس کی صفائی ہو چکی تھی۔ وہ چلتی ہوئی بار کے دروازے تک پہنچی اور باہر نکل گئی۔

باہر ہلکی سی دھند چھائی ہوئی تھی لیکن چونکہ وہ گھر جا رہی تھی۔ اس لیے اسے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ اس کے بال گیلے ہو جائیں گے۔ اس نے چھتری کھولنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ بائیں جانب مڑی اور فٹ پاتھ پر احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنے لگی کہ کہیں گیلی زمین پر اس کا پاؤں نہ پھسل جائے۔ وہ سڑک پار کر کے اپنی کار تک پہنچی جو بارش کے قطروں سے گیلی ہو گئی تھی اور کھڑکیوں پر ہلکی سی کہر جمی ہوئی تھی۔

ڈرائیور سائڈ کا دروازہ کھولتے ہی سیکیورٹی سسٹم سے بیپ کی آواز آئی۔ وہ گاڑی میں سوار ہوئی اور اس نے زور سے دروازہ بند کیا لیکن اسی دوران اس کے پرس کا اسٹریپ دروازے میں آ گیا۔ اس نے دوبارہ دروازہ کھول کر پرس نکالا اور دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔ وہ بہت جلدی میں تھی اور اس کے ہاتھوں میں ہلکا سا لرزہ تھا۔ کیرولین سے خوفزدہ ہونا محض ایک حماقت تھی لیکن وہ تھوڑی بہت پریشان ضرور تھی۔ گریس نے کہا تھا کہ وہ اپنی دنیا میں رہتی ہے۔ بظاہر یہ کوئی اہم بات نہیں تھی لیکن اس کا یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ تھوڑی سی غیر متوازن تھی اور اپنے تصورات کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ کیرولین نے اپنی کہانی سنانے کے لیے اسے منتخب کیا۔ اس سے پہلے کبھی ان دونوں کے درمیان ذاتی نوعیت کی گفتگو نہیں ہوئی تھی پھر اس نے اصرار کر کے کیوں اسے اپنی میز پر بلایا اور بلا سوچے سمجھے پوری کہانی سنا دی۔ شاید وہ ایلیکس اور میلنڈا کے تعلق کے بارے میں جانتی تھی اور یہ سب باتیں کرنے کا مقصد یہی تھا کہ میلنڈا، ایلیکس سے بدظن ہو جائے۔

اس نے اپنا پرس پسنجر سیٹ پر دھکیلا تو یوں لگا جیسے گاڑی اسے چڑھائی کی جانب دھکیل رہی ہے۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے والی تھی کہ اسے کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی۔ کار پیچھے کی طرف جھک رہی تھی۔ ساتھ ہی بارش بھی شروع ہو گئی۔ اس نے چھتری اٹھائی۔ دروازہ کھولا اور کار سے باہر آ گئی۔ پیچھے جا کر دیکھا تو گاڑی کا ایک ٹائر پنکچر ہو چکا تھا۔ اس نے سروس اسٹیشن فون کر کے ایک آدمی کو بلایا تاکہ وہ اس کی گاڑی کا ٹائر بدل دے پھر وہ اس کے ساتھ ہی سروس اسٹیشن گئی اور پرانے ٹائر میں پنکچر لگوایا۔ اس کام میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔

گھر پہنچ کر اس نے ایلیکس کو ٹیکسٹ میسیج کیا اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ کافی دیر بعد بھی اس کا جواب نہیں آیا تو وہ سونے کی تیاری کرنے لگی۔ اس نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کیے۔ بیرونی دروازے کو تالا لگایا اور بستر پر لیٹ گئی لیکن نیند نہیں آئی۔ کافی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد وہ ایک بار پھر اٹھی۔ پورے گھر کا چکر لگایا۔ بیرونی دروازے کا تالا دوبارہ چیک کیا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں اتنی خوفزدہ ہو رہی تھی۔ کیرولین اور گریس کی باتیں اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ تنگ آ کر اس نے نیند کی گولی کھائی اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔

صبح اسے ایلیکس کا پیغام ملا۔ ''رات بہت ہو چکی تھی، اس لیے تمہارے پیغام کا جواب نہ دے سکا۔ میں تمہیں بہت یاد کر رہا ہوں۔''

اس نے جوابی پیغام بھیجا۔ ''میں بھی تمہیں یاد کر رہی ہوں۔''

اس کا پیغام آیا۔ ''آج میرے ساتھ ناشتا کرو۔''

وہ سلیکون ویلی کا بہترین کافی ہاؤس تھا جہاں وہ ہمیشہ ناشتا کیا کرتے تھے۔ بغیر زردی والے انڈے کے آملیٹ اور گرم گرم کافی سے شغل کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''گزشتہ شب میں میراج گئی تھی۔ جانتے ہو وہاں مجھے کون ملا؟''

ایلیکس کی نظریں اپنی پلیٹ پر تھیں اور وہ چھری سے آملیٹ کے مزید ٹکڑے کر رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ ''کون؟''

''کیرولین۔''

''اس نے تمہیں کیا بتایا؟''

''یعنی تمہیں معلوم ہے کہ اس نے کیا کہا ہو گا؟''

ایلیکس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے اور وہ دوبارہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اس نے کہا کہ تم اور وہ......'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

ایلیکس حیران تھا کہ کیرولین نے ایسی بات کیوں کہہ دی۔ اسے ان لوگوں سے نفرت تھی جن میں اعتماد کی کمی ہو۔

خاص طور پر وہ ایسی عورتوں کو تو بالکل برداشت نہیں کرسکتا تھا جو بچگانہ حرکتیں کرتی ہوں اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہو کہ کوئی انہیں چاہے۔ اس نے بتایا کہ صرف اس کے اعتماد کی وجہ سے وہ اس میں کشش محسوس کرنے لگا تب سے ہی وہ اس تصور کو ذہن میں بسا بیٹھی اور اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ پُراعتماد ظاہر کرنے لگی جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔

اس نے انڈے کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں نے ہی کل اسے کام پر آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اب بھی دو ہفتے کے لیے میرے پے رول پر ہے لیکن میں نے اسے بتادیا ہے کہ وہ مزید یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ وہ ضرورت مند دکھائی دیتی ہے اور ایک حقیر اسسٹنٹ کے طور پر کام کررہی ہے۔''

میلنڈا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ مزید کیا کہے۔ وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ کیرولین خیالی دنیا میں رہتی ہے لیکن ایلیکس کو یہ بات بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود کیرولین بہت زیادہ پُراعتماد تھی اور وہ ٹائر...... اس میں صرف ہوا کم نہیں ہوئی تھی بلکہ مکینک نے بتایا کہ اسے تیز دھار چاقو سے کاٹا گیا تھا تاکہ وہ قابلِ مرمت نہ رہے۔ شاید اس سے یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ چاقو کتنا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔

''میرا خیال ہے کہ اس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔'' ایلیکس بولا۔

''مجھے تو وہ کچھ ڈراؤنی سی لگ رہی تھی۔''

ایلیکس نے اپنا کافی کا کپ اٹھایا اور بولا۔ ''اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، وہ اپنی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اسی نے میرا ٹائر پھاڑا تھا۔''

''تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟''

''ہمارے درمیان کچھ عجیب سی گفتگو ہوئی تھی۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ اس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ کوئی ٹائر پھاڑ سکے۔'' یہ کہہ کر ایلیکس نے ایک قہقہہ لگایا اور دوبارہ کھانے میں مشغول ہوگیا۔

میلنڈا کو اس کے جڑواں بھائی کا خیال آیا جس کا ذکر گریس نے کیا تھا۔ کیرولین یہ کام اس کے ذریعے بھی کرواسکتی تھی۔ ایلیکس مصر تھا کہ اسے کیرولین سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ کیرولین حقیقت سے کتنی دور ہے تاوقتیکہ وہ محض میلنڈا کو پریشان کرنے کے لیے اس سے تفریح لے رہی ہو لیکن اس نے ایلیکس سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ یہ ایک دفعہ کی بات ہو کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کیرولین اس سے حسد کرتی ہے اور اس کے منتشر دماغ کے کسی حصے میں یہ بات موجود ہے کہ وہ ایلیکس کو حاصل نہ کرسکی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ملازمت بھی خطرے میں پڑ گئی اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ ایلیکس پر اپنی تشویش ظاہر نہ کرے بس اسے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت تھی۔

ایلیکس نے اپنا پرس نکالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ ہم کم از کم ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔'' پھر اس نے کچھ نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''امید ہے کہ تم ہمیشہ کی طرح مجھے رخصت کروگی۔''

وہ اس کا اشارہ سمجھ کر اس سے بغل گیر ہوگئی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ کیرولین کی کہانی جھوٹی یا خیالی تھی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے اس کہانی کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھا۔

ایلیکس اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں آج شکاگو جارہا ہوں۔ جمعے تک واپسی ہوگی پھر ہم الیگزینڈر میں ڈنر کریں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

''ڈنر کے بعد تم میرے گھر چلنا۔'' اس نے آنکھ مارتے ہوئے شرارت سے کہا۔

اس روز مسلسل بارش ہوتی رہی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بارش کی بوچھاڑ نے ایک دیوار کھڑی کردی تھی جس کے پار... کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میلنڈا کو اگلے ٹریننگ سیشن کی تیاری کرنا تھی لیکن وہ اس پر پوری طرح توجہ نہیں دے پارہی تھی۔ اس کے سامنے والی کھڑکی پر کیرولین کا چہرہ بار بار نمودار ہورہا تھا۔ اسے گریس کے الفاظ یاد آرہے تھے جو اس نے باتھ روم میں آئینہ دیکھتے وقت کہے تھے...... وہ اپنی دنیا میں رہتی ہے۔ اس کا بھائی جعل سازی کے الزام میں جیل کاٹ چکا ہے۔ گوکہ اس میں خوفزدہ ہونے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن وہ پھٹا ہوا ٹائر بھی دیکھ چکی تھی جس کے بعد اسے یقین ہوچلا تھا کہ کیرولین اس کے علاوہ بھی کچھ کرسکتی ہے۔

جب وہ دفتر سے اٹھی تو بارش کی جگہ دھند نے لے لی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں نصب حفاظتی روشنیاں جگنوؤں کے مانند لگ رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کار تک پہنچی۔ اس نے چابی کے گچھے میں لگی ہوئی چھوٹی سی ٹارچ کے ذریعے باری باری چاروں

ٹائر چیک کیے اور مطمئن ہوکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور گیئر میں ڈال کر تھوڑا سا پیچھے لے گئی پھر اس نے بریک لگایا۔ جب اسے اطمینان ہوگیا کہ سب کچھ ٹھیک ہے تو اس نے کار آگے بڑھا دی اور پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی دوسری گاڑیوں کے پاس سے گزرتی چلی گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے اعصاب پُرسکون ہوگئے ہیں اور گردن کے تناؤ میں کمی آگئی ہے۔ اگر وہ کچھ دیر میراج میں گزارے تو اس کا ذہن بالکل پُرسکون ہوجائے گا اور وہ اس پاگل عورت کے تصور سے نجات حاصل کرلے گی۔

بارہ بجنے میں دس منٹ پر وہ میراج سے نکلی۔ اس روز اس نے معمول سے زیادہ شراب پی لی تھی۔ چار یا پانچ گلاس۔ اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا لیکن اس نے کافی مقدار میں اسنیک فوڈ بھی لی تھیں اور اب اسے ہلکی ہلکی مستی محسوس ہورہی تھی۔ اسی لیے وہ بڑی احتیاط سے کار چلا رہی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ اپنی ہی لین میں رہے۔

بارہ بج کر پندرہ منٹ پر وہ بحفاظت اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گئی۔ اب وہ اپنے آپ پر ہنس رہی تھی اور اسے یہ سوچ کر سکون محسوس ہورہا تھا کہ اس نے ایلیکس کے سامنے اپنی معمولی سی تشویش بھی ظاہر نہیں کی۔ اس نے اپنی گاڑی انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں کھڑی کی اور کار سے باہر آگئی۔

وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر آئی اور دو عمارتوں کے درمیان بنے ہوئے چھوٹے سے باغ کی طرف مڑ گئی جس میں روشنی کے لیے تین خوب صورت لیمپ پوسٹ لگائی گئی تھیں اور ان میں سے ایک کا بلب جل چکا تھا۔ کنکریٹ کی فٹ پاتھ پر اس کی ایڑیوں کی ٹھک ٹھک سے ایسی آواز پیدا ہورہی تھی جیسے کوئی خراب دروازے پر دستک دے رہا ہو۔

''میں نے تمہیں ناشتا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔'' یہ آواز تاریکی میں سے آئی تھی۔ اسے سنتے ہی میلنڈا رک گئی۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ کسی کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کس کی آواز ہوسکتی ہے لیکن وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ چلنا شروع کردیا۔ اس سناٹے میں ایڑیوں کی آواز گونج رہی تھی جس پر اس نے پہلے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ سوئمنگ پول کے گرد لگی ہوئی لوہے کی باڑ کے پاس سے گزری۔ اس کے دوسری طرف جھاڑیوں کی ایک باڑ تھی جو ہر اپارٹمنٹ کے مرکزی دروازے کو ایک دوسرے سے الگ کرتی تھی۔

''تم اسے حاصل نہیں کرسکتیں۔'' کیرولین نے پکارا۔ اس کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن دونوں عمارتوں کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا، اس لیے وہ زیادہ دور نہیں ہوسکتی تھی۔

بہتر ہوتا کہ وہ واپس اپنی کار کی طرف جاتی اور اس وقت تک اپنے کسی دوست یا والدین کے پاس رہتی جب تک کیرولین وہاں سے نہ چلی جائے لیکن وہ ہمیشہ وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ جن لوگوں کے دماغ کی کوئی کل ڈھیلی ہو ان پر سردی یا بوریت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

''تم نے میری تنبیہ پر توجہ کیوں نہیں دی؟'' کیرولین چلائی۔

کیرولین کو یقیناً یہ معلوم نہیں تھا کہ میلنڈا کا اپارٹمنٹ کون سا ہے لیکن اگر میلنڈا ادھر کا رخ کرتی تو شاید کیرولین اسے اس کے دروازے پر ہی مل جاتی۔ اگر اسے اندازہ ہوجاتا کہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔

میلنڈا ایک بار پھر رک گئی۔ اس نے کان لگا کر آواز کی سمت جاننے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ مڑی اور واپس انڈرگراؤنڈ پارکنگ کے داخلی دروازے کی طرف جانے لگی۔ گوکہ وہ پنجوں کے بل چل رہی تھی لیکن اس کے بوٹوں کی دھمک سناٹے میں گونج رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر رک گئی۔ اس نے بائیں جانب قدم بڑھایا پھر دوسرا...... یہاں تک کہ اس کے قدم نرم مٹی کو چھونے لگے۔ اس نے چند قدم اور بڑھائے۔ گوکہ وہاں کیچڑ تھی لیکن کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ بالآخر وہ پارکنگ لاٹ تک پہنچ گئی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی کار کی طرف بھاگی۔ اسے اچانک ہی ڈر محسوس ہونے لگا کہ کہیں کیرولین اس کا تعاقب تو نہیں کررہی۔ ایک بار پھر اسے پھٹے ہوئے ٹائر کا خیال آیا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور جوتے صاف کیے بغیر ہی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے دروازہ لاک کیا۔ اسٹیئرنگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اپنی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرنے لگی۔

چند لمحوں بعد اس نے کار اسٹارٹ کی اور پارکنگ لاٹ سے باہر آگئی۔ اس کے لیے سب سے مناسب جگہ اس کے والدین کا گھر ہی تھی۔ وہ وہاں ایک خوفزدہ بچے کی طرح جارہی تھی لیکن ایلیکس کو بھی یہ معلوم نہیں ہوگا۔ وہ شکاگو میں غافل پڑا ہوگا۔ یقیناً اسے اندازہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے میں حق بجانب تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کے اپارٹمنٹ میں داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ کیرولین کہیں نزدیک ہی اس کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھی ہوگی۔

کار چلاتے ہوئے اس کی نظریں مسلسل ونڈشیلڈ پر جمی ہوئی تھیں کہ کہیں کیرولین تو اس کا پیچھا نہیں کررہی۔ وہ جگہ بالکل سنسان پڑی ہوئی تھی۔ وہ حیران تھی کہ ابھی تک اس کے پڑوسیوں میں سے کوئی ایک بھی گھر نہیں آیا حالانکہ وہ بدھ کی شب دیر تک گھر سے باہر نہیں رہتے تھے۔

جیسے ہی وہ اوپر آئی، کیرولین اچانک ہی نمودار ہوگئی۔ وہاں ڈرائیووے ختم ہوتا تھا اور اس جگہ ایک اسپیڈ بریکر بنا ہوا تھا تاکہ سڑک پر جانے والے اپنی رفتار کم کرلیں۔ میلنڈا نے زور سے بریک لگایا۔ اس کے کیچڑ میں لت پت جوتے خطرناک طریقے سے پھسلے لیکن وہ کار روکنے میں کامیاب ہوگئی۔

کیرولین مسکرائی۔ اس کے لمبے بالوں نے اس کے جسم کا بالائی حصہ تقریباً پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کے چہرے کا بہت تھوڑا حصہ نظر آرہا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی پتلون اور چست قمیص پہن رکھی تھی۔ میلنڈا نے ہارن بجایا تو سناٹے میں اس کی آواز معمول سے زیادہ تیز محسوس ہوئی۔

کیرولین نے تیوری چڑھائی اور آہستہ آہستہ کار کی طرف بڑھنے لگی۔ میلنڈا نے ایک بار پھر ہارن بجایا لیکن کیرولین پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ لہراتی اور ایک کے بعد دوسرا قدم بڑھاتی ہوئی ایک نظر نہ آنے والی لائن پر چلتی رہی جیسے کوئی ماڈل ریمپ پر چل رہی ہو۔

اس بار میلنڈا نے پوری قوت سے ہارن بجایا۔ یہ کان پھاڑ دینے والی آواز تھی۔ اس کے کانوں میں درد ہونے لگا لیکن اس نے ہارن پر سے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ اس کے باوجود کیرولین سامنے سے نہیں ہٹی اور نہ ہی اس کی رفتار میں کوئی کمی آئی۔ وہ کار کے سامنے والے بمپر کے پاس آکر رک گئی اور اس نے اپنی کہنیاں کار کے ہڈ پر رکھ دیں۔ وہ لہراتی ہوئی آگے بڑھی، یہاں تک کہ اس کا چہرہ میلنڈا کے بالکل قریب آگیا۔ ان کے درمیان بمشکل دو فٹ کا فاصلہ ہوگا اور صرف ونڈ اسکرین کے شیشے نے انہیں الگ کیا ہوا تھا۔

میلنڈا نے اس بار بھی پوری قوت سے ہارن بجایا۔ ایک دو نہیں بلکہ سات آٹھ مرتبہ لیکن پوری قوت صرف

کرنے کے باوجود وہ اس کی آواز نہ بڑھا سکی البتہ کیرولین کے مسکراتے چہرے پر ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اپنی پتلون کی بیلٹ میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا چاقو نکالا تو میلنڈا کی نظریں کیرولین کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ یہ چاقو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا کیونکہ کار کے سب شیشے مضبوطی سے بند تھے۔ اس نے ایکسلریٹر پر پاؤں رکھا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ انجن کے غرانے کی آواز آئی۔ اس کے باوجود کیرولین اپنی جگہ سے نہیں ہٹی۔ وہ قہقہے لگاتی اور چاقو کا بلیڈ آہستہ آہستہ شیشے پر مارتی رہی۔ اس نے اپنے بازو اس طرح پھیلائے جیسے ونڈشیلڈ سے لپٹنا چاہ رہی ہو۔ اس نے اپنا خالی ہاتھ شیشے پر رکھ دیا اور چہرہ اس کے قریب لے آئی۔

میلنڈا نے چلانا شروع کردیا۔ حالانکہ اسے کوئی خطرہ نہیں تھا اور وہ کار کے اندر محفوظ تھی۔ اس کا یوں چلانا محض ایک حماقت تھی۔ اب کیرولین زور زور سے قہقہے لگارہی تھی اور میلنڈا کار کے اندر بھی اس کے قہقہے سن سکتی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ہارن بجانا شروع کردیا لیکن کیرولین وہاں سے نہیں ہٹی۔

میلنڈا نے مضبوطی سے اسٹیئرنگ پکڑا اور ایکسلریٹر پر ہلکا سا دباؤ بڑھایا۔ اگر وہ زیادہ رفتار بڑھاتی تو کیرولین کار سے گرجاتی اور اسے شدید چوٹیں آتیں۔ اس نے ایکسلریٹر پر سے پاؤں ہٹایا تو کار چند انچ پیچھے کی طرف جانے لگی۔ اس نے رفتار کم کرنے کی کوشش کی لیکن کیچڑ کی وجہ سے اس کا پاؤں ایکسلریٹر پر سے پھسل گیا اور کار اسپیڈ بمپر سے جا ٹکرائی۔

کیرولین کا جسم ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ اس نے فوراً ہی شیشے کے وسط میں اپنا ہاتھ رکھا اور وائپر کو پکڑلیا۔ میلنڈا نے قہقہہ لگایا۔ یہ بے وقوف عورت اسے دہشت زدہ کررہی تھی۔ اس نے کار کی رفتار آہستہ کی اور ڈرائیووے سے بائیں جانب موڑلی۔ سڑک پر آنے کے بعد اس نے کار کی رفتار بڑھادی۔ کیرولین کی وجہ سے اسے سامنے کا منظر واضح طور پر نظر نہیں آرہا تھا جو اب بھی دانت نکالے ہنس رہی تھی۔ کار لہراتی ہوئی فٹ پاتھ کی جانب بڑھی اور اس کا اگلا حصہ کوڑے دان سے ٹکرایا۔ پلاسٹک کا کوڑے دان یہ ضرب برداشت نہ کرسکا اور بغلی دروازے سے ٹکراتا ہوا نیچے آن گرا۔ کیرولین بونٹ سے چپٹی ہوئی تھی۔ میلنڈا نے دیکھا کہ کار فٹ پاتھ سے بالکل لگ گئی ہے تب اسے احساس ہوا کہ اس سے چند گز کے فاصلے پر آگ بجھانے کا پانی کا پمپ ہے۔ اس نے جلدی سے اپنا پاؤں بریک پر رکھا لیکن کیچڑ کی وجہ سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ کار فٹ پاتھ پر چڑھ گئی اور پمپ سے چند انچ کے فاصلے پر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔

کیرولین اپنی گرفت برقرار نہ رکھ سکی۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا نچلا دھڑ فضا میں اچھلا اور وہ ایک طرف جاگری۔ کھڑکیاں بند ہونے کے باوجود میلنڈا نے اس کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز سنی۔ اس نے ایک بار پھر بریک لگایا لیکن اس بار بھی پاؤں پھسل گیا پھر اس نے دونوں پیر استعمال کیے۔ بالآخر وہ کار روکنے میں کامیاب ہوگئی۔

اس کی سانسیں بے ترتیب ہورہی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے دروازہ کھولا اور کیرولین کی طرف دوڑ لگادی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور مسکراہٹ غائب ہوچکی تھی۔ اس کے خون میں لت پت بال پانی کے پمپ سے چپکے ہوئے تھے اور چاقو اس کے سینے پر پڑا ہوا تھا جیسے اس نے خود وہاں رکھا ہو۔

میلنڈا لڑکھڑاتی ہوئی اپنی کار تک واپس آئی اور بیگ سے اپنا فون نکالا۔ جو کچھ ہوا، اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ وہ تھوڑا فخر محسوس کررہی تھی کہ اس نے ایک خوفناک دھمکی کا سامنا کرنے میں تھوڑی سی جرأت دکھائی۔ وہ محض دھمکی نہیں بلکہ حملہ تھا۔

اس نے فون کو غیر مقفل کرنے کے لیے بٹن دبایا تو اس کی نظر ایلیکس کے پیغام پر گئی۔ اس نے کھول کر وہ پیغام پڑھا۔ لکھا تھا...... ''کیا کیرولین نے تمہیں کچھ اور نہیں بتایا؟''

میلنڈا سوچ میں پڑ گئی۔ ''کچھ اور'' سے ایلیکس کی کیا مراد ہے؟ پھر اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ انتظامیہ کے خیال میں ایسی عورت کو کسی دوسری کمپنی میں ملازمت حاصل کرنی چاہیے جس کا اپنے باس سے کوئی جذباتی تعلق ہوتا کہ ایلیکس کا کیریئر بچ جائے۔

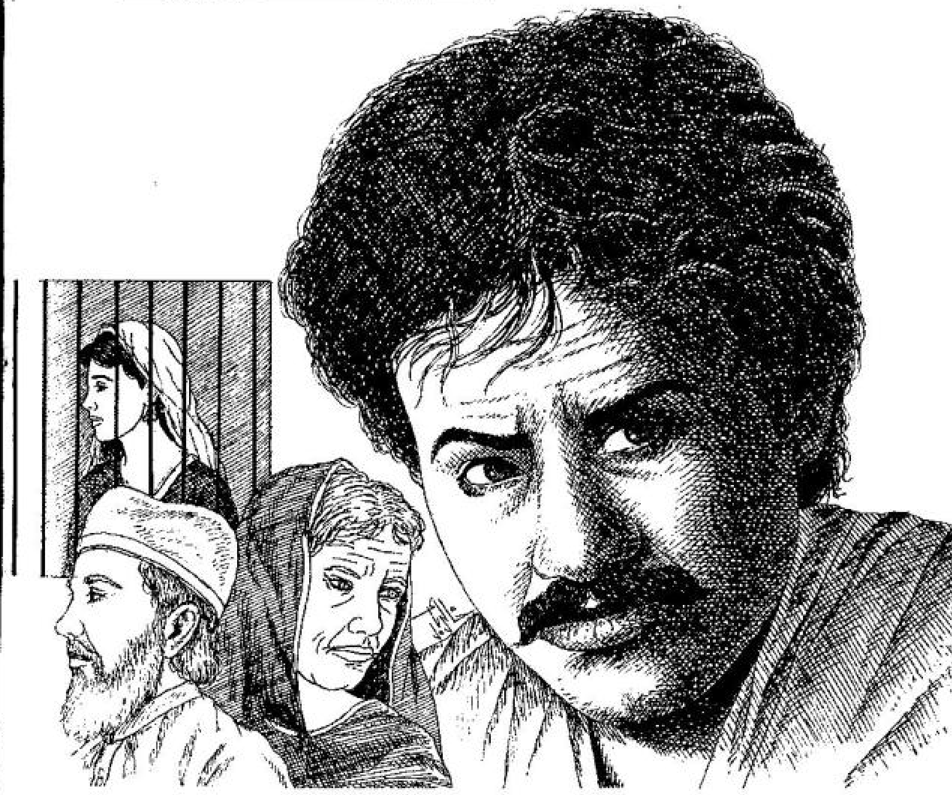
کیرولین پاگل نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایلیکس سے محبت کرنے کی پاداش میں اسے ملازمت سے ہاتھ دھونا ہوں گے۔ اسی لیے ایلیکس نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اس کے باوجود وہ میلنڈا کے مقابلے پر آگئی جس کے نتیجے میں اس کی جان چلی گئی۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ ایلیکس کبھی بھی اپنے کیریئر کی قربانی دے کر اس سے محبت نہیں کرے گا۔ اسے پہلے ہی میلنڈا کا قرب حاصل تھا پھر وہ گھاٹے کا سودا کیوں کرتا۔

بازگشت

پروین زبیر

کبھی کبھی دائرے کی سب سے بڑی خامی سب سے بڑی خوبی بن کر انسان کو حیران کر دیتی ہے یعنی جس مقام سے سفر کا آغاز کیا جائے اسی مقام پر اختتام بھی ہو جائے... گویا جہاں سے چلے... ڈھیروں مسافت اور تھکن کے بوجھ تلے واپس اسی جگہ رک جانے پر مجبور۔ وہ بے بس خاندان بھی قدرت کی اس کرشمہ سازی پر حیران تھا۔ جس آواز سے پیچھا چھڑانا چاہا تمام عمر اس کی بازگشت تعاقب میں رہی۔ اس نے بھی بڑے زعم سے عشق کا امتحان دینے کی ہمت میں گھر کی دہلیز پار کی اور عشق کے الزام میں گرفتار، قبر کی قید میں چلی گئی... ماجرا اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو ٹھیک تھا مگر بات تو اس سے آگے کہیں بہت دور چلی گئی جہاں اس کی جان کے ٹکڑے... اس کے جگر گوشے دنیا کی ٹھوکروں میں رُلتے پھرتے رہے اور بالآخر ماں کے حصے کا سفر مکمل کرتے کرتے دائرہ مکمل کر ڈالا گویا آغازِ سفر پر ہی انجامِ سفر کر کے بازی جیت لی اور جھکے ہوئے سر اور بلکتے ذہنوں میں احساس اور فرائض سے متعلق بے شمار سوالوں کی جنگ چھیڑ دی۔

خونی رشتوں کے ہاتھوں خون کے آنسو رونے والوں کی عبرت اثر داستان



دور افق پر سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ دور دور تک سناٹا تھا۔ ایسے میں یا تو دریا کے پانی کا شور تھا یا پھر دور کھیتوں میں کام کرتے کسانوں کی ان کے جانوروں کی ہلاشیری کی آوازیں۔

وہ دونوں بچوں کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہی تھی۔ پانچ سالہ لڑکی اور چھ سات سالہ لڑکا۔ لمبے عبائے اور حجاب نے اسے سر سے پیر تک چھپایا ہوا تھا لیکن چہرہ نظر آ رہا تھا جس پر سنگین کیفیت طاری تھی۔ ہاں موٹی سیاہ آنکھوں میں غم واندوہ کی کیفیت اور مایوسی کا تاثر بہت نمایاں اور صاف نظر آ رہا تھا۔

وہ جانے کہاں سے پیدل چل کر آ رہی تھی اور اب اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پل پر قدم رکھتے ہی تھک گئی ہو اور تھکن سے اس کے قدم بھاری ہو گئے ہوں۔ اس نے بچوں کو فٹ پاتھ پر بٹھایا۔ انہیں جانے کیا کیا سمجھاتی رہی۔ بچے رونے لگے۔ وہ ان کو گلے لگا کر پیار کر کے ان سے الگ ہوئی اور گزرگاہ کو پار کر کے دوسری جانب پل کی ریلنگ کی طرف بھاری قدموں سے بڑھتی رہی۔ بچے زور زور سے رونے لگے۔ سات سالہ بچہ اٹھ کر اس کی طرف دوڑا تو بچی بھی پیچھے پیچھے ماں کو پکارتی ہوئی آگے آئی۔

وہ جو نیچے گہرائی میں بہتے دریا کو دیکھ کر کودنے کی تیاری کر رہی تھی، رک گئی۔ بچوں نے آ کر اس کا دامن پکڑ لیا۔

''امی......امی......'' وہ زور زور سے روتے ہوئے اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے تھے۔

اس نے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ ان دونوں کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اسی جگہ لائی جہاں پہلے بٹھایا تھا۔ اس مرتبہ اس نے دونوں کو فٹ پاتھ سے آگے لگی ریلنگ کے ساتھ کھڑا کر کے اپنے حجاب کا ڈوپٹا کھینچا اور باندھ دیا۔ ان کے آنسوؤں سے بھیگے چہروں کو چوما اور ان پر آخری نظر ڈالی اور دوبارہ گزرگاہ کے پار جا کر دوسری جانب کی ریلنگ سے جھانکا۔ دریا کا پرشور پانی تیز لہروں کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ مڑ کر ان پر آخری نظر ڈالی اور اگلے ہی لمحے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

☆☆☆

''ذرا دیکھیے تو! اس لڑکی کی تصویر۔ کیا آپ کو بھی اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسا مجھے محسوس ہو رہا ہے۔''

اس عمر دار خاتون نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار اپنے شوہر کی طرف بڑھایا اور اس میں چھپی ایک تصویر پر انگلی رکھ کر نشاندہی کی۔

''ارے ہاں! یہ تو بالکل ہماری مناہل جیسی ہے۔ کون ہے یہ؟'' مسعود علی خان نے چشمے کے اوپر بیوی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں کون ہے...... لیکن ہے مصیبت کی ماری بیچاری ناکردہ جرم کی پاداش میں جیل میں ہے۔ اسی بارے میں یہ پورا فیچر چھپا ہے۔''

نوشابہ مسعود نے جواب دیا اور اخبار واپس اٹھا لیا۔ مسعود نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور اطراف کا جائزہ لیا۔ صبح کی چمکیلی دھوپ نے لان میں لگے موسمی پھولوں کے رنگ نکھار دیے تھے اور سبز گھاس مخملی نظر آ رہی تھی۔

مناہل کی یاد نے ان کا دل دکھا دیا تھا۔ برسوں پہلے وہ تتلی کی طرح یہاں اڑتی پھرتی تھی۔ کبھی گیند سے کھیلتے ہوئے کبھی سائیکل چلاتے اور کبھی جھولا جھولتے۔ اس کی یادیں آج بھی یہاں بکھری ہوئی تھیں۔

''مسعود! بالکل بے سہارا لڑکی ہے یہ۔ لوگوں کے رویے اور حالات کی گردش نے اسے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ جیل میں اس کی سزا ختم ہو چکی ہے لیکن اس نے جیل سے باہر جانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ کہتی ہے جیل سے باہر میں کہاں جاؤں گی۔ میرا نہ کوئی گھر ہے اور نہ ہی کوئی اپنا۔ اگر مجھے زبردستی بھیجا گیا تو میں پھر کوئی جرم کر کے واپس جیل میں آ جاؤں گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ مجھے یہاں سے نہ بھیجا جائے۔''

نوشابہ نے فیچر پڑھ لیا تھا۔ اب تبصرہ کرتے ہوئے اخبار میز پر رکھ دیا اور ایک نظر لان کے پرے نظر آنے والے اپنے طویل و عریض گھر کو دیکھا جہاں وہ دونوں برسوں سے تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی زندگی کی ایک ہی راحت تھی۔ ان کی بیٹی مناہل جو برسوں پہلے اس گھر سے جا چکی تھی۔

☆☆☆

فیصل شاہان سرکاری ملازم تھا۔ ایک فاریسٹ آفیسر۔ خوش جمال و خوش خصال۔ اچھا لباس پہننے کا شوقین۔ وہ اچھا خاصا ہیرو دکھتا تھا۔ اگر کسی بڑے حلقے میں راہ و رسم ہوتی تو لیڈی کلر کا ٹائٹل اسے فوراً مل جاتا۔ پر اب بھی وہ صنف مخالف کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے کے فن میں ماہر تھا۔ خود جمال پرست تھا اس لیے خوب صورت چہرے اسے بہت بھاتے تھے۔ اس کی بیک وقت کئی لڑکیوں سے دوستی ہوتی تھی اور اس کمال کے ساتھ کہ ایک کو

دوسری کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ ہر ایک الگ الگ اسے اپنا عاشق صادق ہی سمجھتی تھی۔

جانے کیسے وہ مناہل سے ٹکرا گیا۔ امیر ماں باپ کی اکلوتی بیٹی۔ اس نے بہت کچھ کیلکولیٹ کر کے اس سے ملنے کو ایک اتفاقی حادثہ بنا دیا۔ وہ ایک شاپنگ مال میں اس سے ٹکرایا جس سے مناہل کا سامان گر پڑا۔ معذرت کر کے اس نے جلدی سے بکھرا ہوا سامان اٹھا کر اسے پکڑایا اور نظریں ملتے ہی ساکت ہو گیا۔ بغیر پلکیں جھپکائے ایک انتہائی ڈیشنگ ہینڈسم لڑکے کو بے خودی میں اپنی جانب دیکھتے ہوئے مناہل کا دل اتھل پتھل ہو گیا۔ چہرے پر تمازت لالی بن کر پھیل گئی۔

''کیا آپ وہی ہیں......؟'' اس کے ہونٹوں سے ایک سرگوشی سرسرائی ہوئی نکلی تو مناہل گھبرا گئی۔

''کون......؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''وہی جو ہمیشہ سے میرے ذہن و دل میں تھیں۔ وہی خوابوں والا چہرہ، وہی حسن و جمال...... میں اس وقت خواب میں ہوں یا جاگتی آنکھوں کے خواب سے گزر رہا ہوں؟ بتائیے نا......'' اس نے خواب آگیں لہجے میں جو کچھ کہا اس نے مناہل کے دل کو بے طرح دھڑکایا لیکن اس نے اپنے اوپر قابو پایا۔

''وہارٹ ربش؟ آر یو کریزی؟ ہٹو سامنے سے۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی۔

لیکن وہ نہیں ہٹا۔ نہ اس وقت اور نہ ہی آئندہ کبھی۔ اس نے بار بار دل پر دستک دے کر اس کے دل کا دروازہ اپنے لیے کھلوا ہی لیا۔ اس کوشش میں اس نے اپنی ساری مہارتیں آزمائی تھیں اور ویسے بھی وہ اس میدان کا پکا کھلاڑی تھا تو پھر مناہل کہاں تک مزاحمت کر سکتی تھی۔ وہ کہتی۔

''تم گھس بیٹھے ہو میرے دل میں۔ جانے کیسے میری مرضی کے بغیر دل میں داخل ہو کر قبضہ جما لیا۔''

تو وہ زور سے ہنستا۔

''مجھے تو آنا ہی تھا ہر صورت کیونکہ میرا دل یہی کہتا تھا کہ چل بھئی! یہی تیری منزل ہے اور اس سے گریز ممکن نہیں ہے۔ یا تو زندگی میں مناہل نہیں یا زندگی نہیں۔'' اس نے جذباتی انداز میں کچھ اس طرح کہا کہ مناہل کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ انویسٹی گیٹو رپورٹر اور فیچر رائٹر تھی اور اپنے میدان میں اپنے کام کی ماہر۔ اس کے فیچر ایک معروف روزنامے کے سنڈے ایڈیشنز میں چھپتے تھے۔ انوکھے موضوعات اور کرداروں پر مشتمل یہ فیچر اس روزنامے کی سرکولیشن بڑھانے میں بہت بڑا حصہ ڈالتے تھے۔ اس نے غور سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بزرگ کو دیکھا۔ جو اپنے حلیے اور چہرے مہرے سے خاصے اسمارٹ نظر آ رہے تھے۔

''جی فرمائیے؟'' اس نے استفہامیہ نظریں ان کی طرف مرکوز کیں۔

''میں آپ کے لکھے ہوئے فیچر کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ جو آپ نے جیل میں موجود لڑکی پر لکھا ہے جو وہاں سے آزاد ہونے سے انکاری ہے۔'' انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اپنی بات شروع کی۔

''جی! کیا بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟ فرمائیے!''

''کیا آپ کے توسط سے میں اور میری بیوی اس سے مل سکتے ہیں؟''

''میرا حوالہ ضروری نہیں۔ آپ ویسے ہی جا کر مل لیجیے۔''

''میں گیا تھا لیکن اس نے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ ہمارے بے حد اصرار کے باوجود وہ ہم سے ملنے نہیں آئی۔''

''ہاں۔ وہ کسی سے نہیں ملتی لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

''جی۔ ہم اس سے اس لیے ملنا چاہتے تھے کہ ہم اسے بتا سکیں کہ وہ دنیا میں بالکل بے سہارا نہیں ہے۔ اس کا ایک گھر ہے۔ ہمارا گھر۔ ہم اسے گود لینا چاہتے ہیں۔''

''وہ کوئی چھوٹی بچی نہیں ہے۔ ایک سولہ سترہ سال کی لڑکی ہے۔ آپ اسے گود لینا چاہتے ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہم اسے سہارا دینا چاہتے ہیں۔ ایک گھر دینا چاہتے ہیں جہاں وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ چین و سکون اور عزت کی زندگی جی سکے۔''

''اوہ! آپ کا جذبہ قابل ستائش ہے لیکن زمانہ اس قدر خراب ہے کہ ایسے قابل فخر جذبے پر بھی کوئی بھروسا کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسے بھی کسی پر بھروسا نہیں ہے۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ وہ ہم پر ہمارے خلوص پر بھروسا نہیں کر رہی ہے۔ اسی لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ اسے یہ بھروسا دلائیں۔ ہم دونوں میاں بیوی اس کو ایک اچھی زندگی دینے کے خواہشمند ہیں۔'' ان کے

لہجے میں سچے جذبوں کی جھلک تھی۔

''لیکن وہی لڑکی کیوں! دنیا میں اور بہت سے بے سہارا لوگ ہیں۔ کیا سب کے لیے آپ کے جذبات ایسے ہی ہیں؟''

''جذبات تو سب کے لیے ایسے ہی ہیں لیکن ہمارے وسائل اور عمر کے تقاضے ایسے نہیں ہیں کہ ہم سب کے لیے کچھ کر سکیں۔ آپ کا فیچر پڑھ کر دل اس بچی کے لیے بہت دکھی ہوا۔ اسی لیے سوچا کہ چلو، کچھ نہ کچھ اس کے لیے ہی کرلیں۔ دادا دادی یا نانا نانی بن کر اس کی پرورش کرلیں گے تو ہماری زندگی کو بھی ایک مقصد مل جائے گا اور بچی بھی اپنے گھر اور اپنوں کے درمیان رہ کر گزرے دنوں کی تلخی بھلا کر ایک اچھی زندگی گزار لے گی۔ آپ کے پاس آنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ آپ اس بچی سے ملتی رہی ہیں۔ وہ آپ سے مل لیتی ہے۔ تو آپ اسے ہمارے بارے میں بتائیں، ہمارا مقصد سمجھائیں تو شاید وہ مان جائے۔'' انہوں نے صراحت سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے مسعود صاحب! میں کوشش کروں گی۔''

''صرف کوشش نہیں کرنا ہے بلکہ اس کو راضی کرنا ہے۔ اسے یقین دلانا ہے کہ ایک اچھی زندگی اس کے اپنے گھر میں اس کی منتظر ہے۔ اسے اس طرف قدم بڑھانا چاہیے۔ رائٹ؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

''اوکے!''

☆☆☆

''بس مناہل! اب مجھ سے اور انتظار نہیں ہوتا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے شادی کرنا ہے تم سے فوراً۔'' فیصل نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

اوہو! اتنی بے قراری!'' مناہل نے مسکرا کر اپنا ہاتھ آہستگی سے چھڑایا۔

''ہاں...... ایسا ہی ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

''اوکے، اوکے۔ پہلے مجھے ممی پاپا سے بات تو کر لینے دو۔ وہ کیا کہتے ہیں۔''

''ان سے پوچھنا نہیں ہے، صرف انہیں بتانا ہے کہ تم مجھ سے شادی کر رہی ہو۔ ٹھیک ہے نا؟''

''پاگل ہو۔ وہ میرے ممی پاپا ہیں۔ میں ان کی ایک ہی اولاد ہوں۔ بہت پیار کرتے ہیں وہ مجھ سے۔ میں ان سے ایسی بات کیسے کر سکتی ہوں لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں بات کروں گی۔'' مناہل نے اسے تسلی دی۔

''وہ مان جائیں گے؟''

''ہوں! ممی کا تو یقین ہے لیکن پاپا تھوڑے اصول پرست ہیں۔ وہ جب تک مطمئن نہیں ہوں گے، کچھ نہیں ہو سکتا۔'' وہ مسکرائی۔

''اف! نہ کہو...... مجھے خوفزدہ مت کرو۔'' فیصل نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

''خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ مطمئن ہو گئے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ چلو! اب مجھے گھر ڈراپ کردو۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ پاپا ناراض ہوں گے۔''

وہ گھر میں داخل ہوئی تو شام کا سرمئی اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ ممی ڈائننگ ٹیبل لگوا رہی تھیں۔

''کہاں چلی جاتی ہو۔ اتنی دیر میں واپس آئی ہو۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ تمہارے پاپا کو اتنی دیر تک تمہارا گھر سے باہر رہنا پسند نہیں ہے۔ مزہ آتا ہے ان کی ڈانٹ کھانے میں۔'' انہوں نے غصے سے اسے مخاطب کیا۔

''سوری ممی! آئندہ خیال رکھوں گی۔ میں آتی ہوں فریش ہو کر۔'' وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ڈائننگ ٹیبل پر ہی اس نے فیصل کے بارے میں مختصراً بات کی۔

''ممی، پاپا! ایک بات کہنی تھی آپ لوگوں سے۔ وہ...... ایک...... لڑکا ہے۔ مجھ سے...... شادی کرنا...... چاہتا ہے۔'' مناہل نے بڑی ہمت کر کے بات کی جو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلی۔

''وہاٹ؟ آر یو کریزی مناہل؟ تم سیکنڈ ائر میں پڑھ رہی ہو۔ ابھی تمہاری تعلیم کچھ بھی نہیں ہے اور تم شادی کے چکر میں پڑ گئیں۔ ہاؤ اِٹس پوسیبل۔'' نوشابہ چیخ پڑیں لیکن وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ پر جھکی چمچ سے کھیلتی رہی۔

''لڑکا کون ہے؟'' پاپا نے کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھ کر پوچھا تو اس نے پاکٹ سے ایک تصویر نکال کر خاموشی سے ان کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے تصویر دیکھی پھر پلٹ کر اس کا تعارف دیکھا۔

''ہوں! یہ ایک معمولی فاریسٹ آفیسر ہے۔ تھوڑی سی تنخواہ ہوگی۔ اس کا کوئی اسٹیٹس نہیں ہے۔ تم جن آسائشوں کی عادی ہو، وہ تمہیں نہیں ملیں گی۔ تم گزارہ کرلوگی؟'' انہوں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا جس میں اندر ہی اندر ہلکا ہلکا غصہ نمایاں محسوس ہو رہا تھا تو اس نے خاموشی

اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اف مناہل! ہمارے خاندان میں سب ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ہم دونوں پی ایچ ڈی ہیں اور ہماری اولاد محض میٹرک پاس رہ جائے۔ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ تمہارا شادی کا فیصلہ بہت جلد بازی والا ہے۔ شادی تو کرنا ہے۔ اسی سے کرلینا لیکن تعلیم تو مکمل کرلو۔'' نوشابہ نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''وہ نہیں مانتا۔ انتظار نہیں کر سکتا۔'' اس نے آہستگی سے کہا تو وہاں سناٹا چھا گیا۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے تھوڑا وقت دو۔ میں سوچ کر جواب دوں گا۔ اب کھانا کھاؤ۔'' مسعود علی خان نے اشارہ کیا تو وہ تینوں خاموشی سے کھانا زہر مار کرنے لگے۔

☆☆☆

''ریحان! تمہاری انویسٹی گیٹو کارکردگی کا امتحان ہے۔ یہ ایک صاحب ہیں، مسعود علی خان۔ ریٹائرڈ بیورو کریٹ ہیں۔ ڈیفنس کے کسی فیز میں ہزار گز کے بنگلے میں رہتے ہیں۔ اتنے بڑے گھر میں صرف دونوں میاں بیوی ہیں۔ ذرا ان کی بایوگرافی کا پتا کرنا ہے۔'' موی نے ریحان کی طرف ایک کارڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سلسلہ کیا ہے؟'' ریحان نے کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سلسلہ یہ ہے کہ ہم نے وہ جو جیل والی لڑکی پر فیچر تیار کیا تھا، انہوں نے یہ فیچر پڑھ کر اسے گود لینے کی خواہش ظاہر کی ہے لیکن وہ کسی سے بھی ملنے کو ہی تیار نہیں ہے تو انہوں نے مجھ سے اسی سلسلے میں مدد کی درخواست کی ہے۔''

''تو کردیں مدد۔ ملوادیں اس سے۔ ان کی انویسٹی گیشن کیوں کروا رہی ہیں؟''

''ارے بھئی! کسی کے اندر جھانک کر تو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ پتا نہیں ان کی نیت واقعی مدد کرنے کی ہے یا کچھ اور...... آج کل اتنے عجیب و غریب واقعات سننے میں آرہے ہیں کہ کسی پر بھروسا کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔'' موی نے کہا۔

''تو نہ پڑیں اس چکر میں...... چھوڑیں۔'' ریحان نے بے پروائی سے چیونگم چباتے ہوئے کہا۔

''میں اس چکر میں اس لیے پڑنا چاہ رہی ہوں کہ میں واقعی اس لڑکی کا بھلا چاہتی ہوں۔ جیل میں اس کی آدھی عمر تو گزر گئی ہے۔ باقی عمر بھی وہ جیل میں ہی گزارنا چاہتی ہے کیونکہ دنیا بھر میں اس کا نہ کوئی گھر ہے اور نہ کوئی اپنا۔ اگر یہ صاحب واقعی پورے خلوص سے اس لڑکی کی زندگی سنوارنا چاہتے ہیں تو اس سے بہتر کچھ ہو نہیں سکتا۔''

''شادی کروادیں اس کی۔ مل جائے گا گھر بھی اور گھر والا بھی۔'' ریحان نے میگزین پر نظریں جماتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

''جیل میں رہ کر کس سے شادی ہوگی اور کیا گھر والا ملے گا۔ اگر کسی اچھے گھر سے شادی ہوئی تو دونوں چیزیں بہت اچھی ہو جائیں گی۔''

''ٹھیک ہے بھئی! میں سمجھ رہا تھا کہ وہ فیچر مکمل ہو گیا ہے لیکن ابھی تو اس میں بہت کام نکل آیا۔ دیکھتا ہوں۔ دو تین دن لگیں گے۔''

''دو تین نہیں، صرف ایک دن۔ آج کا اپنا سارا کونٹنٹ مجھے دے جاؤ، میں نمٹا لوں گی۔ تم ابھی نکل جاؤ اور کل مجھے اسی وقت رپورٹ کرو...... اوکے؟'' موی نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اتنی جلدی کیسے ہوگا؟ کچھ وقت لگے گا بھئی۔'' اس نے دہائی دی۔

''نو...... چلو فوراً نکل لو اور کل اسی وقت پوری اور مکمل معلومات دینا ہیں۔ ناؤ گو۔''

☆☆☆

بچوں کے رونے چلانے کی آوازوں نے کسانوں کو اس طرف متوجہ کیا پھر ایک کسان نے اس لڑکی کو دریا میں کودتے دیکھ کر شور مچایا تو وہ چند کسان جو نزدیک کام کر رہے تھے، اپنے اپنے کام چھوڑ کر بھاگے۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے پل تک پہنچے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ دریا کی لہریں اسے بہاتی ہوئی نہ جانے کہاں لے جا چکی تھیں۔ دور دور تک پانی میں کوئی بہتا نظر نہیں آیا تو وہ مایوس ہو کر مڑے اور روتے ہوئے بچوں کی طرف متوجہ ہوئے جو امی امی کہہ کر رو رہے تھے۔

انہوں نے بچوں کو کھولا تو بیٹا روتا چلاتا ہوا پل کی ریلنگ کی طرف دوڑا اور جھانک کر دریا کے پانی کو دیکھ کر اپنی ماں کو متلاشی نظروں سے ڈھونڈتا رہا پھر اس کے وجود کی کوئی نشانی نہ ملی تو بلک بلک کر رونے لگا۔ اس کی بہن بھی اس سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ کسان حیران اور پریشان انہیں دیکھ رہے تھے۔

''نورے! اب ان بچوں کا کیا کریں؟''

''بھائی جی! ان کے گھر کا پتا پوچھو۔ ان کا باپ تو ہوگا۔ وہاں پہنچا دیں گے۔''

پر دونوں بچے گھر کا پتا بتا نہیں پائے۔ انہیں معلوم

نہیں تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے۔ باپ کا نام ضرور معلوم تھا جو انہوں نے فیصل بتایا۔ اب فیصل تو دنیا میں بہت سے ہیں۔ ان کا باپ کون ہے، یہ معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔

''نورے! ہم ان دونوں بچوں کو زمیندار جی کی حویلی پہنچا دیتے ہیں۔ وہ آپ پتا کروالیں گے کہ یہ کس کے بچے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بھائی جی۔'' وہ انہیں لے کر حویلی چلے گئے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ دونوں کچھ بھی بتانے سے قاصر تھے اس لیے زمیندار نے دو تین بندے ادھر ادھر دوڑائے کہ آس پاس کے گاؤں جا کر معلوم کریں کہ کس کے بچے گمشدہ ہیں۔ پتا چل جائے گا۔

''بختاں! بچوں کو لے جا۔ کچھ روٹی، دودھ وغیرہ کھلا پلا اور ان کے سونے کا بندوبست کردے۔ کل تک خبر مل جائے گی تو بھیج دیں گے۔''

پر کوئی خبر نہ ملی۔ کہیں سے کسی کے دو بچے گم نہیں ہوئے تھے۔ دریا سے ان کی بدنصیب ماں کی لاش بھی نہیں ملی۔

''ٹھیک ہے بختاں! ان بچوں کو چودھرانی کے پاس لے جا اور بول کہ اب یہ یہیں رہیں گے۔ ان کے روٹی پانی کا خیال تو خود رکھنا۔''

لیکن بختاں جب بچوں کو چودھرانی کے پاس لے کر گئی تو ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''جانے کس کمی کمین کی اولاد ہیں۔ اب یہ میرے بچوں کے ساتھ رہیں گے۔ بختاں! تیرے ساتھ برآمدے میں سوئیں گے یہ۔ ادھر بستر لگوا ان کے۔''

''پر بی بی! حلیے اور شکل صورت سے تو اچھے گھر کے ہی لگتے ہیں۔''

''اچھے گھر کے بچے یوں بے گھر بے در نہیں پھرتے۔ ماں نے پتا نہیں کس کے گناہ پالے ہیں۔ خود تو شرم سے دریا میں ڈوب مری اور ان کو چھوڑ گئی یہاں۔''

چودھرانی نے نفرت سے ناک سکوڑی اور وہ بچے ناکردہ جرم کی پاداش بھگتنے کے لیے وہاں رہ گئے۔

☆☆☆

انہوں نے بے چین ہوکر کوئی دسویں بار گھڑی دیکھی۔ انہیں یہاں جیلر کے سامنے بیٹھے کوئی دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ صفیہ شاہنواز اس خواتین جیل کی انچارج تھی۔ وہ انہیں چائے بھی پلوا چکی تھی۔ پہلی مرتبہ اس نے اپنی ایک کانسٹیبل کو اسے لانے کے لیے بھیجا تھا لیکن اس نے انکار کہلا بھیجا تھا۔

''اب میں کیا کروں سر! وہ کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتی۔ میں نے خود بھی اس سے بات کی تھی مگر اس کا ایک جواب ہے کہ جیل کے باہر میرا کوئی رشتہ نہیں ہے اس لیے مجھے کسی سے نہیں ملنا۔'' صفیہ نے خود بھی ان سے معذرت کرلی تھی۔

اس مرتبہ وہ موی کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ حسب معمول جب اس نے ملنے سے انکار کہلا بھیجا تو موی نے خود جا کر اس سے بات کرنے کی ٹھانی۔ اب وہ اندر گئی ہوئی تھی اور وہ دونوں بے چینی سے اس کا انتظار کررہے تھے۔

پھر آخرکار لیڈی کانسٹیبل کی آمد ہوئی اور اس نے ان دونوں کو اندر لے جانے کے لیے اپنی انچارج سے اجازت لی۔

''آپ دونوں اندر تشریف لے جایئے۔ آل دا بیسٹ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ کانسٹیبل کے ہمراہ وزیٹر روم میں چلے گئے۔ جب وہ ان کے سامنے آئی تو وہ فرطِ حیرت سے کھڑے ہوگئے۔ جذبات سے مغلوب ہوکر ان دونوں کے منہ سے ایک ہی نام نکلا...... مناہل!

''جی نہیں۔ میرا نام مشعل ہے۔ مشال کہتے ہیں سب مجھے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''اوہ اچھا...... مشال! میں مسعود علی خان ہوں اور یہ میری بیگم نوشابہ۔ کیا ہم کچھ دیر بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں؟''

''ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ آپ کو مجھ سے کیا بات کرنا ہے؟''

''اجنبی ابھی ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ ہوں۔ ہم اسی اجنبیت کو ختم کرنے تو آئے ہیں۔''

''کیوں؟ آپ کو اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ مجھے تو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''ہاں۔ معلوم ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے گھر میں...... ہم دونوں مل کر بھی اکیلے ہیں۔ جب اپنی اپنی ملازمتیں کررہے تھے تو مصروفیات کے سبب اتنا احساس نہیں ہوا لیکن اب ریٹائرمنٹ کے بعد یہ تنہائی ہمیں کھانے لگی ہے۔ تکلیف دینے لگی ہے۔ پچھلے دنوں تمہارے بارے میں میمونہ نے جو فیچر چھاپا تھا، وہ ہم دونوں نے پڑھا۔ تمہاری تصویریں بھی تھیں اور یہ بیان بھی کہ تم سزا ختم ہوجانے کے بعد بھی جیل سے باہر نہیں جانا چاہتیں کیونکہ تمہارا کوئی رشتہ اور گھر جیل کے باہر نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ ہم تمہیں اپنے گھر لے آئیں۔ ہماری تنہائی دور ہوجائے گی۔ ہمیں ایک بیٹی مل جائے گی اور تمہیں ایک گھر...... اور ماں باپ تو نہیں کہہ سکتے، ہاں دادا دادی یا نانا نانی

کہہ سکتی ہو۔ وہ مل جائیں گے۔ ہم تینوں مل کر بہت اچھی زندگی گزاریں گے۔ کیا یہ ایک اچھا خیال نہیں ہے؟''

نوشابہ نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ کو ایک کل وقتی ملازمہ کی ضرورت ہے جو بڑھاپے میں آپ کی خدمت کرسکے...... بغیر تنخواہ...... صرف روٹی کپڑے اور چھت کے عوض۔''

مشال نے تلخی سے کہا تو وہ دونوں ہنس پڑے اور نوشابہ سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''ہمارے گھر میں چار ملازم پہلے سے ہیں اور اگر تم چلوگی تو ایک ملازمہ صرف تمہارے لیے ہوگی۔ صرف تمہارے کام کرنے کے لیے۔ ہمیں ملازمہ کی نہیں، ایک بیٹی کی ضرورت ہے۔ تمہاری جیسی بیٹی کی۔'' نوشابہ نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور بھئی! میں تو بیٹی سے ایک پیالی چائے تو ضرور بنوا کر پیوں گا۔ اب تم چاہو تو اسے ملازمت سمجھ لو۔'' مسعود علی خان مسکرائے۔

''میں ہی کیوں آخر اور بہت بے سہارا لڑکیاں بھی تو ہیں۔'' مشال لگ رہا تھا ہارتی جارہی تھی۔

''ہاں لیکن ہمارا دل چاہتا ہے کہ تم ہی ہو۔ ہم تمہیں اپنانا چاہتے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ تم بھی ہمیں اپنالوگی۔''

''میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' مشال نے الجھتے ہوئے کہا تو نوشابہ نے جلدی سے ہاتھ اٹھایا۔

''کوئی بات نہیں۔ تم سوچ لو۔ جتنا وقت چاہتی ہو، لے لو۔ مجھے پوری امید ہے کہ جتنا بھی سوچ کر فیصلہ کرو، وہ ہمارے حق میں ہی ہوگا۔''

''ضروری تو نہیں ہے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''ضروری تو ہے میری جان! بہت ضروری ہے۔'' نوشابہ نے پیار سے اس کا کاندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

''ہم پھر آئیں گے۔ امید ہے ملنے سے انکار نہیں کروگی۔'' مسعود علی خان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ انہیں دیکھتی رہی۔

''نہیں۔ اب یہ انکار نہیں کرے گی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ اوکے، میں آؤں یا نہ آؤں، تم ان لوگوں سے ضرور ملنا۔ یہ باہر کی دنیا میں واحد تمہارے اپنے ہیں۔'' موی نے ہنستے ہوئے کہا پھر وہ تینوں خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے اور وہ سوچ میں گم واپس اپنی بیرک میں آگئی۔

☆☆☆

آج پھر وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ مسعود علی خان نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور ان دونوں میں سے کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر پڑھنا شروع کیا۔

''فیصل شاہان، عمر بتیس سال، بی کام، فاریسٹ آفیسر...... بدعنوانی کے باعث دوبار معطل کیا جاچکا ہے۔ جوڑ توڑ میں مہارت کے باعث پھر بحال ہوجاتا ہے۔ لڑکیوں، عورتوں کا شوقین ہے۔ کسی لڑکی کے ساتھ بداخلاقی کی شکایت پر پولیس کے جوتے بھی کھا چکا ہے۔ جنگل سے لکڑی چوری کروا کر پیسے بنانے میں ماہر ہے۔ دونوں بار اسی سبب معطل ہوا۔

''والد کا نام شاہان حسن، پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ والدہ گھر میں بچوں کو قرآن پڑھا کر اور سلائی کرکے گھر کا خرچ چلاتی تھیں۔ کچھ سال پہلے زلزلے سے ان کے گھر کی چھت گرگئی۔ وہ دونوں اس میں دب کر مرگئے۔

''فیصل شاہان سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ ٹرانسفر ہونے کے سبب سرکاری ڈاک بنگلے میں وقت گزارتا ہے۔ اپنا کوئی گھر یا ٹھکانا نہیں ہے لیکن رہتا ٹھاٹ باٹ سے ہے اور یہ سارا ٹھاٹ باٹ حرام کی کمائی سے ہے۔'' انہوں نے کاغذ موڑ کر واپس جیب میں رکھا۔

''تو یہ ہے تمہارے اس فیصل شاہان کا اسٹیٹس۔ کیا یہ ساری باتیں اس نے تمہیں بتائی ہیں اپنے بارے میں؟'' انہوں نے مناہل سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ سب جاننے کے بعد اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اب بھی اس سے شادی کرنا پسند کروگی؟'' نوشابہ نے پوچھا تو وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔

''مالی طور پر کسی کا اسٹیٹس کم ہونے سے کچھ اتنا خاص فرق نہیں پڑتا اگر بندے کا اسٹیٹس اخلاقی طور پر اچھا ہو لیکن یہاں تو صورت حال دونوں طرف سے مایوس کن ہے۔ تمہارے لیے یہ شخص بالکل اچھا نہیں ہے مناہل!''

''ہوسکتا ہے، اسے معلوم ہوگیا ہو کہ تم ایک بیورو کریٹ کی بیٹی ہو جو تھوڑی بہت بلکہ اچھی خاصی دولت و جائداد کا بھی مالک ہے اور تم اس کی اکلوتی وارث ہو۔ اس لیے وہ تمہیں شیشے میں اتار رہا ہو۔'' مسعود نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہ ایسا نہیں ہے۔'' مناہل کا جواب سن کر وہ دونوں

حیرت اور بے بسی سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ نوشابہ آزردہ ہوئیں اور مسعود علی خان غصے میں آ گئے۔ تاہم انہوں نے ضبط کیا۔

”ٹھیک ہے۔ پھر بھی کہوں گا کہ تم میری بتائی ہوئی باتوں پر غور کرو اور اسے کم از کم اتنا آزما لو کہ تم اس کے بارے میں صحیح فیصلہ کرسکو۔ کوئی بھی لڑکی اپنے شوہر کو دوسری لڑکیوں کے ساتھ گل چھرے اڑاتے دیکھ کر برداشت نہیں کرسکتی۔ کیا تم کرسکتی ہو؟ بقول تمہارے اسے تمہاری دولت سے کوئی سروکار نہیں ہے تو اسے کہہ کر دیکھنا کہ پاپا نے شادی کی اجازت تو دے دی ہے مگر وہ مجھے کچھ دیں گے اور نہ ہی بعد میں مجھ سے کوئی تعلق رکھیں گے۔ وہ یقیناً کنارہ کش ہوجائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنے کا فیصلہ نہیں کروگی۔“

مگر وہ عشق ہی کیا جو سر چڑھ کر نہ بولے۔ اس نے فیصل سے بات کی۔

”مجھے شریک حیات تمہارے جیسی چاہیے تھی اور اسی تلاش میں لڑکیوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ تھوڑا وقت ان کے ساتھ گزارتا تو اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ تمہاری جیسی نہیں تھیں۔ اس لیے چھوڑ دیتا تھا ان کی دوستی۔ اب تم مل گئی ہو تو کسی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں رہی کیونکہ منزل مل جانے کے بعد راستے کون تلاش کرتا ہے۔“

”لیکن پھر بھی...... پاپا کہتے ہیں کہ اگر میں نے تم سے شادی کی تو وہ مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔“ مناہل نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

”ارے شروع شروع میں سب غصے میں ایسے ہی کہتے ہیں۔ تھوڑے عرصے میں سب مان جاتے ہیں۔ وہ بھی مان جائیں گے۔ آخر تم ان کی اکلوتی بیٹی ہو۔“ فیصل نے اطمینان دلایا۔

”نہیں۔ پاپا بہت اصول پرست انسان ہیں۔ بے شک وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن جہاں بات اصول کی آجائے، ان پر وہ کبھی کوئی سمجھوتا نہیں کرتے۔ اگر میں نے ان کی مرضی کے خلاف تم سے شادی کی تو وہ واقعی مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لاتعلق ہوجائیں گے۔“

”میں ہوں نا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم دونوں مل کر انہیں منالیں گے۔“

”تو پھر تم انہیں ابھی منالو نا۔ تم ان سے مل کر انہیں راضی کرنے کی کوشش کرو نا پلیز!“ مناہل کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔

”اوکے۔ اوکے۔ اوکے۔ پریشان مت ہو۔ میں کوشش کروں گا۔ اب وہ بے شک مجھے گولی مار دیں، میں انہیں منا کر ہی دم لوں گا۔ ڈونٹ وری بے بی!“ فیصل نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے تسلی دی اور پھر ایک ملاقات کا وقت لے کر وہ ان سے ملنے آفس پہنچ گیا۔

☆☆☆

حویلی میں زندگی کب کی بیدار ہوچکی تھی۔ صبح کی نرم دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ برآمدہ بھی دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔

بختاں نے برآمدے میں چٹائی بچھادی تھی۔ دونوں بچوں کو اس پر بٹھا کر پراٹھا اور دودھ کا کٹورا ان کے سامنے رکھ دیا۔

”چلو پتر! ناشتا کرلو۔ آجاؤ۔“ اس نے شفقت بھرے لہجے میں انہیں مخاطب کیا تھا۔ وہ دونوں بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے اور بختاں ادھر ادھر پھیلی چیزیں اور بستر سمیٹ رہی تھی کہ چودھرانی کی آواز سنائی دی۔

”واہ بھئی! تیرے شہزادے شہزادی کی بڑی خدمتیں ہورہی ہیں۔ سر پر بٹھایا جارہا ہے۔ آسمان سے اترے ہیں یہ لاڈلے؟“

وہ طنز کے تیر برساتی ہوئی بختاں سے مخاطب تھی۔

”نہ جی! کون سی خدمتیں۔ بے سہارا بچے ہیں۔ چودھری صاحب نے حکم دیا ہے کہ ان کے روٹی پانی کا خیال رکھوں۔“

”ہاں تو روٹی پانی کا خیال رکھنے کو کہا ہے، عیش کروانے کو نہیں۔ دھوپ میں پلنگ ڈال میرا اور بھیج انہیں کہ میری مٹھی چاپی کریں۔“

بختاں ان کا حکم بجالائی۔ بچوں کو چودھرانی کے ہاتھ پاؤں دبانے کے لیے ان کے پاس چھوڑ کر وہ جھاڑو لگانے میں مصروف ہوگئی کہ اچانک ایک زوردار تھپڑ کی آواز آئی۔ پھر بچی کی چیخ اور چودھرانی کی مغلظات سنائی دیں۔

”دودھ پراٹھے ڈکار کے بھی ہاتھوں میں جان نہیں آئی۔ مٹھی چاپی کررہی ہے کہ احسان کررہی ہے۔ منحوس۔“ اس نے زوردار تھپڑ رسید کیا تھا، اس پانچ سال کی معصوم بچی کو جس سے وہ پلنگ سے نیچے گر گئی تھی اور چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ اس کا بھائی بے چین ہوکر اپنا کام چھوڑ کر پلنگ سے نیچے اترا اور اپنی بہن کو سنبھالنے لگا تو چودھرانی کے غصے کا گراف اور اوپر چلا گیا۔ اس نے ایک زوردار لات چلائی جو لڑکے کو لگی اور وہ بہن سمیت فرش پر لڑھکتا چلا گیا۔ اب

چودھرانی پلنگ سے نیچے اتر کر لاتوں ٹھڈوں سے ان کی بری طرح مرمت کررہی تھی۔ بختاں حواس باختہ کھڑی ان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ہمت نہیں تھی کہ وہ بچوں کو اس کے چنگل سے نکالے۔ ”بختاں! لے جا ان حرام کے پلوں کو یہاں سے۔ چودھری صاحب کے شوق کی پیداوار ہیں یہ۔ پتا نہیں کہاں کہاں منہ مارتے پھرتے ہیں وہ۔“ چودھرانی کے منہ سے یہ بات سن کر بختاں حیران رہ گئی۔ اس نے ایک لمحے میں ان بچوں کو چودھری کی ناجائز اولادیں قرار دے دیا تھا۔ اب ان بچوں کی بدنصیبی پر مہر لگ جانا یقینی تھا۔ بختاں افسوس سے سر ہلاتے ہوئے دونوں بچوں کو اٹھا کر وہاں سے لے گئی۔ پھر یہ چودھرانی کے مشق ستم کا اکثر شکار ہونے لگے۔ معصوم بچوں پر وہ حیوانی ظلم ہونے لگا کہ ان کے برداشت کی قوت جواب دینے لگی۔ چودھرانی کی غلط فہمی نے ان کی زندگی عذاب بنادی۔ آخرکار بختاں کو ان بچوں پر رحم آگیا۔ اس نے بچوں کو سمجھا بجھا کر دودھ والے کی گاڑی میں چھپا کر حویلی سے نکال دیا۔

”جاؤ بچو! اللہ بیلی۔ شاید باہر کی دنیا میں تمہیں جینے کا کوئی بہتر آسرا مل جائے۔ رب راکھا ہو تمہارا۔“ اس نے آزردگی سے انہیں رخصت کیا۔ چودھرانی کو بچوں کے فرار کی خبر ملی تو اس نے قیامت برپا کردی۔

”تیرا بیڑا غرق ہووے بختاں! دو بچوں کی خبر نہیں رکھ سکی۔ وہ حویلی میں نہیں ہیں تو باہر کیسے گئے۔ کون لے کر گیا انہیں؟ تجھے اچھی طرح پتا ہوگا۔ ان کے کسی ہوتے سوتے کا۔ بول۔ ورنہ تیری ٹانگ توڑ دوں گی۔“ چودھرانی کے تیور ٹھیک نہیں تھے۔

”قسم لے لو بی بی جی! مجھے نہیں پتا۔ وہ بچے کب اور کیسے نکل گئے۔ میں تو اپنے کاموں میں لگی تھی۔ جب دیر تک نظر نہیں آئے تو میں نے سوچا کہیں ادھر ہی کھیل میں لگے ہوں گے۔ وہ تو جی جب آپ نے بلایا تو میں نے ڈھونڈا انہیں۔ پر وہ تو پوری حویلی میں نہیں ہیں۔“

”بکواس نہ کر۔ لے کر آ انہیں ڈھونڈ کر۔ نہیں تو میں نے تیری ٹانگیں توڑ دینی ہیں بدبختے!“ چودھرانی کے چلانے پر اندر سے چودھری صاحب برآمد ہوئے۔

”کیا بات ہے؟ کیا شور مچایا ہوا ہے صبح صبح؟“ انہوں نے بیوی سے پوچھا۔

”لو جی! ہونا کیا ہے؟ ہر کسی کو گھر میں گھسا لیتے ہو۔ تمہارے بھیجے ہوئے ان دو سنپولیوں نے ڈس لیا مجھے۔ میرے سونے کے بھاری کنگن اڑا کر لے گئے۔ میرے بھائی کا تحفہ تھے وہ۔ نکے کی پیدائش پر اس نے دیے تھے مجھے۔ میں نہیں جانتی چودھری جی! مجھے میرے کنگن چاہئیں اور وہ دونوں مینے جیل میں جائیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔“ چودھرانی بری طرح بھڑکی ہوئی تھیں۔

”او بس کر نیک بختے! او معصوم بچے تیرے کنگن کیوں چوری کریں گے۔ وہ تو شاید یہ بھی نہیں جانتے ہوں کہ سونا کوئی قیمتی چیز ہوتی ہے۔ تو آپ کہیں رکھ کر بھول گئی ہوگی۔ اچھی طرح ڈھونڈ ادھر ہی مل جائیں گے۔“ چودھری جی نے ایک معقول بات کہی جس نے بیوی کا غصہ اور بھڑکا دیا۔

”ہاں جی! آپ تو بولو گے ہی۔ آپ نے تو طرفداری کرنا ہی ہے ان کی۔ پر میں بتادوں چودھری جی! میں اپنے بچے پال لوں بہت ہے۔ میں کسی کی ناجائز اولاد نہیں پال سکتی۔ اب آپ کچھ نہ بولنا۔ اب جو کچھ کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔“

چودھری بیوی کی بات سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ غصے کی ایک شدید لہر نے انہیں جھلسا دیا لیکن پھر انہیں اپنے غصے پر قابو پانا پڑا کیونکہ یہی وقت کا تقاضا تھا۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے باہر چلے گئے۔

چودھرانی نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ اپنے بھائی کے ذریعے وہ پولیس کو حرکت میں لائیں۔ بچوں کے خلاف سونے کے کنگن چوری کرنے کی ایف آئی آر درج کروائی اور ان کو جلد تلاش کروالیا۔

پولیس کو وہ ایک سڑک کے کنارے ہوٹل کے ساتھ فٹ پاتھ پر بیٹھے روتے ہوئے ملے۔ پولیس نے پکڑا تو دونوں خوفزدہ ہوگئے۔ انہیں پولیس اسٹیشن لایا گیا۔

”تم دونوں نے کنگن چوری کیے ہیں؟“ ایس ایچ او نے پوچھا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”کنگن کیا ہوتا ہے؟“ لڑکے نے سوال کیا تو ایس ایچ او نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”بتاؤ! جن کو یہ نہیں معلوم کہ کنگن کس بلا کا نام ہے، ان پر اس کی چوری ڈالی جارہی ہے۔ واہ اوپر والے! کیسے کیسے لوگ بنائے ہیں تو نے جو معصوم بچوں پر بھی رحم نہیں کھاتے۔ چل بھئی خدا بخش! لکھ رپورٹ۔“ ایس ایچ او نے کہا۔

”سر جی! کیا واقعی ان پر چوری کی رپورٹ لکھوں؟“

”لکھنا تو پڑے گی مگر مجھ سے بیر تو نہیں پال سکتے نا۔ لکھ اور انہیں حوالات میں ڈال۔ روٹی پانی کو پوچھ لینا۔ مجھے تو بہت بھوکے پیاسے لگ رہے ہیں بچارے۔“ ایس

ایچ او نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی عرصے میں ایک پیشی پر ان کا فیصلہ ہوا اور دونوں کو جووینائل جیل میں بھیج دیا گیا۔ بچے کو لڑکوں والے حصے میں اور بچی کو لڑکیوں والے حصے میں پہنچا دیا گیا۔ دونوں الگ ہونے پر تیار نہیں تھے لیکن جیل کا قانون تھا۔ دونوں روتے چیختے بچے، بہن بھائی الگ الگ ہو گئے اور پھر کبھی ایک دوسرے سے مل نہیں پائے۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ معصوم بچے بڑے ہوتے گئے اور ایک وقت آ گیا کہ اب ان کی جگہ جووینائل کے بجائے بڑی جیل میں ہو گئی اور وہ معصوم بچی اب اپنے بھائی کے خدوخال بھی بھول کر اپنے حالات سے سمجھوتا کر چکی تھی کہ اس کی دنیا وہی تھی۔

☆☆☆

دروازہ انگلی سے ناک کر کے وہ ان کے شاندار آفس میں داخل ہوا تو پیچھے بند ہونے والا شیشے کا دروازہ خودکار طریقے پر جھنجھنا کر بند ہو گیا۔

اس کی آواز پر انہوں نے سر اٹھا کر ناگواری سے آنے والے کی طرف دیکھا۔ گہرے نیلے سوٹ میں وہ سرخ وسپید ہونے کے باوجود آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے ناپسندیدہ تھا۔

''فیصل شاہان!'' آنے والے نے اپنا تعارف کروایا تو انہوں نے سنجیدگی سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

''میری بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' انہوں نے براہِ راست اس سے سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیوں؟'' دوسرا سوال تھا۔

''کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہوں! اس سے پہلے اور کتنی لڑکیوں کو چاہ چکے ہو؟''

''کسی کو نہیں۔ یہ پہلی اور آخری محبت ہے۔''

''اچھا.....'' انہوں نے ٹیبل کی دراز کھول کر ایک پتلی سے فائل نکالی اور کھول کر ایک صفحے پر انگلی رکھی۔

''شہلا جو ایک اسکول ٹیچر تھی، پہلی محبت۔ روزینہ جو کسی بڑے سرکاری افسر کی سیکریٹری تھی، دوسری محبت۔ پھر شمائل، صدف، نورین۔ ایک ہی وقت میں تین محبتیں اور آج کل صوفیہ صاحبہ، حرا اور صنم۔ ایک ساتھ ان چاروں سے چوتھی محبت چل رہی ہے لیکن میری بیٹی سے پہلی اور آخری محبت ہے۔ یہ حساب کتاب مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کچھ سمجھائیں گے کہ یہ کیا چکر ہے؟''

انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو فیصل شاہان نے پیشانی پر نمی محسوس کی لیکن اعتماد میں کمی نہیں آنے دی۔ ''جو نام آپ لے رہے ہیں، میں ان سے کبھی واقف نہیں رہا۔ یہ محض الزام تراشی ہے مجھ پر۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''اچھا۔ پھر یہ چند تصاویر بھی ہیں۔ اگر کہیں تو ایک ایک کر کے پیش کروں؟'' انہوں نے ایک تصویر اس کے سامنے ڈالی جس میں وہ کسی لڑکی کے ساتھ خاصا نزدیک نظر آ رہا تھا۔ اب وہ سچ مچ پریشان سا ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ انہوں نے اچھا خاصا ہوم ورک کیا ہوا ہے اس پر۔

''دیکھیے! یہ سب تو لڑکوں کی لائف میں چلتا ہی رہتا ہے لیکن شادی تو ہر ایک سے نہیں ہوتی نا۔ وہ تو کوئی ایک ہی ہوتی ہے اور میری زندگی مناہل کے ساتھ لکھی جا چکی ہے۔''

''ہاں آں آں۔ شادی تو یقیناً ایک سے ہوتی ہے لیکن فلرٹ کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ وہ ایک بیچاری گھر میں سڑتی رہتی ہے۔ وفا نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے یا نہیں؟'' انہوں نے تپ کر کہا۔

''بیوی کو جو مقام ملتا ہے، وہ کسی اور کو نہیں دیا جاتا ہے پھر کیا پریشانی ہے آپ کو؟''

''اچھا۔ شادی کے بعد بھی لڑکیوں سے دوستیاں چلتی رہیں۔ یہ بات بیوی کو اچھی لگ سکتی ہے، یا نہیں۔ یہ میں پوچھ لیتا ہوں مناہل سے۔''

انہوں نے فون اٹھایا ہی تھا کہ وہ تیز آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ کبھی نہیں مانیں گے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ میں مالی حیثیت میں آپ کے برابر نہیں ہوں لیکن مناہل اس فرق کو نہیں مانتی۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، وہ مجھ سے ہی شادی کرے گی اور اس سے شادی کرنے کے بعد اور آپ کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد آپ کا سب کچھ مناہل کا ہوگا اور پھر مناہل کا سب کچھ میرا ہوگا۔ مٹ جائے گا یہ فرق۔'' اس نے لفظ چبا چبا کر کہا۔

''کاش، صرف مالی حیثیت کا فرق ہوتا مگر...... تم تو ہر لحاظ سے کنگال ہو۔ اخلاقی اعتبار، معاشرتی اعتبار سے اور ہر اعتبار سے بھی۔ تمہاری حیثیت ایسی نہیں ہے کہ تم ہماری برابری کر سکو۔ تم نے ایک کم عمر لڑکی کو اس کی ناسمجھی کے سبب بے وقوف بنا لیا ہے لیکن مجھے بے وقوف بنانا کم از کم

تمہارے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ یہ کوشش ترک کر دو۔'' انہوں نے غصے سے جواب دیا۔

''مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مناہل خود کرے گی یہ کام۔ وہ مجھ سے ہر صورت شادی کرے گی۔ آپ کتنا ہی کوشش کرلیں، روک نہیں سکیں گے اسے آپ۔'' اس نے چیلنج دیا۔

''ٹھیک ہے۔ مناہل تم سے شادی کرے گی تو اسے مجھ سے کچھ نہیں ملے گا اور تمہیں بھی صرف وہی ملے گی اور شاید یہ تمہارے لیے گھاٹے کا سودا ہوگا۔'' انہوں نے دھمکی دی تو وہ چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔

''آپ نے کتنے دن رہنا ہے۔ آخر کار دنیا سے جانا ہی ہے۔ تو بس! اتنا ہی انتظار کرنا ہوگا مجھے۔ ناٹ بیڈ۔''

''گیٹ آؤٹ یو باسٹرڈ...... آؤٹ!'' وہ بھنا کر چلائے تو بھی وہ بڑے اطمینان سے اٹھا۔ ایک کمینی مسکراہٹ آنکھوں میں سجائے انہیں دیکھتا ہوا دروازے کی طرف مڑا۔ چپراسی جو صاحب کی آواز سن کر اندر آرہا تھا، وہ اس کے پاس ایک لمحے کو رکا۔

''صاحب کو ٹھنڈا پانی پلاؤ۔'' اس نے چپراسی سے کہا اور دروازہ کھول کر نکل گیا۔ وہ بیٹھے غصے میں کھولتے رہے۔ وہ صاف ان کے منہ پر کہہ گیا کہ اسے ان کی دولت جائداد چاہیے اور مناہل بے وقوف یہ سمجھ ہی نہیں رہی ہے۔

رات بیوی اور بیٹی کے سامنے انہوں نے اس سے ہونے والی ساری گفتگو دہرائی تو نوشابہ تو دہل کر رہ گئیں لیکن مناہل چہرے پر بغیر کسی تاثر کے خاموش بیٹھی رہی۔ جیسے اسے اندازہ تھا کہ یہ ملاقات اسی طرح ہوگی۔

''نوشابہ! وہ آدمی انتہائی کمینہ ہے۔ لالچی اور بداخلاق۔ مناہل اگر اس سے شادی کرے گی تو اس کے ساتھ اس کی زندگی کانٹوں کا سفر ہوگی۔ سخت عذاب میں کاٹے گی یہ سفر۔ یہ بات اسے اچھی طرح سمجھا دو کہ اگر اس نے اس بے ہودہ انسان سے شادی کرنا ہے تو پھر مجھ سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہ رکھے۔ نہ ہی میں اسے کچھ دوں گا۔ خالی ہاتھ جائے گی یہ اس گھر سے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔'' وہ انتہائی غصے سے یہ کہہ کر اٹھ گئے۔

''مناہل! بیٹا اچھی طرح سوچ لے۔ تیرے پاپا اپنی بات کے پکے ہیں۔ انہوں نے جو کہہ دیا وہی کریں گے اور وہ لڑکا تجھ سے تیرے پاپا کی دولت جائداد کی خاطر ہی شادی کر رہا ہے۔ محبت کا صرف دھوکا دے رہا ہے۔ مت آ اس دھوکے میں مناہل۔ عقل سے کام لے۔''

نوشابہ نے بڑی دردمندی سے سمجھانے کی کوشش کی جسے وہ خاموشی سے سنتی رہی اور پھر اسی خاموشی سے اس نے ایک دن گھر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

میمونہ عرف موی آج پھر اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''مشال! وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں مکمل معلومات کروائی ہیں۔ وہ ایک بیوروکریٹ ہیں۔ ساری زندگی انہوں نے ایک شاندار سرکاری ملازمت کی ہے۔ ان کی بیوی بھی پی ایچ ڈی ہیں۔ یونیورسٹی میں پڑھاتی رہی ہیں۔ اب دونوں ریٹائرڈ ہیں۔ روپے پیسے کی فراوانی ہے۔ بہت شاندار گھر میں رہتے ہیں۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی جو اب نہیں رہی۔ اس سے وہ دونوں بہت محبت کرتے تھے۔ اسی لیے وہ تم میں اپنی بیٹی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ تم اتنے اچھے لوگوں کو انکار کیوں کر رہی ہو، میں سمجھ نہیں پارہی۔'' موی نے پھر اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''مجھے کسی پر بھروسا نہیں ہے۔ ہر انسان اپنی کسی غرض کا بندہ ہوتا ہے۔ بلاوجہ کوئی کسی کو سلام نہیں کرتا تو یہ بغیر کسی وجہ کے مجھ ایسی لڑکی کو اپنے گھر میں رکھنا چاہتے ہیں...... یہ بات میرے حلق سے اتر نہیں رہی ہے۔'' مشال نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ان کی بھی غرض ہے نا۔ انہیں ایک بیٹی چاہیے۔ اس کی محبت چاہیے تو اس غرض میں برا کیا ہے؟''

''پتا نہیں لیکن بس، میرا دل نہیں مانتا۔''

''ایسا کرو، تھوڑے دن کے لیے چلی جاؤ۔ اگر مطمئن نہ ہو تو واپس آجانا۔ جیل سے باہر جانا مشکل ہوتا ہے۔ جیل کے اندر آنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' موی نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے اور وہ شرط میں انہی کو بتاؤں گی۔''

''ہاں ضرور! میں دو چار دن میں انہیں لے کر آتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اتنے خوش ہوں گے کہ تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہو جائیں گے۔ ٹھیک! اب میں چلتی ہوں۔ دو چار دن میں آؤں گی۔ خدا حافظ۔''

☆☆☆

وہ مٹھائی کے چار بڑے بڑے ٹوکرے لے کر گئے تھے۔ بہت خوش تھے کہ آج وہ اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جارہے تھے۔

کل جیلر صفیہ شاہنواز نے فون پر انہیں خوشخبری سنائی تھی کہ وہ ان کے ساتھ جانے پر راضی ہوگئی ہے اور میں نے اس کے تمام ضروری کاغذات تیار کروا لیے ہیں۔ آپ آکر لے جائیں اور وہ فوراً ہی تیار ہو گئے۔

''نوشابہ! اس کے لیے کمرا تیار کروالو۔ اس کی ضرورت کی تمام چیزیں وہاں رکھوا دو۔ اگر کسی چیز کی کمی ہے تو چلو! ہم بازار سے لے آتے ہیں۔'' مسعود نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''میں نے مناہل والا کمرا ہی ٹھیک کروا دیا ہے۔ وہی سب سے اچھا ہے اور فی الحال تو کچھ نہیں چاہیے۔ بعد میں ضرورت ہوئی تو اسے ساتھ لے جا کر لے آئیں گے۔'' وہ بھی بالکل اس طرح خوش تھیں جیسے مناہل آرہی ہو۔

صبح سے گیارہ بجنے مشکل ہوگئے تھے کیونکہ صفیہ نے انہیں ساڑھے گیارہ بجے کا ٹائم دیا تھا۔ خدا خدا کرکے وہ وقت آیا کہ وہ وزیٹر روم میں بیٹھے تھے۔ دس منٹ بعد ہی وہ آگئی۔ نوشابہ نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔

''میں نے کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔'' مشال نے سنجیدگی سے کہا تو مسعود مسکرائے۔

''ہاں بیٹی! ہمیں تمہاری ہر شرط منظور ہے...... کہو۔''

''مجھے اپنا بھائی بھی چاہیے۔ ہمارے بچپن میں ہمیں الگ الگ جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ پھر کبھی مجھ سے نہیں ملا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے لیکن مجھے ہر صورت اپنا بھائی چاہیے اور اس کو آپ تلاش کریں گے۔ اگر آپ میرے بھائی کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے تو میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ ورنہ میں اس جیل میں ہی ٹھیک ہوں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں اپنی شرط بیان کی۔

''فکر نہ کرو۔ میں اسے ڈھونڈنے کی پوری کوشش کروں گا۔ مل جائے گا وہ انشاءاللہ۔''

''کوشش نہیں کرنا ہے، اسے ڈھونڈنا ہے۔ ہر صورت۔ اگر آپ اسے ڈھونڈنے میں ناکام ہوگئے تو مجھے خود اس جیل میں چھوڑ کر جائیں گے۔ یہ وعدہ کرنا پڑے گا۔''

اس کی بات میں کچھ ایسا تھا کہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے پھر مسعود علی خان گویا ہوئے۔

''دیکھو بیٹا! ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ حتیٰ کہ نام اور شکل وصورت سے بھی ناواقف ہیں اور پھر ایک عرصہ ہو گیا ہے اسے تم سے بچھڑے ہوئے لیکن پھر بھی میں وعدہ کر رہا ہوں۔ میں اسے ڈھونڈنے کی پوری کوشش کروں گا اور امید ہے کہ میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔''

پھر وہ جیل میں ایک ایک سے مل کر اس طرح رخصت ہوئی جیسے کوئی بیٹی سسرال کے لیے رخصت ہوتی ہے۔ جیل میں اس کی ساتھی قیدی عورتیں، عملے کی عورتیں اور عہدیدار سب خوشی خوشی اسے دعاؤں سے رخصت کر رہی تھیں۔

آخری بات صفیہ شاہنواز نے کہی۔

''جیل کوئی اچھی جگہ نہیں ہوتی۔ قسمت نے تمہیں ایک اچھا موقع دیا ہے۔ جو گھر تمہیں ملا ہے، وہاں سے تمہیں محبت، عزت اور اعتبار ملے گا۔ اس کی قدر کرنا اور آئندہ کبھی یہاں نہ آنا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے گلے لگا کر اسے رخصت کیا۔

مسعود علی خان کی شاندار گاڑی اسے لے کر گھر جارہی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار ایسی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ باہر شدت کی گرمی اور تیز دھوپ نے جھلسایا ہوا تھا لیکن گاڑی کے اندر ائر فریشنر کی خوشبو کے ساتھ ٹھنڈ گلاسوں کے سبب نیم تاریک ماحول نے آسودگی بکھیر رکھی تھی۔ اس کی خنکی روح تک میں ٹھنڈک بن کر اتر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے تیزی سے گزرتے باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی اور انجانی سوچوں میں گم تھی۔

☆☆☆

''فیصل! ہم کب تک یوں دربدر ایک سے دوسرے ڈاک بنگلوں میں گھومتے رہیں گے۔ ہمارا اپنا بھی تو ایک گھر ہونا چاہیے نا۔''

مناہل نے کہا تو فیصل نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''ہاں۔ ہونا تو چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے پاپا کو جلد سے جلد منالو۔'' اس نے کہا تو مناہل نے چونک کر اسے دیکھا۔

''پاپا کو منالوں؟ کیا مطلب ہے فیصل؟ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جس طرح میں اس گھر سے نکلی ہوں، ان کی عزت پامال کر کے...... اس کے بعد وہ میری شکل دیکھنا تو دور کی بات ہے، میرا نام بھی سننا گوارا نہیں کریں گے۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''یہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ بھول جاؤ کہ ہم کبھی اپنا گھر بنا سکیں گے۔ میری آمدنی کا تمہیں پتا ہے۔ اس میں مہینے بھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا تو مکان بنانا تو دور کی بات ہے۔ کرائے کا مکان بھی نہیں لیا جاسکتا اس لیے مجبوری ہے۔ ڈاک بنگلوں میں ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔''

فیصل نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن فیصل! کب تک؟ کچھ عرصے میں ہمارے ہاں ایک اور فرد کا اضافہ ہو جائے گا۔ بچے کے ساتھ ہم کیسے......؟''

وہ بول رہی تھی کہ فیصل چلّایا۔

''ایک تو یہ اور نئی مصیبت وارد ہونے جا رہی ہے۔ مجھے نہیں چاہیے تھے بچے۔'' اس کی بات سن کر مناہل حیرت سے اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ مصیبت؟ یہ ہمارا بچہ ہے فیصل۔ مصیبت نہیں ہے۔''

''شٹ اپ۔ مجھے نہیں معلوم۔ بس کچھ بھی ہو، تمہیں اپنے ماں باپ کو منانا ہی پڑے گا۔ اگر تم انہیں راضی نہ کر سکیں تو میرے تو سارے خواب مٹی میں مل جائیں گے۔ جیسے بھی ہو، ان سے رابطہ کرو۔ انہیں مناؤ۔ ورنہ تم ناقابلِ بیان مصیبت میں آجاؤ گی۔''

فیصل کی بات سن کر مناہل اندر سے لرز کر رہ گئی۔

''اس کا مطلب ہے، پاپا ٹھیک کہتے تھے۔ تمہیں پاپا کی دولت اور جائداد چاہیے تھی۔ اسے نکال کر صرف میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ تم نے محبت کے نام پر صرف مجھے بے وقوف بنایا۔'' اس کے ہونٹوں سے الفاظ سرسراتے ہوئے نکلے۔

''زیادہ فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس پر غور کرو۔ تم اور تمہاری اولاد اچھی زندگی کے حقدار ہیں۔ وہ زندگی کی آسائشوں سے بہرہ ور ہوں۔ یہ حق چھیننے والے تمہارے پاپا کون ہوتے ہیں۔ تم ان کی اکلوتی وارث ہو۔ آخر کار سب کچھ تمہارا ہے۔ تو تم ان کے مرنے تک کا انتظار کیوں کرو۔ جو کچھ کل ملنا ہے، وہ آج مل جائے تو کیا برا ہے۔'' فیصل چلّایا تو وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت طاری تھی۔ آج اس کو اپنے پاپا سو فیصد درست لگ رہے تھے۔ انہوں نے صحیح پہچانا تھا فیصل کو۔ آج وہ کھل کر سامنے آگیا تھا۔ اس کے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ یہ اس کا وہ مان تھا کہ فیصل صرف اس سے محبت کرتا ہے۔ آج وہ مان ٹوٹ گیا تو وہ اندر سے زخم زخم ہو رہی تھی۔

پھر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ کبھی فیصل سے کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ یہ ہمت تو اس میں تھی ہی نہیں کہ وہ پاپا سے معافی مانگنے کی کوشش کرتی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ان کا مان، ان کا غرور خاک میں ملا کر اور جس طرح ان کی عزت کو بٹا لگا کر گھر سے نکلی تھی، اب کبھی اس کی واپسی نہیں ہو سکتی اور خود اس کا ضمیر بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے اب جیسا بھی ہے اسے ایسے ہی گزارہ کرنا تھا۔

پھر ان کی زندگی میں عالیان آگیا۔ اس کا ننھا سا پیارا سا بیٹا عالیان۔ اس کی زندگی کا رخ بدل گیا۔ اب اس کی ساری دلچسپیوں کا مرکز عالیان کی ذات تھی۔ وہ فیصل کی کج ادائیوں سے بیزار ہو کر بیٹے کی ذات کو اپنی زندگی کا محور و مرکز بنا کر خوش تھی۔ زندگی تلخ و شیریں تجربات کے ملے جلے احساسات کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ عالیان کی دوسری سالگرہ تھی۔ اس نے خود ایک اچھا سا کیک بنایا اور کچھ غباروں سے سجاوٹ کر کے اہتمام کیا تھا۔ اب فیصل کا انتظار تھا۔ وہ شام تک آجاتا تھا لیکن اب تو شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ پھر رات کو تقریباً دس بجے فون کی گھنٹی بجی۔

فیصل کے دوست کا فون تھا۔

''بھابی! فیصل کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ آفس سے ہی اٹھالیا تھا اسے۔ شاید آپ کو اطلاع بھی نہیں ہو گی اسی لیے میں نے فون کیا ہے۔''

مناہل یہ سن کر لرز اٹھی۔

''مگر ریاض بھائی! فیصل نے کیا کیا ہے؟ پولیس نے کیوں اٹھایا ہے؟''

''بھابی!...... وہ...... کچھ...... کرپشن کا معاملہ ہے۔ مجھے ٹھیک سے تو کچھ پتا نہیں لیکن اس کے آفس کا دوست بتا رہا تھا کہ کئی دنوں سے نیب کی تحقیقات چل رہی تھیں اس کے خلاف۔ اب نیب کی سفارش پر ہی اسے گرفتار کیا گیا ہے۔'' ریاض نے بتایا۔

''ریاض بھائی پلیز! ان کے بارے میں ٹھیک سے پتا کریں، کہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے، کس تھانے میں اور ان کی ضمانت......''

مناہل سے پھر کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ آنسوؤں نے گلے میں پھندا ڈال دیا۔ ''فکر نہ کریں بھابی! میں صبح پتا کرتا ہوں۔ ضمانت وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ انتظام کرتا ہوں۔ بشرطیکہ ہو سکے۔ آپ پریشان نہ ہوں، اللہ بہتر کرے گا۔'' ریاض نے اسے تسلی دے کر فون بند کر دیا اور وہ آنے والے دنوں کے مہیب سایوں سے ڈرتی رہی، روتی رہی...... یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

ریاض اور اس کے کچھ اور دوستوں نے مل کر بہت کوششیں کیں، تب کہیں جا کر اس کی ضمانت تو ہو گئی لیکن کیس چل رہا تھا اور جلدی جلدی تاریخیں مل رہی تھیں۔ کورٹ میں سماعت تیزی سے ہو رہی تھی اور ہر سماعت پر

اسے کورٹ جانا پڑتا تھا۔ اسے نوکری سے معطل کر دیا گیا تھا اس لیے گھر میں ہی پڑا رہتا۔ اس کے چڑچڑے پن اور بدمزاجی نے مناہل کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ وہ ان دنوں زندگی کا مشکل ترین عذاب جھیل رہی تھی۔ عالیان چھوٹا تھا اور اب دوسرے بچے کی آمد آمد تھی۔ فیصل کی نوکری ختم ہو چکی تھی۔ اس پر مقدمہ چل رہا تھا اور مالی معاملات دن بدن دگرگوں ہوتے چلے جا رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی۔ اللہ سے معافی طلب کر رہی تھی کہ اس نے والدین کی نافرمانی کر کے اور ان کا دل دکھا کر جو گناہ کیا ہے، وہ معاف کر دے۔ وہ دنیا میں اس کا جو عذاب بھگت رہی ہے، وہی ناقابلِ برداشت ہے تو آخرت میں تو نہ جانے کیا ہو گا۔ یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ معاف کر دے۔

☆☆☆

گاڑی ایک شاندار گھر کے پورچ میں آکر رکی۔ ڈرائیور نے اتر کر دروازہ کھولا اور وہ ان دونوں کی معیت میں نیچے اتر آئی۔ پورچ سے آگے ایک بڑا اور خوب صورت لان تھا جس میں رنگ برنگے موسمی پھول اور پودے اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ وہ اندر آگئے۔

''آؤ بیٹا! ہم تمہیں تمہارا کمرا دکھاتے ہیں۔ تم فریش ہو جاؤ۔ پھر ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔'' نوشابہ اسے ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھتی چلی گئیں۔

بہت خوب صورت کمرا تھا۔ بڑی سی شیشوں والی کھڑکی کے پردے سمٹے ہوئے تھے اور باہر لان کا منظر خوب صورت نظر آ رہا تھا۔

''اس میں تمہارے کپڑے ہیں۔ کوئی سا بھی سوٹ پہن لینا اور نیچے آجانا۔ میں کھانا لگوا رہی ہوں۔ او کے۔'' انہوں نے الماری کھلی چھوڑی اور کمرے کا دروازہ بھیڑتی ہوئی نیچے چلی گئیں۔

سب کچھ بہت اچھا تھا۔ اسے اتنا کچھ مل گیا تھا کہ جیل کی زندگی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک شاہانہ طرزِ زندگی کے ساتھ ساتھ بے حد محبت کرنے والے لوگ بھی تھے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سے جڑے رشتے کو کیا نام دے؟ ماں باپ وہ لگتے نہیں تھے۔ دادا دادی یا پھر نانا نانی؟

پھر یہ مشکل انہوں نے خود ہی آسان کر دی۔

''ہمارا کوئی بیٹا تو تھا نہیں کہ اس کی اولاد ہمیں دادا دادی کہتی۔ ہماری صرف ایک بیٹی تھی۔ وہ نہ رہی مگر ہم تم سے رشتہ اسی کے حوالے سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ تم ہمیں نانو اور نانا جی کہہ سکتی ہو۔ امید ہے تمہیں بھی اچھا لگے گا۔'' نوشابہ نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایک دن اس نے مسعود علی خان کو اپنی شرط یاد دلائی۔

''نانا جی! آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا ہوا ہے۔ کیا وہ آپ کو یاد ہے ابھی تک؟''

''بالکل یاد ہے بیٹا! میں نے کوششیں شروع کر دی ہیں۔ کچھ دن پہلے میں گیا تھا جوینائل جیل میں۔ عالیان نام بتایا تھا نا تم نے اپنے بھائی کا۔ ہاں! پہلے تو اجازت بڑی مشکل سے ملی پھر جیل کا عملہ اتنا پرانا کیس ادھیڑنے میں آنا کانی کر رہا تھا۔ بہت سارا ریکارڈ کھنگالنا اتنا آسان نہیں ہے۔ خیر، میں نے راضی کر لیا۔ اب وہ تلاش کر رہے ہیں۔ میں ان سے رابطے میں ہوں۔ ہر دوسرے تیسرے دن خیر خبر لیتا رہتا ہوں۔ انشاء اللہ جلد مل جائے گا اس کا پتا نشان۔ تم فکر نہ کرو۔''

''اچھا یہ بتاؤ، تم نے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے یا نہیں؟'' نوشابہ نے پوچھا۔

''جی، میں نے پچھلے سال میٹرک کا امتحان دیا تھا اور اے گریڈ میں پاس بھی ہو گئی تھی۔'' مشال نے بتایا تو وہ دونوں خوشگوار حیرت میں آگئے۔

''اچھا...... ارے واہ! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہماری بیٹی اے ون گریڈ کی طالبہ ہے۔ اس کا مطلب ہے شوق سے اور دل لگا کر پڑھتی ہو۔'' مسعود نے خوش ہو کر کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''پھر اب کیا پروگرام ہے، آگے پڑھنا چاہتی ہو یا بس اتنا کافی ہے؟'' نوشابہ نے پوچھا۔

''میری خواہش تو ہے کہ میں بہت سا پڑھوں۔ بہت آگے تک جاؤں۔ میں نے جیل سے اپنے لیے فرسٹ ایئر کا داخلہ بھی بھجوایا ہوا ہے۔''

''اوہ...... ماشاء اللہ! بچے اب تم ایک بہترین کالج میں پڑھو گی۔ نئے سیشن کے لیے داخلے شروع ہو گئے ہیں۔ ہم کل چلیں گے اور جو کالج تمہیں اچھا لگے گا، وہاں ہم تمہارا ایڈمیشن کروا دیں گے۔ خوب پڑھنا دل لگا کر شوق سے۔'' مسعود نے خوش ہو کر کہا۔

''مستقبل میں کیا کرنا چاہتی ہو؟ ابھی سے سوچ کر چلنا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' نوشابہ نے بھی پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

☆☆☆

''ہمارے ریکارڈ کے مطابق پچھلے سال فروری میں وہ

رہا ہو گیا تھا۔ اب رہا ہونے کے بعد وہ کہاں گیا، اس بارے میں ہمارا ریکارڈ بالکل خاموش ہے۔'' جیلر نے رجسٹر بند کرتے ہوئے مسعود علی خان کو معلومات فراہم کیں۔

''اچھا جیلر صاحب! ایک فیور کر سکتے ہیں آپ میرا۔ آپ کے رجسٹر میں اس کے ریکارڈ میں اس کی تصویر تو ہو گی۔ کیا آپ مجھے دکھا سکتے ہیں؟''

''ہاں جی! کیوں نہیں۔ یہ دیکھیں۔'' جیلر نے رجسٹر کھول کر گھما کر ان کی طرف کر دیا۔ وہ ایک گورا چٹا خوش شکل نوجوان تھا لیکن حالات کی سختی اس کے چہرے سے صاف عیاں تھی۔

''ہوں...... دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بہت ملتے ہیں۔ جیلر صاحب! اس کی بہن میری نواسی ہے۔ وہ اپنے بھائی کی شکل بھی اب تو بھول چکی ہے۔ بچپن سے بچھڑے ہوئے ہیں۔ میں اس کی ایک تصویر لے لوں اگر آپ کی اجازت ہو؟'' مسعود نے پوچھا۔

''تصویر تو آپ شوق سے لے لیں۔ پر اگر اس کی بہن آپ کی نواسی ہے تو یہ بھی تو نواسا ہوا نا۔'' جیلر نے چونک کر پوچھا۔

''بالکل ہے۔ اسی لیے تو اس کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ نواسی نے شرط لگا دی ہے کہ اس کے بھائی کو میں ڈھونڈ کر لاؤں۔'' انہوں نے سیل فون سے تصویر لیتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا! تو یہ وہ کیس ہے جو آپ نے اس لڑکی کو گود لیا ہے۔ وہ جو جیل سے باہر جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔'' جیلر نے پوچھا۔

''آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔'' مسعود علی خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہو۔ اچھا جی! تو یہ وہ کیس ہے۔ آپ تو بڑی نیکی کا کام کر رہے ہیں سر جی! میں نے سنی تھی ان بہن بھائی کی کہانی۔ بڑا ظلم ہوا تھا ان پر۔ شکر ہے قدرت کو ان پر رحم آ گیا اور آپ جیسے انسان کے دل میں ان کے لیے رحم ڈال دیا۔'' جیلر نے تحسین آمیز نظروں سے انہیں دیکھا۔

''رحم نہیں محبت جیلر صاحب! محبت۔ یہ رحم کے نہیں، محبت کیے جانے کے قابل بچے ہیں۔''

''او خیر ہو آپ کی۔ میں اس سلسلے میں آپ کو ایک ٹپ دیتا ہوں۔ وہ لڑکا یہاں بیرک میں جن لوگوں کے ساتھ رہتا تھا، ان کو ضرور پتا ہو گا کہ وہ رہا ہو کر کہاں گیا ہے۔ اگر آپ ان سے پوچھ سکیں تو شاید معلوم ہی ہو جائے۔''

''میں ضرور پوچھنا چاہوں گا اور اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' مسعود علی خان نے پوچھا تو جیلر نے انہیں کانسٹیبل رب نواز کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

''اوئے چلو اوئے! جگہ بناؤ۔ آج ایک بندے کی طرف سے خاص کھانا ہے تم لوگوں کے لیے۔ لے آ بھئی۔ کھانا لگا ادھر۔''

''کیوں بھئی! آج جیل میں دال پانی اور روٹی چھتر نہیں پکے کیا؟'' ایک قیدی نے رب نواز کو چھیڑا۔

''اوئے قسمت سے کچھ اچھا نصیب ہو رہا ہے۔ تو شکر کر کے کھا۔ میزبان بھی تمہارے ساتھ ہی کھائے گا۔'' دوسرے کانسٹیبل نے کھانے کے ڈبے لا کر رکھنا شروع کیے تو اس سیل کی فضا بریانی اور قورمے کی خوشبو سے مہک اٹھی۔

''عالیان آپ لوگوں کے ساتھ رہا ہے نا؟ وہی لڑکا جو پچھلی فروری میں یہاں سے رہا ہو کر چلا گیا۔'' مسعود علی ان کے ساتھ ہی فرش پر بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔

''ہاں صاحب! ہمارے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔'' ایک نے جواب دیا۔

''آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ جیل سے نکل کر کہاں گیا ہو گا؟'' مسعود کا سوال سن کر وہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے پھر ایک نے انہیں مخاطب کیا۔

''آپ اس کے بارے میں یہ تحقیقات کیوں کر رہے ہیں؟ کیوں ڈھونڈنا چاہ رہے ہیں اسے؟ کیا اس نے کوئی جرم کر دیا ہے؟''

''ارے نہیں نہیں۔ مجھے آپ لوگوں کو پوری بات بتانی پڑے گی۔''

پھر انہوں نے ساری .... تفصیل ان لوگوں کے سامنے بیان کی تو ان میں سے ایک نے پھر کہا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ دونوں بہن بھائیوں کو عزت کی زندگی دینا چاہتے ہو۔ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ عالی یہاں سے رہا ہو کر استاد موسیٰ کے پاس گیا ہو گا۔ یہ اپنے علاقے کا چھوٹا موٹا دادا ہے۔ عالی اس کی بڑی خدمت کرتا تھا اور وہ عالی سے بہت محبت کرتا تھا۔ استاد کا تو جیل میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ وہ عالی سے پہلے چلا گیا تھا لیکن عالی کو اپنا پتا، فون نمبر دے گیا تھا۔ اس کا اور تو کوئی تھا نہیں اس لیے لازمی وہ اسی کے پاس گیا ہو گا۔ وہ دونوں جیل میں یہاں ہمارے سیل میں ہی تھے۔ اس لیے ہمارے سامنے ہی ساری باتیں ہوتی تھیں۔ اب آپ چاہو تو استاد موسیٰ سے معلوم کر لو اس کا۔'' اس نے تفصیل سے بتا

کرانہیں راہ دکھادی تھی۔

"آپ لوگوں کا بہت شکریہ۔ آپ کے ساتھ کھانا کھانے میں بھی بہت مزہ آیا۔ بس چائے اور منگوالو یار۔ پھر میں چلتا ہوں۔"

رب نواز نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔

"چل بھئی! کڑک دودھ پتی چائے بھی لے آ۔ برتن صاف ستھرے ہوں۔ ویسے صاب جی! آج آپ کے آنے اور اس طرح ساتھ بیٹھ کر کھانے میں جو مزہ ہمیں آیا، وہ ہم بھی نہیں بھول سکتے۔ ہمیں عالی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اس کے لیے۔ ورنہ آپ نے کدھر آنا تھا۔"

"نہیں بھئی! ایسا نہیں ہے۔ میں آیا کروں گا کبھی کبھی۔ میرے لیے بھی یہ ایک نیا تجربہ تھا اور بہت اچھا بھی۔ میں آؤں گا، انشاء اللہ!"

☆☆☆

"تم میرے لیے اتنا نہیں کرسکتیں اور تو کچھ کیا نہیں۔ کم از کم اب جو میں کہہ رہا ہوں مان لو۔ کچھ تو سکون آجائے گا زندگی میں۔"

"تمہیں اپنے حالات کی سختی نے شاید سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کردیا ہے۔ تمہیں بالکل بھی اندازہ نہیں ہے کہ تم مجھ سے کیا کہہ رہے ہو۔" مناہل نے سر اٹھا کر کہا۔

"میں کون سا مشکل اور عجیب وغریب مطالبہ کررہا ہوں۔ دنیا کی عورتیں شوہر کی خاطر ایسا بہت کچھ کرتی رہتی ہیں۔ تم اگر کرلوگی تو کون سی قیامت آجائے گی۔" وہ چلایا۔

"میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی عزت گنواتی پھریں۔"

"مناہل! تم اگر نیب کے اس افسر کے ساتھ کچھ وقت گزار لوگی تو قیامت نہیں آجائے گی۔ ہمارے اچھے دن آجائیں گے۔ میں اس کیس سے بری ہوجاؤں گا۔ میری ملازمت بحال ہوجائے گی۔ میری، تمہاری اور تمہارے بچوں کی ساری پریشانیاں دور ہوجائیں گی۔"

"اور پھر تم دوبارہ یہی حرکتیں کروگے پھر پکڑے جاؤگے اور پھر تمہارے برے حالات کو سدھارنے کی ذمے داری میرے کاندھوں پر آجائے گی۔ فیصل! ضمیر یا عزتِ نفس نام کی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کیا تمہارے اندر اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے؟"

"بکواس بند کرو۔ تم سے شادی کرکے پچھتا رہا ہوں۔ کچھ حاصل نہیں ہوا اور ذمے داریوں کا بوجھ ان دودم چھلوں کے نام پر اور بڑھالیا۔ کوئی اور بیوی ہوتی تو شوہر کو مشکل سے بچانے کی خاطر اب تک نہ جانے کیا کیا کرچکی ہوتی مگر تم......"

وہ مستقل اسے برا بھلا کہتا جارہا تھا اور وہ اس کی باتیں سن کر سوائے آنسو بہانے کے اور کچھ کر نہیں پارہی تھی کہ اتنی دیر میں ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ فیصل اٹھ کر چلا گیا۔ اس کا وکیل آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جاکر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ کچھ حیران سی تھی۔ دو تین دن سے فیصل کا رویہ بہت مختلف تھا۔ وہ اس کے اور بچوں کے ساتھ بہت اچھے انداز میں پیش آرہا تھا۔ اسے اور بچوں کو باہر گھمانے پھرانے بھی لے گیا تھا۔ پارک میں بچے دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے اور وہ اس کے پاس بیٹھا میٹھی میٹھی باتیں کررہا تھا۔ وہ کچھ الجھی ہوئی تھی۔ چند دن پہلے تک انہیں عذاب میں مبتلا رکھنے والا اچانک اس طرح مہربان ہوجائے، وہ کچھ سمجھ نہیں پارہی تھی۔

"کیا بات ہے مناہل! تم خوش نہیں ہو؟" اچانک باتیں کرتے کرتے فیصل نے سوال کردیا۔

"میں وجہ سمجھنے کی کوشش کررہی ہوں لیکن سمجھ نہیں پارہی۔" مناہل نے اپنے شبہے کا اظہار کیا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ میرے وکیل نے مجھے اچھی امید دلادی ہے۔ تم نے تو تعاون نہیں کیا لیکن اس نے کوئی راستہ نکال لیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس دفعہ پیشی میں انشاء اللہ میں بری کردیا جاؤں گا۔"

"اوہ اچھا...... پھر تو واقعی خوشی کی بات ہے۔ اب چلیں گھر...... کافی دیر ہوگئی ہے۔"

"ہاں چلو!" فیصل اٹھ گیا اور وہ گھر روانہ ہوگئے

اگلے دن مغرب کے بعد ان کے گھر کی ڈور بیل بجی۔ فیصل سے کوئی ملنے آیا تھا۔ وہ اپنے مہمان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آیا۔

"مناہل! میرے کیس کے انکوائری افسر آئے ہیں۔ تم ذرا اچھی سی چائے بنادو۔ میں سامنے بیکری سے کچھ چیزیں لے کر آتا ہوں۔" وہ جاتے جاتے بچوں کو اشارہ کرتا گیا۔ بچے بھی اس کے پیچھے چلے گئے۔

وہ کچن میں کھڑی چائے بنارہی تھی کہ اسے اپنے کاندھوں پر دباؤ محسوس ہوا۔ وہ ہڑبڑا کر پیچھے مڑی تو اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ صورت سے ہی منحوس لگ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ہوس چنگاریوں کی طرح جل رہی تھی۔

"کون ہو تم...... ہٹو پیچھے۔ بدمعاش! جاؤ یہاں سے۔ فیصل! فیصل!" اس نے زور زور سے فیصل کو آوازیں دیں تو وہ خباثت سے ہنسا۔

"فیصل چلا گیا ہے اور وہ میرے جانے تک نہیں آئے گا۔ ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا اس لیے چلانا بیکار ہے۔ آؤ! میرے پاس آؤ!"

وہ ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا تو مناہل نے ایک چیخ مار کر اسے دھکا دیا اور وہاں سے نکلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ ہوس کے چنگل میں پھنس گئی۔ پامال ہوگئی۔ اس دکھ کے ساتھ کہ اس کی اس پامالی کا اہتمام اس کے شوہر نے کیا ہے۔

پھر کیا ہوا اور کتنا وقت گزر گیا، وہ بے حسی سے اندھیروں میں بیٹھی رہی۔ وہ درندہ وہاں سے جاچکا تھا اور فیصل کی واپسی ہوئی نہیں تھی۔ وہ نہ روئی، نہ اس کی سسکیاں کسی کو سنائی دیں۔ سکتے کے عالم میں بیٹھی وہ بے حسی کے ساتھ مٹی کا ایک بے جان بت لگ رہی تھی۔

پھر وہ آگئے۔ بچے بہت خوش تھے۔ ان کے ہاتھوں میں غبارے اور کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ وہ آکر ماں سے لپٹ گئے تھے لیکن نہ اسے کچھ محسوس ہوا اور نہ وہ کچھ بولی۔ پھر وہ اپنے کھانے پینے میں لگ گئے پھر فیصل اس کے پاس آیا۔

"مناہل! کیا ہوا ہے۔ اٹھو! زمین پر کیوں بیٹھی ہو...... اٹھو!" فیصل نے پکارا لیکن اس نے کچھ نہیں سنا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو وہ بے ہوش ہوکر لڑھک گئی۔

☆☆☆

وہ ایک جگہ گاڑی پارک کرکے اترے تو تنگ گلیوں اور تاریک راستوں والا وہ علاقہ مشکوک لوگوں سے آباد نظر آنے لگا۔ کوئی ان کے نزدیک نہیں آیا لیکن سب دور دور سے خاموشی سے ان پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ وہ گلی میں تھوڑا آگے بڑھے تو کچھ لوگ ہتھیار ہاتھ میں لیے تھوڑے فاصلے سے ان کے پیچھے بڑھے۔ انہوں نے سر ہلایا اور ہلکا سا تبسم ہونٹوں پر آکر معدوم ہوگیا۔

"یار! ذرا...... ستاد موسیٰ کا پتا تو بتاؤ۔ کہاں ملیں گے وہ؟" انہوں نے اس سانولی رنگت والے پان والے سے پوچھا جو جلدی جلدی پان بنانے میں مصروف تھا اور تیکھی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"تم کو کیا کام ہے استاد سے؟" بینچ پر بیٹھے ایک شخص نے تیکھے لہجے میں پوچھا اور اپنی گن پر سے خیالی گرد جھاڑنے لگا۔

"ذاتی کام ہے یار! استاد کو ہی بتانا ہے۔"

"استاد ہر کسی کو نہیں ملتا۔ ابھی ادھر سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔" اس نے گلی چھاپ اسٹائل میں جواب دیا۔

"استاد سے ملے بغیر نہیں جاسکتا۔ میں یہیں بیٹھا ہوں۔ تم جاؤ اور اس سے پوچھ کر آؤ۔ اس سے کہنا مجھے عالی کے سلسلے میں کچھ بات کرنی ہے۔" وہ بینچ پر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ تھوڑی دیر انہیں گھورتا رہا پھر اپنی گن سنبھالتا ہوا اٹھا اور گلی میں آگے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ استاد موسیٰ کے سامنے بیٹھے تھے۔ فرشی نشست پر گاؤتکیے سے ٹیک لگائے وہ دونوں بیٹھے تھے۔

"عالی ہمارا دل جان ہے، ہمارا بچہ ہے۔ آپ کو اس سے کیا کام ہے؟" استاد نے پوچھا۔

"مجھے کیا کام ہوتا موسیٰ! اس کی بہن نے شرط لگادی ہے کہ میرے بھائی کو ڈھونڈ کر نہیں لائے تو میں واپس جیل چلی جاؤں گی۔ اب بتاؤ! میں کیا کروں؟"

"اس کا بھین مل گیا ہے؟ تمہارے پاس ہے؟" استاد نے کچھ حیران ہوکر پوچھا تو مسعود نے اثبات میں سر ہلایا۔

"او میرے خدا! وہ بھی اپنا بھین کے واسطے بہت دکھی رہتا ہے۔ بہت یاد کرتا تھا اس کو۔ یہ تو بہت بڑا خوشخبری ہوگا اس کے واسطے کہ اس کا بھین مل گیا ہے۔ پر تمہارے پاس کیسے آیا وہ؟" استاد نے سوال پوچھا تو مسعود علی خان کو ساری تفصیل بتانا پڑی۔

"اچھا اچھا۔ اب میرے کو یاد آیا۔ کسی نے میرے کو بتایا تھا کہ کوئی بچی ہے، جو جیل سے باہر جانا ہی نہیں چاہتا۔ اس کو تم نے گود لیا ہے۔ بہت اچھا کیا۔ جیل کوئی اچھا جگہ ہے کیا۔ عزت دار گھر میں رہے گا تو عزت ملے گا۔" استاد نے خوش ہوکر کہا۔

"مگر مسئلہ یہ ہے نا کہ اس نے بھائی کی شرط لگادی ہے کہ اگر میں اسے نہ لایا تو وہ واپس جیل چلی جائے گی تو اسی لیے مجھے تمہارے پاس آنا پڑا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بات کرلیتے ہیں عالی سے۔ میرا خیال ہے کہ اپنی بھین کا سن کر بہت خوش ہوگا۔ چلا جائے گا آپ کے ساتھ۔"

استاد نے کھانا لگاتے ہوئے آدمی سے عالی کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ جم میں ہے، ایکسرسائز کررہا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ اس کو بولو، ہم نے بلایا ہے۔ چلو صاب!

جب تک کھانا کھاتے ہیں۔ اوخیرو! صاب کے ہاتھ دھلوا۔"

وہ ایک ہی تھال تھا جس میں چاول بھرے ہوئے تھے اور اوپر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کونوں پر سینک کر رکھے گئے تھے۔ مسعود نے شاید پہلی بار ہاتھ سے وہ کھانا کھایا۔ وہ دونوں ایک ہی تھال میں کھا رہے تھے۔ استاد کبھی کبھی گوشت کے ٹکڑے توڑ توڑ کر ان کے سامنے رکھ رہا تھا۔ یہ اس کا محبت بھرا میزبانی کا انداز تھا۔

"یار موسیٰ! میں نے پہلی بار اس طرح کا کھانا اور وہ بھی ہاتھ سے کھایا۔ بہت مزہ آیا۔ واللہ جواب نہیں۔" انہوں نے قہوے کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔ اتنے میں عالیان اندر داخل ہوا۔

"ادھر آجا جانِ جگر!" استاد نے بہت محبت سے اسے اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور مسعود سے اس کا تعارف کروایا۔ وہ اجنبی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا لیکن جیسے ہی اس کی بہن کا ذکر آیا تو وہ بے چین ہوگیا۔

"مشال آپ کے پاس ہے؟ کیسی ہے وہ؟ کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟" اس نے کئی سوالات کر ڈالے تو وہ دونوں اس کی بے چینی پر ہنس پڑے۔

"اسی واسطے تو یہ آیا ہے صاب! یہ تجھ کو تیری بھین سے ملوانا چاہتا ہے کیونکہ وہ بھی تجھ سے ملنے کو اتنا ہی بے چین ہے۔" استاد بولا۔

"اسے لائے کیوں نہیں...... ساتھ لے آتے؟" اس نے سوال کیا تو وہ گڑبڑا گئے۔

"کیسا بات کرتا ہے۔ اس جگہ خود پہلی دفعہ آیا ہے یہ صاب۔ بھین کو کیسے لے کر آتا۔ اس سے ملنے تیرے کو جانا پڑے گا۔"

"چلیے۔ چلتے ہیں۔" وہ یکدم ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا تو مسعود بھی اٹھ گئے۔

"اپی کھانا تو کھا پھر جانا۔" استاد نے کہا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آ کر کھاؤں گا۔" وہ ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے چلتے چلتے استاد کو اپنا کارڈ دیا۔

"موسیٰ! اس پر میرے گھر کا فون نمبر ہے۔ جب ضرورت پڑے تو فون کرلینا۔ تمہارا نمبر میں عالیان سے لے لوں گا۔ خدا حافظ۔"

استاد اسے باہر تک چھوڑنے آیا۔ مسعود علی خان راستے میں اس سے باتیں کرتے آرہے تھے اور وہ ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ وہ اپنی زندگی کا بہت بڑا موڑ لینے والا ہے۔ اسی کی بے چینی اس کے اندر ہلچل مچائے ہوئے ہے، اسی لیے وہ کچھ بول نہیں رہا ہے۔

عجیب منظر تھا۔ سالوں کے بچھڑے بہن بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ کر بری طرح رو رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو تسلی دینے کی کوشش کرتے اور پھر رو پڑتے۔ مسعود اور نوشابہ کی آنکھیں بھی یہ منظر دیکھ کر بار بار بھر آتی تھیں۔

پھر انہوں نے ہی دونوں کو سنبھالا۔ نوشابہ نے مشال کو اور مسعود نے عالیان کو گلے لگا کر، تھپک کر تسلی دے کر خاموش کروایا۔

"بس کرو بیٹا! بس کرو۔ اب رونے کے نہیں، خوش ہونے اور ہنسنے مسکرانے کے دن ہیں۔ اللہ نے دونوں بہن بھائیوں کو ملا دیا ہے۔ دونوں ساتھ رہو اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹو۔ اب کبھی الگ نہ ہونا۔" مسعود علی خان نے خوش ہو کر کہا۔

"مگر مجھے تو استاد کے پاس جانا ہوگا۔ میں آتا رہوں گا کبھی کبھی ملنے۔" عالی نے مشال کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ اتر گیا۔

"کیوں بھائی! تم میرے ساتھ یہاں نہیں رہو گے؟ ٹھیک ہے تو پھر مجھے بھی وہاں لے چلو جہاں تم رہتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی اب۔"

"وہ جگہ ایسی نہیں ہے۔ تو ادھر نہیں رہ سکتی۔"

"نہیں۔ تم رہ سکتے ہو تو میں بھی رہ سکتی ہوں۔ مجھے تمہارے ساتھ ہی رہنا ہے۔" مشال نے حتمی لہجے میں کہا تو عالی کچھ پریشان سا ہوگیا۔

"عالی! بیٹا تم یہاں رہو۔ اپنی بہن کے ساتھ۔ یہاں رہنے میں تمہیں کوئی اعتراض ہے کیا؟" مسعود نے سوال کیا تو وہ سر جھکا کر خاموش ہوگیا پھر آہستگی سے بولا۔

"استاد کے بڑے احسان ہیں مجھ پر۔ بہت محبت کرتے ہیں وہ مجھ سے۔"

"میں جانتا ہوں بیٹا! لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تمہاری بہن کی خاطر تمہیں اجازت دے دے گا کہ تم میرے پاس رہو۔ اس سے ملنے جاتے رہنا اور فکر نہ کرو۔ اس سے یہ بات میں خود کروں گا۔ وہ مان جائے گا۔" مسعود نے اسے تسلی دی۔

"نہیں۔ مجھے واپس جانا ہے۔ میں آتا رہوں گا۔" اس کا جواب تھا۔

"نہیں بھائی! اگر جانا ہے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے

کر چلو۔" مشال نے روہانسی ہو کر کہا تو کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں۔

وہ چائے وغیرہ سے فارغ ہو چکے تو نوشابہ نے مشال کو مخاطب کیا۔

"مشال بیٹا! بھائی کو اپنے کمرے میں لے جاؤ اور دونوں بہن بھائی باتیں کرو۔ ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹو اور عالیان بیٹا! تمہیں جب جانا ہو تو بتا دینا۔ نانا جی تمہیں چھوڑ آئیں گے۔ ٹھیک ہے؟" اس نے سر ہلایا تو مشال اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

☆☆☆

جب وہ ہوش میں آئی اور حواس پوری طرح بیدار ہوئے تو اندھیرا دم توڑ رہا تھا۔ چڑیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ بیڈ پر دونوں بچے اس کے آس پاس سو رہے تھے۔ فیصل کا کچھ پتا نہیں تھا۔

وہ اب پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ کل جو کچھ اس پر گزری، آج وہ اور بھی قیامت ڈھا رہی تھی۔ فیصل نے اس کے کانچ جیسے وجود کو کرچی کرچی کر دیا تھا۔ اس کا پندار بھرم کچھ اس طرح ٹوٹا کہ جینے کی آس ہی ختم ہوگئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ سوچا اور ایک لمحے میں فیصلہ کرلیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ الماری کھول کر اپنا عبایا اور حجاب نکال کر پہنا اور کمرے سے باہر نکلی۔ دوسرے کمرے کے کھلے دروازے سے فیصل بے خبر سوتا نظر آیا۔ اس نے ایک لمحہ رک کر اسے دیکھا تو اس کے اندر نفرت کا ایک طوفان اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ اس پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دے لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ ایسا نہیں کرسکتی، اس لیے آگے بڑھ گئی باہر جانے والا دروازہ کھولا تو اچانک اسے خیال آیا۔

"اگر میں ان بچوں کو یہاں چھوڑ گئی تو یہ بے غیرت آدمی آج بیوی کا سودا کرسکتا ہے تو کل بیٹی بھی اس کے ہاتھوں محفوظ نہ ہوگی۔"

وہ واپس مڑی۔ کمرے میں جا کر بچوں کو اٹھایا۔ کچھ ان کے کھانے پینے کے لیے ساتھ لیا اور گھر سے نکل گئی۔

"امی! ہم کہاں جا رہے ہیں؟" بیٹے نے چلتے چلتے سوال کیا لیکن وہ کچھ بھی جواب دیے بغیر آگے بڑھتی رہی۔

بچے چلتے چلتے تھک گئے تو وہ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ کچھ کھا پی کر پھر اٹھ کر ماں کے ساتھ چلنے لگے۔ ریسٹ ہاؤس کے پاس تھوڑی سی آبادی تھی۔ آگے کھیت اور جنگل تھے۔ دور دریا کا پل نظر آرہا تھا جس کے نیچے بہنے والا پرشور دریا نہ جانے کہاں سے آرہا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ وہ دونوں بچوں کا ہاتھ تھامے دریا کی طرف بڑھتی رہی۔ روشنی بڑھ گئی تھی۔ سورج طلوع ہونے ہی والا تھا۔ وہ پگڈنڈیوں سے گزرتی ہوئی دریا کے پل تک پہنچ گئی۔

اس قدر پیدل چل کر بچے بری طرح تھک چکے تھے۔ اب وہ آہستہ آہستہ احتجاج سے رونے پر آگئے تھے کیونکہ ماں کی سنگین خاموشی اب انہیں ڈرانے لگی تھی۔ وہ کچھ بولے بغیر ان دونوں کا ہاتھ تھامے مسلسل چلتی رہی اور آخر میں تو انہیں گھسیٹتی ہی رہی کیونکہ اب ان سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ پھر وہ پل پر پہنچ گئے۔ اس کی فٹ پاتھ پر بچے بیٹھ گئے۔ تھکن نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔

وہ کچھ دیر ریلنگ کے ساتھ لگی، نیچے گہرائی میں بہتے ہوئے دریا کو دیکھتی رہی۔ پرشور لہریں اپنے ساتھ نہ جانے کیا کیا بہا کر لے جا رہی تھیں، یہی میرا گندا ناپاک وجود اپنے اندر سمیٹ کر لے جائیں گی، اس نے سوچا پھر بچوں کے پاس بیٹھ گئی۔ انہیں پیار کیا اور گلے لگا کر اللہ حافظ کہا تو چھوٹی بچی تو کچھ نہ سمجھی لیکن سات سالہ بچے نے نہ جانے کیا سمجھا اور وہ رونے لگا۔

"امی! آپ کہاں جا رہی ہیں؟ کیا ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہیں امی!" وہ بلک بلک کر رویا تو اس نے پھر اسے گلے لگا کر پیار کیا، آنسو پونچھے۔ پھر اسے چھوڑ کر پل کی سڑک پار کرکے دوسری ریلنگ کے پاس پہنچی۔ ابھی وہ اس کے اوپر چڑھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ دونوں بچے روتے ہوئے اور اسے پکارتے اس کے پیچھے دوڑ کر آنے لگے۔ وہ رک گئی۔ وہ دونوں آکر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

دور نیچے کھیتوں میں کام کرتے کسان سر اٹھا کر انہیں دیکھ رہے تھے کیونکہ بچوں کے زور زور سے رونے کی آوازیں اور اس قدر سویرے ان کی وہاں موجودگی انہیں کچھ مشکوک سی لگ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر ان کسانوں کو دیکھا اور پھر بچوں کو...... پھر انہیں لے کر دوبارہ سڑک پار کرکے فٹ پاتھ تک لائی۔ ریلنگ کے ساتھ کھڑا کرکے اپنے سر سے دوپٹا کھینچ کر اتارا اور ریلنگ کے ساتھ کس کر باندھ دیا۔ بچے اور زور زور سے رونے لگے۔

اس نے ایک الوداعی نظر دونوں روتے ہوئے بچوں پر ڈالی۔ اب وہ اس کے پیچھے نہیں آسکتے تھے۔

بھاری بھاری قدموں سے اپنی بے حس لاش کو گھسیٹتی وہ پھر سڑک پار کرکے ریلنگ تک آئی۔ مڑ کر بچوں پر نظر ڈالی۔ وہ امی...... امی کہہ کر چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ وہ پلٹی، ریلنگ پر چڑھی اور بھر کر... بہتے والے دریا میں چھلانگ

لگادی۔ کسان شور مچاتے دوڑتے ہوئے آئے لیکن وہ پانیوں میں کہیں گم ہوگئی۔

☆☆☆

''تو میرا جان ہے،جگر ہے۔ میرا بیٹا جیسا ہے۔ جب تو مجھے بابا بولتا ہے تو دل کو جو ٹھنڈک ملتا ہے، وہ کسی اور چیز سے نہیں ملتا۔ دل کرتا ہے تو پاس رہوے۔ نظر کے سامنے۔ کدر بھی نہ جاوے۔'' استاد موسیٰ عالیان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولتا جارہا تھا۔

''اتنا پیار کرتے ہو تو جانے کا کیوں بولتے ہو؟'' عالی نے آہستگی سے کہا تو اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ادھر بھین ہے۔ کتنے سالوں کے بعد ملا ہے۔ تجھے اس کا ساتھ رہنا چاہیے۔ تو ادھر نہیں رہے گا اس کا ساتھ تو دل ٹوٹ جائے گا اس کا۔''

''میں مل آیا کروں گا اس سے وہیں جاکر۔ رہنا ضروری تو نہیں ہے۔''

''ارے نادان بچہ! ادھر عزت والا لوگ ہے۔ عزت والا گھر ہے۔ تو ادھر ہوگا، تو تو اور تیرا بھین بھی عزت والا بن کے رہے گا۔ ادھر کیا ہے۔ غنڈا موالی لوگ کا علاقہ۔ بدمعاشی کا کام۔ بے عزت رسوا لوگ کی آبادی۔ گندا ماحول۔ یہ تیرے لیے نہیں ہے۔ خدا نے تجھ پر کرم کیا ہے تو اس کا شکر کر اور جو نعمت اس نے تیرا اور تیرا بھین پر اتارا ہے، اس کا قدر کر۔''

''لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا بابا!'' عالی نے استاد کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بے بسی سے کہا تو وہ ہنسا۔

''ہاں تو آتا رہنا ملنے کا واسطے۔ ملنے سے تو منع نہیں کیا ہے۔ میں بھی آئے گا ادھر کبھی کبھی اپنے جانِ جگر سے ملنے۔ فکر نہ کر۔''

اور اس طرح نہ جانے کیا سمجھا بجھا کر استاد موسیٰ خود اسے گاڑی میں بٹھا کر مسعود علی خان کے گھر لے آیا۔

''اب یہ ادھر ہی رہے گا خان صاب! اپنی بھین کے ساتھ اور آپ لوگوں کے ساتھ۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو مسعود بھی مسکرائے۔

''سرآنکھوں پر۔ میرے گھر میں تو جیسے بہار آگئی ہے۔ ان دونوں کے آنے سے گھر کتنا بھرا پُرا سا لگنے لگا ہے۔ آپ اندازہ کرسکتے ہو۔'' بھائی کے آنے کا پتا چلا تو مشال بھی دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ لان میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ بھائی بھائی چلاتی ہوئی آئی اور اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ عالی نے موسیٰ کی طرف اشارہ کیا۔

''بابا۔'' مشال نے دیکھا اور مسکراتے ہوئے اسے بھی زوردار سلام جھاڑا۔

''السلام علیکم بابا! تو آپ ہو میرے بھائی کے بابا؟ پھر تو میرے بھی بابا ہوئے...... ہے نا!'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا تو استاد موسیٰ زور سے ہنس پڑا۔

''نٹ کھٹ بچہ ہے خان صاب! اپنا عالی تو سنجیدہ ہے۔ دونوں بھین بھائی الگ مزاج کا ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ بہن اسے بھی سکھا دے گی۔'' مسعود کی بات سن کر وہ اور بھی ہنسا۔

نوشابہ ملازم سے چائے ناشتا بنوا کر وہیں لے آئیں۔ موسیٰ نے کھڑے ہو کر انہیں تعظیم دی۔

''اچھا۔ تو آپ ہیں عالیان کے بابا...... موسیٰ۔'' انہوں نے پوچھا تو موسیٰ نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

ان سب نے وہاں بیٹھ کر چائے پی پھر موسیٰ واپس چلا گیا۔ رات کو وہ سب ساحل سمندر پر بنے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے گئے، واپسی میں گھومتے گھامتے آئے اور ایک سرخوشی کا احساس لیے اپنے اپنے کمروں میں سو گئے۔

ان سب کی زندگی ایک نئے ڈھب پر چلنے لگی تھی۔ نوشابہ اور مسعود کو ایک نئی منا اہل مل گئی تھی اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مشال کو وہ سب کئی گنا کر کے دیں جسے ان کی منا اہل ٹھوکر مار کر چلی گئی تھی۔ وہ سارا پیار، محبت، توجہ اور زندگی کی بے شمار آسائشیں سب منا اہل کے حصے کا تھا جو وہ مشال کو دینا چاہتے تھے اور پھر عالیان...... مشال کا بھائی۔ ان کا بھی لاڈلا ہو گیا تھا وہ۔

''عالی بیٹے! تم نے کچھ پڑھا لکھا ہے؟'' ایک دن مسعود نے پوچھا۔

''تھوڑا بہت۔ باقاعدہ کلاسیں نہیں پڑھیں۔'' عالی نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

''کچھ شوق ہے کہ تم بھی دوسرے بچوں کی طرح کالج یونیورسٹی میں پڑھو...... تعلیم حاصل کرنے کا...... مستقبل میں کچھ بڑا بننے کا یا نہیں؟''

''شوق تو بہت ہے نانا جی! لیکن اب عمر کا اتنا حصہ گزر گیا ہے کہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ پڑھنا ناممکن ہے۔ اسکول کے بچوں کے ساتھ پڑھنا مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

''اس کا بھی بندوبست ہوجائے گا۔ صرف یہ بتاؤ کہ پڑھنے کی خواہش ہے یا نہیں کیونکہ خواہش کے بغیر محنت نہیں ہوتی اور اگر تم نے پڑھنا ہے تو اپنے ہم عمروں تک پہنچنے کے لیے دن رات ایک کرنا ہوگا۔''

''محنت سے میں کبھی نہیں گھبرایا۔ اب بھی نہیں گھبراتا۔''

''ارے واہ یار! دل خوش کردیا۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے ایک بہت اچھا ٹیچر تلاش کرتا ہوں جو تمہیں گھر آکر پڑھائے گا اور ایک ایک کلاس پڑھا کر تمہیں آگے بڑھاتا جائے گا۔ پھر بڑی کلاس کا کورس پڑھا کر تمہیں کسی اسکول سے امتحان دلوائے گا۔ پاس ہوگئے تو بورڈ میں تمہارا داخلہ بھجوا دے گا۔ بس پھر شروع ہوجائے گا سلسلہ۔''

ان دونوں کو اس ڈھلتی عمر میں زندگی نے ایسے خوشگوار فرائض اور ذمے داریوں میں ڈال دیا تھا کہ ان میں جوانی کی ترنگ اور جوش و جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ وہ ان دونوں بچوں کی زندگی بنانے اور سنوارنے کی جدوجہد میں اس طرح مشغول تھے کہ بھول گئے کہ اب یہ ان کاموں کا وقت نہیں تھا ان کے لیے۔ اس لیے زیادہ بھاگ دوڑ کے سبب کبھی کبھی تھکن کا احساس ہونے لگتا تو بھی وہ دونوں ہنستے تھے۔

''کیوں مسعود! تھک گئے ہو نا؟ اب اتنی بھاگ دوڑ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ ہر بات کے لیے خود نہ دوڑا کرو۔ ملازموں سے کروالیا کرو کام۔'' نوشابہ انہیں تھکا ہوا دیکھ کر کہتیں۔

''ہاں۔ کبھی کبھی تھکن ہوجاتی ہے لیکن ان بچوں کے کام کرکے جو خوشی ہوتی ہے، اس کے سامنے تھکن کچھ بھی نہیں ہے۔ اب دیکھو عالیان کو ڈرائیونگ سکھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ اسے لے کر جانا ہے اور ایسا لگ رہا ہے کہ اللہ نے اس عمر میں ہمیں بیٹا دے دیا ہے اور اس کی ساری تعلیم و تربیت کی ذمے داری نبھانا ہے۔ یہ فرض ہے اور بڑا خوشگوار فرض۔ پورا کرتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی ہے۔'' وہ ہنس کر جواب دیتے۔

''اچھا انسٹرکٹر صاحب! آپ کی دوسری اسٹوڈنٹ کی ڈرائیونگ کہاں تک پہنچی؟'' نوشابہ نے بھی ہنس کر پوچھا۔

''مشال۔ ہاں وہ تو بہت اچھی سیکھ گئی ہے۔ کل گراؤنڈ سے گھر تک وہی لے کر آئی تھی۔ کہہ رہی کہ آج گراؤنڈ تک گاڑی لے کر بھی وہی جائے گی۔ کافی پُراعتماد بچی ہے۔''

''مجھے تو ہوبہو اپنی منا اہل لگتی ہے۔ اس کی شکل و صورت، چال ڈھال حتیٰ کہ اس کی بعض عادات بھی اسی جیسی ہیں۔ مجھے تو اسے دیکھ کر ایسا ہی لگتا ہے کہ اس کی شکل میں منا اہل ہی ہمارے آس پاس چل رہی ہے۔'' نوشابہ کو پھر بیٹی یاد آرہی تھی۔

''ہاں! مجھے بھی کبھی کبھی ایسا ہی لگتا ہے۔ مجھے تو عالی میں بھی اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ اب وہ نہیں ہے۔ نہ جانے کہاں ہوگی وہ بدنصیب اور کن حالوں میں ہوگی۔ اس نے کبھی بھول کر بھی رابطہ نہیں کیا۔ کبھی تو یاد کرتی ہمیں۔ ایک فون ہی کرلیتی مگر ایسی گئی کہ اپنا کوئی پتا نشان ہی نہیں چھوڑا کہ ہم ہی اسے تلاش کرلیتے۔'' مسعود بھی بیٹی کو یاد کرکے اداس ہوگئے۔

''چلیں چھوڑیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ جہاں بھی ہو خوش رہے۔ یہ لیں چائے پئیں پھر آپ کو جانا بھی ہے۔''

☆☆☆

آج دیر ہوگئی تھی۔ دونوں اٹھ کر آئے نہیں تھے۔ وہ ناشتے کی ٹیبل پر انتظار میں تھے۔ مسعود علی خان نے اخبار پڑھتے پڑھتے نظریں اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔

''ارے بھئی! آج اس لڑکی کی چھٹی ہے کیا؟ پندرہ منٹ رہ گئے ہیں اس کے جانے میں اور ابھی تک نیچے آئی نہیں۔ جانا نہیں ہے کیا؟'' انہوں نے نوشابہ سے پوچھا۔

''ہاں! دیر ہوگئی ہے۔ چھٹی تو نہیں ہے۔ رات دیر تک دونوں بہن بھائی باتیں کرتے رہے ہوں گے۔ شاید اس لیے آنکھ نہیں کھلی ہوگی۔ میں دیکھتی ہوں جاکر۔''

''آپ کیوں جارہی ہیں، نوری کو بھیجیں۔ وہ اٹھا دے گی۔'' انہوں نے کہا تو نوشابہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ چکی تھیں۔ اوپر پہنچ کر مشال کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ان کی نظر عالیان کے کمرے پر پڑی۔ وہ بیڈ کو چھوڑ کر نیچے قالین پر سو رہا تھا۔ کھلے دروازے سے اس کی ٹانگیں باہر تک پھیلی ہوئی تھیں اور وہ تکیہ دبوچے ہوئے بے خبر سو رہا تھا۔

''یہ بیڈ چھوڑ کر نیچے کیوں سویا ہوا ہے؟'' انہوں نے خود سے سوال کیا اور آگے بڑھ کر مشال کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ اب تک سو رہی تھی۔

''مشال بیٹا! دیر ہو رہی ہے۔ آج کالج نہیں جانا ہے کیا۔ کب تک سونے کا ارادہ ہے؟ مشال! اٹھو بیٹا!'' انہوں نے آواز دی تو وہ کسمسائی۔ نیم وا آنکھوں سے انہیں دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے انداز میں بولی۔

''نانو! آج میری کلاس دس بجے ہے۔ میں دیر سے اٹھوں گی۔ پلیز! تھوڑی دیر اور سونے دیں۔'' اس نے کمبل دوبارہ منہ تک اوڑھ لیا تو نوشابہ مسکراتی ہوئی باہر آگئیں۔ کچھ دیر عالیان کے کمرے کے دروازے کے سامنے رک کر اسے دیکھا۔ اس کی ٹانگیں دروازے تک پھیلی ہوئی

تھیں۔ ایک پیر زمین پر تھا اور زمین ٹھنڈی...... اس لیے انہوں نے ڈورمیٹ کھینچ کر اس کے پیر کے نیچے رکھنا چاہا تو وہ بیدار ہو گیا۔

''نانو! یہ کیا کر رہی ہیں؟'' وہ گھبرا کر اپنا پاؤں کھینچ کر اٹھ بیٹھا۔

''کچھ نہیں میری جان! تمہارا پاؤں زمین پر تھا اور زمین ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ڈورمیٹ تمہارے پاؤں کے نیچے رکھ دوں تاکہ تمہیں ٹھنڈ نہ لگے۔'' نوشابہ نے کہا تو وہ انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے جذبات آئے۔

نانو! میں کس دنیا میں آ گیا ہوں جہاں آپ اور نانا جی جیسے اس قدر پیار کرنے والے لوگ بستے ہیں۔ ورنہ جس دنیا میں رہا ہوں میں...... وہاں تو سوائے نفرتوں اور ذلتوں کے کچھ نہیں تھا۔ میرا سارا بچپن اور آج تک کی زندگی سوائے دکھ اور اذیت کے کچھ نہیں تھی اور دکھوں کے اس سمندر میں واحد جزیرہ بابا تھے۔ مگر وہ جیل میں بھی ہوتے، کبھی چلے جاتے تھے لیکن ان کی محبت اور انسانیت نے مجھے جیل کی بے ہودہ زندگی میں بھی آسانیاں فراہم کی تھیں۔ مجھے لگتا تھا کہ میری زندگی میں بابا کی آمد قدرت کی طرف سے کوئی انعام ہے۔ لیکن اب...... یہاں...... آپ کے ساتھ رہنا۔ آپ کی یہ بے پناہ محبت میرے لیے کتنا بڑا انعام ہے، آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہوں جس میں آپ اور نانا جان جیسے فرشتے میرے ساتھ ہیں اور میں سو کر بیدار بھی ہو جاؤں تو بڑی دیر تک اس ڈر سے آنکھیں نہیں کھولتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خواب ٹوٹ جائے۔'' وہ بہت جذباتی ہو کر بول رہا تھا۔

''یہ جاگتی آنکھوں کا خواب ہے۔ کبھی نہیں ٹوٹے گا میرے بچے! تم دونوں نے ہماری ویران زندگی میں آ کر جو بہار کا سماں پیدا کیا ہے تو ہم تو دراصل تمہیں قدرت کی طرف سے اپنے لیے انعام سمجھتے ہیں۔'' مسعود ان دونوں کی باتیں سن کر اوپر آ گئے تھے اور عالیان کی بات سن کر جواب دے رہے تھے۔ نوشابہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

''ہاں! تم دونوں کو اللہ نے ہماری زندگی کی تمام محرومیوں کی تلافی کے لیے بھیجا ہے۔ سچ مچ بہت بڑا انعام ہو تم دونوں۔ ہمیں زندگی میں جو خوشیاں تم دونوں سے مل رہی ہیں، اس کے لیے ہم پروردگار کا جتنا بھی شکر کریں کم ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''ویسے ایک بات بتاؤ! یہ تم بیڈ چھوڑ کر نیچے فرش پر کیوں سو رہے تھے برخوردار!'' مسعود نے پوچھا۔

''وہ...... دراصل بات یہ ہے نانا جی...... کہ...... میری ٹانگیں شاید...... کچھ زیادہ لمبی ہیں تو وہ بیڈ سے باہر نکل جاتی ہیں۔ تو مجھے لگا کہ شاید فرش پر سونا زیادہ ٹھیک رہے گا۔'' اس نے اٹک اٹک کر کچھ شرمندہ سے لہجے میں کہا تو مسعود ہنس پڑے۔

''سنا نوشابہ! یہ تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے یہ اس کا کوئی مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ ارے میاں! لمبے ہو تو ٹانگیں تو لمبی ہوں گی نا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے صرف بیڈ ہی نہیں، کمرا بھی چھوٹا ہے۔ جب ہی تو فرش پر لیٹنے کے باوجود تمہاری ٹانگیں دروازے سے بھی باہر آ رہی تھیں۔ تم ایسا کرو نوشابہ...... کہ اس کے لیے وہ سامنے والا کمرا ٹھیک کروا دو۔ وہ بڑا ہے۔ یہ وہاں آرام سے رہے گا۔''

''وہ مناہل والا کمرا؟'' نوشابہ نے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! میں آج ہی اس کی صفائی کروا دوں گی۔ تم کل سے اس کمرے میں شفٹ ہو جانا۔''

''میں ٹھیک ہوں نانو! یہاں کر لوں گا ایڈجسٹ۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ زحمت نہ کریں۔'' اس نے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا تو وہ مسکرائیں۔

''مجھے خوشی اس دن ہوگی، جب تم مجھ سے فرمائش کر کے ضد کر کے اپنی بات منواؤ گے، اپنے نانا نانی اور اس گھر پر اپنا پورا حق سمجھ کر۔ یہ مہمانوں اور اجنبیوں والے طور طریقے، اپنایت نہیں رہنے دیتے۔ اس لیے تکلف والی باتوں سے گریز کرو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے، اب بھی اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لیے نانو کی جان! میں چاہتی ہوں کہ تم نے اب تک کی زندگی میں جو کچھ کھویا ہے، وہ سب تمہیں ملے بلکہ اس سے بڑھ کر ملے۔ یہ صرف گھر کا آرام اور آسائشیں ہی نہیں بلکہ پیار، محبت، اپنایت اور رشتوں کا تعلق بھی اس میں شامل رہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟'' انہوں نے پوچھا تو اس نے ہونٹ بھینچ کر نم آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

''اچھا بھئی! وہ لڑکی تو آج دیر تک سونے کے موڈ میں ہے۔ میرے تو پیٹ میں اب چوہے دوڑ رہے ہیں۔ تم اٹھ ہی گئے ہو تو آ جاؤ۔ ساتھ ناشتا کرتے ہیں۔ ویسے بھی تمہارے ٹیچر کے آنے کا وقت ہونے والا ہے۔ آ رہے ہو یا ابھی اور سونا ہے؟'' مسعود نے پوچھا تو اس نے اثبات

میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

''ادھر نہیں بھائی! ادھر۔ وہ کمرا۔'' وہ اوپر آیا تو مشال نے اشارے سے بتایا کیونکہ آج اس نے اور نانو نے مل کر اس کے لیے دوسرا بڑا کمرا سیٹ کروایا تھا۔ وہ ادھر بڑھ گیا۔ آج سارا دن وہ کچھ اس طرح مشغول رہا تھا کہ اب اسے تھکن کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور بیڈ پر چھلانگ لگائی۔ کچھ دیر اسی طرح پڑے پڑے بستر کی نرمی اور گداز کو محسوس کیا پھر پلٹ کر سیدھا ہو گیا۔ کمرا بہت خوب صورت اور کافی بڑا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹا اس کا ہر طرف سے جائزہ لے رہا تھا پھر اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

سامنے دیوار پر لگی ہوئی فریم شدہ تصویر نے اس کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔ بیٹھے بیٹھے وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے غور سے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے اٹھا اور اس طرح اس تصویر کی طرف بڑھا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ قریب پہنچ کر اسے غور سے دیکھتا رہا پھر دونوں ہاتھوں سے اس کا فریم ہاتھوں میں تھام کر اسے اور نزدیک سے دیکھا۔

دلربا چہرے پر دائیں جانب ٹھوڑی کا تل اسے بتا رہا تھا کہ اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ پھر تصویر کے نیچے کا کیپشن کہہ رہا تھا کہ وہ بالکل صحیح پہچان گیا ہے۔ لکھا تھا...... ماما، پاپا کی جان...... مناہل!

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ وہ تصویر کے ساتھ ایسے چپک گیا جیسے گلے لگ گیا ہو۔ اس کے دل میں ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ ''امی!'' وہ زور سے چلایا۔ پھر امی، امی کہہ کر زور زور سے رونے لگا۔ چیخ چیخ کر۔ چلا چلا کر۔

وہ تینوں اس کی آوازیں سن کر گھبرا گئے۔ اندھا دھند دوڑتے ہوئے عالی کے کمرے میں پہنچے تو عجیب منظر تھا۔ وہ تصویر سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اتنی بے چینی اور بے قراری سے کہ ان تینوں کو بھی اس نے بے چین اور بے قرار کر دیا تھا۔

مسعود اور نوشابہ تو ہکا بکا کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ کچھ سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے پھر مسعود نے ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور آگے بڑھ کر عالی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''عالی میری جان! کیا ہوا؟'' انہوں نے اسے پکارا تو وہ پلٹ کر ان سے لپٹ گیا۔ وہ اس طرح رو رہا تھا کہ ان کی بھی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ اسے تسلی دیتے رہے۔ پیٹھ تھپکتے رہے۔ بڑی مشکل سے اس کے جذبات قابو میں آئے۔

''یہ...... یہ تصویر کس کی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ...... یہ ہماری بیٹی مناہل کی ہے۔ تم جانتے ہو اسے؟'' مسعود نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم جانتے ہو مناہل کو؟ کہاں ہے وہ؟ کیسی ہے وہ؟ وہ کہاں ہے؟ مناہل کہاں ہے؟'' نوشابہ بے قراری سے چلا اٹھیں تو اس نے کچھ حیرانی سے انہیں دیکھا۔

''یہ آپ کی بیٹی ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں ہے کہ کہاں ہے وہ؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں! وہ ہم سے ناراض ہو کر چلی گئی تھی اور ایسی گئی کہ اپنا کوئی پتا نشان چھوڑا نہ اپنی کوئی خبر دی۔ ہم آج تک اس کے انتظار میں ہیں۔ خدا کے لیے بتاؤ۔ ہماری مناہل کہاں ہے؟'' مسعود نے بھی بے چینی کا اظہار کیا لیکن وہ خاموشی سے ان دونوں کو دیکھتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ وہ دونوں اس سے پوچھ پوچھ کر ہلکان ہو گئے لیکن وہ خاموشی سے بت بنا انہیں دیکھتا رہا۔ بڑی دیر کے بعد اس کے لبوں کو جنبش ہوئی اور ایک سوال برآمد ہوا۔

''وہ گھر چھوڑ کر کیوں گئی تھیں؟'' عالیان کے اس سوال پر وہ دونوں یکلخت خاموش ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگے۔ اس نے پھر اپنا سوال دہرایا تو نوشابہ نے ہی جواب دیا۔

''وہ ایک بہت برے شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ ہم نے منع کیا تو وہ خاموشی سے گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی گئی اور ایسی گئی کہ آج تک ہم سے نہیں ملی۔ نہ کبھی کوئی رابطہ کیا۔ نہ اپنا کوئی پتا نشان دیا کہ ہم خود ہی اسے ڈھونڈ لیتے۔ یہ ہمارے دل کا درد ہے۔ اب تم بتا رہے ہو کہ تم اسے جانتے ہو۔ جانتے ہو تو پلیز! بتاؤ...... کہاں ہے مناہل؟'' نوشابہ نے کہا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سے جذبوں کا عکس لہرایا۔

''آپ کی بیٹی سے ایک نادانی ہوئی۔ وہ چلی گئی، اپنی پسند سے شادی کر کے تو آپ کی ساری محبت بھاپ بن کر اڑ گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک برا آدمی تھا پھر بھی آپ نے اپنی بیٹی کی کوئی خیر خبر نہیں لی کہ وہ کس حال میں ہے؟ زندہ ہے یا مر گئی۔''

''اللہ نہ کرے۔ اللہ کرے کہ وہ زندہ ہو اور خوش ہو...... اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ۔'' نوشابہ نے حسرت

سے کہا۔

’’نہیں۔‘‘ وہ چلاّیا۔

’’نہ وہ شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش ہے اور نہ ہی وہ زندہ ہے۔‘‘ اس کا لہجہ غم کی شدت سے نڈھال تھا لیکن اس کے الفاظ ان دونوں پر قیامت بن کر اترے۔

’’کیا...... مناہل زندہ نہیں ہے؟‘‘ مسعود زیر لب بڑبڑائے پھر وہ دونوں بھی شدتِ غم سے بری طرح رو پڑے۔

’’وہ واقعی بہت برا شخص تھا جس کی خاطر امی نے آپ لوگوں کو چھوڑ دیا تھا۔ ہر وقت امی کو پریشان رکھتا تھا۔ میں نے اپنی امی کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ مجھے زیادہ کچھ تو یاد نہیں ہے۔ لیکن آخری دن بہت اچھی طرح یاد ہے۔ اس دن ابو کا کوئی بہت گندا سا دوست آیا تھا۔ ابو اس کے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لینے جارہے تھے۔ ہم دونوں کو ابو نے ساتھ جانے کے لیے کہا تو ہم دونوں بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس دن ابو نے ہم کو بہت گھمایا۔ کھانے کی چیزیں بھی دلائیں اور مشال کو بہت سارے غبارے بھی۔

’’جب ہم گھر واپس آئے تو امی کمرے کے دروازے پر فرش پر بیٹھی تھیں۔ بالکل خاموش اور ان کے بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ میں جا کر ان سے لپٹ گیا... وہ کچھ نہیں بولیں۔ پھر ابو نے انہیں اٹھایا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ ہم دونوں بھی امی کے پاس جا کر لیٹ گئے۔ وہ ہم سے بھی بالکل نہیں بولیں۔

’’بہت صبح انہوں نے ہمیں اٹھایا اور ہم تینوں گھر سے باہر نکل آئے۔ ابو ہمارے کمرے میں سو رہے تھے۔ ہم تینوں پیدل چلتے رہے۔ مشال تھک کر رونے لگی لیکن امی ہم دونوں کا ہاتھ پکڑے چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ ہم دریا کے پل پر پہنچ گئے۔ امی نے ہمیں اپنے دوپٹے سے ایک کھمبے سے باندھ دیا۔ وہ ......وہ ......‘‘ اس کا گلا بھر آیا، آواز رندھ گئی اور وہ خاموش ہوگیا۔ وہ تینوں آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

’’نیچے دریا...... بہت بھرا ہوا بہہ رہا تھا۔ لہروں کا شور مجھے ڈرا رہا تھا لیکن امی بالکل بھی نہیں ڈریں۔ انہوں نے جنگلے کے اوپر چڑھ کر......دریا میں...... چھلانگ لگادی......‘‘ وہ برداشت کی آخری حدوں تک پہنچ کر پھر زور سے رو دیا۔ اس دفعہ وہ تینوں بھی اس کے ساتھ روئے۔ بڑی دیر رونے کے بعد جب دل ذرا ہلکا ہوا تو نوشابہ کے لبوں سے ایک جملہ پھوٹا۔

’’تم ......تم دونوں......میری مناہل کے بچے ہو؟‘‘ وہ اٹھیں اور ان دونوں کو گلے لگا کر پھر رو پڑیں۔

’’اس کے بعد تم دونوں واپس گھر گئے......تمہارے باپ نے کچھ نہیں کیا؟‘‘ مسعود نے عالی سے پوچھا۔

’’ہم گھر سے اتنی دور آگئے تھے کہ ہمیں واپسی کا راستہ ہی نہیں ملا۔ لوگوں نے ہمیں کسی زمیندار کے گھر پہنچا دیا۔ اس کی بیوی ہم دونوں سے بہت نفرت کرتی تھی۔ وہ ہم دونوں کو بہت مارتی پیٹتی تھی۔ پھر اس نے ہم دونوں پر اپنے کنگن چوری کرنے کا الزام لگا کر پولیس کے حوالے کردیا اور پتا نہیں کیا کیا الزام لگا کر ہمیں جیل بھجوا دیا۔ جب سے ہم جیل میں ہی تھے۔ ہم دونوں الگ جیلوں میں اب تک کی زندگی کاٹتے رہے اور اب ملے تو کہاں؟ یہاں آپ کے ہاں۔‘‘

وہ چاروں الگ الگ انداز میں مناہل کو یاد کرکے رو رہے تھے۔ مشال اس وقت بہت چھوٹی تھی اس لیے ماں اسے بہت اچھی طرح یاد نہیں تھی لیکن عالیان کو سب کچھ یاد تھا اس لیے وہ ماں کو یاد کرکے زیادہ بے قرار تھا۔

’’جب بیٹی کو اس وقت چھوڑ دیا اور پلٹ کر اسے پوچھا بھی نہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نادانی میں ایک برے شخص کے چنگل میں پھنس گئی ہے تو اب اس کے لیے کیوں رو رہے ہیں؟‘‘ یہ تلخ لہجے میں کہا ہوا جملہ عالیان کے ہونٹوں سے برآمد ہوا تو ان دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے اور ناراضگی کا کھلا اظہار تھا۔

’’یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟‘‘ نوشابہ نے حیران ہوکر پوچھا۔

’’ٹھیک نہیں کہہ رہا ہوں میں؟ اگر ان سے وہ نادانی ہو بھی گئی تھی تو کم از کم آپ ان کی خیر خبر تو رکھتے کہ آپ کی اکلوتی لاڈلی اور پیاری بیٹی کس حال میں ہے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اس وقت تو یہ آپ کی انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ آپ نے سوچا ہوگا، بھاڑ میں جائے۔ ہماری عزت کو بٹا لگا کر چلی گئی۔ اب ہماری طرف سے جہنم میں جائے۔ آپ کی اپنی بیٹی سے ساری محبت بھاپ بن کر اڑ گئی۔‘‘ عالی کے لہجے میں تلخی بڑھتی جارہی تھی۔

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وقتی جذبات کا یہی اثر تھا لیکن بعد میں اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی میں نے لیکن نہیں ملی وہ۔‘‘

مسعود نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تو وہ بیڈ سے اٹھ کر ان کی طرف آیا اور کرسی پر بیٹھے مسعود کے پیروں کے پاس زمین پر گھٹنے ٹکا کر بیٹھ گیا۔

’’نانا جی! میں آپ کی پیاری بیٹی بلکہ بقول آپ کے بہت پیاری بیٹی مناہل کا بیٹا ہوں، اپنا یہ ہاتھ میرے سر پر رکھ کر قسم کھایئے اور پھر بتایئے کہ کیا واقعی آپ نے امی کو تلاش کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی...... کہیے؟‘‘

اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ مسعود زخمی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

’’دیکھیے نانا جی! جھوٹی قسم نہ کھایئے گا۔ سچ بتایئے گا...... پلیز!‘‘ اس نے اصرار کیا تو وہ اس کے سر پر رکھے اپنے ہاتھ کو دیکھتے رہے پھر ان کی آنکھوں میں شکست اتر آئی۔ انہوں نے سر جھکا لیا تو عالی نے اپنے سر پر موجود ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

’’میں جانتا تھا...... میں جانتا تھا، آپ نے کبھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ اگر کہیں ایسی کوشش کی ہوتی تو میری ماں اور ہم دونوں بہن بھائی اس قدر اذیت بھری زندگی نہ گزارتے۔ میری ماں حوصلہ ہار کر اس طرح خودکشی نہ کرتی۔ ہماری اس تباہی و بربادی کے ذمے دار آپ ہیں نانا جی صرف آپ!‘‘ اس کے الفاظ میں غصے کی تپش تھی۔ وہ ہاتھ جھٹک جھٹک کر کمرے کا طول و عرض ناپ رہا تھا۔ اسے کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔ پھر وہ اسی غصے کے عالم میں کمرے سے نکلا اور دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ زور سے بند کرلیا۔

☆☆☆

’’مسعود! اٹھو مسعود! جلدی اٹھو!‘‘ نوشابہ حواس باختہ سی انہیں ہلا ہلا کر اٹھا رہی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے۔

’’کیا ہوا نوشابہ؟ سب خیریت ہے نا...... کیا ہوگیا؟‘‘

’’سب ختم ہوگیا۔ وہ دونوں گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ ہماری مناہل کے بچے ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ چل کر دیکھو۔ وہ دونوں اپنے کمروں میں نہیں ہیں۔ وہ چلے گئے مسعود۔ اب نہیں آئیں گے۔‘‘ نوشابہ شدتِ غم سے رو پڑیں۔ مسعود جلدی سے بیڈ سے اتر کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ان کے کمروں تک گئے۔ ہر کمرے کو دیکھا لیکن تینوں کمرے خالی تھے۔ بیڈ بھی ایسے ہی تھے جیسے ان پر کوئی لیٹا بھی نہ ہو۔

رات کی بدمزگی اور مناہل کی موت کی خبر نے انہیں دہلا دیا تھا۔ پھر عالی نے انہیں اس کی موت اور اپنی بربادی کا ذمے دار ٹھہرا کر اندر سے بری طرح توڑ پھوڑ دیا تھا۔ وہ دونوں رات نہ جانے کون سے پہر تک روتے اور تڑپتے رہے تھے اور اب صبح سویرے یہ افتاد پڑی کہ ان دونوں کے گھر چھوڑ کر چلے جانے کی خبر مل گئی۔

وہ دونوں سر پکڑے بیٹھے تھے۔ نوشابہ کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ وہ بار بار انہیں پکار پکار کر رو رہی تھیں۔ کبھی مناہل تو کبھی مشال اور کبھی عالی۔ ان دونوں کو ایک پل چین نہیں آرہا تھا۔

’’مسعود! خدا کے لیے کچھ کرو۔ انہیں ڈھونڈو۔ کہیں سے ڈھونڈ کر، منا کر لے آؤ۔ جوان اور خوب صورت بچی کہیں کسی عذاب میں گرفتار نہ ہوجائے۔ پتا نہیں وہ نادان لڑکا اسے لے کر کہاں پھر رہا ہوگا۔‘‘ انہوں نے فریاد کی۔

’’فکر نہ کرو نوشابہ! ان کا ایک ہی ٹھکانا ہے، موسیٰ کا گھر......اور کہاں جائیں گے۔ میں فون کرتا ہوں موسیٰ کو۔‘‘ مسعود نے فون ملایا۔

ہیلو! ہاں موسیٰ کہاں ہے؟ میں مسعود بات کررہا ہوں۔ نہیں یار! بہت بہت ضروری بات ہے۔ ایمرجنسی سمجھ لو۔ جلد سے جلد میری اس سے بات کروادو۔‘‘ مسعود کے چہرے پر پریشانی تھی۔

’’موسیٰ کہیں گیا ہوا ہے۔ آتا ہے تھوڑی دیر میں تو بات کراتا ہوں۔‘‘ اب وہ بھی پریشان ہورہے تھے۔ مسلسل ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے کہ تھوڑی دیر میں ہی موسیٰ کا فون آگیا۔

’’خیر تو ہے خان صیب! کیا ایمرجنسی ہوگیا۔ تم نے فون کیا تھا؟‘‘ اس نے اپنے انداز میں پوچھا۔

’’خیر ہی تو نہیں ہے موسیٰ! بڑا غضب ہوگیا ہے۔ عالی ناراض ہوکر اپنی بہن کو ساتھ لے کر گھر سے چلا گیا۔ ہمیں بتائے بغیر۔ نہ جانے کب اور کہاں گیا۔ کچھ معلوم نہیں۔ اس کا ٹھکانا تمہارے ٹھکانے کے سوا کہیں اور نہیں ہے۔ کیا وہ وہاں نہیں پہنچے؟‘‘

’’یہ کیا بولتا ہے خان صیب! تم نے اتنا ناراض کائے کو کردیا کہ وہ گھر سے ہی چلے گئے۔‘‘ موسیٰ نے چونک کر پوچھا۔

’’یہ ایک پرانی اور لمبی کہانی ہے موسیٰ! میں بتاؤں گا تمہیں۔ فی الوقت مسئلہ انہیں ڈھونڈنے کا ہے۔ جوان لڑکی کو لے کر اس طرح بے یار و مددگار نہ جانے کہاں بھٹک رہا ہوگا۔ زمانہ بہت خراب ہے یار! اگر وہ تمہارے پاس نہیں پہنچے ہیں تو شہر میں ہی کہیں ادھر ادھر بھٹک رہے ہوں گے۔ انہیں ڈھونڈنا ہے۔ ہر قیمت پر تلاش کرنا ہے یار!‘‘ وہ روہانسے ہوگئے، یہ جان کر کہ وہ دونوں اس کے پاس نہیں پہنچے۔

’’اوہ میرے خدایا! خان صیب! یہ تو بہت برا ہوگیا

ہے پر فکر نہ کرو۔ ام ابھی اپنے لوگوں کو صرف اس واحد کام پر لگاتا ہوں۔ آپ بھی تلاش کرو۔ وہ پیدل ہی ہیں تا یا گاڑی ماڑی میں گیا اے۔'' موئی نے پوچھا۔

'' پیدل ہی نکلے ہیں۔ گاڑیاں سب موجود ہیں۔ چوکیدار نے بتایا کہ وہ اسے جاگنگ کا کہہ کر نکلے تھے۔ بہت صبح سویرے اور ویسے کچھ بھی لے کر نہیں نکلے۔ بالکل خالی ہاتھ گئے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ شاید پیسے وغیرہ بھی زیادہ نہیں ہیں ان کے پاس۔''

'' ٹھیک اے۔ میں بھیجتا ہوں اپنا آدمی سارا کا سارا۔ ڈھونڈ لیں گے، فکر نہ کرو۔ پیدل گئے ہیں تو تمہارے علاقے میں ہی کہیں موجود ہوں گے۔ تم بھی تلاش کرو۔ میں بھی تلاش کرواتا ہوں۔''

☆☆☆

جیل میں زندگی کو بیدار ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ تمام قیدی خواتین بیرکوں سے باہر اپنی اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں لگی ہوئی تھیں۔ بڑے سارے کھلے میدان کی صفائی...... کیاریوں میں موجود پودوں کی دیکھ بھال...... دور میدان کے آخری حصے میں سبزیوں کی کاشت میں مصروف خواتین کے علاوہ اندر بڑے ہال میں سلائی کٹائی، قرآن کی تعلیم، کمپیوٹرز اور پھر کچن کی گہما گہمی کہ یہی اس جیل کے معمولات تھے۔

جیلر صفیہ شاہنواز نے ایک راؤنڈ لے کر ان سب معمولات کو چیک کیا اور اپنی دونوں اسسٹنٹس کے ساتھ اپنے آفس میں داخل ہوئیں تو ڈیوٹی کانسٹیبل نے اطلاع دی۔

'' میڈم! وہ ایک لڑکی اور ایک لڑکا بڑی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ملنا چاہتے ہیں۔''

'' ایک لڑکا اور ایک لڑکی، مجھ سے ملنا چاہتے ہیں...... کیوں؟'' وہ بڑبڑائیں اور انہیں بلانے کا اشارہ کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھی ہی تھیں کہ ایک دم وہ لڑکی اندر داخل ہو کر ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

'' ارے ارے...... بیٹا کیا ہوا ہے؟ کون ہو تم؟'' وہ ہڑبڑا سی گئیں تو اس نے شکوہ بھرے انداز میں سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

'' میڈم! آپ اتنی جلدی مجھے بھول گئیں؟'' اس نے شکوہ کیا تو صفیہ شاہنواز نے غور سے اسے دیکھا۔ جدید انداز میں کٹے ہوئے سنہری بال، ماڈرن لباس اور اپنے حلیے سے کسی بڑے گھر کی شاندار نظر آنے والی لڑکی کو اب وہ پہچانی تھیں۔

'' اوہ مائی گاڈ! مشال یہ تم ہو۔ کتنی بدل گئی ہو اور ماشاء اللہ یہ بہت اچھی تبدیلی ہے۔ اس کا مطلب ہے تم اپنے اس گھر میں بہت خوش اور محبتوں بھری زندگی گزار رہی ہو لیکن تمہاری یہاں آمد؟ اور یہ......'' وہ عالی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولیں تو مشال نے فوراً تعارف کروایا۔

'' میڈم! یہ میرا کھویا ہوا بھائی عالیان ہے۔ نانا جی نے اسے بھی ڈھونڈ لیا تھا۔''

'' یہ تو اور بھی زیادہ خوشی کی بات ہے کہ اب تم دونوں بھائی بہن ایک ساتھ ہو۔ کتنی مدتوں کے بعد تم دونوں ایک دوسرے سے مل پائے ہو۔ اس کے لیے تو تم کو اپنے نانا جی کا اور بھی زیادہ شکر گزار ہونا چاہیے۔''

'' نہیں۔ ہمارے بچپن سے لے کر آج تک کی زندگیوں میں جتنی بھی اذیتیں اور تکلیفیں آئی ہیں، اس کے ذمّے دار بھی ہمارے نانا جی ہی ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے ہماری امی کو گھر سے نکال دیا تھا اور پھر پلٹ کر خبر نہیں لی کہ امی اور ان کے بچے کس حال میں ہیں۔ کن تباہیوں سے دوچار ہیں۔ اگر وہ امی کو معاف کر کے انہیں گلے لگا لیتے تو نہ ان کو مرنا پڑتا اور نہ ہم تباہ ہوتے۔''

یہ عالیان کی آواز تھی جس میں زمانے بھر کا درد تھا۔

'' کیا مطلب......؟ انہوں نے تمہاری امی کو نکال دیا تھا...... مگر کیسے؟'' صفیہ شاہنواز نے چونک کر پوچھا تو جواب میں انہوں نے...... حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

'' لیکن بیٹا! جو وقت گزر گیا اسے بھول کر آگے بڑھنا ہی بہتر ہے۔ زندگی کہیں بھی، کسی کے لیے بھی رکتی نہیں ہے۔ اگر ماضی میں ان سے وقتی جذبات کے تحت کوئی بھول ہوئی بھی ہے تو اب وہ اس کی بھرپور تلافی کرنے کی کوشش تو کر رہے ہیں۔ تم دونوں کو وہ دل سے لگا کر پورا اور بھرپور پیار دے رہے ہیں نا...... جوان کی بیٹی کی وراثت کے طور پر تمہیں مل رہا ہے۔ تمہیں ان کے جذبات کی قدر کرنا چاہیے۔'' صفیہ شاہنواز نے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور بھڑک اٹھا۔

'' نہیں۔ ان کے اس جھوٹے پیار سے میری امی تو واپس نہیں آجائیں گی نا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو مرنے پر مجبور کیا اور اب اس احساسِ جرم کو ختم کرنے کے لیے وہ ہم سے پیار جتا رہے ہیں۔ آپ کو کچھ بھی پتا نہیں ہے اس لیے آپ ہمارے جذبات سمجھ ہی نہیں سکتیں۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا تو صفیہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

'' اچھا! تو بتاؤ مجھے کہ تمہیں تکلیف کیا ہے؟ ایسا کیا

کر دیا ہے انہوں نے کہ تم یہاں میرے پاس آگئے ہو...... چلو شروع سے بتاؤ۔'' پھر وہ انہیں سے داستان سناتا رہا اور آخر میں سوال کیا۔

'' اب آپ ہی بتائیے۔ میں اور میری بہن ان کے ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں؟''

'' اچھا تو اب مجھے یہ بتاؤ کہ ان کا گھر چھوڑ دینے کے بعد تم اور تمہاری بہن کہاں رہ سکتے ہو؟'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر پوچھا۔

'' ہم دونوں کی قسمت میں گھر نہیں ہے۔ ہماری آدھی زندگی جیل میں گزری ہے اور اب ہمارا خیال ہے باقی آدھی زندگی بھی جیل میں ہی بہتر ہے۔ ہمیں نہیں رہنا ہے کسی کے گھر میں۔ ہمارے لیے دنیا میں کوئی گھر بنا ہی نہیں ہے۔'' اس نے تلخی سے جواب دیا۔

'' اور تمہارا کیا خیال ہے؟'' انہوں نے مشال سے پوچھا۔

'' جو بھائی کہہ رہا ہے، وہ ہی ٹھیک ہے۔'' اس نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

'' ہوں! دونوں ایک سے بے وقوف ہو۔ جیل کوئی ہوٹل یا سرائے نہیں ہوتی کہ جب جس کا جی چاہے آئے اور چلا جائے۔ جرائم پیشہ افراد کو سزا کے طور پر بھیجا جاتا ہے یہاں اور یہ کام عدالت کرتی ہے۔ تم یہاں کیسے رہ سکتے ہو...... ہاں؟''

'' کوئی بات نہیں۔ ہم دونوں ابھی باہر نکل کر کسی پولیس والے کا پتھر مار کر سر پھوڑ دیتے ہیں یا کسی بڑی دکان کے شیشے توڑ دیتے ہیں یا کہیں سے کوئی چوری ووری کر لیتے ہیں پھر تو آجائیں گے نا ہم جیل میں؟'' عالیان نے کہا تو صفیہ نے اسے گھورا۔

'' بچپن سے اب تک گزارے گئے وقت میں اگر تم لوگوں کی زندگی میں تلخ اور شرمناک واقعات نہیں ہوئے تو یہ تم دونوں کی اتنی بڑی خوش نصیبی ہے کہ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ یہاں سے نکل جانے پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے تم دونوں واپس اس جہنم میں آنا چاہتے ہو؟ یاد رکھو، یہاں! ایسے ایسے لوگ بھی ہیں جو یہاں کے عذابوں سے نجات پانے کے لیے مرنا چاہتے ہیں تو مر نہیں سکتے۔ نہ جانے کس خوش فہمی میں یہاں آگئے۔ نوجوان اور خوب صورت لوگ تو ویسے ہی یہاں پر رس بھری کی طرح ہوتے ہیں جسے ہر کوئی منہ میں رکھ لینا چاہتا ہے۔ بائی ہک اور بائی کروک۔ کل کو دو چار مشٹنڈے تمہاری اس بہن کو اٹھا کر لے گئے تو وہ اس نرم و نازک تتلی کا کیا حشر کریں گے، کچھ اندازہ ہے تمہیں؟ خود بھی تباہی کے غار میں گرنے آگئے ہو، ساتھ میں اس کو بھی لے آئے۔ تم دونوں کی عافیت اسی میں ہے کہ جو گھر ملا ہے، وہاں عزت اور سکون سے رہو۔ زندگی کا لطف اٹھاؤ اور جیل نام کے اس جہنم سے دور رہو۔ بہت دور...... سمجھے!'' صفیہ نے اسے آئینے میں وقت کا بھیانک چہرہ دکھایا۔

'' لیکن میں وہاں نہیں رہنا چاہتا۔ رہ ہی نہیں سکتا۔ مجھے نفرت محسوس ہوتی ہے ان لوگوں سے۔'' وہ غصے سے بولا۔

'' ٹھیک ہے۔ تمہیں اگر نہیں رہنا تو میں تمہاری

بدقسمتی پر افسوس ہی کرسکتی ہوں لیکن کم ازکم اپنے ساتھ اپنی بہن کو تو تباہ و برباد کرنے کی کوشش مت کرو۔ اس کے لیے وہ ایک محفوظ پناہ گاہ ہے جس کی چار دیواری میں اس کی ناموس محفوظ رہے گی۔ تم اگر کچھ کرسکتے تو پہلے بہن کے لیے ایک چھت اور محفوظ پناہ گاہ تعمیر کرتا پھر اسے اپنے ساتھ وہاں لے جاتا۔ ابھی اس کے ساتھ تم سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر تو نہیں رہ سکتے۔ اس لیے جاؤ، پہلے اسے واپس گھر چھوڑو اور پھر تمہارا جہاں جی چاہے چلے جانا۔'' صفیہ نے حکم دیا تو عالی نے بہن کو دیکھا۔''اور تم تو مجھے اتنی بے وقوف نہیں لگتی تھیں کہ معمولی جذباتیت میں آکر بھائی کا ہاتھ پکڑ کر جہنم میں چھلانگ لگانے کو تیار ہو جاتیں۔ کچھ سوچ سمجھ کر گھر سے باہر قدم نکالا تھا یا بس منہ اٹھا کر چلی آئیں۔ بہتر ہے اسے بھی سمجھاؤ اور خود بھی گھر جاؤ۔ وہ دونوں بہت زیادہ پریشان ہوں گے تمہارے لیے۔ جاؤ...... سیدھے گھر جاؤ اور اب کوئی حماقت مت کرنا۔''

صفیہ نے مشال کو بھی ٹھیک ٹھاک ڈانٹ پلائی تو وہ دونوں منہ لٹکائے اس کے آفس سے نکل گئے۔ پھر صفیہ شاہنواز نے فون پر کوئی نمبر ملایا اور تازہ ترین موضوع پر کسی سے بات کرنے لگی۔

☆☆☆

وہ دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے۔ صبح سے دوپہر ہو چلی تھی۔ ان کے سامنے نہ کوئی منزل تھی اور نہ ہی کوئی ٹھکانا۔ مشال چلتے چلتے تھک گئی تھی۔ چڑھتے سورج کی حدت سے اب پسینا پسینا ہو رہی تھی۔

''بھائی! اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا تو عالیان نے اس پر ایک نظر ڈالی تو اس کی آنکھوں میں غصہ کم اور بے بسی زیادہ نظر آ رہی تھی۔

''پتا نہیں!'' اس نے مختصر جواب دے کر منہ موڑ لیا۔

''بھائی! گھر چلیں؟'' اس نے پھر ڈرتے ڈرتے سوال کیا تو اس نے غصے سے اسے گھورا۔

''تمہیں اگر اس گھر کی بہت یاد آ رہی ہے تو میں تمہیں وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ جانا ہے؟''

''مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے لیکن اگر ہم وہاں نہیں جاتے تو کہاں رہیں گے؟'' اس نے پوچھا تو عالی نے کچھ فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم بابا کے پاس چلتے ہیں۔ ان کے پاس رہیں گے۔ وہ بہت اچھے ہیں۔'' اس نے ایک رکشا روکا اور دونوں بیٹھ گئے۔

رکشا مختلف سڑکوں سے گزرتا ہوا، اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ بڑی سڑک سے وہ ایک نسبتاً چھوٹی سڑک پر مڑا جس پر اِکّا دُکّا پرائیویٹ گاڑیوں کے علاوہ کوئی ٹریفک نہیں تھا۔ اس خاموشی میں رکشا کی پرشور آواز اور بھی زیادہ فساد پیدا کر رہی تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم بیٹھے بیٹھے یکدم چونک پڑے۔

ایک سیاہ شیشوں والی بڑی گاڑی ایک سائڈ روڈ سے نکلی اور اس نے رکشا کا رستہ روک لیا۔ شلوار قمیص میں ملبوس تین چار تنومند افراد باہر نکلے اور رکشے کے دونوں طرف آ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک نے مشال کو پکڑ کر ایک جھٹکے میں رکشے سے باہر کھینچ لیا۔ اس نے ایک چیخ مار کر بھائی کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی اور نہ ہی عالی اسے پکڑ سکا۔ اس نے بہن کو بچانے کی خاطر رکشے سے اترنا چاہا تو اس کی جانب کھڑے ہوئے آدمی نے اس کی گردن دبوچ کر اسے ناکام کر دیا۔

ان لوگوں نے مشال کو گاڑی میں ڈالا۔ خود بیٹھے اور گاڑی نامعلوم راستوں پر چلی گئی۔ چند سیکنڈوں میں یہ واردات ہو گئی۔ عالی کے سن ہوتے احساسات یکلخت بیدار ہوئے تو وہ چلایا۔

''چلو! جلدی کرو۔ گاڑی کا پیچھا کرو...... چلو۔ جلدی چلو!'' وہ ہذیانی انداز میں رکشے والے کو جھنجوڑ کر کہہ رہا تھا لیکن جتنی دیر میں وہ کھٹارا رکشا دوبارہ اسٹارٹ ہوا اور آگے بڑھا، اتنی دیر میں وہ قیمتی اور جدید گاڑی دور سڑک کے آخری موڑ پر مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی اور اس کے ساتھ ساتھ عالیان کی دنیا بھی اندھیر ہو گئی۔ اس کی سالہا سال کے بعد ملنے والی پیاری بہن اس سے بچھڑ کر نہ جانے کن بھیڑیوں کے نرغے میں پہنچ چکی تھی اور وہ بے بسی سے دیکھتا رہ گیا تھا اور کچھ بھی نہیں کر پایا۔ اپنی بے بسی پر اب وہ بے طرح رو رہا تھا۔ رکشے والا اسے پریشان نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''بابو صاب! پولیس اسٹیشن چلوں کیا؟ رپورٹ لکھوانی ہے آپ نے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ عالی نے اس کا سوال سنا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں۔ جہاں .... جانے کا کہا ہے، وہیں چلو۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھے اور بے حسی کے عالم میں خاموش بیٹھ گیا۔

رکشا نامعلوم راستوں سے ہوتا ہوا جانے پہچانے

راستوں پر آ گیا پھر اس کے اشارے پر ایک جگہ رک گیا۔ وہ اتر کر آگے بڑھا تو مانوس سی آوازیں آ نے لگیں۔

''اڑے! اپنا عالی بھائی آیا ہے۔''

''کیسا ہے عالی بھائی؟'' وہ بے حسی کے عالم میں ایسے جملے سنتے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور آخر کار لوہے سے بنے اس چھوٹے سے دروازے میں داخل ہو گیا جو دنیا میں شاید اس کی واحد پناہ گاہ تھی۔ یہاں وہ شخص رہتا تھا جو دنیا میں اس کا واحد رشتہ، محبت اور خلوص کا پیکر تھا۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی وہاں کے مکینوں میں ایک خوشگوار سی ہلچل مچی۔ اس کو خوش آمدید کہا جا رہا تھا لیکن اس کا دھیان کسی کی طرف بھی نہیں تھا۔ وہ بڑھتا رہا اور آخر اس کمرے میں داخل ہوا جہاں سے اسے اپنی چوٹ کا مرہم ملنے کی پوری امید تھی۔ وہ وہاں بانہیں پسارے کھڑا تھا۔ اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

''ارے! میرا جانِ جگر آیا ہے۔ خوش آمدید...... خوش آمدید۔'' عالی نے ایک لمحہ رک کر اسے دیکھا تو آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔

''بابا!'' وہ ٹوٹے ہوئے درخت کی طرح اس کی بانہوں کی پناہ گاہ میں گر پڑا۔ اس کے آنسوؤں اور سسکیوں میں اس کا دل پگھل پگھل کر بہہ رہا تھا۔ بری طرح رو رہا تھا وہ۔

''عالی میرا جان! کیا ہوا ہے؟ ایسا کیوں روتا ہے؟'' اس نے اشارے سے اندر آ جانے والوں کو باہر بھیجا اور اس کو گلے لگا کر پیار سے تھپکیاں دیتے ہوئے پوچھا تو وہ پھٹ پڑا۔

''ختم ہو گیا...... سب کچھ ختم ہو گیا بابا! میری زندگی میں تھوڑے دن کے لیے بہن نام کی خوشی آئی تھی جو چھن گئی۔ ظالم اسے اٹھا کر لے گئے بابا!'' اس کا دل شدتِ غم سے پھٹ گیا۔

''کیا بولتا ہے عالی؟ کون لے گیا بہین کو؟ مجھے سارا بات بتا۔ فکر نہ کر۔ زمین کے اندر بھی گیا ہوں گا تو زمین پھاڑ کر نکال کے لے کے آئے گا۔ کون لوگ تھا اور کیوں لے گیا؟ حوصلہ کر۔ عورت کا مافق آنسو بہانا بند کر۔ پورا بات بتا میرے کو۔''

موسیٰ نے سخت لہجے میں کہا تو اس نے اپنے اوپر قابو پایا اور پھر ٹھہر ٹھہر کر اسے ساری بات بتائی۔

''اوئے عقل کا ماٹھا بچہ! یہ تم نے کیا کر دیا؟'' موسیٰ نے پیشانی پر ہتھیلی زور سے مارتے ہوئے کہا تو اس نے سر جھکا لیا۔

''کچھ یاد ہے۔ کیسا گاڑی تھا...... نمبر کیا تھا؟'' اس نے دوبارہ پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کالی بڑی فور وہیل ڈرائیو گاڑی تھی۔ کالے شیشے تھے اس کے۔ گھبراہٹ میں نمبر نہیں دیکھ سکا۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''اوہ میرے خدایا! ابھی کیا کرے...... بولو!'' اس نے کچھ بے بسی سے کہا تو عالی تڑپ اٹھا۔

''اسے ڈھونڈو بابا! کہیں سے بھی اسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ میری آخری امید تم ہی ہو۔ میری بہن نہ ملی تو پچھتاوا مجھے مار ڈالے گا۔ میں مر جاؤں گا۔''

''ایسا کیوں بولتا ہے جانِ جگر! تیری خاطر سارا شہر الٹ پلٹ کر دے گا۔ پر تو بتا! اندھیرے میں بابا کو سوئی ڈھونڈنے کا بولتا ہے۔ کیسے ڈھونڈ لے گا۔'' موسیٰ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''مجھے نہیں پتا کیسے ڈھونڈنا ہے، پر ڈھونڈنا ہے۔ کیسے بھی ہو بابا! کیسے بھی ہو...... مجھے اندیشے ڈرا رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ میں اس کے ساتھ ہونے والے کسی ظلم کے بعد جی نہیں سکوں گا بابا۔ میں نہیں جی پاؤں گا۔'' وہ پھر بلک بلک کر رو پڑا تھا۔

''اچھا اچھا، حوصلہ رکھ۔ کرتا ہے کچھ...... کچھ کرتا ہے۔ پر اب تو نے رونے کا نہیں ہے۔ چپ کر کے ادھر بیٹھنے کا ہے۔ صبر سے، حوصلے سے۔''

موسیٰ نے اسے اشارے سے بیٹھنے کا کہا پھر فون نکال کر نہ جانے کس کس کو کالیں کرنا شروع کر دیں۔ ہر ایک کو ایک ہی حکم تھا ایسی گاڑی تلاش کرو جو کالی، فور وہیل ڈرائیو ہو اور اس کے باہر کی جانب لگے ہوئے فالتو ٹائر پر ''ماسٹر'' نام کا بڑا سا اسٹکر لگا ہوا ہے اور رنج اور پیلے کلر میں...... کہ یہی واحد نشانی بتائی تھی عالی نے اس کی پہچان کے لیے۔

''ہر طرف، ہر جگہ اپنے آدمی پھیلا دو۔ کوئی علاقہ نہیں چھوڑنے کا ہے۔ جلدی تلاش کرو۔ ایک ایک آدمی لگا دو۔ ادھر رجسٹریشن آفس میں اپنے بندے کو جگاؤ۔ ایسی جتنی گاڑی ہے اس کا رجسٹریشن نکلواؤ پھر تلاش کرو۔ جلدی...... جلدی...... جلدی کرو!''

موسیٰ نے واضح ہدایات دیں پھر عالی کا کاندھا تھپک کر اسے تسلی دی۔ عالی نے اس کے انداز میں فکرمندی محسوس کی تو اس کا دل کچھ بیٹھنے سا لگا۔ اسے لگا کہ آج اس نے نانا جی کے گھر سے بہن کو ساتھ لے کر نکلنے کی کتنی بڑی بے وقوفی کی تھی۔ اس کی محفوظ پناہ گاہ چھین کر اسے طوفانی تھپیڑوں کی نذر کر دیا۔ اب پتا نہیں کیا ہو گا۔ یہ سوچ کر اس

کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں صبح سے بھوکے پیاسے ان کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ آس پاس کا کوئی علاقہ نہیں چھوڑا تھا انہوں نے۔ بڑی سڑکوں کے ساتھ ساتھ اندرونی چھوٹی سڑکوں پر بھی گاڑی دوڑاتے رہے تھے۔ علاقے کے سارے پارکس کو بھی چیک کیا تھا انہوں نے لیکن ان کا کوئی پتا نشان نہیں مل سکا تھا۔

آخر مایوسی نے ان پر تھکن طاری کر دی۔ مسعود نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی اور اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر نڈھال سی کیفیت میں ساکت ہو گئے۔ نوشابہ نے روتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور فکر مند ہو گئیں۔

"مسعود! آپ ٹھیک تو ہیں نا۔ سنبھالیں اپنے آپ کو۔ ہم نے اپنی سی ساری کوششیں تو کر لی ہیں نا! آگے ان کی اور ہماری قسمت۔ اب سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیں۔ اگر ہمارے مقدر میں اولاد کی خوشی لکھی ہے تو وہ خود ہی واپس آ جائیں گے۔ ورنہ ہمیں صبر کرنا ہی پڑے گا۔ چلیں! ہم واپس گھر جا کر قدرت کے فیصلے کا انتظار اور دعا کریں گے۔"

نوشابہ کی بات پر انہوں نے سر ہلایا اور وہ گھر آ گئے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر موسیٰ کو فون کیا۔

"موسیٰ! ان کی کوئی خبر ملی؟" انہوں نے فکر مندی سے پوچھا اور دوسری طرف سے انکار سن کر ان کے چہرے پر دکھ کا سایہ چھا گیا۔

"تم نے ڈھونڈنے کے لیے جنہیں بھیجا، انہوں نے کوئی خبر نہیں دی۔ اب دوپہر بھی گزرنے والی ہے یار! میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ کیا؟ کیا کہہ رہے ہو موسیٰ؟" انہوں نے ہڑبڑا کر کہا تو نوشابہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"یہ عالیان نے بتایا؟ کون لوگ لے گئے اسے۔ نہیں معلوم۔ اف میرے خدایا!" فون ان کے لرزتے ہاتھوں سے گر گیا۔

"کیا...... کیا ہوا مسعود؟ مشال کہاں ہے؟ کیا کہہ رہا تھا موسیٰ؟ مسعود! مشال کو کیا ہوا؟ بتاؤ مسعود!" وہ حواس باختہ سی ان سے پوچھ رہی تھیں۔

"وہ...... وہ...... اغوا کر لی گئی ہے...... کچھ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔ کچھ پتا نہیں، کون تھے اور کہاں لے گئے۔ عالیان کو مار پیٹ کر چھوڑ گئے۔" انہوں نے شکستہ سی آواز میں بتایا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"یہی ڈر تھا، یہی خوف تھا ہمیں کہ اس بے وقوف لڑکے کی نادانی کہیں مشال کے لیے عذاب نہ بن جائے اور دیکھو! وہی ہو گیا۔ پتا نہیں اس معصوم بچی پر کیا گزر رہی ہو گی۔ یا اللہ! تو میری معصوم بچی کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔" وہ پھر سے رو پڑیں۔

وہ اسی طرح روتے اور تڑپتے رہے۔ بے بسی انہیں توڑے ڈال رہی تھی اور وہ چاہنے کے باوجود کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔ کوئی پتا نشان نہیں تھا۔ وہ اسے کہاں ڈھونڈتے۔ ٹوٹتے چٹختے اعصاب کے ساتھ وہ یونہی بے سدھ پڑے ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔

"یہ کون ہے؟ نامعلوم نمبر ہے؟" مسعود نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

"مشال ہمارے پاس ہے۔" کسی نے انتہائی پُراعتماد انداز میں انہیں اطلاع دی۔

"تمہارے پاس ہے؟ لیکن کیوں؟" مسعود نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"اس لیے باباجی کہ ہم نے اسے اغوا کر لیا ہے۔" تمسخرانہ انداز میں جواب ملا۔

"کیوں اغوا کیا ہے میری بچی کو...... کیا چاہیے تمہیں؟" مسعود نے پوچھا۔

"یہ ہوئی نہ کام کی بات۔ ہمیں تھوڑے سے پیسے چاہئیں۔ صرف پانچ کروڑ۔"

"کیا؟ پانچ کروڑ تھوڑے سے پیسے ہیں؟ پاگل ہو کیا؟ میں اتنے پیسے کہاں سے لاؤں گا؟" مسعود حواس باختہ ہو گئے۔

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے کہ کہاں سے لاؤ گے۔ لڑکی چاہیے تو پانچ کروڑ دے جاؤ اور لڑکی لے جاؤ ورنہ......" دوسری جانب سے فون بند ہو گیا تو مسعود ٹھنڈے پسینوں میں ڈوب گئے۔

"اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں؟ کیسے ہو گا؟ کیسے ہو گا اس کا انتظام...... کیا کروں؟ کس سے کہوں؟" مسعود بری طرح پریشان ہو گئے۔

"مسعود! اس طرح پریشان ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں کوئی راستہ نکالنا ہو گا۔ ایسا راستہ جس پر چل کر ہم اپنی بچی کو حاصل کر سکیں اور وہ اسے کوئی نقصان بھی نہ پہنچائیں۔" نوشابہ نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینے کی کوشش کی۔

"ایسا راستہ کون سا ہو گا نوشابہ؟ اس نے دھمکی آمیز

لہجے میں جو بات کہی، اس نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔"

"دیکھو! اب اگر اس کا فون آ سکتا ہے تو وہ یہی بات کرے گا۔ اس سے بارگیننگ کرو اور کم سے کم رقم پر آمادہ کرنے کی کوشش کرو۔ اتنی رقم جتنی ہم دے سکتے ہیں۔ اسے صاف صاف بتا دو کہ ہم کوئی بہت زیادہ پیسے والے لوگ نہیں ہیں۔ ہم اپنا سب کچھ بھی بیچ دیں تو پانچ کروڑ نہیں ہو سکتے۔ سوائے مکان کے اور مکان اتنی جلد بکنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس سے پچاس لاکھ کے آس پاس بات کرو۔ ہمت کرو مسعود! اللہ بہتر کرنے والا ہے۔" نوشابہ نے انہیں سوچنے کے لیے ایک رخ بتا دیا۔

"اور اگر وہ نہ مانے...... تو؟"

"اللہ مالک ہے۔ وہی راستہ نکالنے والا ہے۔"

پھر ایسے ہی کئی فون آئے اور بات چیت ہوتی رہی۔ آخرکار ایک کروڑ پر معاملات طے پا گئے۔ اس ایک کروڑ کے لیے بھی انہیں اپنے بہت سے اثاثے بیچنے پڑے۔ یہاں تک کہ نوشابہ کا بہت سا زیور بھی۔

اب انہیں یہ پیسے لے کر کسی مخصوص جگہ جانا تھا اور کسی کے حوالے کرنا تھا۔

☆☆☆

اسے کسی طرح چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس مختصر کمرے میں کبھی بیٹھ جاتا، کبھی بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ کبھی بڑبڑاتا، کبھی روتا۔ کبھی فریاد کرتا اوپر والے سے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب وہ نانا جی کے گھر سے مشال کو لے کر نکلا تھا۔ اب اسے اپنے بے وقوفی کا احساس ہو رہا تھا۔

کاش وقت کا پہیہ الٹا گھوم جائے۔ وہ دوبارہ کبھی مشال کو نانا جی کے گھر سے نہ نکال کر لے جائے۔ وہ اس مضبوط اور محفوظ پناہ گاہ میں اچھی بھلی رہ رہی تھی۔ اسے وہاں سے نکال کر خوامخواہ طوفانوں کے حوالے کر دیا۔ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہو گی۔

"یا اللہ! میری غلطی معاف کر دے۔ میری بہن کو ایک بار مجھے لوٹا دے۔ میں پھر کبھی ایسی حماقت نہیں کروں گا۔" وہ پھر رو دیا۔

"بابا کہاں ہے؟" اس نے لڑکے سے پوچھا جو کھانا لے کر آیا تھا۔

"موسیٰ بھائی کا کوئی پتا نہیں۔ پتا نہیں کدھر گیا ہے۔ کسی کو کچھ بول کر نہیں گیا۔ آ جائے گا۔ آپ کھانا کھا لو عالی بھائی!"

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ نہیں کھا سکتا۔ لے جاؤ۔ بابا آئے تو اس کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔ لے جاؤ۔" اس نے بیزاری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے حکم دیا تو وہ چپ چاپ کھانا اٹھا کر لے گیا۔ وہ پھر انگاروں پر چلنے لگا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ جانے کس پہر تک پہنچ گئی تھی۔ آس پاس کا شور اور ہنگامہ خاموشی میں بدل چکا تھا۔ شاید آخری پہر تھا۔ اس خاموشی میں کسی کے ہلکے قدموں کی چاپ گونجی اور موسیٰ اندر داخل ہوا۔ وہ دوڑ کر اس تک پہنچا۔

"بابا! ملی وہ؟ مشال کا کچھ پتا چلا بابا! بتاؤ نا۔" وہ چہرے پر دہشت لیے اس کا بازو ہلا ہلا کر پوچھ رہا تھا۔ موسیٰ اسے غور سے دیکھتا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر نڈھال سا نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ اس کے سوال کے جواب میں وہ کچھ نہ بولا۔ سوچوں کے تانے بانے کا جال اس کی پیشانی پر پھیلا ہوا تھا۔

"بابا! کچھ تو بولو...... کچھ تو بتاؤ۔" اس نے بے قراری سے پوچھا۔

"ابھی کیا بولے۔ زمین آسمان کو کھنگالنا ہے۔ اتنا جلدی نہیں ہوتا ہے۔ ایک ایک آدمی کو لگایا ہوا ہے۔ سب کو بول دیا ہے۔ بہین کو لے کر آئے گا تو گھر جائے گا۔ نہیں تو کسی کو ادھر شکل دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لگا رہو تلاش میں...... سب لگا ہوا ہے۔ میں بھی لگا تھا، پر تیری فکر میں ادھر آنا پڑا۔ کا سو بولا تو نے کھانا بھی نہیں کھایا...... پانی بھی نہیں پیا۔"

"مجھے کچھ نہیں کھانا پینا ہے بابا! مجھے مشال کو تلاش کرنا ہے۔ اسے واپس لانا ہے۔ اب جاؤ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چلو۔ مجھ سے یہاں بیٹھا نہیں جا رہا ہے۔" اس نے کہا تو موسیٰ نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم کچھ نہیں کر سکتا، جو کام اتنے آدمی مل کر کر رہے ہیں ان کے لیے دعا کر کہ وہ کامیاب ہو جائیں۔ تو نے مسعود خان کو فون کیا؟"

"کس منہ سے انہیں فون کروں۔ ان کی محبتوں کا، ان کے خلوص کا کیسا بدلہ دیا ہے میں نے۔ میں تو انہیں منہ نہیں دکھا سکتا۔ کچھ کہنے کے لیے بھی نہیں ہے میرے پاس۔ کیسے فون کروں؟" اس کے لہجے میں شرمندگی اور پچھتاوا تھا۔

"وہ دونوں بہت برا حال میں ہے۔ میں نے فون کیا تھا ان کو۔ تمہارا بہین کو اغوا کرنے والوں نے پانچ کروڑ

روپیا مانگا ہے اس سے۔''
موسیٰ کی اس اطلاع پر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر وہ حیرت کی زیادتی سے باہر آیا تو ہونٹ تھرتھرا گئے۔
''پانچ کروڑ؟ اتنا پیسا دے سکتے ہیں وہ؟''
''کدھر سے دے گا۔ ریٹائر آدمی ہے۔ مکان کے علاوہ کچھ زیادہ مال تو ہے نہیں اس کے پاس۔ کچھ تھوڑا بہت ہے۔ باقی بیوی کا زیور ہے۔ اور یہ سب مل کر پانچ کروڑ نہیں ہوسکتا۔ مکان بیچنے کو بولتا تھا۔ پر مکان اتنا جلدی نہیں بک سکتا۔ پتا نہیں کیا کرے گا۔''
موسیٰ کی بات سن کر اس پر مایوسی کی ایک لہر آ کر گزر گئی۔
''بابا! کیا...... تم نہیں...... دے سکتے؟'' اس نے نہ جانے کس امید پر پوچھا۔
''دے سکتا ہے۔ پر دو چار بینک لوٹنے کے بعد دے سکتا ہے۔ پانچ کروڑ کوئی تھوڑا پیسا ہوتا ہے؟ ہمارا پاس ہوتا تو تیرے کو کہنے کا ضرورت نہیں پڑتا۔ پہلے ہی دے کر لے آتا تیرا بھین کو۔ اب تو بس تو دعا کر کہ میرا آدمیوں کو اس کا کچھ پتا نشان مل جائے۔ کتنا بھی مارا ماری کرنا پڑے...... یا قتل کرنا پڑے۔ اسے لے کر ہی آئے گا۔''
''اور اگر...... پتا نشان نہ ملا تو؟'' اس نے مایوسی سے پوچھا۔
''کیسے نہیں ملے گا۔ وہ ادھر، اسی شہر میں ہے نا۔ وہ لوگ کسی چوہے کا بل میں بھی چھپ جائے گا، ہم ڈھونڈ کے لائے گا۔ فکر نہ کر۔''

☆☆☆

انہیں انڈسٹریل ایریا کے کسی فیکٹری گودام کا پتا دیا تھا اور ٹائم رات نو بجے۔ انہیں پتا اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا اور وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ وہ تیار تھے۔
''میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' نوشابہ سچ مچ پریشان تھیں۔
''نہیں۔ انہوں نے مجھے اکیلے آنے کو کہا ہے۔ میں کوئی ایسی بات کرنے کو تیار نہیں ہوں جس سے مشال کو کوئی نقصان پہنچے۔ تم فکر نہ کرو اور دعا کرو کہ واپسی میں مشال میرے ساتھ ہو۔'' مسعود نے انہیں تسلی دی۔
''ان شاء اللہ! مسعود اپنا خیال رکھنا۔ بہت احتیاط سے جانا۔ وہ اس قدر ویران سا علاقہ ہے کہیں کوئی اور گلے نہ پڑ جائے۔''
''نہیں، اس کا امکان نہیں ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ اپنے واچ ڈاگ کھڑے کر رکھے ہوں گے۔ اتنے بے خبر تھوڑی ہوں گے کہ ان کو ملنے والے مال کو کوئی اور لوٹ لے۔ تم فکر نہ کرو۔'' وہ اپنا بڑا سا سیاہ بیگ اٹھا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔
وہ سنسان اور اندھیرے میں ڈوبا علاقہ تھا۔ کہیں کہیں فیکٹریوں کے گیٹ پر یا بلڈنگ پر لائٹیں جل رہی تھیں اور کہیں کہیں چوکیدار ٹائپ کے لوگ دو دو یا چار چار کے گروپ بنا کر بیٹھے گپ شپ کرتے نظر آئے۔ گاڑی تو کوئی نظر نہیں آئی، ہاں اکا دکا موٹر سائیکل سوار گزر جاتے تھے۔ وہ راستے کا اندازہ کرتے ہوئے ڈرائیو کرتے کرتے اس مطلوبہ فیکٹری کے گودام تک پہنچ گئے۔ گیٹ کے سامنے گاڑی روک کر انہیں حسب ہدایت تین دفعہ ڈپر دینا تھا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو گیٹ کھلتا چلا گیا۔ اسے اندر سے ہی کھولا گیا تھا۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ گاڑی اندر لیتے چلے گئے۔ ٹین کے شیڈز سے ڈھکا ہوا وہ وسیع و عریض گودام تھا اور اس میں کہیں کہیں بڑی بڑی سوت کی گانٹھیں پڑی نظر آ رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ گاڑی آگے بڑھاتے جا رہے تھے کہ اچانک سامنے کسی نے فون کی فلیش لائٹ چمکا کر انہیں رکنے کا سگنل دیا۔ انہیں روشنی نظر آئی اور ایک ہیولا بھی نظر آیا۔ انہوں نے گاڑی روک دی اور اتر آئے۔ وہ ہیولا آگے آیا تو انہوں نے ملگجی روشنی میں دیکھا، وہ ایک قد آور نوجوان تھا جو جینز اور ٹائٹ ٹی شرٹ میں تھا۔
''مال لایا ہے؟'' اس نے کھردرے لہجے میں پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس پر اس نے ہونٹ سکوڑ کر تیز سیٹی بجائی۔ گانٹھوں کے ڈھیر کے پیچھے سے چار پانچ لوگ نکلے اور آگے آئے۔ مسعود کو وہ مسلح لگے۔
پھر پیچھے ایک اور آدمی آیا۔ اس نے لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ گہرے رنگ کے کپڑوں میں وہ خود بھی کچھ سیاہی مائل نظر آیا۔ چہرے پر نہ جانے کیا پہنا ہوا تھا کہ اصل چہرہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ آگے آ کر مسعود کے سامنے کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ مسعود نے گاڑی سے بیگ نکالا اور نوٹوں سے بھرا وہ سیاہ بیگ اس نقاب پوش کو تھما دیا۔
بیگ منتقل ہوتے ہی اس کے پیچھے سے کسی نے مشال کو آگے بڑھایا۔ وہ مسعود کی شکل دیکھتے ہی بے تاب ہو کر ان کی طرف دوڑی۔
''نانا جی! نانا جی!'' ان کے گلے لگ کر وہ بے طرح

رونے لگی۔ انہوں نے اپنا بازو اس کے کاندھے کے گرد پھیلا کر اس کا سر تھپک کر تسلی دی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے بٹھایا۔ پھر گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اور گاڑی واپسی کے لیے موڑ کر آہستہ آہستہ آگے آئے۔ گیٹ کھلا ملا۔ وہ باہر نکلتے چلے گئے۔
یہ حیرت انگیز ڈیل بغیر ایک لفظ کہے خاموشی سے تکمیل تک پہنچی اور وہ مشال کو لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

بہت جذباتی منظر تھا۔ وہ نانو اور نانا جی سے مل کر کئی بار روئی۔ ان دونوں نے اسے تسلی دی، پیار کیا پھر انہوں نے مل کر کھانا کھایا۔ نوشابہ نے مشال سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو مسعود نے اشارے سے منع کیا کہ فی الحال اس سے کچھ نہ پوچھا جائے۔ وہ صوفے پر ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ کبھی نوشابہ اور کبھی مسعود اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے اور وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ڈور بیل بجی تو مشال کو نوشابہ نے اوپر اپنے کمرے میں جانے کا اشارہ کر دیا۔
''اس وقت۔ رات کو بارہ بجے کون آ گیا۔ بادشاہ خان! اس وقت کون آیا ہے؟'' انہوں نے انٹرکام پر چوکیدار سے پوچھا۔
''صاب! موسیٰ صاب آیا ہے۔''
''اچھا...... اچھا، گیٹ کھولو۔ بلاؤ انہیں۔'' انہوں نے باہر کا دروازہ کھولا اور موسیٰ کی پذیرائی کو آگے بڑھے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ ان کے سامنے وہی حلیہ رکھنے والا شخص کھڑا تھا جس سے وہ تھوڑی دیر پہلے مشال کو لے کر آئے تھے۔
گہرے رنگ کا لباس اور لمبا کوٹ، سر پر ٹوپی لگائے۔ وہ موسیٰ تھا اور حیرت انگیز طور پر اس کے ہاتھ میں وہی سیاہ بیگ تھا جس میں بڑے کرنسی نوٹوں کی گڈیاں اور نوشابہ کا بہت سارا زیور تھا کیونکہ اغوا کنندگان سے ڈیل یہی ہوئی تھی کہ اگر کرنسی کم ہے تو وہ زیور بھی لینے کو تیار ہیں۔
مسعود موسیٰ کو اس طرح دیکھ کر بہت الجھ سے گئے جب اس نے وہ بیگ مسعود کی طرف بڑھایا۔
''یہ تمہارا امانت۔ کھول کر گن لو۔ ایک ٹیڈی پیسا بھی کم ہووے تو ہمارا گردن پکڑ لو۔'' موسیٰ نے بیگ انہیں پکڑا دیا۔
''یہ...... یہ کیا ہے موسیٰ؟ یہ سب کیا ہے؟'' مسعود بہت الجھ گئے تھے۔ مشال کو [illegible]
نادان تم نے مانگا تھا؟ پھر یہ داؤں [illegible] سلسلہ ہے؟ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کچھ بتاؤ نا؟'' [illegible] موسیٰ کا بازو پکڑ کر کہا تو موسیٰ نے ان کا ہاتھ [illegible]
''بتاتا ہوں۔ ہم سب بتاتا ہوں۔ پہلے [illegible] اور مجرم کو تمہارا حوالے کردوں پھر سب بتائے گا۔ [illegible] آ جانِ جگر!''
اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دی تو وہاں سے عالیان اندر داخل ہوا۔ نظریں جھکی ہوئی، چہرے پر شرمندگی کے اثرات...... وہ ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتا ہوا ان کے سامنے کھڑا تھا۔
''مسعود صاب! یہ نادان ہے۔ ابھی دنیا کو جانتا نہیں ہے۔ اس لیے جذبات میں آ کر غلطی کر گیا۔ پر اب بہت شرمندہ ہے۔ آپ بڑے دل کے ہو، اسے معاف کر کے گلے لگا لو۔ معافی مانگ عالی!'' اس نے عالیان کو آگے بڑھایا۔
''نانو! نانا جی! مجھے معاف کر دیں۔ اپنی اس حماقت کے لیے جس نے ہم سب کو پریشانیوں میں ڈال دیا تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔'' عالیان نے آگے بڑھ کر ان سے معافی مانگی تو مسعود نے اسے گلے لگا لیا۔ وہ آنسو بہاتی نوشابہ کے بھی گلے لگ گیا۔ جذباتی سا سین چل رہا تھا کہ موسیٰ کی آواز گونجی۔
''بھابی! ابھی اچھا سا چائے بنوا لو۔ میں ابھی کچھ دیر بیٹھے گا۔ باتیں ماتیں کرے گا۔'' وہ اطمینان سے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ چائے آ گئی تھی۔ سب کے ہاتھوں میں کپ تھے۔
''موسیٰ! یار! اتنا سسپنس کیوں پھیلایا ہے ہو۔ اب بتا بھی دو، یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے؟'' مسعود نے بے تاب ہو کر بڑی اپنائیت سے کہا۔
''ہاں کیوں نہیں بتائے گا۔ آیا اسی لیے تو ہے۔ مگر پہلے اس نادان کو اپنی بھین سے تو ملوا دو تا کہ اسے بھی کچھ صبر آ جائے۔''
نوشابہ نے فوراً عالیان کو مشال کے کمرے کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ ''ہاں وہ اپنے کمرے میں ہی ہے۔''
عالیان تیزی سے اوپر مشال کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو موسیٰ نے کہنا شروع کیا۔
''دیکھو خان صیب! ہمارے پاس ایک دن صبح صبح ایک فون آیا کہ عالی اور اس کا بھین جیل میں آیا ا نے.

دونوں بولتا اے، جیل میں رہنا اے۔ ضد کرتا اے۔ گھر...... یعنی تمہارا گھر رہنے کو تیار نہیں اے۔ بولتا اے ایسے جیل میں نہیں رکھے گا تو باہر کسی پولیس والے کا سر پھوڑ کر آئے گا۔ ورنہ دکان کا شیشہ توڑ کر کچھ چوری کرے گا۔ پھر تو جیل میں رکھنا پڑے گا۔ وہ ہر قیمت پر جیل میں رہے گا۔ گھر واپس نہیں جائے گا۔

''ہم سمجھ گیا کہ ابھی ان دونوں کو اتنا عقل نہیں ہے کہ باہر کا دنیا کتنا گندا اے۔ کتنا خراب اے۔ کیسا برا برا لوگ اے ادھر۔ ہم نے سوچا، دونوں کو اس برا دنیا کا ایک جھلک دکھادیوے تاکہ ان لوگ کو تھوڑا عقل آوے۔ ہم نے اپنا لوگ لگادیا ادھر۔ ان لوگ نے مثال کو اٹھالیا اور ہمارا ایک خفیہ ٹھکانے پر پہنچادیا۔''

''ہا...... مثال کو آپ نے اغوا کروایا تھا اتنا برا کام؟'' نوشابہ حیرت سے چلائی۔

''ہاں! ہم نے اٹھوایا۔ اس لیے ادھر عزت اور آرام سے تھا، ورنہ تھوڑا سبق اس کے واسطے بھی ہونا چاہیے تھا۔ اس کو بھی تھوڑا ڈرانا ضروری تھا تاکہ وہ بھی منہ اٹھا کر کبھی گھر سے اس طرح نہ نکل جاوے۔ اس کو پتا ہووے کہ اس گھر سے انہیں جو تحفظ ملا اے، پیار اور آرام ملا اے، اس کا قدر ہووے۔ اتنا محبت کرنے والا سگا رشتہ ملا ہے۔ اس کا قدر ہووے۔ ابھی بات سمجھ میں آیا ہے۔ اگر اس کو بابا کا لوگ نہیں اٹھاتا، کوئی بدمعاش غنڈا لوگ اٹھاتا۔ تو ہم لوگ کو اس کا نوچا ہوا لاش کسی کوڑا کے ڈھیر سے اٹھانا پڑتا۔ یہ ٹھیک تھا؟'' موسیٰ نے ہیبت ناک نقشہ کھینچ کر اس سے سوال کیا تو وہ دہشت زدہ ہو کر موسیٰ کو تکنے لگی۔

''اللہ نہ کرے۔'' نوشابہ کے منہ سے نکلا۔

''تھوڑا سبق عالی کو بھی سکھانا ضروری تھا۔ کیسا یہ بھین کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکل گیا۔ اپنے آپ کو بڑا رستم کا مافق سمجھ کر بھین کا سر سے چھت ہٹالیا۔ خود بھی خوار ہونے کا واسطے ایسا پناہ گاہ کو چھوڑ کر نکل گیا۔ پھر اس کو بھی پتا چل گیا کہ دنیا میں برا لوگ کتنا طاقتور ہے اور یہ رستم خان خود کتنا کمزور اے۔ وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا تو بھین کو کیسا بچائے گا۔ ابھی لگتا ہے کہ یہ بات اس کو بھی سمجھ میں آگیا ہے۔'' موسیٰ نے عالیان کے بارے میں کہا۔

''ابھی معاف کرنا مسعود صاب! اور بھابی صبا! ابھی تھوڑا آپ کو بھی سیکھنا بہت ضروری اے کہ بچہ لوگ کو صرف پیار کا نہیں، تھوڑا سدھار کا بھی ضرورت ہوتا۔ چوٹ لگے تو زخم پر مرہم رکھو۔ پر کبھی ضرورت ہووے تو تھپڑ بھی رسید کرو۔ ان لوگ کو اس طرح کا تھپڑ لگنا بہت ضروری تھا۔ ابھی امید ہے کہ یہ لوگ کبھی گھر چھوڑنے کا سوچے گا بھی نہیں۔ اگر سوچے تو موسیٰ خان کو بولو۔ آپ تو پیار کرنے والا لوگ اے۔ سزا کا تو کبھی سوچے گا بھی نہیں۔ پر ہم لحاظ نہیں کرے گا۔''

موسیٰ اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا تو عالیان اور مثال اوپر سے آتے ہوئے تیزی سے موسیٰ سے لپٹ گئے۔

''بابا! معاف کردو۔'' دونوں کے منہ سے نکلا تو اس نے زور سے ہنستے ہوئے دونوں کو لپٹالیا۔

''ارے بابا۔ تم لوگ میرے کو بابا بول کے آسمان پر چڑھا دیتا ہے۔ یہ ایسا خوشی ہے جو صرف تم لوگ سے ملتا اے میرے کو، جیتا رہو۔ خوش رہو۔''

''موسیٰ! کسی دن آکر تھوڑا وقت گزارو ہم سب کے ساتھ۔ کھانا کھائیں گے۔ تمہاری بھابی بریانی بہت اچھی بناتی ہے۔'' مسعود نے موسیٰ کو دعوت دی۔

''مسعود صیب! بڑا دن ہوگیا۔ جیل والا ساتھی لوگ بڑا یاد کرتا ہے۔ ابھی کچھ دن کا واسطے اور جانے کا ہے۔ جیل کا دال روٹی کھانا ہے۔ تو اور آجاؤ۔'' موسیٰ نے بات ختم کر کے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا تو مسعود کو بھی کچھ یاد آگیا۔

''ارے ہاں یار! ایک دفعہ میں گیا تھا جیل کے اندر۔ تمہاری تلاش میں۔ کھانا بھی کھایا تھا۔ چلو ٹھیک ہے۔ میں ادھر ہی آؤں گا کسی دن۔ وہ بھی ایک نئی دنیا ہے۔'' مسعود بھی خوش دلی سے ہنسے۔

''چلو ٹھیک ہے پھر اور ادھر ہی ملاقات ہوتا ہے۔ خدا حافظ۔'' وہ ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیٹ سے باہر نکلا اور سیاہ فور وھیلر میں بیٹھ کر اندھیری سڑک پر آگے بڑھ گیا۔

مثال اور عالیان دونوں ندامت سے ہاتھ جوڑ کر نوشابہ اور مسعود کے آگے کھڑے تھے۔ ''ہمیں معاف کر دیجیے۔ ہم سے بھول ہوئی کہ جس گھر میں ہماری ماں کا بچپن گزرا...... ہماری ماں کی یادیں اور خوشبو بکھری ہے ہم نے اس جنت کو چھوڑنے کی غلطی کرڈالی......'' عالیان کی لرزتی آواز نے ان دونوں کو بے چین کر دیا اور انہوں نے بڑھ کر دونوں کو اپنی ممتا کی چادر میں چھپالیا۔

''تم دونوں ہماری منا ہل کی نشانی ہو...... اب کبھی جانے کی بات نہ کرنا۔''